نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی

حکایتِ ہستی

(خودنوشت سوانح)

مؤلف
حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ
(م: ۲۸ر ستمبر ۲۰۱۳ء)
(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو، یوپی)

ترتیب جدید
مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

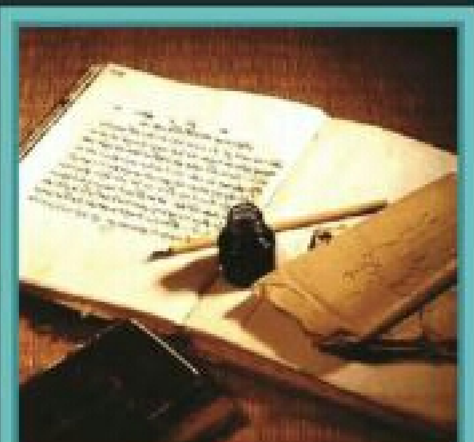

مکتبہ ضیاء الکتب خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)

حکایتِ ہستی
(خودنوشت سوانح)
مؤلف
حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ
ترتیب جدید
مولانا ضیاء الحق خیرآبادی
FBD

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

حکایتِ ہستی

(خودنوشت سوانح)

مولف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ (م: ۲۸؍ستمبر ؁۲۰۱۳ء)
(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو یوپی)

ترتیب جدید

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

ناشر

مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
پن کوڈ:276403 موبائل:9235327576

تفصیلات

نام کتاب : حکایت ہستی (خودنوشت سوانح)
مؤلف : حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ
مرتب : مولانا ضیاء الحق خیرآبادی
صفحات : 384
طبع اول : ۲۰۱۱ء
طبع دوم : ۲۰۱۵ء
ناشر : مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
قیمت : =/250
ای میل: **zeyaulhaquekbd@gmail.com**

ملنے کے پتے

☆ فرید بک ڈپو پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲
☆ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
☆ مدرسہ سراج العلوم چھپرہ ضلع مئو یوپی 9235327576
☆ مکتبہ الفہیم صدر چوک مئوناتھ بھنجن 9236761926
☆ مولانا محمد خالد قاسمی مکتبہ دارارقم، اسلام آباد (ڈکہا) جون پور 9554983430

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

تمہید	مولانا ضیاء الحق خیرآبادی	۹
پیش لفظ	حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی	۱۰
صدائے دل	حضرت مولانا نثار احمد صاحب بستوی	۱۶
مُقدّمۃ	مولانا ضیاء الحق خیرآبادی	۲۰
مختصر سوانح	مولانا ضیاء الحق خیرآبادی	۲۶

☆☆☆☆☆

	مضامین	صفحہ نمبر
۱	**پہلا باب** مطالعہ کی سرگزشت	۴۵
۲	**دوسرا باب** مکتب کی تعلیم	۶۶
۳	**تیسرا باب** درجہ فارسی اور عربی کے ڈیڑھ سال	۷۸
۴	**چوتھا باب** جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں	۸۸
۵	پہلا سال (عربی دوم)	۸۸
۶	**پانچواں باب** عربی سوم (شوال ۱۳۸۶ھ تا شعبان ۱۳۸۷ھ)	۱۰۶
۷	حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب	۱۰۷
۸	غیبی مدد	۱۲۲
۹	ایک نئی دھن	۱۲۵
۱۰	**چھٹا باب** عربی چہارم (شوال ۱۳۸۶ھ تا شعبان ۱۳۸۷ھ)	۱۲۸

۱۱	مولوی کا امتحان	۱۳۰
۱۲	عربیت کا ذوق	۱۳۲
۱۳	چند اہم واقعات	۱۳۳
۱۴	حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کی رحلت	۱۳۶
۱۵	مناظرہ	۱۳۶
۱۶	جلسہ	۱۴۰
۱۷	طالب علمی میں تدریس	۱۴۰
۱۸	قاضی اطہر مبارکپوری سے تلمذ	۱۴۱
۱۹	امتحان سالانہ	۱۴۳
۲۰	امتحان سے پہلے ایک لطیفہ	۱۴۴
۲۱	مطبخ کے نظام میں میری شمولیت	۱۴۵
۲۲	طلبہ کے ساتھ میرا طرزِ عمل	۱۴۵
۲۳	سیرۃ النبی کی خریداری	۱۴۷
۲۴	**ساتواں باب** **عربی پنجم** (شوال ۱۳۸۷ھ تا شعبان ۱۳۸۸ھ)	۱۴۹
۲۵	ایک ناگوار واقعہ	۱۵۰
۲۶	مولانا عبداللطیف صاحبؒ کی تشریف آوری	۱۵۱
۲۷	فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحبؒ کی تشریف آوری	۱۵۱
۲۸	تقریریں لکھیں	۱۵۳
۲۹	تجوید کی تکمیل	۱۵۳
۳۰	جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور	۱۵۴
۳۱	**آٹھواں باب** **شوق اور دلچسپیاں**	۱۵۶
۳۲	محبت کا اتھاہ جذبہ	۱۵۶

۳۳	دوستیاں اور محبتیں	۱۵۸
۳۴	بحث ومباحثہ	۱۶۴
۳۵	جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور کے رفقاء واحباب	۱۶۶
۳۶	ایک وقتی دلچسپی	۱۷۰
۳۷	**نواں باب** **دارالعلوم دیوبند کی تیاری اور داخلہ**	۱۷۲
۳۸	دارالعلوم دیوبند میں	۱۸۶
۳۸	مسجد کا منظر	۱۸۸
۳۹	داخلے کے مراحل	۱۹۰
۴۰	امتحان داخلہ کا منظر	۱۹۲
۴۱	اسباق کی تفصیل	۱۹۵
۴۲	ایک قابل ذکر واقعہ	۱۹۹
۴۳	مولانا کا اندازِ تدریس	۲۰۲
۴۴	النادی الادبی	۲۰۳
۴۵	مولانا کا اندازِ تربیت	۲۰۴
۴۶	ایک تاسّف کا ازالہ	۲۰۵
۴۷	ایک طالب علم کی تقریر اور اس سے تاثر	۲۰۷
۴۸	جماعت اسلامی سے سابقہ	۲۰۸
۴۹	کتب خانے سے استفادہ	۲۱۳
۵۰	**دسواں باب** **دارالعلوم دیوبند کی اسٹرائیک**	۲۲۰
۵۱	مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں چند دن	۲۹۹
۵۲	بچے کی زبان سے نصیحت	۲۳۰
۵۳	دیوبند میں	۲۳۲

۵۴	گھڑی بیچی	۲۳۳
۵۵	حافظ (قاری) شبیر احمد صاحب نابینا	۲۳۳
۵۶	عید کی نماز میں ایک لطیفہ	۲۳۸
۵۷	دیوبند میں میرے کھانے کا انتظام	۲۴۰
۵۸	دیوبند کی کچھ یادیں	۲۴۱
۵۹	حضرت مولانا فخر الدین صاحب (شیخ الحدیث) کی خدمت میں	۲۵۳
۶۰	امروہہ میں	۲۵۴
۶۱	ادیب ماہر کا امتحان	۲۵۶
۶۲	مدرسہ کا سالانہ امتحان	۲۵۷
۶۳	خواب میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زیارت	۲۵۸
۶۴	امروہہ کی چند ناقابل فراموش یادیں	۲۵۸
۶۵	نمازوں کی پابندی	۲۵۹
۶۶	بیداری میں زیارت نبوی	۲۶۰
۶۷	ٹرین میں ایک شاعر سے ملاقات	۲۶۱
۶۸	بدنامی بھی عجیب ہوتی ہے	۲۶۲
۶۹	تجارت اور ناکامی	۲۶۳
۷۰	تدریس	۲۶۵
۷۱	مولوی محمد اجمل صاحب	۲۶۶
۷۲	حافظ الطاف حسین صاحب کا مالی احسان	۲۷۱
۷۳	**گیارہواں باب طالب علمی سے فراغت کے بعد**	۲۷۳
۷۴	تبلیغی جماعت میں ایک چلّہ	۲۷۶
۷۵	حفظ قرآن کا آغاز	۲۷۷
۷۶	۱۶ر مہینے گھر پر	۲۷۹

۷۷	حافظ احمد کریم صاحب	۲۸۱
۷۸	مدرسہ قرآنیہ جون پور میں حاضری	۲۸۲
۷۹	مولانا عبدالباطن صاحب	۲۸۳
۸۰	مدرسہ قرآنیہ میں تدریس	۲۸۶
۸۱	کپڑے کی بنائی	۲۸۶
۸۲	تدریس	۲۸۷
۸۳	بعد نماز عصر کی مشغولیات	۲۸۸
۸۴	خانہ آبادی	۲۸۸
۸۵	میری افتادِ طبع	۲۹۰
۸۶	محبت نبوی ﷺ	۲۹۲
۸۷	۱۹۷۱ء کا سیلابِ عظیم	۳۰۰
۸۸	تصوف کی سلوک کی طرف رُجحان	۳۰۴
۸۹	تدریسی ملازمت کی ایک کوشش اور ناکامی	۳۰۸
۹۰	میری بہن کا انتقال	۳۰۹
۹۱	پھر امروہہ میں	۳۱۰
۹۲	تدریس	۳۱۲
۹۳	مولانا نجم الحق سلّمہٗ	۳۱۳
۹۴	**بارہواں باب** **میسور میں**	۳۱۴
۹۵	تنخواہ میں ترمیم	۳۲۱
۹۶	میسور یونیورسٹی میں	۳۲۲
۹۷	پروفیسر غوث محمد مولوی	۳۲۳
۹۸	بریلوی فتنہ	۳۲۵
۹۹	وطن واپسی	۳۳۰

۱۰۰	تدبیر پر تقدیر کا غلبہ	۳۳۲
۱۰۱	میسور کی بعض یادیں (ایک نصیحت خیز مشاہدہ)	۳۳۴
۱۰۲	شب برأت	۳۳۵
۱۰۳	**تدریسی زندگی**	۳۳۶
۱۰۴	جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس	۳۴۰
۱۰۵	میری پہلی تصنیف	۳۴۴
۱۰۶	ایک مسکین طالب علم	۳۴۶
۱۰۷	تین خصوصی طلبہ	۳۴۶
۱۰۸	ایک اور مسکین طالب علم	۳۴۸
۱۰۹	میسور کا سفر	۳۵۰
۱۱۰	تحصیل مال میں طبائع کی پستی	۳۵۱
۱۱۱	مال کی طغیانی	۳۵۴
۱۱۲	**مدرسہ دینیہ غازی پور میں**	۳۶۰
۱۱۳	بارگاہِ مصلح الامت میں	۳۶۲
۱۱۴	زندگی میں ایک خوشگوار اضافہ	۳۶۴
۱۱۵	ایک خاص واقعہ	۳۶۷
۱۱۶	برکت کا قصہ	۳۶۸
۱۱۷	ضلع دُمکا (سنتھال پرگنہ) میں	۳۷۰
۱۱۸	ایک عجیب واقعہ	۳۸۰
۱۱۹	تعویذات کا آغاز	۳۸۳
۱۲۰	**مدرسہ دینیہ میں دوسرا سال**	۳۸۸
۱۲۱	کھلی ہوا کا مدرسہ	۳۸۹
۱۲۲	مدرسہ میں طلبہ کے بگاڑ کے اسباب	۳۹۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

آج سے تقریباً پندرہ بیس سال قبل میں نے کتابوں کے مطالعے کے موضوع پر ایک آپ بیتی پڑھی تھی ، مجھے اس موضوع سے بڑی دلچسپی ہے ، مجھے خیال آیا کہ حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ کے مطالعہ کی بھی ایک دلچسپ داستان ہے ، جس کے بعض حصے مولانا طلبہ کی تشجیع کیلئے کبھی کبھی بیان کرتے ہیں ۔ جی چاہا کہ اگر یہ داستان مولانا قدرے قلمبند کر دیتے تو رہروانِ راہ علم کے لئے ایک روشن نمونہ ہوتا ۔ میرے دل کی یہ بات زبان پر آئی ، لیکن فرصت نہ ہونے کی وجہ سے مولانا ادھر توجہ نہ دے سکے ، حسن اتفاق کہئے بلکہ مشیئت الٰہی کی منظوری کہئے کہ بیرون ملک کے ایک سفر کے سلسلے میں دہلی میں تین ہفتے تک انتظار میں ٹھہرنا پڑا ۔ میں نے اپنی درخواست دہرائی ، اور مولانا نے وہیں لکھنا شروع کیا ، مگر جیسے جیسے رہوار قلم آگے بڑھتا گیا ، مطالعہ کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ داستانِ حیات کے دیگر گوشے اور زندگی کی دوسری تفصیلات بھی اس میں شامل ہوتی ہوگئیں ، اور اس مضمون نے خودنوشت سوانح کی شکل اختیار کر لی ۔ اس تحریر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سعی وکاوش اور جہد وطلب کے نتیجہ میں انسان بلندیوں کے کن مقام پر پہونچ جاتا ہے ، خدا کرے یہ تحریر دوسروں کے لئے بھی حوصلوں کی بلندی اور عزائم میں استحکام کا سبب بنے ۔

ضیاء الحق خیرآبادی
مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور اعظم گڈھ
یکم جمادی الاخریٰ ۱۴۳۲ھ مطابق ۵؍مئی ۲۰۱۱ء
جمعرات

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

آپ بیتی یا خودنوشت سوانح لکھنے کا کام بڑا نازک عمل ہے، میں نے اس کا کبھی تصور نہیں کیا تھا، میں سمجھتا تھا کہ یہ بڑے لوگوں کا کام ہے جن کی زندگی ابتداء ہی سے بلندیوں کی جانب عروج کرتی رہی ہے، ان کے کارناموں کے ذکر سے، ان کے بعد کے لوگوں کو خوبی وکمال کی تحصیل کا حوصلہ ملتا ہے، نمونہ دیکھ کر باصلاحیت افراد کو چلنے کی راہ بھی ملتی ہے اور سفر کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔ میں چھوٹا، بہت چھوٹا ہوں، اتنا چھوٹا کہ کبھی کبھی اپنے چھوٹے پن کا احساس کر کے مجھے تکلیف ہونے لگتی ہے، میری عمر ساٹھ سال سے آگے بڑھ چکی ہے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مدرسوں میں رہنے، پڑھنے پڑھانے اور اساتذہ کی صحبت و تعلیم کے باوجود میرا قد بڑا تو کیا ہوتا کچھ چھوٹا ہی محسوس ہوتا ہے۔ اس تحقیر و تصغیر کے ساتھ اپنی آپ بیتی لکھنے کا خیال ایک جنون اور حماقت کے علاوہ، کیا کہا جا سکتا ہے، مگر اب دیکھتا ہوں کہ اس جنون میں مبتلا ہو چکا ہوں، اور یہ حماقت مجھ سے سرزد ہو گئی ہے۔

کیوں سرزد ہوئی ؟ اسے بتانا اور اس کی توجیہ و تاویل کرنی بھی شاید اسی حماقت میں شمار ہو، جس کا ارتکاب آپ بیتی لکھ کر ہوا ہے، لیکن باتوں کا سلسلہ جب چل پڑا ہے اور ناظرین کی ایک بڑی تعداد نے اس میں دلچسپی بھی لی ہے، تو پھر اتنا اور گوارا کر لیجئے، جو میں تمہید میں کہنا چاہتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ میں زمانۂ طالب علمی کے بعد سے مسلسل مدرسوں میں معلّمی کر رہا ہوں۔ معلم کے سامنے بچے اپنے دل و دماغ کی سادہ تختیاں لے کر آتے ہیں اور معلم ان

میں علم وفن کے نقش ونگار کندہ کرتا ہے، میں بھی جب معلم کی جگہ بیٹھا اور طلبہ سادہ تختیاں لے کر میرے سامنے آئے تو مجھے بہت سوچنا پڑا۔ کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھا دینا آسان معلوم ہوا، مگر ان کا مزاج بنانا، ان کے قلوب اور اذہان کو علم کی اہمیت پر مرکوز کرنا ایک مشکل کام دکھائی دیا۔ میں صرف کتاب پڑھاؤں، یہ بات مجھے گوارا نہ ہوئی، مجھے ان کے مزاج وطبیعت اور قلوب واذہان کی ایک خاص نہج پر تشکیل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تاکہ یہ ایسے عالم دین بنیں، جو اپنے دین، اپنے رسول اور اپنے اللہ کے وفادار ہوں، یہ دنیا کی عام فضا اور عام ہوا کے خلاف دین کو اور آخرت کو مقصد زندگی اور مطمح نظر بنائیں، اس کے لئے میں نے سبق کے اندر تھوڑے سے وقت کی گنجائش نکالی، سبق کی تکمیل کے بعد کچھ ایسی باتیں ضرور کرتا جس سے ان کے مزاج وطبیعت کی دینی تربیت ہو۔ جمعرات کے دن خصوصیت سے اس کا اہتمام کرتا، پھر وقتاً فوقتاً الگ سے وقت نکال کر اجتماعی طور پر تمام طلبا سے تربیتی خطاب کرتا، ان خطابات میں قرآن وحدیث، سیرت نبوی، حالات صحابہ، تذکرۂ علماء ومشائخ اور ذکر اہل اللہ وخاصان خدا سے میں کام لیتا، کہیں کہیں ان ریشمی ومخملی چادروں میں اپنے کسی کسی واقعہ سے ٹاٹ کا پیوند بھی لگا دیتا، اور محسوس کرتا کہ بچے ٹاٹ کے ان پیوندوں کا اثر زیادہ لیتے ہیں۔ بڑے لوگ تو بڑے تھے، چھوٹے بچے یہ سوچ کر کہ یہ حضرات تو کچھ مافوق العادت لوگ تھے، عظمت کے کان سے سن لیتے، لیکن ان کے حالات وواقعات کے تقاضوں پر چل پڑنے کی ہمت نہ کرتے، اس کے برخلاف جب اپنے ہی جیسے ایک چھوٹے کے متعلق کچھ سنتے، تو یہ سوچ کر کہ ہمارے ہی جیسا ایک کمترین شخص کچھ کر سکتا ہے، تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔

میرے اس طرح کے خطابات میں ایک خاص جوش بیان ہوتا، اور میں بے تکلفی سے جہاں اکابر کے بلند احوال بیان کرتا، اسی بے تکلفی سے اپنے کچھ حالات بھی بتاتا چلا جاتا، جوشِ بیان میں ایک وارفتگی اور ربودگی کی سی حالت ہوتی، اس میں یہ سوچنے کا موقع

ہی نہ ملتا کہ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگانا مناسب عمل نہیں ہے۔

میں نے دیکھا کہ میرے طلبا ان بیانات میں بہت دلچسپی لیتے ہیں ۱۳۹۲ھ سے اب ۱۴۳۲ھ تک مسلسل میرا یہ عمل جاری ہے، اور مجھے اس کے فوائد بہت محسوس ہوئے۔ آپ بیتی کے مدرسی والے حصے میں اس کے نمونے جا بجا ملیں گے۔

میں نے کبھی سوچا نہیں کہ ان باتوں کو قلمبند کر لینا چاہئے، کیونکہ قلم سے اور تحریر سے مجھے مناسبت نہ تھی، بعض طالب علموں نے کبھی کبھی توجہ دلائی، مگر میں نے ٹال دیا، میں طلبہ سے باتیں کرتا اور جو طلبہ میرے پاس سے فارغ ہو کر آگے بڑھ گئے ہوتے اور وہ از راہ سعادت مندی مجھے خطوط لکھتے، تو میں ان خطوط کے مفصل جواب لکھا کرتا، چنانچہ اس کا ایک خاصا مجموعہ ''حدیث دوستاں'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، میرے پیش نظر طلبہ کی تربیت رہی، اسی مقصد کے لئے میں خطاب بھی کرتا اور اسی مقصد سے خطوط بھی لکھتا۔

آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا، اور میرے اس کام میں طول وعرض کے اعتبار سے اضافہ ہوتا گیا، اور طلبہ کی جماعت یکے بعد دیگرے میرے پاس سے گزر کر میدان عمل میں اترتی رہی۔ ان میں زیادہ تر وہ تھے جنھوں نے جانے کے بعد بھی تعلق کا تسلسل قائم رکھا، میرے تجربات بھی بڑھتے رہے، اور ہر دوسرے سال پچھلے سال کے تجربات کا اضافہ ہوتا رہا۔ اور میں ان سے تربیتی تقریروں میں کام لیتا رہا، میرے بعض طالب علموں نے ان بیانات کے لکھنے کی کوشش بھی کی، مگر معاملہ زیادہ تر زبان اور ذہن وحافظہ ہی سے متعلق رہا۔

میرے حلقۂ تعلیم میں اب سے سترہ اٹھارہ سال پہلے، میرے قریبی گاؤں خیر آباد کے رہنے والے میرے بہت قریبی اور مخلص بزرگ دوست حاجی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کے ذہین وذکی اور پڑھنے کے شوقین اور باصلاحیت فرزند حافظ ضیاء الحق سلّمہٗ داخل ہوئے۔ یہ کئی سال تک میرے خصوصی طالب علم رہے، عربی دوم سے عربی پنجم تک دو کتابوں کے علاوہ تمام کتابیں میں نے پڑھائیں، پھر دو سال دیوبند میں رہ کر انھوں نے فضیلت کی تکمیل کی۔

۱۹۹۶ء میں مجھے کراچی جانا تھا، حافظ ضیاء الحق سلّمہٗ بھی ساتھ تھے، ویزا کے انتظار میں دیر تک دہلی میں ٹھہرنا پڑا، انھوں نے موقع پا کر اصرار کیا کہ اپنے مطالعۂ کتب کے احوال لکھ دیجئے، عزیز موصوف کو مطالعہ کا خاص ذوق ہے، اور میں اپنے مطالعہ کے احوال کبھی کبھی بیان کیا کرتا تھا، ان احوال سے انھیں بہت دلچسپی تھی، انھوں نے اس کی فرمائش کی، میں نے فرصت پا کر مطالعہ کی سرگزشت لکھنی شروع کی، اس وقت بھی آپ بیتی کا کوئی تصور نہ تھا، مگر جب قلم چلا تو کب یہ آپ بیتی کی طرف مڑ گیا، مجھے احساس نہیں ہوا۔ اس وقت ہوا، جب قلم کا مسافر دور جاچکا تھا، پھر میں نے بالقصد آپ بیتی ہی کی تحریر شروع کردی، مگر یہ تصور نہ تھا کہ اسے شائع کرنا ہے، اسی لئے تحریر کا سلسلہ رک رک جاتا تھا، جتنا لکھ لیتا، مولوی ضیاء الحق سلّمہٗ اسے پڑھ لیتے اور محفوظ کرلیتے، میں نے کہہ رکھا تھا کہ یہ شائع کرنے کے لئے نہیں ہیں اگر انھیں چھاپنا ہی ہو تو میرے مرجانے کے بعد چھاپا جائے۔

میں جب کہیں سفر میں جاتا تو عزیز موصوف تاکید کیا کرتے کہ جہاں کہیں موقع ملے آپ بیتی لکھتے رہئے گا، مگر اس کی نوبت کم آتی، اس کے باوجود اس کا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا۔

۲۰۰۴ء میں مجھ پر فالج کا حملہ ہوا، فالج دماغ کا مرض ہے، مجھے محسوس ہوا کہ حافظہ اس مرض سے متاثر ہوگیا ہے، مگر جوں جوں علاج ہوتا گیا، حافظہ درست ہوتا رہا۔ اس وقت میرا دایاں ہاتھ کام نہیں کررہا تھا، میں اعظم گڈھ شہر میں اپنے خصوصی معالج ڈاکٹر فرقان احمد صاحب کے نرسنگ ہوم میں تین ہفتے داخل رہا۔ میرے بعض دوستوں نے کہا کہ اپنی بعض خصوصی چیزیں املا کرادیجئے، مجھے خیال آیا کہ مدرسی کے ابتدائی دور میں عوام میں دینی کام کے مقصد سے بہار کے ضلع سنتھال پرگنہ (دُمکا) میں میرا خاصا وقت گزرا ہے، اور وہاں عجیب وغریب حالات سے سابقہ پڑا تھا، پھر حق تعالیٰ کی بڑی مہربانیاں وہاں میں نے دیکھیں۔ میں نے سوچا کہ وہاں کے کچھ حالات لکھوادوں، خدانخواستہ حافظہ غائب ہوگیا تو پھر کچھ یاد نہ رہے گا۔

میرے عزیز فرزند مولوی حافظ محمد عابد سلّمہٗ اس وقت تیمارداری اور خدمت کے لئے میرے پاس ہی تھے، میں نے انھیں دُمکا کے حالات قدرے املا کرائے، پھر میں اچھا ہوکر مدرسے واپس آگیا اور تعلیم وتدریس کی مجلس پھر آراستہ ہوگئی، اور وہ تحریر میں بھول گیا، بہت دنوں کے بعد مولوی ضیاء الحق سلّمہٗ نے اس تحریر کو یاد کیا، تلاش کی گئی تو گم تھی، پھر ایک مدت کے بعد اللہ کی مہربانی سے مل گئی، عزیز موصوف کا خیال ہوا کہ اسے ماہنامہ ضیاء الاسلام میں چھاپ دیا جائے، میں نے کافی حیص بیص کے بعد اجازت دے دی، یہ مضمون ’’پہاڑیوں کے دیس میں‘‘ کے عنوان سے دو قسطوں میں ماہنامہ ضیاء الاسلام فروری، مارچ ۲۰۱۰ء کے شماروں میں شائع ہوا، میرے اندیشے کے خلاف اہل علم اور اہل دل حضرات نے اس مضمون کو بہت پسند کیا۔

رمضان ۱۴۳۱ھ مطابق اگست ۲۰۱۰ء میں عمرہ کے لئے میں حرمین شریفین حاضر ہوا تھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد بہت زیادہ بیمار ہوگیا، داہنے ہاتھ میں ایسی تکلیف پیدا ہوگئی تھی کہ میں دو ماہ تک لکھنے سے معذور رہا، میری بیماری کی وجہ سے ضیاء الاسلام کی اشاعت میں تاخیر ہوئی، مولانا ضیاء الحق سلّمہٗ مدیر رسالہ نے تجویز رکھی کہ تین ماہ کا رسالہ شائع کیا جائے، مگر اتنا مضمون نہ تھا کہ تین ماہ کے صفحات پُر ہوتے، انھوں نے دوسری تجویز رکھی کہ آپ بیتی لکھی ہوئی موجود ہے، اسے شائع کردیا جائے، مجھے سخت تردد ہوا، میں نے منع کیا، انھوں نے کہا کہ ’’پہاڑیوں کے دیس میں‘‘ آپ بیتی ہی کا ایک حصہ ہے، اس کی اشاعت ہوچکی ہے اور اہل نظر نے اسے پسند کیا ہے، پھر اب کیا حرج ہے؟ اگر باقی حصہ بھی شائع کردیا جائے؟

میں نے طوعاً تو نہیں کرہاً اجازت دے دی، جب پہلی قسط شائع ہوئی تو اس کی پسندیدگی کی اتنی آوازیں آئیں کہ مجھے بڑی حیرت ہوئی، اور صرف پسندیدگی نہیں بلکہ اس کی تاکید بھی کہ یہ سلسلہ بند نہیں ہونا چاہئے، چنانچہ اس کا سلسلہ ماہنامہ ضیاء الاسلام میں مسلسل چل رہا ہے۔

میں نے تدریس کے آغاز تک آپ بیتی کی تحریر مکمل کرلی، تو خیال ہوا کہ اسے کتابی صورت میں یکجا کردیا جائے، چنانچہ یہ حصہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

بہت معمولی آدمی کی بہت معمولی داستان ہے، پڑھ کر پسند آئے، تو اس کے راقم اور محرک کے لئے دعا کیجئے، نہ پسند آئے تو یہ اسی لائق ہے۔ **أللّٰهم اغفرلي ولوالدي ولاساتذتي ولاخواني ولأحبائي ولأولادي وارحمهم يا ارحم الراحمين**

اعجاز احمد اعظمی

۱۰؍رجب ۱۴۳۲ھ

۱۳؍جون ۲۰۱۱ء دوشنبہ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صدائے دل

حضرت مولانا نثار احمد صاحب قاسمی دامت برکاتہم

صدر المدرسین دار العلوم الاسلامیہ بستی

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم **امابعد!**

زندگی قطرہ کی سکھاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا

کہتے ہیں کہ انسان ایک ترقی پذیر حیوان ہے، ربّ کریم کی شانِ کرم، خالق کائنات کی حکمت بالغہ کا تقاضا ہوا کہ انسان کو علم و عمل سے کورا پیدا کرے۔

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ شَیْئاً وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۔ (سورۃ النحل: ٧٨)

وہی ذات ہے جس نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا اس حال میں کہ تم کو کچھ خبر نہیں تھی، تم جاہل مطلق تھے، اور اسی نے تمہارے فائدے اور ترقی کے لئے تمہارے واسطے کان اور آنکھ (عقل و شعور کا محل) دل بنا دیا، تاکہ تم لوگ اللہ کا احسان مانو۔

پھر صحیح عقل و شعور اور فکر و تدبر کا حامل بنا کر خلیفۂ کائنات اور اشرف المخلوقات کا خطاب عطا کیا، خاص الخاص اپنی صفت ربوبیت و رزّاقی سے ایک مشت خاک کی تربیت فرما کر باکمال انسان بنا دیا۔

دنیا کی اسی بستی پر خیر و شر کے بڑے بڑے معرکوں میں نبرد آزمائی کے لئے اللہ نے کیسے کیسے سورما پیدا کئے اور کتنے پیدا کئے؟ وہی جانتا ہے۔ انبیاء و صدیقین، شہداء و صالحین

اور مصلحین کی جماعت ایک طرف اللہ کے بندوں کو کلام الٰہی واحادیث نبوی وارشادات بزرگان کو لے کر اللہ سے جوڑتی رہی، احقاق حق بالدلائل وابطال باطل بالحجۃ والسیف کے ساتھ موعظہ حسنہ، شفقت ومحبت بھری باتوں سے ترغیبی وترہیبی پہلوؤں کو وعدے اور وعید کی شکل میں اجاگر کرتی رہی۔ اہل سعادت ان کی طرف دوڑ دوڑ کر قربانی پیش کر کے آخرت کی کامرانیوں اور معرفت وقرب کے راستے پر گامزن رہ کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے، اور جو باقی ہیں وہ اسی صراط مستقیم پر بلا لومۃ لائم آخری امیر امام مہدی کے زمانۂ اتحاد تک قائم رہیں گے۔ انشاءاللہ

فَمِنۡهُمۡ مَنۡ قَضیٰ نَحۡبَهٗ وَمِنۡهُمۡ مَنۡ یَّنۡتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوۡا تَبۡدِیۡلاً۔

ان میں سے کچھ لوگ اپنی تمنا پوری کر چکے، رفیق اعلیٰ سے جا ملے، اور کچھ لوگ ابھی منتظر ہیں اور ذرا بھی ان کی استقامت میں فرق نہیں آیا۔ **اللّٰهم اجعلنا منهم**

دوسری طرف ابلیس لعین اور اس کے جن وانس کارندے ہیں جن کی سرکردگی میں خلق خدا کی ایک بڑی بھاری جماعت نے اپنی قوت وشوکت اور نئے نئے نظامہائے زندگی لا کر شکم سیری اور شہوت رانی کے ایک ایک خوش کن دروازے کھول دیئے، اور دجالی فتنوں کے بازار گرم کر رہے ہیں جن سے صالحین و مصلحین حیران وششدر ہیں، لیکن باطل باطل ہے، اِنَّ الۡبَاطِلَ کَانَ زَهُوۡقاً کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ وَّکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیۡلاً۔ کا تشفی بخش اور فرحت افزا مژدہ شرمندۂ تعبیر ہو کر رہے گا، انھیں دو متضاد (خیر وشر) کے حالات سے ہر انسان گذرتا ہے، دوچار ہوتا ہے، کہیں لاچار ہو کر ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر کے آدمی اپنے کو حالات کے دھارے میں ڈال دیتا ہے

؏ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

یہ وہ بدنصیب لوگ ہیں جن کے بارے میں ارشاد باری ہے:

وَاِخۡوَانُهُمۡ یَمُدُّوۡنَهُمۡ فِی الۡغَیِّ ثُمَّ لَا یُقۡصِرُوۡنَ، اور شیطان اپنے بھائیوں کو

گمراہی میں گھسیٹے چلے جاتے ہیں، پھر ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتے۔

اور جو باعزم وہمت انسان ہیں، آخری سانس تک نبرد آزما رہتے ہیں، یہاں تک کہ رحمت باری کو جوش آتا ہے، پھر غیب سے اس کی دستگیری کی جاتی ہے اور منجدھار سے نکل کر ساحل عافیت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

یہ وہی خاصانِ خدا ہیں جن کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:

وَإِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَاهُمْ مُبْصِرُوْنَ۔

جب اللہ والوں پر شیطان کا کوئی حملہ ہوتا ہے تو وہ چونک اٹھتے ہیں، پس وہ لوگ سمجھ جاتے ہیں۔

حضرت مولانا الحاج الشیخ اعجاز احمد **ذوالمجاز للارشاد والاصلاح** کی شخصیت انھیں خاصان خدا میں سے ایک ہے جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ زندگی کے سمندر کی موجوں میں الجھتا اور سلجھتا نظر آتا ہے اور قدم قدم پر رحمت الٰہی کی مخفی طاقتوں سے دستگیری ہوتی رہی ہے، محترم مولانا موصوف کی زندگی ایسی ہی معلوم ہوتی ہے، جیسے علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی ترجمانی کر رہی ہو ؎

نہنگے بچۂ خودرا چہ خوش گفت   حرام آمد بدین ما کرانہ
بموج آویز واز ساحل بہ پرہیز   ہمہ دریا است مارا آشیانہ

عاقبۃ الامر مولانا کو اللہ نے اپنے خاص فضل وکرم سے علمی وعملی، تحریری وتقریری، اصلاح خلق وفریضۂ دعوت واصلاح کے کمالات سے وافر حصہ عطا کیا اور ان کیلئے حکمت (احقاق حق) جدال (ابطال باطل) اور موعظت وشفقت کے دروازے کھول دیئے۔

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْراً كَثِيْراً ۔ جس کو حکمت عطا کی گئی اس کو خیر کثیر دیا گیا۔

مولانا موصوف کی تحریریں اور مواعظ میری مذکورہ باتوں کی تائید کریں گی، یہ باتیں عقیدت مندانہ مبالغہ آرائی نہیں بلکہ میرا ایک دلی اور ذاتی تاثر ہے، جس کا میں نے آج اظہار

کردیا۔ مولانا بہت دنوں سے علیل چل رہے ہیں، اللہ تعالیٰ صحت وعافیت عطا کرے۔ آمین

علالت کے باوجود ان کے وقت کی برکت وقبولیت ہی ہے کہ صحت مندوں سے زیادہ لکھ پڑھ رہے ہیں اور فون پر افادہ وافاضہ کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔

کتاب ’’حکایت ہستی‘‘ مولانا کی خودنوشت جزئی سوانح ہے، جس میں آپ کو بہت سی باتیں ایسی ملیں گی جو موقع ومحل کے اعتبار سے آپ کے دل کو لگے گی اور مستقبل کے لئے آئینہ دکھادے گی، اس میں نہ کہیں اِدعاء ہے نہ تعلّی، اور نہ کہیں اپنے کردار واستقامت پر ناز ہے نہ اعتماد، ہر جگہ ایک عاجزی، بے بسی، بندگی، تواضع جھلکتی ہے، نیز بامراد وشادکام ہونے پر تشکر وامتنان کے آنسو بھی جھلکتے اور چمکتے ہیں۔ طوالت مانع ہے ورنہ تحریریں بھی مثال میں پیش کرتا جو مولانا کی شخصیت وہستی کی آئینہ دار ہیں، کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے، آپ براہ کرم توجہ سے پڑھیں، عوام وخواص بالخصوص اہل مدارس (علماء وطلبہ) کے لئے خاصے کی چیز ہے۔

توقع ہے کہ ہستی کی طرح حکایت ہستی بھی بارگاہ ایزدی میں قبولیت ومقبولیت کا مقام حاصل کرے گی۔ بقول شیخ شیرازی

بماند سالہا ایں نظم ترتیب　　زما ہر ذرہ خاک افتادہ جائے
غرض نقشیست کز یاد ماند　　کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحبدلے روزے برحمت　　کند درکار درویشاں دعائے

ربّ کریم مولانا موصوف کو بکمال صحت وتمام عافیت وایمان کے ساتھ ہم خردوں بلکہ امت مسلمہ اور اسلام کی نفع رسانی کے لئے تادیر قائم ودائم رکھے۔ آمین

نثار احمد قاسمی

(۱۳؍رجب ۱۴۳۲ھ ۱۶؍جون ۲۰۱۱ء جمعرات)
صدر المدرسین دار العلوم الاسلامیہ بستی

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقدّمہ

آپ بیتی یا خودنوشت سوانح اس خاص فن نگارش کو کہتے ہیں جس میں لکھنے والا اپنی ذات کو سامنے رکھ کر ان تمام احوال وکوائف ، افراد وشخصیات ، سماج ومعاشرہ اور ماحول ومقام کا ذکر کرتا ہے جو اس کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں موثر رول ادا کرتے ہیں، وہ ان تمام واقعات وکیفیات سے قاری کو آگاہ کرتا جاتا ہے جن سے مختلف احوال ومواقع پر وہ دوچار ہوا رہتا ہے، کہ کس چیز یا شخصیت نے اس پر مثبت اثر ڈالا اور کس چیز نے منفی؟ پھر اس کی زندگی کے نشیب وفراز نے زندگی کا رخ متعین کرنے میں کیا کردار ادا کیا؟ ان تمام باتوں کو وہ قارئین کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ اب وہ اس کی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کرلیں کہ وہ اچھی ہے یا بری، کامیاب ہے یا ناکام؟

سوانح نگاری چاہے جس زبان میں بھی ہو، صرف ادب برائے ادب کوئی چیز نہیں ہے، اس کا مقصد ادب برائے زندگی ہونا چاہئے ، کہ زبان وبیان کی لذت وحلاوت اور فصاحت وبلاغت کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی پیش نظر رہے کہ سوانح نگار نے کس مقصد کے تحت اپنے حالات لوگوں کے سامنے رکھے ہیں، وہ کون سا جذبہ کارفرما تھا جس نے اس کو اپنی حیات مستعار کے تمام گوشوں کو دوسروں کے سامنے رکھنے پر آمادہ کیا جبکہ اس میں ہر طرح کی باتیں آجاتی ہیں، خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی، حسن عمل کے ساتھ بے عملی بھی، اور گوشۂ حیات کے دیگر کمزور پہلو بھی! اس طرح کی سوانح عمری سوانح نگار کے افکار ونظریات ، خیالات ورجحانات کے تابع ہوا کرتی ہیں ، وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے مخصوص افکار ونظریات سے آزاد ہوکر کچھ نہیں لکھ سکتا ، ورنہ وہ ایک مصنوعی آپ بیتی ہوکر رہ جائے

گی۔ ایک صاف گو سوانح نگار تو لوگوں کی تعریف وتوصیف یا تنقید وتبصرہ بلکہ تنقیص سے بھی بے نیاز ہوکر اپنی ذات پر جو کچھ گزرا ہے بے کم وکاست بیان کردیتا ہے تاکہ پڑھنے والے اس کے مثبت ومنفی پہلو سامنے رکھ کر اس سے سبق لیں اور عبرت حاصل کریں، اس کی مثال میں ادیب شہیر مولانا عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

آپ بیتی لکھنے والوں میں ہر قسم کے افراد ہوتے ہیں، وہ بھی ہیں جو پستی سے بلندی پر پہونچے، وہ بھی جنھوں نے میدان سیاست کو اپنی جولان گاہ بنایا اور اسی راہ سے ترقی وشہرت کے بام عروج پر پہونچے، وہ بھی ہیں جن پر دین ومذہب کا رنگ غالب ہے، وہ بھی ہیں جو ایوان اقتدار سے وابستہ رہے، وہ بھی ہیں جو بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہے، اس میں علماء کرام اور مشائخ طریقت بھی ہیں، اس طرح خود اردو زبان میں جو دیگر زبانوں کے مقابلہ میں ابھی نسبتاً کم عمر ہے مختلف النوع افراد کی سیکڑوں آپ بیتیاں موجود ہیں۔ پڑھنے والوں کا اپنا اپنا ذوق اور اپنی اپنی پسند ہوتی ہے، کسی کو سیاسی افراد کی سوانح پڑھنے میں لطف آتا ہے، تو کسی کو ادبا وشعرا کی آپ بیتیوں سے دلچسپی ہوتی ہے، تو کسی کو علماء ومشائخ کی خودنوشت سوانح سے رغبت ہوتی ہے، جیسا ذوق ہو ویسی ہی ترجیح اور پسند بھی ہوتی ہے، ہر آپ بیتی کا اپنا ایک رنگ، انداز اور اسلوب ہوتا ہے۔

اگر ہم کسی عظیم ہستی اور مشہور شخصیت کے مکمل تعارف، اس کے مزاج ونظریہ اور پسند ورجحان کے بارے میں جاننا چاہیں تو خودنوشت سوانح اس کا ایک بہترین ذریعہ ہے، اس لئے کہ اپنی ذات کی معرفت لکھنے والے کو جتنی ہوگی کسی دوسرے کے بیان سے وہ بات حاصل نہیں ہوسکتی، اس لئے آپ بیتیوں کی ہمہ گیر افادیت ایک مسلم چیز ہے جس سے انکار مشکل ہے۔ یہ آپ بیتیاں شخصیت کو بنانے، کردار کو سنوارنے اور زندگی کی راہ متعین کرنے میں اور کسی کو اسوہ ونمونہ بنا کر زندگی کا سفر طے کرنے میں بہت معاون ہوتی ہیں۔

لیکن آپ بیتی لکھنا ہر ایک کا کام نہیں، اس سنگلاخ وادی میں وہی شخص قدم رکھے جس کے ضمیر وخمیر میں راست گوئی وراستبازی رچ بس گئی ہو، جس کی زندگی میں شہرت وریا

کا گزر نہ ہو، اور وہ شخص اپنے اور قاری دونوں کے حق میں مخلص ہو، تاریخ سازی مقصود نہ ہو۔ ورنہ ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں یہ اوصاف عالیہ رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جا رہے ہیں، اور تجارتی نقطۂ نظر، جھوٹی شہرت اور کردار کشی کے لئے بھی آپ بیتیاں لکھی اور لکھوائی جا رہی ہیں جس میں حقائق کو مسخ کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔

ہمارے بزرگوں نے بھی آپ بیتی اور خودنوشت سوانح لکھی ہے اور جس طرح انھوں نے اپنی کتابِ زندگی کو کھول کر پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دیا ہے اس سے ان کی بے لوثی، دیانتداری، اخلاص نیت اور اصلاحِ امت کے جذبے کا اندازہ ہوتا ہے، یعنی مقصدیت کو انھوں نے زبان وادب اور الفاظ وعبارت کے بازار میں ضائع نہیں کیا ہے۔

''حکایت ہستی'' بھی انھیں آپ بیتیوں میں سے ایک قابل قدر، مشعل راہ اور صداقت ودیانت کا مرقع، آپ بیتی ہے۔ اس کے لکھنے والے استاذ محترم حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی **نور اللہ مرقدہ ورفع اللہ درجاتہ** دور حاضر کے ان باکمال علماء میں سے تھے جن کو خلاق عالم نے ہمہ گیر صفات اور گوناگوں خوبیوں سے نوازا تھا، اس سلسلے میں مَیں خود کچھ نہ کہہ کر ان کے رفیق درس اور مشہور صاحب قلم عالم مولانا نور عالم خلیل امینی مدظلہ کی تحریر کا ایک اقتباس نقل کرنا چاہتا ہوں:

> مولانا اعجاز احمد اعظمی نے علم وعمل کی دنیا میں بڑی نیک نامی حاصل کی، ملک کے منتخب روزگار علما میں اُن کا بھی نام لیا جاتا تھا۔ علومِ شریعت میں مہارتِ تامہ کے ساتھ ساتھ تدریس وتالیف اور اِحسان وتربیت کی دنیا میں بھی وہ اپنی شناخت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے تعلیم وتربیت اور تحریر وتالیف کے ساتھ ساتھ دینی ودعوتی اسفار سے بھری پُری زندگی گزاری اور اِن سارے میدانوں میں اپنا نقشِ دوام چھوڑ گئے۔ وہ ایک صاحبِ نسبت شیخ بھی تھے، اچھے اور بافیض مدرس بھی، مقبول ومحبوب مصنف اور اہل قلم بھی اور بابرکت مقرر وواعظ بھی۔ وہ خوب صورت، شستہ، بے ساختہ اور بہت رواں اردو زبان لکھتے تھے، جو لسانی خوبیوں سے بھی خاصی مالا مال ہوتی تھی؛ اسی لیے

> اُن کی تحریریں بہت مقبول ہوئیں؛ کیوں کہ علمی مواد اور متعلقہ موضوعات پر بھرپور معلومات کے ساتھ ساتھ اُن کے یہاں زبان کی چاشنی اور ادبی تراوش بھی پائی جاتی تھی۔ اُن کے مستفیدین وتلامذہ اُن کے بہت گرویدہ ہوتے تھے؛ کیوں کہ اُن کے یہاں علم وعمل کی یک رنگی اور قول وفعل کا اتحاد تھا، ایسا عالم ہمیشہ محبوب ہوتا ہے جس کے یہاں علم وعمل میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اُنھوں نے مرتب زندگی گزاری اِس لیے اسفار ورحلات کے باوجود ڈھیر سارا علمی کام کرنے میں کام یاب رہے۔

واقعی حضرت الاستاذ فضل وکمال کی دنیا کے ایسے فرد کامل تھے جن پر ’’عالم ربانی‘‘ کا اطلاق حق بجانب ہے، وہ ان کمیاب بلکہ نایاب علماء میں سے تھے جو آخرت کے لئے جب رخت سفر باندھتے ہیں تو ایک تاریخ چھوڑ جاتے ہیں، ایک راہ مقرر کر جاتے ہیں جس پر بعد والوں کے لئے چلنا آسان ہوتا ہے۔

مولانا نور عالم صاحب ’’حکایت ہستی‘‘ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اُنھوں نے یہ بہت اچھا کیا کہ اپنے قلم سے اپنی سوانح بھی لکھ دی اور ’’حکایتِ ہستی‘‘ کے نام سے وہ شائع بھی ہوگئی، لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور خوب پڑھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل علم کو (بہ شرطے کہ اُسے اچھا لکھنا بھی آتا ہو) اپنی زندگی کی کہانی خود ہی لکھ جانا چاہیے؛ کیوں کہ یہ آنے والوں کے لیے باوثوق ماخذ بھی ہوتی ہے اور عہد وماحول کی سچی تصویر بھی۔ دوسروں کے ہاتھوں دوسروں کی باتیں اِتنی سچی پکی نہیں ہوسکتیں، جتنی کسی کی اپنی زبان سے اپنی باتیں، نیز گرد وپیش کے حالات اور برتے ہوئے معاصر انسانوں سے انسان جتنا خود واقف ہوتا ہے، کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔

حضرت مولانا نے اس میں پوری دیانت وصداقت اور حق گوئی وبے باکی کے ساتھ اپنے اوپر گزرے ہوئے احوال کا ذکر کیا ہے، میری فرمائش پر اپنے مطالعہ کی داستان سناتے ہوئے انھوں نے داستان حیات کے تمام گوشوں کو ابتدائی مکتبی زندگی سے لے کر احیاء العلوم مبارکپور، دارالعلوم دیوبند، مدرسہ چلہ امروہہ اور میسور کی تدریسی وتبلیغی زندگی کے تمام اہم واقعات وسرگزشت کو بیان کردیا ہے۔ خاص کر اپنی داستان حیات کا سب سے

کربناک اور دردناک دور انھوں نے کس طرح گزارا، اور کس طرح توفیق الٰہی نے انھیں ثابت قدم رکھا، اس کو تو پڑھ کر صحابی رسول حضرت کعب بن مالکؓ کی آپ بیتی یاد آنے لگتی ہے جو غزوہ تبوک سے تخلف کے بعد پچاس دن کا وقفہ تھا، جس کو قرآن نے: ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ ، سے تعبیر کیا ہے، لیکن اپنا واقعہ سنانے میں انھوں نے کہیں ایک حرف بھی جھوٹ نہیں کہا، یہی سچائی تھی جس نے ان کو معیارِ عمل بنادیا تھا، اللہ نے ان لوگوں کو معیار صداقت بنا کر مسلمانوں کو حکم دیا کہ: كُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی زندگی اور اس کے غیر معمولی اثرات کو حضرت مولاناؒ نے بے کم و کاست اور بغیر رسوائی کے خوف کے تفصیل کے ساتھ حرف بحرف پوری سچائی کے ساتھ قارئین کے سامنے کردیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ''حکایت ہستی'' سوانح برائے سوانح یا ادب برائے ادب نہیں بلکہ یہ ایک پیغام ہے، ایک سبق ہے، عبرت وموعظت کی ایک داستان ہے جو دوسروں کی زندگی کو سنوارنے، نکھارنے اور جذبات وحالات کی رو میں بہنے سے روکنے کے لئے لکھی گئی ہے، اور یہ سبق دیتی ہے کہ حالات چاہے کتنے ہی ناگفتہ بہ ہوں لیکن انسان اگر اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر کے ثابت قدم رہے تو آزمائشوں کی تاریک گھٹا دیر سویر چھٹ کر رہے گی، اور اسی کی اوٹ سے کامرانیوں کا آفتاب طلوع ہوگا، اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت کو آئندہ آپ سے جو کام لینا تھا اس کے لئے کٹھن سے کٹھن حالات سے آپ کو گزارا گیا تاکہ کندن بن سکیں، کہ ع

فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

بہر حال یہ کتاب بعد کے لوگوں کے لئے بالخصوص طالبان علوم نبویہ کے لئے ایک مشعل راہ ہے جس کی روشنی میں وہ راہ علم کو بسہولت طے کرسکیں گے۔ اور اس میں پیش آنے والی دشواریوں اور مشکلات سے بخوبی نبرد آزما ہوسکیں گے۔

حضرت مولانا نے اپنی حیات میں زمانہ طالب علمی کے احوال کو حصہ اول بنا کر

شائع کروادیا تھا، اور توقع تھی کہ دوسرے حصہ میں مدرسی کے زمانے کے احوال وہ سنائیں گے، اور یہ حصہ تعلیم وتربیت کے لحاظ سے بہت اہم تھا، اس لئے کہ وہ اس ہستی کے تدریسی دور کے حالات ہوتے جس کی سب سے نمایاں خصوصیت تعلیم وتربیت اور درس وتدریس ہی تھی، وہ خود اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

> ''میں طبعاً مدرّس اور معلّم ہوں، مطالعۂ کتب میرا شوق ہے، طلبہ کو پڑھانا میرا ذوق ہے، اطاعت وسپردگی میری طبیعت ہے، ذکرِ الٰہی میری غذا ہے، فکرِ آخرت میری سوچ ہے۔ طبیعت اسی رنگ میں ڈھلی ہوئی ہے۔''

اہل علم کو اس کا بہت شدت سے انتظار تھا، چنانچہ لوگوں کے تقاضے پر یہ حصہ شروع بھی کردیا تھا، لیکن اخیر زمانہ حیات میں شدید و مدید بیماری اور ضعف نے اس قدر نیم جاں بنادیا کہ لکھنے کا تسلسل باقی نہ رہ سکا، اور زمانہ تدریس کے ساٹھ ستر صفحات لکھنے کے بعد حکایت ہستی کا یہ سچا راوی ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ اب جبکہ اس کی دوبارہ اشاعت کا وقت آیا تو خیال ہوا کہ بقیہ حصہ کو بھی مطبوعہ کتاب میں شامل کرکے شائع کردیا جائے اور شروع میں مختصر سوانح چند صفحات میں لکھ دی جائے جس سے قارئین حکایت ہستی کی انتہا سے بھی واقف ہوجائیں، گو سرسری طور پر ہی سہی!

چنانچہ میں نے اختصار کے ساتھ مکمل سوانح لکھ کر کتاب کے شروع میں شامل کردی ہے۔ اللہ تعالیٰ سابقہ ایڈیشن کی طرح اس کو بھی شرف قبولیت سے نوازے اور مولف مرحوم کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

ضیاء الحق خیرآبادی
مدیر مجلّہ سراج الاسلام
استاد مدرسہ سراج العلوم، سراج نگر، چھپرہ ضلع مئو یوپی
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ مطابق ۲۱/ مارچ ۲۰۱۵ء شنبہ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ

مختصر سوانحی خاکہ

(ولادت: ۲۸/ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۵/فروری ۱۹۵۱ء
وفات: ۲۲/ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۸/ستمبر ۲۰۱۳ء)

ضیاء الحق خیرآبادی

لیس علی اللہ بمستنکر   أن یجمع العالم فی واحد

اللہ پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے کہ وہ فردِ واحد میں ایک عالم کو سمیٹ دے۔

ایک شخص باکمال مدرس ومربی، بے مثال مقرر وخطیب، سحر نگار انشاء پرداز وادیب، خضر راہ شریعت وطریقت ہو، ایسا بہت کم ہوتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کو جب کسی فرد واحد سے ایک عالم کا کام لینا مقصود ہوتا ہے تو اس کے اندر یہ تمام خوبیاں جمع کردیتے ہیں۔ میرے مربی ومحسن استاذ محترم حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ کی ذات ایسی ہی جامع صفات کی حامل تھی، وہ اللہ کی قدرتِ کاملہ کی حجت بالغہ تھے۔ حضرت مولانا تقریباً چالیس بیالیس سال تک اپنے علم وعرفان کی خوشبو بکھیر کر ۲۸/ستمبر ۲۰۱۳ء شنبہ کا دن گزار کر رات ساڑھے گیارہ بجے ایک مختصر علالت کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ **انا للہ وانا إلیہ راجعون، اللھم اجرنی فی مصیبتی واخلف لی خیرا منھا**۔ اس مضمون میں حضرت مولانا کے سوانحی حالات اختصار کے ساتھ درج کرتا ہوں، تاکہ قارئین کے سامنے چند صفحات میں مکمل حالات زندگی سامنے آجائیں۔ **بتوفیق اللہ وعونہ**

ولادت: ۲۸ / ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۵ / فروری ۱۹۵۱ء کو آپ یوپی کے مردم خیز خطہ اعظم گڈھ کے ایک گاؤں بھیرہ ولید پور میں پیدا ہوئے۔ والد محترم الحاج قاضی محمد شعیب صاحب کوثرؔ اعظمی دین کا ذوق رکھنے والے ایک بہترین شاعر تھے، جس کی وجہ سے گھر کے ماحول میں دین وادب کا قدرے چرچا تھا، اسی ماحول میں آپ کی نشوونما ہوئی، جس کی وجہ سے مطالعہ کا ایک فطری ذوق پیدا ہوگیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ’’مجھے پڑھنے کا ذوق بہت ہے، ذوق نہ کہئے شوق کہئے، بلکہ جنون کہئے‘‘ چنانچہ اسی کے زیر اثر ابتداء سے ہی ہر طرح کی کتابیں زیر مطالعہ رہیں۔

تعلیم: مکتب کی تعلیم اپنے گاؤں بھیرہ کے مدرسہ اسلامیہ رحیمیہ میں حاصل کی، پرائمری درجہ پانچ تک پڑھنے کے بعد مولانا عبدالستار صاحب بھیروی اور ان کے صاحبزادے مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کی خدمت میں فارسی اور عربی اول کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں عربی دوم میں داخل ہوئے، یہ شوال ۱۳۸۵ھ کا واقعہ ہے، انگریزی سن ۱۹۶۵ء تھا۔ یہاں رہ کر آپ نے عربی پنجم تک تعلیم حاصل کی، شعبان ۱۳۸۸ھ تک یہاں قیام رہا۔ یہاں کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

> ’’جامعہ عربیہ احیاء العلوم کا وہ دور تعلیم وتدریس کے اعتبار سے ایک بہترین دور تھا، اساتذہ سب باکمال تھے، طلبہ بھی اچھے تھے اساتذہ میں استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب علیہ الرحمۃ، مولانا محمد یحییٰ صاحب علیہ الرحمہ، مولانا زین العابدین صاحب مدظلہ (۱)، مولانا عبدالمنان صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ، مولانا جمیل احمد صاحب مدظلہ، (مولانا محمد عثمان صاحب ساحرؔ مبارکپوری) تھے یہ سب چندے آفتاب چندے ماہتاب تھے، مدرسہ کے ماحول میں فی الجملہ آزادی تھی نگرانی وغیرہ کا زیادہ اہتمام نہ تھا، لیکن اساتذہ نے طلبہ میں اتنا ذوق پیدا کر دیا تھا کہ وہ خود بخود پڑھنے لکھنے میں لگے رہتے تھے۔‘‘ (حکایت ہستی: ۷۳)

---

(۱) ۱۶ / جمادی الاخری ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۸ / اپریل ۲۰۱۳ء بروز یک شنبہ جوارِ رحمت میں جاپہونچے۔ **اللہم اغفر لہ**

> ’’یہیں شعور کی آنکھ کھلی، یہیں اس میں پختگی آئی، اور یہاں جو مزاج بن گیا اس کی چھاپ اب بھی باقی ہے، مدرسے کا جب تصور آتا ہے تو لوح ذہن پر پہلے یہی مدرسہ ابھرتا ہے، ابھی کچھ عرصہ پہلے تک میں خواب میں جب بھی اپنے کو پڑھاتے یا پڑھتے دیکھتا تو اسی مدرسے میں دیکھتا، اللہ تعالیٰ اس مدرسہ کو اس کے اساتذہ وطلبہ اور اہل انتظام کو اپنی رحمتوں، مہربانیوں سے نوازیں۔ آمین‘‘ (حکایت ہستی:۱۲۹)

دار العلوم دیوبند میں :اس کے بعد شوال ۱۳۸۸ھ میں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ امتحان داخلہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی نے لیا، اور نمایاں نمبرات آپ کامیاب ہوئے، جدید طالب علم ہونے کے باوجود آپ کی غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے مولانا نے عربی تکلم وانشاء کے درجہ ’’صف ثانوی‘‘ میں آپ کو داخل کیا۔ مولانا لکھتے ہیں:

> عربی تکلم وانشاء کے استاذ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی علیہ الرحمہ تھے، ان سے دورِ احیاء العلوم ہی سے بہت عقیدت تھی، میں ان کے درس میں خصوصیت سے شرکت کرنا چاہتا تھا۔ مولانا نے عربی تکلم وانشاء کے لئے تین درجے قائم کر رکھے تھے، پہلے درجے کو ’’صف اول‘‘ دوسرے کو ’’صف ثانوی‘‘ اور تیسرے کو ’’صف نہائی‘‘ کے نام سے موسوم کر رکھا تھا، جدید طلبہ کا داخلہ ’’صف اول‘‘ میں ہوتا تھا۔ یہ جماعت دو حصوں میں منقسم تھی، اور دونوں کو صف نہائی کے ممتاز طلبہ جن کو مولانا متعین فرماتے تھے، انھیں پڑھایا کرتے تھے، اور مولانا خود صف ثانوی اور صف نہائی کو پڑھاتے تھے، ان تینوں جماعتوں میں شامل ہونے کے لئے تعلیمات میں درخواست دینی ہوتی تھی، میں نے صف ثانوی میں شامل ہونے کی درخواست دی، دفتر تعلیمات سے مجھے ہدایت ملی کہ آپ جدید طالب ہیں مولانا وحید الزماں صاحب کی منظوری کے بعد آپ کو اس میں شامل کیا جائے گا، میں مولانا کی خدمت میں گیا، مولانا سے گزارش کی، مولانا نے مجھے پہچان لیا، اور فرمایا اچھی بات ہے، آپ سبق میں آیا کیجئے، میں کہہ دوں گا۔ میں صف ثانوی کے سبق میں حاضری دینے لگا، مگر

درسگاہ میں تعلیمات کی جانب سے رجسٹر طلبہ آیا تو اس میں میرا نام نہ تھا، میں تعلیمات میں گیا، میں نے اس کی تحقیق کی، تو معلوم ہوا کہ مولانا کی طرف سے تصدیق نہیں آئی ہے، میں حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، تو مولانا نے ایک تحریر لکھ کر دی، وہ تحریر میرے پاس محفوظ نہیں ہے، میں نے اسی وقت اس کی نقل والد صاحب کی خدمت میں بھیج دی تھی، ان کی اصل تحریر تو دفتر تعلیمات میں جمع ہوگئی تھی، اس کے الفاظ تو اب یاد ہونے کا سوال ہی نہیں، مضمون یہ تھا:

> ”میں نے اس طالب علم کا امتحان لیا تھا، ماشاء اللہ استعداد اچھی ہے، آئندہ ان سے بہتر توقعات ہیں، یہ صف ثانوی میں داخلہ کے مستحق ہیں، ان کا نام شامل کرلیا جائے۔

یہ تحریر میں نے دفتر تعلیمات میں جمع کردی، پھر میرا نام رجسٹر میں درج ہوگیا۔ صف ثانوی کا درس بعد نماز مغرب ہوتا تھا، اس درس میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی، منتخب طلبہ ہی تھے۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب (بمبئی) مولانا نور عالم صاحب (دیوبند) مولانا بدرالحسن صاحب (کویت) مولانا مجیب اللہ صاحب (دیوبند) اس میں تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں اسباق کی تفصیل اس طرح تھی:

جلالین شریف	حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہٗ	پہلا گھنٹہ
// //	// // //	دوسرا گھنٹہ
میبذی	حضرت مولانا قمرالدین صاحب مدظلہٗ	تیسرا گھنٹہ
کتابت	حضرت منشی امتیاز احمد صاحب علیہ الرحمہ	چوتھا گھنٹہ
ہدایہ اخیرین	حضرت مولانا اختر حسین میاں صاحب علیہ الرحمہ	پانچواں گھنٹہ
// //	// // //	چھٹا گھنٹہ

امروہہ میں: دیوبند میں چند ماہ گزرے تھے کہ ایک ہنگامہ کے نتیجہ میں تقدیر الٰہی نے امروہہ حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب جوہر قاسمی کی خدمت میں پہونچادیا۔ مدرسہ حسینیہ چلہ، امروہہ میں آپ نے دورۂ حدیث حضرت مولانا افضال الحق

صاحب اور دیگر اساتذہ سے پڑھا۔ وہاں اسباق کی ترتیب یوں تھی:

(۱)...... حضرت مولانا عبدالحی صاحب امروہوی علیہ الرحمہ ابوداؤد شریف
(۲)...... حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب دیوریاوی مدظلہ مسلم شریف
(۳)...... حضرت مولانا افضال الحق صاحب قاسمی مدظلہ(۱) بخاری شریف
(۴)...... حضرت مولانا افضال الحق صاحب قاسمی مدظلہ بخاری شریف
(۵)...... حضرت مولانا افضال الحق صاحب قاسمی مدظلہ ترمذی شریف
(۶)...... حضرت مولانا عبدالمنان صاحب مظفرپوری مدظلہ شمائل ترمذی شریف

دارالعلوم دیوبند کے بعد اور امروہہ جانے سے پہلے ۲۲/ روز آپ نے مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں تعلیم حاصل کی، تفصیلات کے لئے اسی کتاب کا مطالعہ کیجئے۔

۱۹۷۱ء مطابق ۱۳۹۱ء میں امروہہ سے فارغ ہوئے، اس کے بعد ۱۶/ مہینے تک اپنے وطن بھیرہ میں رہے، اس دوران گھر کے کاموں کے ساتھ حفظ قرآن کریم مکمل کیا، اور گاؤں کے نوجوانوں کو قرآن شریف کا ترجمہ پڑھاتے رہے، مولانا مرحوم کو قرآن کے ساتھ بڑی مناسبت تھی، اس کا ذکر میرے تفصیلی مضمون میں انشاء اللہ آئے گا۔

تدریس : تدریسی زندگی کا آغاز امروہہ مدرسہ چلہ کی عارضی مدرسی سے ہوا، وہاں ایک استاذ رخصت لے کر گھر گئے ہوئے تھے، تو آپ کے اساتذہ کرام نے آپ کو مامور کیا کہ ان کے آنے تک تدریس کے فرائض انجام دیں، چنانچہ آپ نے وہاں سے مختصر المعانی، مقامات حریری، مرقات اور ہدایۃ النحو سے تدریسی زندگی کا آغاز کیا، اس کے بعد آپ کے اساتذہ نے میسور بھیجا جہاں چند ماہ امامت وخطابت کا فریضہ انجام دیا، جس کے بڑے خوشگوار اثرات وہاں کی دینی فضا پر مرتب ہوئے، آپ نے وہاں مستقل قیام کا ارادہ کرلیا، لیکن جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس کے ذمہ داروں کے غیر معمولی اصرار پر وہاں کی مدرسی منظور کی، اور اس طرح ۱۹۷۲ء سے آپ نے باقاعدہ درس وتدریس کی ابتداء

---

(۱) ۳۰/ نومبر ۲۰۱۲ء مطابق ۱۶/ محرم ۱۴۳۴ھ بروز جمعہ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ اللہم اغفر لہ

کی، اوراس کا سلسلہ بلا کسی انقطاع کے ۴۲ر سالوں پر محیط ہے، جس دن آپ کا انتقال ہوا ہے یعنی ۲۸ر ستمبر شنبہ کو، اس دن بھی آپ نے دو کتابوں کا سبق پڑھایا ہے۔

ایک سال جامعہ اسلامیہ بنارس میں رہنا ہوا، اس کے بعد مدرسہ دینیہ غازی پور ۱۹۷۳ء میں تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے دو مرحلوں میں نو سال تدریس کی خدمات انجام دیں، پہلے مرحلہ میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۷ء تک، اور دوسرے مرحلے میں ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۶ء تک یہاں رہے۔ قیام غازی پور کے پہلے دور کے دو سالوں تک کے حالات حضرت مولانا نے تحریر فرمائے تھے کہ حیات مستعار کے دن پورے ہو گئے۔

قیام غازی پور کے دوران تصوف وسلوک کی طرف رجحان ہوا، اس سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں:

> **تصوف وسلوک**: غازی پور میں جب یکسوئی نصیب ہوئی، تو طبیعت ان اعمال ووظائف کی طرف مائل ہوئی جن میں مَیں گھر پر رہ کر مشغول رہا کرتا تھا، یعنی تلاوت، طول طویل نوافل، اوراد ووظائف، اوران سب کے ساتھ شوق مطالعہ، تہجد کی پابندی بحمد اللہ ہر جگہ رہی۔ میسور میں، بنارس میں، یہاں بھی وہ سلسلہ قائم رہا۔ یہاں اوراد ووظائف میں اضافہ بھی ہوا اور پابندی بھی بڑھی۔ ایک روز مدرسہ کے کتب خانہ میں مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی خانقاہ الہ آباد سے نکلنے والے رسالہ ''معرفت حق'' کے چند شمارے ہاتھ آئے، میں انھیں پڑھنے لگا، ان کے پڑھنے سے دل پر عجیب وغریب اثر ہوا، ایسا محسوس ہوا جیسے پیاسے کو آبِ زُلال مل گیا ہو، دلچسپی بڑھی اور اتنی بڑھی کہ میں ان مضامین ومواعظ میں جذب ہو کر رہ گیا، وہاں جتنے رسائل مل سکے، میں سب اٹھا لایا اور بار بار پڑھتا رہا، اور جتنا پڑھتا دلچسپی بڑھتی رہی، طبیعت دنیا سے پہلے ہی سرد ہو چکی تھی، دل نے ''معرفت حق'' کے مضامین سے محبت ومعرفت کی گرمی پائی، پھر آنکھوں نے آنسوؤں کی جھڑی لگا دی۔ میں شاہ صاحب کے نام سے واقف تھا، ان کی تاثیر بھی قدرے جانتا تھا، مگر ان کے مواعظ وملفوظات پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، اب جو پڑھنے کی توفیق ہوئی تو دل کی دنیا زیر وزبر ہو کر رہ گئی، میں بار بار ان مضامین کو پڑھتا اور قلب کو گرماتا رہتا، لیکن یہ چند ہی

پرچے تھے، وہ بھی متفرق!‘‘

پہلے آپ مولانا حکیم منیرالدین صاحب مئوی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے، اس کے بعد اصلاحی تعلق جانشین مصلح الامت حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب سے رہا، اخیر میں یہ تعلق سلسلۂ قادریہ سندھ کے نامور شیخ حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجوی (خلیفہ حضرت مولانا تاج محمود امروٹی) کے خلیفہ حضرت مولانا عبدالواحد صاحب دامت برکاتہم (تلمیذ رشید حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ) سے قائم ہوا۔ اور انھیں کی طرف سے مولانا کو اجازت وخلافت ملی۔ یہ موضوع بھی تفصیل طلب ہے۔

شعر وادب سے لگاؤ:

مطالعہ کا ذوق تو قدرت کی طرف سے حضرت مولانا کو غیر معمولی فیاضی سے عطا ہوا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ شعر وادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا، سخن فہمی وسخن سنجی کا ملکہ تو بدرجۂ کمال آپ کو حاصل تھا، کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے، خود کہتے تھے کہ میری طبیعت موزوں نہیں ہے، آپ کے استاذ حضرت مولانا محمد مسلم صاحبؒ کی وفات کا آپ پر بہت گہرا اثر ہوا، مہینوں آپ کی طبیعت اس سے متاثر رہی، اور ایک بے کیفی سی آپ پر طاری رہتی تھی، آپ لکھتے ہیں

> میں شاعر نہیں ہوں۔ اور نہ کبھی کوئی شعر پورا کہہ پاتا، مگر آج کی بے کیفی شعر میں ڈھلنے لگی تو ڈھلتی چلی گئی۔ آرزوؔ لکھنوی نے کیا اچھی بات کہی ہے۔ ؎
>
> ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
> اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی
>
> آج کی بے کیفی شام تک نوحۂ غم کے سانچے میں ڈھلتی رہی۔ شام ہوئی تو ۲۷؍ اشعار کی ناتمام سی نظم تیار ہو چکی تھی، پھر طبیعت کا غبار چھٹ گیا۔ دوسرے دن بہت کوشش کی کہ چند اشعار اور ہو جائیں، تو نظم مکمل ہو جائے۔ لیکن نہیں ہوئے، یہ نظم یونہی پڑی رہی۔ اب اس کو شائع کرنے کا خیال عزیزم مولانا ضیاء الحق سلّمہٗ کو ہوا تو ارادہ ہوا کہ یہ تک بندیاں کسی صاحبِ نظر کو دکھالی جائیں۔ رفیقِ محترم مولانا فضلِ حق صاحب عارفؔ خیرآبادی مدظلہٗ کی خدمت میں انھیں پیش کیا تو انھوں نے کچھ نوک

پلک درست کردئے اور مقطع کا ایک شعر اس میں بڑھا دیا۔ تاکہ نظم پر ناتمام ہونے کا داغ نہ رہ جائے۔

استاذ محترم کی وفات پر کہا ہوا مرثیہ، ایک غزل جو قیام الہ آباد کے زمانے کی ہے، اور فارسی زبان میں ایک حمد محفوظ ہے، ملاحظہ فرمائیں:

نالۂ غم:

بیادِ استاذِ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ

باغ ہے اجڑا ہوا، ساری فضا خاموش ہے
عندلیبِ خوشنوا شاید کوئی روپوش ہے
کیوں نہیں تھمتے ہیں آنسو آج آنکھوں سے مری
ناگہاں ٹوٹی ہے مروارید کی جیسے لڑی
کیوں فضا تاریک ہے، پُرہول منظر چارسو
مضطرب دل، دم گھٹا جاتا ہے آنکھوں میں لہو
میں ہی کیا؟ روتے ہیں فرقت میں زمین وآسماں
دیکھئے! آنکھیں ہیں کسکے غم سے خونابہ فشاں
کون ہے وہ جسکی فرقت سے یہ کل ناشاد ہیں
کس کے جانے سے یہ محوِ نالہ وفریاد ہیں
ہم نشینِ بے خبر کچھ بھی خبر ہوتی مری
کاش تیری آنکھ کو حاصل نظر ہوتی مری
کاش میرا درد تجھ پر بھی عیاں ہوتا ذرا
کاش تو بھی جانتا میں میں کیوں ہوا بے دست وپا
آ! بتاؤں میں تجھے میں چاک داماں کیوں ہوا
چشم خونابہ فشاں اور سینہ بریاں کیوں ہوا
تھا وہ پیکر لطف وشفقت کا سراپا عزم تھا
آبروئے دین ودانش یعنی شمعِ بزم تھا
قافلہ محوِ سفر تھا، سوئے منزل بے خطر
قافلہ سالار تھا اک مرد کامل باخبر
قافلہ والے تھے شاداں جانب منزل رواں
یک بیک انکے سروں پر چھایا نکبت کا دھواں
قافلہ سالار اچانک یوں جہاں سے چل بسا
خوابِ نوشیں سے یکایک جیسے کوئی اٹھ گیا
کون تھا وہ قافلہ سالار مجھ سے سن ذرا
آہ! مولانائے مسلمؒ کیا نہیں تجھ کو پتا
کون مولانا؟ مرے استاذ عالی، محترم
ذات تھی جن کی سراپا خیر وبرکت، مغتنم
وہ جنھوں نے میرے دل کو علم سے روشن کیا
ایک ویرانہ تھا جس کو رشکِ صد گلشن کیا

جن کی شہ پر دم بہ دم ہر ہر قدم بڑھتا گیا
پیرِ میخانہ کے ہاتھوں خم پہ خم ڈھلتا گیا
جنکے جانے سے میری دنیائے دل ہی لٹ گئی
ظلمتیں اتنی بڑھیں کہ روح میری گھٹ گئی
کتنے ذرے، جن کے پَرتو سے مہِ کامل بنے
بتکدے وحدانیت کے نور کے حامل بنے
خاک پر بیٹھے ہوؤں کو عزت ورفعت ملی
ان کے فیضِ علم سے عظمت ملی شہرت ملی
دین کے کتنے قلعے تعمیر وہ کرتے رہے
جہل کے اڈوں کو علم وفضل سے بھرتے رہے
لال دروازہ کی مسجد نوحہ خواں ، ویران تھی
ایک مدت سے پڑی برباد تھی ، سنسان تھی
ایک مردِ غیب کی تھی منتظر بے برگ وبار
اسکے معماروں کی روحیں مضطرب تھیں بیقرار
روح سجدوں کی خس وخاشاک میں تھی دلفگار
منبر ومحراب فرطِ غم سے تھے زار ونزار
پھر وہ مردِ غیب آیا اک طرف سے ناگہاں
بندھ گیا آمد سے اس کی ایک روحانی سماں
اس کا آنا تھا کہ یک دم چھٹ گئی گردِ ملال
ہوگئی پھر وہ زمیں سجدوں کی کثرت سے نہال
علم وفن کا ایک چشمہ پھر ہوا جاری یہاں
ذرہ ذرہ دینِ حق کا بن گیا ہے ترجماں
ہاں! وہی مردِ مجاہد ہم سے رُخصت ہوگیا
علم کا جادو جگاکر خلد میں جا سوگیا
ان کے اعجازِ کرم کا ہر طرف چرچا ہوا
دشت ودریا کوہ وصحرا قریہ قریہ جابجا

☆☆☆☆☆

غزل

مبارک ہو تجھے اے دل کہ اس کی آرزو پائی
طلب پائی ہے اس کی اور تلاش وجستجو پائی
دلِ بے مدعا پایا کہ دنیا کی ہوس نکلی
دلِ بامدعا پایا کہ تیری آرزو پائی
سبھی جھگڑوں سے ہم چھوٹے تمنا دل کی برآئی
ہوس دنیا کی نکلی اور تیری آرزو پائی
پڑا رہ تو اسی در پر، پڑا رہ تو اسی در پر
یہیں حاصل ہوئی ہے جس نے جو کچھ آرزو پائی
عنایت ہے، نوازش ہے، کرم ہے، مہربانی ہے
محبت تیری دل نے اور میں نے ہاوہو پائی
زہے قسمت، زہے خوبی یہ کیا ہی خوش نصیبی ہے
کہ اس کی آرزو پائی ، اسی کی جستجو پائی
اسی یاد اے ہمدم رہے میں مرے قائم
ترے در پر جو ہم آئے یہی ہے آرزو لائی

یہ دنیا آئینہ خانہ ہے اس حسن منور کا   جدھر بھی کی نظر ہم نے وہ صورت رو برو پائی
چلا ہی جارہا ہے گرتا پڑتا اس کی منزل تک   جہاں سے جس نے جس حالت میں اس دلبر کی بو پائی
یہ کس کے عشق کا سودا ترے سر میں سمایا ہے
کہ رسوائی تری اعجؔاز ہم نے کو بہ کو پائی

☆☆☆☆☆

حمد باری تعالیٰ

قادرا! قدرت تو داری ہر چہ خواہی آں کنی   مردہ را تو جاں بہ بخشی زندہ را بے جاں کنی
گہ گدارا ملک بخشی گہ کنی شہ راگدا   از برائے نیم نانے در بدر حیراں کنی
آسماں را بےستوں برپا تو کردی اے حکیم   ابر را بہر تراوت بر زمیں گریاں کنی
گاہ یونس را دہی اندر شکم ماہی مکاں   گاہ یوسف را زکنعاں چاہ در زنداں کنی
از نگاہ لطف بخشی بر دوعالم را ثبات   باز چوں خواہی ہمہ را برہم وویراں کنی
گر گلستاں را بخواہی وحشتِ صحرا دہی   وربیاباں را بخواہی جنتِ رضواں کنی
گہ ہمہ سوزی تو گلشن را بآتش درخزاں   گہ گل وگلزار را تو سنبل وریحاں کنی
تو دہی یک قطرۂ مہمل راصورت چوں پری   رُو پری را چوں تو خواہی لعنت شیطاں کنی
آں یکے بہر خلافت می کنی تو انتخاب   واں دگر گردن بطوقِ لعنت وعصیاں کنی
آں یکے را بولہب کردی تو ازقہر وغضب   واں دگر از لطف خود تو مصدرِ ایماں کنی
بندات اعجؔاز را توفیق دادی بہر حمد
آرے آرے فضل تو بر پیکر عصیاں کنی

☆☆☆☆☆

۱۹۷۷ء میں جب مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد سے حضرت مولانا محمد حنیف صاحب مدرسہ ریاض العلوم گورینی اور مولانا قمر الزماں صاحب ومولانا عمار الحسن صاحب مدرسہ بیت المعارف منتقل ہوگئے تو حضرت مولانا عملاً صدر مدرس ہوکر وہاں تشریف لے گئے اوران کی درس وتدریس کا وہاں خاص طور پر چرچا ہوا۔ آپ وہاں چارسال تک رہے، اس دوران

مدرسہ دینیہ غازی پور..... جہاں سے الہ آباد گئے تھے .....کے ناظم تعلیمات رہے۔ الہ آباد سے دوبارہ ۱۹۸۱ء میں غازی پور آئے، اور ۱۹۸۶ء تک یہاں قیام رہا، اور یہی دور مدرسہ دینیہ غازی پور کا سب سے زریں دور ہے، مولانا لکھتے ہیں:

> ''چار سال کے بعد میری واپسی ہوئی، اب مدرسہ خاصا ترقی کر چکا تھا۔ مدرسہ دینیہ کی پُرانی عمارت طلبہ واساتذہ کے لئے تنگ پڑ رہی تھی، عزیز صاحب کی جد جہد سے دریائے گنگا کے عین ساحل پر ایک پُرانی وسیع وعریض بلڈنگ میاں پورہ میں وقف ہوئی۔ یہ بلڈنگ ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کی تھی جو مشہور قومی رہنما ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاریؒ کے داماد تھے، ڈاکٹر انصاری مرحوم کی بھتیجی زہرہ بیگم ان کی رفیقۂ حیات تھیں، زہرہ بیگم نے تمام ورثہ کی اجازت سے اسے مدرسہ دینیہ کے نام وقف کر دیا۔ مدرسہ میں وقف ہونے کے بعد اس کا نام شوکت منزل رکھ دیا گیا۔ اب عربی شعبہ شوکت منزل میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں مدرسہ دینیہ کو تعلیمی اعتبار سے بڑا عروج حاصل ہوا۔ یوپی کے اضلاع مشرقی مدارس میں اس کا خاص وقار قائم ہوا۔ بڑے اچھے طلبہ یہاں سے تعلیم حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند گئے۔ اور آج ان میں سے بہتیرے تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کی فضا پر چھائے ہوئے ہیں۔

یہ سلسلہ چار سال پھر متواتر قائم رہا۔ مگر اس ماحول کو پانچویں سال میں نظر لگ گئی کچھ غلط فہمیاں، کچھ بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ مولیٰ صاحب کو اس کا بڑا دکھ ہوا تھا انھوں نے بہت کوشش کی کہ بدگمانیاں دور ہو جائیں۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوئے، مدرسہ کے مہتمم کی طبیعت کچھ بدلی بدلی محسوس ہوئی۔ مجھے ایسے لگا کہ مجھ سے دوری بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اگر مدرسہ دینیہ میں رہنے پر اصرار کرتا تو بدمزگی کا دائرہ پھیلتا، میرا ذہنی طور پر عرصہ سے، جب سے میں نے تدریس کے لئے مدرسہ میں قدم رکھا ہے، یہ عہد ہے کہ نزاع کسی سے نہیں کرنی ہے، خواہ اس کے لئے عزت وجاہ اور راحت وآرام کی کتنی ہی قربانی دینی پڑے۔ مولیٰ صاحب (مشہور عالم مولانا محمد ابوبکر غازی پوریؒ کے والد ماجد) اور دوسرے احباب ومخلصین مجھے بہت روکتے رہے، مگر میں نے پانچواں

سال پورا کر کے مدرسہ دینیہ سے علیٰحدگی اختیار کرلی۔ میری علیٰحدگی کا صدمہ مولیٰ صاحب کو بہت ہوا۔ مگر وہ بھی مجبور تھے، اب ان کے قویٰ مضمحل ہوگئے تھے، میرے ہٹنے کے بعد مدرسہ دینیہ میں بکھراؤ پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ عزیز صاحب نے اس بکھراؤ کو بہت روکنا چاہا مگر وہ قابو نہ پاسکے، مولانا عبدالرب صاحب بھی چلے گئے۔ تاہم مولیٰ صاحب کو تسلی تھی کہ قاری شبیر احمد صاحب اور مولانا صفی الرحمٰن صاحب موجود ہیں۔ لیکن طلبہ کی تعداد کم ہوگئی، تو انھوں نے حفظ کا بھی ایک درجہ شوکت منزل میں منتقل کردیا۔ مگر دھاگا ٹوٹ چکا تھا، دانے بکھر رہے تھے۔ تین چار سال کے اندر قاری شبیر احمد صاحب اور مولانا صفی الرحمٰن صاحب بھی علیٰحدہ ہوگئے۔ حاجی عبدالاحد صاحب بھی معذور ہوکر خدمت سے سبکدوش ہوگئے۔ اب نئے لوگ آگئے، مگر مدرسہ کی بہار نہ لوٹ سکی،،

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مدرسہ دینیہ تعلیم وتدریس کے اعتبار سے، فکر وخیال کے لحاظ سے، اسلوب وانداز کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند کا پیرو بلکہ مبلغ تھا، جمعیۃ علماء کی چھاؤنی تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کے نہ جانے کتنے منصوبے مدرسہ دینیہ میں بنے ہیں، مولانا سید احمد ہاشمی صاحب کی تربیت کا آغاز یہیں سے ہوا۔ اور بالآخر وہ جمعیۃ علماء ہند کی نظامت علیا تک پہونچے، خود جناب عزیز الحسن صاحب صدیقی عرصہ تک مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے ممبر رہے، عزیز صاحب جمعیۃ کی شناخت بن گئے تھے، اور جمعیۃ ان کی علامت! لیکن جس مدرسہ کا یہ حال رہا ہو، اس کا مسلک ومشرب اتنا واضح اور نمایاں رہا ہو، اور یہی اس کا امتیاز واختصاص رہا ہو، کیا حیرت کی بات نہیں ہے کہ اب وہی مدرسہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ضمیمہ بن گیا ہے، اور اس کا مہتمم جمعیۃ کے کیمپ سے اٹھ کر رابطہ کمیٹی کے اسٹیج پر پہونچ گیا ہے، جو فکر وعمل کے اعتبار سے جمعیۃ سے بہت دور اور جماعتِ اسلامی سے ہم آغوش ہے۔ وفاداریاں تبدیل ہوگئیں، صرف اشخاص سے نہیں، دکھ کی بات یہ ہے کہ نظریہ وعقیدہ میں تبدیلی کا احساس ہورہا ہے، اشخاص وافراد سے تعلق ٹوٹتا جڑتا رہے، یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے، لیکن فکر ونظر سے بھی وفاداری تبدیل ہوجائے، یہ بات حیرت کی ہے وہ بھی جناب عزیز الحسن صاحب

صدیقی کے حق میں!

۱۹۸۶ء میں ریاض العلوم گورینی تشریف لے گئے، جہاں چار سال تک قیام رہا۔ وہاں چار سال کے بعد کچھ ایسے احوال پیش آئے کہ مولانا نے گورینی کو خیر باد کہہ دیا، اور شوال ۱۴۱۰ھ (۱۹۹۰ء) میں اپنے استاذ حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بمھوری علیہ الرحمہ کے حکم پر شیخوپور تشریف لے گئے، جہاں آپ نے ۲۴/ سال گزارے، یعنی پوری تدریسی زندگی کا نصف سے زائد حصہ! اس دوران آپ نے وہاں لائق وفائق اور مخلص اساتذہ کو جمع کردیا، جس کے نتیجہ میں تعلیم وتعلم اوراخلاق وتربیت کی ایسی فضا قائم ہوئی کہ یہ ادارہ حضرات اہل علم کے لئے باعث رشک بن گیا، اس کی یہ نیک نامی اور ناموری اگر عدل وانصاف کی نگاہ سے دیکھا جائے تو تمامتر حضرت مولانا کی رہین منت ہے، مولانا کی خدمات اس ادارہ کے گوشہ گوشہ، چپہ چپہ سے عیاں ہیں۔ اب حضرت مولانا دنیا میں نہیں رہے، لیکن ان کے جاتے ہیں زمین وآسمان اس طرح بدل جائیں گے، اس کا اندازہ نہ تھا، لوگوں کی وفاداریاں تبدیل تو ہوتی ہیں لیکن اس طرح، اس کا گمان نہ تھا، دنیا جانتی ہے کہ شیخوپور مولانا کی آمد سے پہلے ایک مکتب سے زیادہ کچھ نہ تھا جیسا کہ اس کے مضافات کے بہت سے مکتب ہیں، مولانا ہی کا فیض تھا کہ اسے ایک جامعہ میں تبدیل کردیا، اور ساری دنیا اس کی معترف ہے، خود ان کا دل بھی ان کی خدمات کا معترف ہے جو آج اپنی تحریروں کے ذریعہ سیاہ کو سفید ثابت کرنے پر تلے ہیں، حضرت مولانا اور ان کی خدمات کو حرف غلط کی طرح مٹانے کی کوشش جاری ہے، اور یہ تاثر دینے کی ناکام کوشش جاری ہے کہ مولانا نے وہاں کی تعمیر وترقی میں کوئی خاص کردار نہیں ادا کیا، مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور کی امسال کی روداد میں ایک مضمون پڑھ کر جو شاید اسی لئے لکھوایا گیا ہے اس کا بہت شدت سے احساس ہوا، اور امسال کے جلسہ میں پڑھی گئی رپورٹ تو احسان فراموشی کا بدترین نمونہ تھی، کہ کہیں بھول سے بھی اس محسن کا نام نہیں لیا گیا جس کی رہینِ منت مدرسہ کی یہ تمام بہاریں اور رونقیں ہیں،۔

حضرت مولانا شیخوپور کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’مولانا (محمد مسلم صاحبؒ) کے حکم پر میں شیخوپور حاضر ہوا۔ تو وہاں علمی اور تعلیمی اور تعمیری ہر اعتبار سے سناٹا تھا۔ جامع مسجد بن کر کھڑی تھی، جس میں ایک بلب روشن تھا اور اندھیرے کو شکست دینے کی ناتمام کوشش کر رہا تھا، جامع مسجد کے مشرق میں ایک لمبی چوڑی پانی سے لبریز گڑھی تھی، گڑھی کے جنوبی حصے میں دو تین کھپریل کے کمرے تھے، مشرقی حصے میں چھ کمرے نیچے اور چھ کمرے اوپر کا ایک ڈھانچہ کھڑا تھا، شمالی جانب ایک ادھورا سا کھپریل کا مطبخ تھا۔

اس احاطہ میں بیس پچیس طلبہ حفظ کے اور چار پانچ طالب علم عربی کے فروکش تھے، مکتب کے گاؤں کے بچے تعلیم کے وقت آتے اور چھٹی پا کر چلے جاتے، میں یہاں آ کر سوچ میں پڑ گیا، ایک طرف استاذ گرامی کا حکم اور دوسری طرف یہ بے سروسامانی! پھر میرے دل نے فیصلہ کیا کہ مجھے نہ دنیا کی شہرت مقصود ہے نہ آسائش مطلوب ہے، دین اور دینی تعلیم کی خدمت میرا مقصد زندگی ہے، امید ہے کہ یہاں اس ویرانے میں وہ بے غل وغش حاصل ہوگا۔ مجھے انشراح صدر ہو گیا اور میں نے یہاں قیام منظور کر لیا ....میں نے عربی کی تمام کتابیں از ابتداء تا انتہا پڑھائیں۔ اس تعلیم میں ایک اور استاذ بھی شریک تھے، اور وہ بھی اس طرح کہ چھ ماہ وہ رہ کر دوسری جگہ چلے گئے، پھر دوسرے استاذ آئے۔ عربی پنجم کی ایک کتاب کے علاوہ تمام کتابیں اور عربی دوم کی زیادہ تر کتابیں اور قدرے قلیل فارسی کی کتابیں میں پڑھاتا رہا۔ سال پورا ہوا، عربی پنجم کے یہ طلبہ تعلیم کی تکمیل کے لئے دیوبند حاضر ہوئے اور انھوں نے تعلیم وتعلم اور دینداری واخلاق میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ وہیں سے مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور کی دارالعلوم دیوبند اور ملک کے دوسرے علاقوں میں شہرت حاصل ہوئی۔

اب مدرسہ کا قافلہ باوجود غربت و بے سروسامانی کے ایک اعلیٰ معیار پر چل پڑا، عمارتیں بھی بنیں، طلبہ کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ بہتر سے بہتر اساتذہ جن میں زیادہ تر مجھی سے تعلیم پائے ہوئے تھے فراہم ہوئے۔ مالیات کا مسئلہ مستحکم ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے مدرسہ شیخ الاسلام ملک و بیرون ملک کا معروف ادارہ بن گیا۔

> جب کوئی چیز اپنے عروج وارتقاء پر پہونچتی ہے، اور حسن ورعنائی سے مزین ہوتی ہے تو اس پر نظر بد بھی پڑنے لگتی ہے، اب مدرسہ کا انتظام کچھ ایسے افراد کے ہاتھ میں آیا جن میں وسعت قلبی کے بجائے تنگ دلی کا مادہ زیادہ تھا، انھوں نے مدرسہ کے تعلیمی واخلاقی ماحول میں خرابیاں پیدا کیں، بعض بے جا ونامعقول اقدامات کی وجہ سے اساتذہ وطلبہ میں بددلی پھیلائی، ....
>
> میرے اوپر ایسے الزامات لگائے گئے جسے ناظم مدرسہ سے لے کر مدرسہ کا ہرفرد جانتا ہے کہ ان کا کوئی چھینٹا میرے دامن پر نہیں ہے۔
>
> بہرحال ماحول ایسا گرم کردیا گیا کہ میں نے فتنوں سے بچ نکلنے میں دین ودنیا کی عافیت محسوس کی۔“

مولانا نے اپنے اس لگائے ہوئے چمن کو کس دل سے چھوڑا ہوگا، ان کا دل ہی جانتا ہوگا

میرے دل میں درد بھرا ہے اتنا ہی تم جانو ہو
دل میں کیسے درد بھرے ہیں درد بھرا دل جانے ہے

بہرحال تقدیر کا لکھا پورا ہوکر رہا، رمضان ۱۴۳۴ھ میں مولانا نے اپنے قائم کئے مدرسہ سراج العلوم چھپرہ ضلع مئو میں مستقل اقامت کرلی، اور یہ جو ابھی مکتب اور حفظ کے درجات پر مشتمل تھا، اس کو ترقی دینے کا فیصلہ کیا، چنانچہ مجھے اور مفتی منظور احمد صاحب کو یہاں لے گئے، مولانا کے قیام کی برکت سے قرب وجوار کے علاوہ دور دراز حلقوں سے بھی اچھے خاصے طلبہ آگئے، اور بہت مناسب اور دین کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے لائق اساتذہ بھی فراہم ہوگئے، تعمیرات کی حد درجہ کمی ہونے کی وجہ سے بہت سے طلبہ کو واپس کرنا پڑا، اور عربی کی دو جماعتیں ہفتم (مشکوٰۃ شریف) اور ششم (جلالین شریف) قائم ہوئیں۔ ارادہ یہ تھا کہ جماعتوں کا قیام اوپر کے درجات سے ہوگا، جیسے جیسے وسعت ہوگی بقیہ جماعتیں قائم ہوتی جائیں گی۔ اسی دوران مولانا کا حادثۂ وفات پیش آگیا، جس اللہ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے مولانا نے تمامتر بے سروسامانی کے یہ قدم اٹھایا تھا اسی کی ذات سے امید ہے کہ ان شاء اللہ مولانا کا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوگا اور مستقبل قریب میں یہ دین اور علم دین کا

ایک اچھا مرکز بنے گا۔

وفات: مولانا کی بیماری کی ابتداء تو آج سے ۹/سال پہلے اس وقت ہوئی جب ۱۴/ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ جمعہ کو ان کے جسم کے دائیں حصہ پر فالج کا شدید حملہ ہوا، اس کے بعد صحت معمول پر نہیں آسکی، لیکن وہ عزم وہمت کے پہاڑ تھے، اسی حالت میں درس وتدریس، تصنیف وتالیف، وعظ وتقریر اور تربیت سالکین کا سلسلہ بدستور جاری رہا، لیکن گزشتہ سال جب گردے کمزور ہوگئے اور ڈائلیسس کا سلسلہ شروع ہوا، ضعف ونقاہت بہت بڑھ گئی، درس وتدریس کا سلسلہ موقوف رہا، اور قیام مسلسل بمبئی میں رہا۔ امسال رمضان سے طبیعت قدرے بہتر ہوئی، تو شوال سے پھر ایک دو کتابوں کے پڑھانے کا سلسلہ رہا، جیسا کہ میں نے ابتداء مضمون میں لکھا کہ ”جس دن آپ کا انتقال ہوا ہے یعنی ۲۸/ستمبر شنبہ کو، اس دن بھی آپ نے دو کتابوں کا سبق پڑھایا ہے۔“

مولانا ۲۸/ستمبر شنبہ کو مغرب کے وقت تک بالکل معمول کے مطابق رہے، نمازوں کیلئے مسجد میں حاضر ہوئے، عصر بعد کی مجلس میں چائے بھی معمول کے مطابق پی، مغرب کے بعد طبیعت میں اضمحلال پیدا ہونا شروع ہوا، عشاء کے وقت دو مرتبہ قے ہوئی اس کے بعد بلڈ پریشر بہت لو ہوگیا۔ فوراً مئو لے جایا گیا، اس وقت تک ہوش میں تھے، اور ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے جیسا کہ ذکر خفی کے وقت ان کا معمول تھا، ڈاکٹروں نے اپنے حساب سے بہت کوشش کی مگر وقت پورا ہو چکا تھا، گیارہ بجے ہاسپٹل پہونچے تھے اور ساڑھے گیارہ بجے آپ مالک حقیقی سے جا ملے۔ ہجری سن کے اعتبار سے مولانا کی عمر ۶۳/سال، ۷/ماہ تھی۔

جسد خاکی مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ لایا گیا، دوسرے دن بعد نماز ظہر تین بجے نماز جنازہ ادا کی گئی، نماز جنازہ مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد عابد صاحب نے پڑھائی۔ مدرسہ کے احاطہ میں مسجد کے زیر سایہ اس امانت کو ہمیشہ کیلئے زمین کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کوردہ دیہات میں جنازہ میں تیس ہزار کا مجمع ہوگیا تھا، جس میں اکثریت مدارس کے علماء وطلباء کی تھی، یہ عنداللہ مقبولیت اور عندالناس محبوبیت کی دلیل ہے۔

میں اپنی اس تحریر کا اختتامیہ مولانا ہی کی ایک تحریر بناتا ہوں جو انھیں نے میرے والد ماجد حاجی عبدالرحمٰن صاحب کے متعلق لکھی تھی:

”اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو رَوْضَۃٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ بنائے۔ مغفرت کی دلنواز ادائیں ہمدم وہم ساز رہیں، نَمْ کَنَوْمَۃِ الْعُرُوْسِ کی صدائے روح پروران کو لوریاں دے، عفو و درگذر کا آب زلال تمام خطاؤں اور غلطیوں سے دھوکر پاک وصاف کردے۔“ آمین یارب العالمین

پسماندگان میں اہلیہ محترمہ، سات صاحبزادگان (حافظ محمد عارف، حافظ محمد عادل، مولانا حافظ محمد عابد قاسمی، مولانا محمد عامر قاسمی، مولانا حافظ محمد راشد قاسمی، مولانا حافظ محمد عرفات اعظمی، اور محمد احمد سلّمہٗ) اور تین صاحبزادیاں ہیں، جن کا نکاح بالترتیب مفتی اعجاز احمد قاسمی، مولانا ابرارالحق قاسمی اور مولوی فیض الحق قاسمی زید مجدہم سے ہوا، ان کے علاوہ تلامذہ و مسترشدین، متوسلین و منتسبین کی ایک جماعت ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو صبر جمیل واجر جزیل مرحمت فرمائیں اور سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھیں، اور اپنی مرضیات پر چلائیں، اور حضرت مولانا جن کی زندگی کا مشن یہ تھا کہ:

”میرے تلامذہ و متعلقین اللہ کے مخلص بندے، رسول کے سچے امتی، شریعت الٰہی کے علمبردار اور دین متین کے صحیح حامل و پاسدار بنیں“۔ اسی کے لئے انھوں نے اپنی پوری زندگی تج دی، ان کے دل میں یہ تڑپ اور تقاضا ہمہ وقت موج زن رہتا تھا کہ ”اہل ایمان اپنے نفس، اپنی طبیعت اور اپنے گرد وپیش کے مختلف تقاضوں کو فنا کرکے، ان سے منہ موڑ کر محض اللہ ورسول کی اطاعت ووابستگی کے لئے یکسو ہوجائیں۔ زندگی کا مرکز ومحور صرف وہ ہو جس کی دعوت اللہ کے آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے دی ہے، اس کے خلاف جتنی راہیں ہیں، سب سے قطعی اجتناب کیا جائے۔“

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی دین کی یہی فکر عطا کرے اور اس راہ پر چلنا آسان فرمائے اور حضرت مولانا نے اپنی اخیر زندگی میں جس ادارے (سراج العلوم چھپرہ) کو پروان

چڑھانے کا عزم بالجزم کر رکھا تھا باری تعالیٰ اس نو دمیدہ پودے کو تناور درخت بنائے اور اس کے لئے اپنی خاص نصرت واعانت کا دروازہ ہمارے اوپر کھول دے۔ آمین

مطبوعہ کتابوں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) تسہیل الجلالین شرح اردو جلالین شریف (جلد اول) (سورۂ بقرہ تا سورۂ نساء مکمل سوا پانچ پارے)

(۲) حدیث دوستاں (دینی واصلاحی اور علمی وادبی مکاتیب کا مجموعہ)

(۳) کھوئے ہوؤں کی جستجو (مختلف شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ)

(۴) حیاتِ مصلح الامت (حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمی کی مفصل سوانح)

(۵) مدارسِ اسلامیہ، مشورے اور گزارشیں (مدارس سے متعلق مضامین کا مجموعہ)

(۶) بطوافِ کعبہ رفتم .... (سفرنامۂ حج) حرمین شریفین کے سفر کی روداد

(۷) تہجد گزار بندے (تہجد کی اہمیت وفضیلت اور تہجد گزار بندوں کا تفصیلی تذکرہ)

(۸) ذکرِ جامی (ترجمانِ مصلح الامتؒ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے حالاتِ زندگی)

(۹) حضرت چاند شاہ صاحب اور ان کا خانوادۂ تصوف (حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈوی اور ان کے خلفاء کے حالات)

(۱۰) تذکرہ شیخ ہالیجوی۔ (سندھ کے معروف شیخ طریقت وعالم حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالجوی کا مفصل تذکرہ)

(۱۱) مودودی صاحب اپنے افکار ونظریات کے آئینہ میں (مولانا بنوریؒ کی عربی کتاب الاستاذ المودودی کا ترجمہ

(۱۲) حکایت ہستی حصہ اول (خودنوشت سوانح، ابتداء حیات سے اختتام طالب علمی تک)

(۱۳) کثرتِ عبادت عزیمت یا بدعت؟

(۱۴) قتل ناحق قرآن وحدیث کی روشنی میں

(۱۵) تعویذات وعملیات کی حقیقت وشرعی حیثیت

(۱۶) شب برأت کی شرعی حیثیت

(۱۷) اخلاق العلماء (علماء کے لیے خاص چیز)

(۱۸) دینداری کے دو دشمن (حرص مال وحب جاہ پر ایک تحریر)

(۱۹) فتنوں کی طغیانی (ٹی وی پر ایک فکر انگیز تحریر)

(۲۰) اہل حق اور اہل باطل کی شناخت

(۲۱) مالی معاملات کی کمزوریاں اوان کی اصلاح

(۲۲) منصب تدریس اور حضرات مدرسین

(۲۳) حج وعمرہ کے بعض مسائل میں غلو اور اس کی اصلاح

(۲۴) برکات زمزم (ماءِ زمزم کی فضیلت واہمیت کا بیان)

(۲۵) تصوف ایک تعارف

(۲۶) خواب کی شرعی حیثیت

(۲۷) تکبر اور اس کا انجام (ایک تقریر)

(۲۸) تذکرہ مولانا عبدالقیوم فتحپوری

(۲۹) تسہیل المیبذی

(۳۰) حدیث درددل (مجلّہ المآثر وماہنامہ ضیاء الاسلام کے اداریوں کا مجموعہ)

(۳۱) مسئلہ ایصال ثواب! ایک ذہنی طغیانی کا احتساب۔

(۳۲) **المد التعظیمی لاسم الجلالة**، اذان میں لفظ اللہ پر مد کرنے کی تحقیق

(۳۳) اذکار سلسلہ قادریہ

حضرت مولانا کی مرتب کردہ کتب

(۱) تالیفات مصلح الامت جلد پنجم (مطبوعہ) جلد ششم (غیر مطبوعہ)

(۲) درد و درماں (حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے ان مضامین کا انتخاب اور ان کی ترتیب جو مصائب وغیرہ کے اسباب اور ان کے حل پر مشتمل ہے)

(۳) محبت الٰہی اور نفس (حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی چند مجالس کا مجموعہ، اور ان پر عناوین کی ترتیب)

(۴) احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن (حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کے طویل سلسلۂ مضامین کی کتابی ترتیب)

(۵) مجالس مصلح الامت (۵/جلدیں) حضرت مولانا نے اخیر عمر میں اس کو اپنے شاگرد مفتی عطاء اللہ صاحب سے اپنی نگرانی میں مرتب کروایا، اور اس کو قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ نے اپنے ادارہ مکتبہ اشرفیہ بمبئی سے شائع کیا۔

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا باب

مطالعہ کی سرگزشت

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
(شادؔ عظیم آبادی)

میرے ایک عزیز نے مجھ سے مطالعہ کی سرگزشت پوچھی ہے میں بھی سوچتا ہوں کہ اسے لکھ دوں لیکن ڈرتا بھی ہوں اور شرماتا بھی ہوں، ڈرتا دوسروں سے ہوں، شرماتا اپنے سے ہوں، ڈرتا اس لئے ہوں کہ جو کچھ اس باب میں لکھوں گا۔ اگر اس وقت کوئی شخص میرے اندر وہ باتیں تلاش کرنے لگے تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میری تکذیب کرے گا ایک شخص دعوی کرے کہ میں نے ایسی ایسی مقوی غذائیں کھائی ہیں، اتنا اتنا روزانہ دودھ پیا ہے، اتنی اتنی کسرت کی ہے، کشتی لڑا ہوں، تو یقیناً لوگ اس کے بدن کا جائزہ لیں گے۔ مگر دیکھا تو اس کی ٹانگیں پتلی، بازو بے جان، رخسارے اندر دھنسے ہوئے، ہڈیوں کے ڈھانچے پر گویا ایک سوکھی کھال منڈھی ہوئی، تو کون اس کی تصدیق کرے گا، لوگ مسکرائیں گے، اور اس کا دعویٰ ایک مسکراہٹ میں تحلیل ہو جائے گا، یہ تو ڈر ہے۔ شرماتا اس لئے ہوں کہ جب میں اپنے مطالعہ کی داستاں سناؤں گا، تو اندر سے میرا ضمیر ٹوکے گا کہ تمھارے پڑھنے کا حاصل کیا نکلا، علم کا کون سا شمہ تمہیں حاصل ہو گیا، میں تو تمھارے اندر جہل اور نادانی کے علاوہ اور کچھ نہیں پاتا۔ اس وقت میری یہ کہانی شرم سے عرق عرق ہو جائے گی۔

لیکن اس کے باوجود آج قصد کرلیا ہے کہ جو کچھ کتابوں کے مطالعہ کے سلسلے میں مجھ پر بیتی ہے اسے کہہ ڈالوں، ڈرتا بھی جاؤں، شرماتا بھی جاؤں، اور کہانی بھی چلتی رہے، انسان کی زندگی ان دونوں سے کب خالی ہوتی ہے، آخر زندگی کی کہانی چلتی رہتی ہے۔ پھر میرے مطالعہ کی داستان بھی سنی جاتی رہے، کیا حرج ہے؟

جس عزیز نے مجھ سے فرمائش کی ہے وہ تو ضرور پڑھے گا، کسی اور سے میرا مطالبہ نہیں ہے میں لکھوں گا میں ہی پڑھوں گا، ہر آدمی کو اپنے ماضی سے محبت ہوتی ہے مجھے بھی ہے، سب کسی نہ کسی طرح اپنے ماضی کو دہراتے ہیں، کوئی زبان سے، کوئی قلم سے، میرے سامنے طلبہ کی جماعت بیٹھتی ہے، تو میں انھیں سناتا ہوں کاغذ پر لکھ دوں گا، تو میں خود سنوں گا، اور سنانے اور سننے میں بڑا فرق ہے، آپ خود شعر پڑھئے اور اسی کو کسی دوسرے سے سنئے، آپ کو فرق محسوس ہوجائے گا، تو میں اپنی کہانی کاغذ کے حوالے کردوں تو یہ مجھے سنائے گا اور کوئی دوسرا نہیں سنا سکتا۔ پس میں خود محظوظ ہوں گا اور لکھنے کی قیمت مجھے مل جائے گی۔

میں نے کب سے مطالعہ شروع کیا ہے، مجھے اچھی طرح یاد نہیں، میرے گھرانے میں مطالعہ کا کوئی ذوق نہیں تھا۔ معمولی پڑھے لکھے لوگ تھے، دادا مرحوم اردو کی صرف ایک کتاب بہشتی زیور پڑھا کرتے تھے اس سے انھیں شغف تھا۔ والد محترم شاعر تھے شاعری کے اثر سے کچھ ادبی رسالے اور اپنے دینی ذوق کی وجہ سے کچھ مذہبی پرچے منگایا کرتے تھے، اور فرصت کے اوقات میں انھیں پڑھا کرتے تھے، مجھے جب اردو پڑھنے کی کچھ شد بد ہوئی، اور مجھے کچھ یاد آتا ہے کہ میری عمر اس وقت کل سات سال کی رہی ہوگی۔ میری ولادت ۵؍فروری ۱۹۵۱ء کی ہے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کی وفات پر والد صاحب نے دو شعر کا ایک قطعہ کہہ کر اپنی بیاض میں لکھا تھا۔ اور میں نے اسی وقت اس کو پڑھ لیا تھا۔ مولانا کی وفات ۱۹۵۷ء میں ہوئی تھی، اس وقت میں نے وہ دونوں اشعار بے تکلف پڑھ لئے تھے، بہر حال جب پڑھنے کی شد بد ہوئی، تو میں نے اپنے اندر مطالعہ اور علم کی شدید پیاس محسوس کی۔ ہر لکھا ہوا کاغذ میں اٹھا اٹھا کر

پڑھتا، جب کوئی نیا رسالہ آجاتا، تو والد صاحب کے ہاتھ تک بعد میں پہونچتا، پہلے میں ہی اسے دیکھ ڈالتا۔ سب کہاں سمجھ میں آتا، مگر اکثر حصہ سمجھ میں آجاتا، گاؤں کے مکتب میں بیٹھایا گیا۔ قاعدہ بغدادی اور قرآن شریف بہت جلد پڑھ لیا۔ گھر پر اردو کی جتنی کتابیں تھیں سب پڑھ ڈالیں میری بڑی بہن بہشتی زیور پڑھتی تھی، وہ سبقاً سبقاً پڑھ رہی تھی اور میں دوسرے اوقات میں گھنٹوں اس کے مطالعہ میں غرق رہتا بہت سے الفاظ کے معنی سمجھ میں نہیں آتے تو بہن سے پوچھتا، اس سے نہیں حل ہوتا تو والد صاحب سے پوچھتا، انھوں نے میرے بار بار کے پوچھنے سے تنگ آکر اردو کا چھوٹا سا لغت ’’جامع اللغات‘‘ خرید کر مجھے دیدیا۔ اب مجھے بہت آسانی ہوگئی، پوچھنا میرے اوپر گراں بھی تھا۔ لغت مل جانے کے بعد مشکل الفاظ کا معنی سمجھنا آسان ہوگیا۔ چند ماہ میں نے لغت کو اتنا استعمال کیا کہ اس کا بڑا حصہ مجھے حفظ ہوگیا۔ اب لغت دیکھنے کی نوبت مجھے کم ہی آتی۔

گھر پر کتابوں کا جو مختصر سا ذخیرہ تھا وہ ختم ہوگیا تو میں انھیں کو دہرا دہرا کر پڑھتا رہا، مکتب میں ایک لائبریری تھی اس میں زیادہ تر تاریخی اور جاسوسی ناول کی کتابیں تھی ناول بچوں کیلئے شجر ممنوعہ تھا۔ پھر وہ ایک استاد کی نگرانی میں تھی ہم بچے تو ادھر رخ بھی نہیں کر سکتے تھے، اس کے علاوہ میری طبیعت میں ایک عیب ہے جس کا میں ابھی ذکر کروں گا، وہ ہے حیا اور مجوبیت کا، وہ میری طبیعت میں کچھ زیادہ ہے، بڑوں کے سامنے میری زبان کھل ہی نہیں سکتی تھی باوجودیکہ مجھے پڑھنے کا شوق فراواں بلکہ جنون تھا اور اس کی وجہ سے کبھی کبھی کوئی کتاب کسی سے مانگ بھی لیتا تھا مگر میرے لئے یہ مجاہدۂ عظیم تھا۔ اس لئے لائبریری میں قدم رکھنے کی کبھی ہمت نہ ہوئی، بس پڑھی ہوئی کتابیں دہراتا رہا۔

یہ ذکر اس وقت کا ہے جب میری عمر سات اور گیارہ سال کے درمیان تھی۔ گیارہ سال کی عمر میں میں نے پرائمری درجہ پانچ کا متحان دیا، اس پر مکتبی تعلیم ختم ہوئی۔

اس زمانے میں میرے والد صاحب کے ایک گہرے دوست تھے، حافظ محمد رفیع صاحب مرحوم، یہ ہمارے گاؤں سے متصل محلّہ نیا پورہ کے رہنے والے تھے۔ پڑھے لکھے تو

معمولی تھے مگر ولید پور اور بھیرا کے مکتبوں کیلئے ضروری کتابوں کو مہیا کیا کرتے تھے، اور اس کے ساتھ کچھ دوسری کتابیں بھی رکھتے تھے انھوں نے ایک چھوٹا سا تجارتی کتب خانہ بنا رکھا تھا اور اپنے دادا میانجی ضیاء اللہ علیہ الرحمۃ کے نام پر اس کا نام ''کتب خانہ ضیائیہ'' رکھا تھا۔ ان کی آمد ورفت اس وقت والد کے پاس کثرت سے تھی مغرب کی نماز پڑھ کر آجاتے، والد صاحب موسم کے اعتبار سے کبھی باہر اور کبھی بیٹھک کے اندر چار پائی بچھا دیتے اور پھر دونوں محو گفتگو ہو جاتے۔ میں اپنے والد سے بے تکلف تھا، دوڈھائی سال کی میری عمر تھی کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ والد صاحب نے مجھے والدہ کی بھی شفقت عطا فرمائی، اس لئے میں حتی الامکان ان سے جدا نہیں ہوتا تھا، زیادہ وقت انھیں کے پاس گزارتا تھا، حافظ محمد رفیع صاحب کو کتابوں سے بہت دلچسپی تھی، ان کی گفتگو زیادہ تر کتابوں کے موضوع پر ہوا کرتی تھی میں والد صاحب کے پاس بیٹھا ان دونوں کی گفتگو سنا کرتا ان کی گفتگو سے مجھے بہت سی کتابوں کی معلومات ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے مجھے پہچان لیا، ایک دن مکتب میں صبح تعلیم کے بعد چھٹی ہوئی تو میں ڈرتے ڈرتے ان کے گھر پہونچ گیا، وہ مکان کے اندر کرگہ پر کپڑا بن رہے تھے اور ان کا کتب خانہ باہر کی بیٹھک میں تھا۔ میں پہونچا تو وہ اٹھ کر کتب خانہ میں آئے، میں نے ان سے اجازت چاہی کہ کتابیں پڑھنا چاہتا ہوں انھوں نے اجازت دی مگر ساتھ ہی تاکید کی کہ یہ کتابیں بیچنے کی ہیں، نہ یہ مڑیں تڑیں نہ ان پر داغ دھبہ لگے، بہت احتیاط سے پڑھنا، یہ تاکید کر کے وہ اندر چلے گئے میں دیر تک بچوں کے لئے جو ان کے پاس کتابچے تھے، انھیں پڑھتا رہا۔ دیر ہوئی تو یہ خوف ہوا کہ والد صاحب تلاش کریں گے، جانے کا ارادہ کرتا تھا، مگر کتابوں کے حسن فراواں نے دامن دل کو پکڑ رکھا تھا۔ لیکن خوف غالب آیا، تاہم شوق مطالعہ کی رعایت بھی ضروری تھی میں نے حافظ صاحب سے دوتین کتابیں مانگیں کہ انھیں پڑھ کر کل واپس کر دونگا۔ انھوں نے اسی احتیاط کی تاکید کر کے مجھے دیدیں، گھر آیا تو معمولی سی ڈانٹ سنی، کھانا کھایا اور بستہ اٹھا کر مکتب کی جانب چل دیا، پھر یہ روزانہ کا قصہ ہو گیا سارے بچے مکتب سے چھوٹتے، تو کھیلتے، ندی میں

نہاتے، میں چھوٹتا تو سیدھا کتب خانہ ضیائیہ جاتا، ظہر تک وہیں کھڑا بیٹھا کتابیں پڑھتا رہتا، حافظ صاحب کبھی کبھی کھانا بھی کھلا دیتے تب تو ظہر کے بعد وہاں سے آتا اور جب آتا تو دو ایک کتابیں ساتھ لاتا، مجھے کھیلنے اور سیر و تفریح کا ذوق بالکل نہ تھا ساتھی مجبور کرتے، مذاق اڑاتے، تو کبھی چلا بھی جاتا، مگر میرا جی کتابوں میں اٹکا رہتا، جمعرات کو مدرسہ میں بعد نماز ظہر چھٹی رہتی میں اس روز مغرب تک ان کے کتب خانہ میں پڑا رہتا، پڑھتا رہتا، دہراتا رہتا، پھر حافظ صاحب نے اپنے کتب خانہ کو وہیں منتقل کر لیا جہاں وہ کرگھہ میں کپڑا بنا کرتے تھے وہاں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی میں گھنٹوں، وہیں کھڑا پڑھتا رہتا۔

اس وقت تک میں نے کوئی ناول نہیں پڑھا تھا۔ بس چھوٹی چھوٹی کتابیں جو بچوں کے مناسب ہوتیں وہی ان کے یہاں زیادہ تر ہوتی تھیں انھیں کو میں مکرر سہ کرر پڑھتا رہتا، کبھی کچھ نئی کتابیں آ جاتیں تو میری عید ہو جاتی مجھے یاد ہے ایک روز میں پہونچا تو ایک چھوٹی سی کتاب ''ابر رحمت'' نام کی رکھی ہوئی تھی، بہت خوبصورت چھپی ہوئی، عمدہ ٹائیٹل، بہترین کاغذ، اس کے تین یا چار حصے تھے میری خوشی کی انتہا نہ رہی دو حصے تو وہیں پڑھ ڈالے، اور باقی گھر لیتا آیا۔ جماعت اسلامی والے بچوں کے لئے اس وقت تک کئی کتابیں لکھ چکے تھے انھیں ایک ایک کر کے پڑھا تھا اور کئی کئی بار پڑھا تھا۔ ''ابر رحمت'' کے سب حصے میں نے اتنی مرتبہ پڑھے تھے کہ تقریباً پوری کتاب حفظ ہو گئی تھی اب جبکہ ایک مدت گزر گئی ہے اس کے بہت سے مضامین یاد ہیں۔

اسی دوران ایک روز ان کے کتب خانہ میں مولانا صادق حسین سردھنوی کا ناول ''جوش اسلام'' دکھائی دیا۔ اسے پڑھنا شروع کیا تو کھو گیا ان کے حسن و عشق کا باب تو میری فہم سے بالاتر تھا، مگر تاریخی حصہ میں بہت دلچسپی ہوئی، اس دن دوپہر میں مکتب نہیں گیا، نہ کھانا کھایا، مغرب تک پوری کتاب پڑھ ڈالی، گھر آیا، تو دادا مرحوم نے ایک زوردار گھونسے سے تواضع کی۔ یہ پہلا ناول تھا جو میں نے پڑھا، دوسرے دن جب پہونچا تو وہ ناول موجود نہ تھا غالباً فروخت ہو گیا تھا یا حافظ صاحب نے اس لئے کہ دوبارہ ناول پڑھنے کا جرم نہ

کروں وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ چند ماہ میں کتب خانہ ضیائیہ کا ذخیرہ تو تمام ہو گیا میں پڑھی ہوئی کتابوں کو پڑھتا رہتا تھا قندِ مکرر کا لطف آتا تھا اب مجھے نئے میدان کی تلاش تھی، مکتب کی تعلیم بھی اپنی طبعی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی اور میرے پڑھنے کا چرچا بھی اہل خاندان میں پھیلتا جاتا تھا اس کا ذکر میں نے اس لئے کر دیا کہ آگے اس کے متعلق میرے بچپن کی زندگی کا ایک اہم قصہ متعلق ہے جس نے مجھے مدتوں مضطرب رکھا اس کا تذکرہ ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

پرائمری کے دو درجے، دوم اور سوم کی تعلیم استاذ محترم مولوی محمد یوسف مرحوم کے یہاں ہوئی تھی، مولوی صاحب بہت دیندار اور یکسو آدمی تھے بچے ان سے بہت ڈرتے تھے، کتب خانہ ضیائیہ سے تعلق انھیں دونوں درجات تک زیادہ رہا پھر جب درجہ چہارم میں آیا تو ہم لوگوں کی تعلیم ایک دوسرے استاذ ماسٹر شفیع احمد صاحب سے متعلق ہوگئی کمرہ بدل گیا استاذ بدل گئے، ماسٹر صاحب بہت اچھا پڑھاتے تھے، طلبہ ان سے بہت محبت کرتے تھے وہ پڑھاتے نہیں تھے، گھول کر پلاتے تھے، مگر وہ دیندار نہ تھے، ڈاڑھی منڈاتے تھے، نماز نہیں پڑھتے تھے، بیڑی پیتے تھے، مدرسہ میں جو لائبریری تھی ”آزاد لائبریری“ اس کے انچارج وہی تھے یہاں آئے تو کتابوں کی ایک نئی دنیا نظر آئی ماسٹر صاحب خود بھی ناولوں کے رسیا تھے اور لوگ بھی ان کے پاس کتابیں لینے اور واپس کرنے آیا کرتے تھے ماسٹر صاحب درجے میں ہوتے تو واپس ہونے والی کتابیں وہیں درجے میں رکھ دیتے، میں ذکر کر چکا ہوں ناول کو ہاتھ لگانا بچوں کے لئے جرم تھا۔ میں انتظار میں رہتا کہ کب ماسٹر صاحب بیڑی پینے کے لئے باہر جائیں اور کب میں یہ جرم کروں، وہ کئی مرتبہ اٹھ کر باہر جایا کرتے اور میں اتنی دیر میں ناول کا خاصا حصہ پڑھ لیا کرتا تھا، میں یہ جرم کرتا اور اس جرم میں اکیلا ہوتا کوئی میرا ساتھی نہ ہوتا، مجھے جب میرے رفقاء درس پریشان کرنا چاہتے یا میں ان کی کوئی فرمائش کبھی پوری نہ کرتا یا اپنی طبیعت کی تیزی کی وجہ سے ان سے کبھی لڑائی کر لیتا تو ان کے پاس مجھے شکست دینے کا یہ بہت آسان حربہ ہوتا کہ ہم ماسٹر صاحب کے پاس شکایت کریں گے کہ یہ ناول پڑھتا ہے اس سے میں سہم جاتا، فوراً شکست قبول کر لیتا، مجھے اس کا ڈر نہ ہوتا کہ

ماسٹر صاحب ڈانٹیں گے، جھڑکیں گے، یہ خوف ہوتا کہ وہ یہاں کی تمام کتابیں اٹھا کر لائبریری میں منتقل کر دیں گے اور اس میں قفل لگا رہتا تھا، مجھے یاد ہے کہ جب لڑکے پڑھائی کے علاوہ اوقات میں کوئی کھیل فٹ بال، کبڈی وغیرہ کھیلنا چاہتے اور اصرار کرتے کہ میں بھی اس میں شریک ہوں اور میں انکار کرتا، تو وہ یہی دھمکی دیتے کہ ماسٹر صاحب سے شکایت کر دیں گے اور مجھے مجبوراً کھیل میں شریک ہونا پڑتا۔

اس طرح دو سال کے دوران میں نے چوری چھپے صادق حسین صاحب کے تمام ناول جو لائبریری میں تھے پڑھ ڈالے ان کے حسن وعشق کا باب میں نہیں پڑھتا تھا، پھر جب دوسری کوئی نئی کتاب نہ ملتی تو اسے بھی پڑھ لیتا مگر اس سے دلچسپی نہ ہوئی، اس زمانے میں جاسوسی ناول کو ہاتھ لگانے کا موقع کبھی نہیں ملا کیونکہ وہ ہمیشہ دست بدست رہا کرتے تھے۔

درجہ چار اور پانچ میرے لئے تاریخی ناولوں کا دور تھا اس درسگاہ میں ایک بڑی سی پٹنی تھی، ماسٹر صاحب کی عدم موجودگی میں میں اس پر چڑھ جاتا وہاں آزادی سے پہلے کے پرانے رسالے مولوی، نظام المشائخ، نگار، پیشوا اور حریت بہت تھے، پھٹے پرانے، مڑے تڑے، نچے ہوئے، وہ دو ایک بوروں میں بندھے رکھے تھے میں نے وہ بورے کھول ڈالے جب جب موقع ملتا ان میں غرق رہتا۔

ہمارا مکتب موسم کے اعتبار سے کبھی دس بجے، کبھی ساڑھے گیارہ بجے دوپہر کے وقفہ کیلئے بند ہوتا۔ سب لڑکے چلے جاتے تو اس میں تالا بند ہو جاتا مجھے ایک ترکیب سوجھی، ماسٹر صاحب چھٹی ہوتے ہی چل دیتے، مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم سب کے بعد نکلتے اور وہی تالا بند کرتے اور تالی اپنے گھر لے جاتے میں چھٹی ہونے کے بعد بیٹھا اپنے درجے میں پڑھتا رہتا، اور ان کو دیکھتا جب وہ اٹھتے تو میں بھی اٹھ جاتا مگر مجھے یہ اٹھنا بہت کھلتا تھا کہ یہی تو فرصت کا وقت تھا جو چاہتا پڑھتا، ایک دن ہمت کر کے بیٹھا رہ گیا، مولوی صاحب نے مجھے بیٹھا دیکھ کر کہا کہ بند کر کے کنجی گھر پر دیدینا میری عید ہوگئی، اب روزانہ کا یہی معمول ہو گیا وہ چلے جاتے اور میں اندر سے مکتب کو بند کر کے کبھی پٹنی پر چڑھ جاتا اور کبھی ناولوں میں

غرق ہوجاتا گھر سے تلاشی آتی کبھی ماسٹر صاحب نکل آتے، ان کا گھر مکتب سے بالکل قریب تھا اور مجھے بادل ناخواستہ جانا پڑتا، چھٹی کے بعد تو یہ ہوتا، اور ظہر بعد مدرسہ کھلنے سے پہلے کا دستور یہ بنایا کہ اس کے کھلنے سے آدھ گھنٹہ پہلے میں مولوی صاحب کے گھر جاتا، کنجی ایک مخصوص کھونٹی پر لٹکی ہوتی مولوی صاحب اس وقت ظہر کی نماز کے لئے جاچکے ہوتے میں گھر کی عورتوں سے کنجی مانگ کر لاتا اور مدرسہ کھول اپنے مطالعہ میں ڈوب جاتا، جب تک ماسٹر صاحب آتے میں مطالعہ کا کافی فاصلہ طے کرچکا ہوتا، مجھے اس دوران کبھی کبھی اپنے ساتھیوں کے گھروں میں جانے کا اتفاق ہوتا، تو میں وہاں بھی کتابیں ڈھونڈتا رہتا اور کوئی کتاب مل جاتی تو جب تک اول سے آخر تک پڑھ نہیں لیتا قرار نہ آتا اس طرح میں بہت دیر دیر تک گھر سے غائب رہتا اور والد صاحب کو تشویش ہوتی رہتی یہ کتابیں زیادہ تر دینی موضوعات پر ہوتیں کیونکہ جس ماحول میں میں نے آنکھیں کھولی تھیں وہ دیندارانہ ماحول تھا تو کتابیں بھی ویسی ہی رہا کرتی تھیں۔ طبیعت میں دین کی محبت رچ بس گئی تھی تاہم میرے لئے موضوع کی کوئی قید نہ تھی درجہ چار پانچ میں ہندی کی بھی کچھ شد بد ہوگئی تھی اس لئے اب مطالعہ دونوں زبانوں میں ہونے لگا تھا ہندی کے ہلکے پھلکے رسالے اور کتابچے خوب پڑھ لیتا تھا میں ہر طرح کی کتابیں پڑھتا، اس سلسلے میں میرا رہنما کوئی نہ تھا، بس طبیعت کی موج تھی، بلکہ جنون تھا کہ ہر لکھی ہوئی چیز پڑھنی ہے، اس وقت گاؤں میں صرف ایک ہوٹل تھا اور وہ بھی صرف شام کو عصر کے وقت کھلتا تھا اور مغرب بعد بند ہوجاتا تھا اس ہوٹل میں صرف پکوڑیاں چھنتی تھیں اور چائے بنتی تھی، کچھ لوگ جمع ہوتے وہاں کانپور کا اخبار ''سیاست'' منگایا جاتا تھا، میں اخبار پڑھنے ہوٹل میں پہونچ جایا کرتا، بڑوں کے ہاتھ سے اس کا کوئی صفحہ چھوٹتا، تو میں پڑھنے لگتا، وہ پڑھتے ہوتے تب بھی میں نگاہ اس پر جمائے رہتا اور جہاں تک بس چلتا دیکھتا رہتا اسی زمانے میں جبل پور میں فساد ہوا تھا، اس کی ہولناک خبریں اس میں چھپتیں اور میری نیند حرام ہوجاتی، طبیعت میں تاثر کا مادہ بہت تھا۔

ایک دن اپنے ایک ساتھی کے گھر گیا، جمعرات کا دن تھا، وہاں قصہ حاتم طائی مل

گیا، پھر جو اس میں ڈوبا تو سورج ڈوبنے کے بعد ہی نکلا، مگر کتاب پوری نہیں ہوئی، رات بھر اسی کو خواب میں دیکھتا رہا صبح ہوتے ہی پھر پہونچا اور پوری کتاب پڑھ کر جمعہ پڑھنے گیا۔

میرا ایک رشتہ کا پھوپھی زاد بھائی میرا اہم عمر تھا، وہ درجہ تین پڑھ کر خیرآباد چلا گیا، کیونکہ وہ بریلوی تھا، دیوبندیوں کے مدرسہ میں پڑھتا تو اس کا عقیدہ خراب ہوجاتا اس کے والد نے اسے ہٹا کر خیرآباد بریلویوں کے مدرسہ میں بھیج دیا اس سے میری بحث دیوبندیت اور بریلویت کے موضوع پر رہنے لگی۔ مجھے اس موضوع پر کسی کتاب کے پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، کیونکہ ایسی کوئی کتاب مجھے ملی ہی نہ تھی اور بریلویوں کے مدرسوں میں ابتداء ہی سے اس کی تیاری کرائی جاتی ہے۔ اس نے جب بحث شروع کی تو میں اوٹ پٹانگ جواب دیتا وہ بھی اوٹ پٹانگ ہی بکتا تھا پھر جب اس نے محسوس کیا کہ اس طرح زیر کرنا مشکل ہے تو مجھے گھر لے گیا اور ایک کتاب نکال کر دی، اس کا نام تھا ’’المصباح الجدید‘‘ مصنف تھے، حافظ ملت مولانا عبدالعزیز صاحب مدرس مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور، مجھے خوب یاد ہے کہ اس نے جب وہ کتاب میرے ہاتھ میں تھمائی، تو میں اس گھر کے اندر صحن کے بعد جو کمرہ ہے اسکے زینہ پر تھا وہیں وہ کتاب پڑھنے لگا کھڑا کھڑا تھک گیا تو بیٹھ گیا اور ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب پڑھ گیا، کتاب کیا تھی دیوبندیت کے اوپر حملوں کی بوچھار تھی، میرا سکون اندر سے ہل گیا، علماء دیوبند سے بے اطمینانی کی کیفیت معلوم ہونے لگی ان کے بارے میں پہلے سے جو کچھ پڑھ رکھا تھا اور اپنے والد سے سن رکھا تھا اس کے بالکل خلاف جب معلومات سامنے آئے تو دل میں آگ سی لگ گئی۔ والد صاحب سے میں نے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے ڈانٹ دیا کہ تم وہاں کیوں گئے؟ اور وہ کتاب کیوں پڑھی؟ وہ سب غلط ہے، جھوٹ ہے، لیکن اس سے میری بے چینی ختم نہیں ہوئی پھر وہاں جا کر میں نے ’’بہار شریعت‘‘ کا بھی مطالعہ کیا۔ لیکن صرف پہلے حصے کا، باقی حصے اس نے مجھے نہیں دیئے۔ قسمت کی خوبی دیکھئے، دل میں ایک بے قراری پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا علاج بھی فراہم کر دیا۔

اس علاج کا ذکر کرنے سے پہلے اس کا پس منظر بیان کر دوں۔ میرے گھر سے لگا ہوا گھر گاؤں کے ایک بزرگ حافظ احمد کریم صاحب کا تھا! گاؤں میں اس وقت تک جتنے حفاظ تھے ان میں وہ سب سے بڑے تھے کئی ایک کے استاذ تھے، بعد میں تو ان کے یہاں سے بہت حافظ تیار ہوئے، فراغت کے بعد میں نے بھی حفظ قرآن کی سعادت انھیں کی خدمت میں حاصل کی، وہ محض لوجہ اللہ اپنے گھر پر پڑھایا کرتے تھے، ان کا گاؤں پر بڑا اثر تھا بہت ذہین اور زبان کے تیز وطرار تھے ان کے گھر پر مغرب کے بعد مسجد کے مصلی حضرات بیٹھا کرتے تھے حقہ چڑھتا تھا، لوگ پیتے، باتیں کرتے گاؤں بھر کے بزرگ امام، میرے استاذ مولوی عبدالستار صاحب بھی آکر بیٹھتے، میرے دادا اور والد بھی بیٹھتے مخلص اور بے ریا لوگ! مغرب کے بعد فوراً بیٹھتے، یہ نشست تھوڑی دیر کی ہوتی بس دس پندرہ منٹ، اس کے بعد لوگ کھانا کھانے گھر گھر چلے جاتے کھانا کھا کر سب لوگ آجاتے اور پھر عشاء تک یہ بیٹھک رہتی اس بیٹھک میں میں بہت پابندی کے ساتھ شریک ہوتا، ان بوڑھوں کی باتیں سنتا، انھیں یاد رکھتا، میرا چچازاد بھائی محمد بلال بھی اکثر اس میں شریک رہتا۔ حقہ کا تمبا کو جب جل جاتا، تو حکم ہوتا اور ہم لوگ حقہ چڑھاتے، یہ روزمرہ کا معمول تھا۔

گاؤں کے ایک معمر ترین بزرگ جو دوسرے محلّہ کے رہنے والے تھے، جاڑے کا موسم تھا، وہ اس مجلس کے شرکاء میں نہ تھے لیکن دیکھا تو ایک روز تشریف لائے ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی انھوں نے بتایا کہ اس کتاب میں بریلویوں کی خوب خبر لی گئی ہے انھیں رد بریلویت سے بہت دلچسپی تھی، اور حافظ صاحب مرحوم بھی بریلویوں کے خلاف اپنی بساط بھر تیغ برہنہ تھے، کتاب لانے والے بزرگ حاجی محمد صابر صاحب نے فرمایا کہ میں مبارک پور سے یہ کتاب لایا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ یہ کتاب پڑھی جائے، سب نے تائید کی لیکن کون پڑھے؟ اس سوال پر سب نے مجھے حکم دیا کہ تم پڑھو میں تو یہی چاہتا تھا اس کتاب کا نام **مقامع الحدید علی الکذاب العنید** تھا۔ مصنف اس کے مولوی محمد حنیف صاحب رہبر مبارکپوری مرحوم تھے۔

میں نے پڑھنا شروع کیا تو محسوس ہوا کہ یہ کتاب المصباح الجدید کا جواب ہے اور اس کے شروع میں مولانا محمد حنیف صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے، مجلس کا وقت تو محدود تھا میں نے اس کتاب کو ایک ہی دن میں پورا پڑھ ڈالا اور ہر روز ایک محدود مقدار میں اسے پڑھ کر سناتا لوگ تبصرے کر کے خوش ہوتے میرے استاذ مولانا عبدالستار صاحب مدظلہ کسی کسی عبارت کی تشریح کرتے اس دوران میں اسے ہر روز ایک مرتبہ پڑھ لیا کرتا تھا وہ کتاب قریب قریب مجھے یاد ہو گئی۔ اب میں اپنے مذکورہ پھوپھی زاد بھائی سے مناظرہ کرنے کیلئے بالکل تیار ہو گیا۔ وہ جمعرات کو خیرآباد سے آتا تو میری اس کی بحث ہوتی، اس سے بہت مناظرے ہوئے خیر وہ ایک الگ موضوع ہے اب وہ اپنی جماعت کا بڑا عالم مولانا محمد احمد صاحب مصباحی شیخ الادب والفقہ جامعہ اشرفیہ عربی یونیورسٹی مبارک پور ہے۔ اپنے مسلک کی روایت کے مطابق سلام وکلام سے احتراز فرماتا ہے، سامنا ہوتا ہے لیکن باوجود طبیعت کے تقاضے کے ان کے مسلک کے احترام میں مَیں بھی سلام کو نظرانداز کر دیتا ہوں۔

مقامع الحدید نے میری طبیعت پر بہت اثر ڈالا، پھر کسی بریلوی عالم یا بریلوی کتاب سے طبیعت متاثر نہیں ہوئی۔ میں ان دنوں کتابوں کی تلاش میں اپنے دوستوں کے گھروں میں جایا کرتا تھا حاجی محمد صابر صاحب مرحوم کے پاس کتابیں تھیں مگر وہ بوڑھے بزرگ ایک بچہ ان کے پاس کیسے جاتا، ان کے بھتیجے، ابوبکر، جو بعد میں حافظ ابوبکر ہوئے، ان سے دوستی ہوئی ان کے واسطے سے ان کے گھر پہونچا، اور جو کچھ ملا اسے چاٹ ڈالا، کیا ملا، وہ بھی بتادوں، تفسیر حقانی کے کچھ اجزاء، تجلی دیوبند کے بہت سے پرچے، سب کہاں سمجھ میں آتا، مگر پڑھتا سب تھا اس کی وجہ سے اسی وقت میرے معلومات بہت وسیع ہو گئے تھے۔

اس مجلس بزرگاں میں جب **مقامع الحدید** پوری ہو گئی تو خیال آتا ہے دوبارہ پھر پڑھی گئی۔ اب لوگوں کو کتاب سننے کا ایک چسکا لگ گیا۔ ان لوگوں نے حاجی صاحب سے فرمائش کی کہ کوئی اور کتاب لایئے، وہ ایک پرانی کتاب کہیں سے لائے جس کا اول

وآخر غائب تھا اس لئے مصنف کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ اوپر صفحہ پر جیسا کہ کتاب کا نام اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے وہ بھی نہ تھا، حاجی صاحب نے اس کا نام ’’مقدس اسلام‘‘ بتایا تھا۔ غالباً اندر کہیں یہ نام آیا بھی تھا کتاب مشہور آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی کی کتاب ستیارتھ پرکاش کے جواب میں لکھی گئی تھی، بہت دلچسپ اور ایمان افروز اور ضخیم بھی تھی، اس کے پڑھنے کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا، اور غالباً وہ بھی دو مرتبہ پڑھی گئی۔ یہ کتاب بھی میں نے ہی پڑھی تھی، اس کتاب کے پڑھنے سے رسول اللہ ﷺ کی محبت اور شریعت کی عظمت وحقانیت کا نقش دل پر خوب جما، اس وقت تک سیرت کے موضوع پر بچوں کے مناسب چھوٹے چھوٹے رسائل اور کتابچے بہت سے پڑھ چکا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعقیدت سے خوب بہرہ ور ہو چکا تھا۔

اسی دوران اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے پڑھنے کا ایک عجیب موڑ آیا۔ غالباً دادا مرحوم نے فرمائش کی تھی، یا والد صاحب نے از خود حافظ محمد رفیع صاحب کے ذریعہ سے بخاری شریف کا ترجمہ کراچی سے منگوایا، یہ ترجمہ تین جلدوں میں ہے، ترجمہ کرنے والے مرزا حیرت دہلوی ہیں، یہ تینوں حصے گھر میں آئے تو میں خوشی سے جھوم اٹھا، مجھے اس کی خوشی تھی کہ اب کچھ دنوں تک مجھے اور کوئی کتاب ڈھونڈھنی نہیں پڑے گی، یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اس سے پہلے میں حدیث کے دوسرے مجموعے، جنت کی کنجی، دوزخ کا کھٹکا، رسول کی باتیں، خدا کی باتیں، پردہ کی باتیں وغیرہ بار بار پڑھ چکا تھا اب جو یہ ام الکتاب آئی تو خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اس کے آجانے کے بعد مکتب کے علاوہ کہیں آنے جانے کا سلسلہ تقریباً بند ہوگیا، آتے ہی اس کا مطالعہ شروع کردیا جس دن کتاب آئی دادا مرحوم نے دوسرے دن مکتب کی چھٹی کے بعد مجھے حکم دیا کہ وضو کرو، خود بھی وضو کیا صاف ستھری چٹائی بچھائی، رحل پر بخاری شریف کا پہلا حصہ رکھا، ادب سے سر جھکا کر بیٹھ گئے اور مجھے حکم دیا کہ پڑھو، میں نے پڑھنا شروع کیا، دیر تک پڑھتا رہا پھر یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک تینوں حصوں کی قرأت مکمل نہیں ہوگئی۔ اور اہتمام والتزام وہی ہوتا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا،

میں نے اس کو موڑ اس لئے کہا کہ مجھے مولوی بنانے میں جہاں تک میرا خیال ہے اس قرأت کا دخل زیادہ ہے ہمارے گھرانے میں کوئی مولوی یا حافظ اس وقت نہیں تھا دادا مرحوم کے والد حافظ محمد طاہر صاحب تھے ان کے بعد نہ کوئی حافظ اور نہ کوئی مولوی، بلکہ مولوی سرے سے کوئی ہوا ہی نہ تھا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ بخاری شریف کی قرأت کے وقت دادا مرحوم میرے لئے دعا کرتے رہے ہوں گے اس وقت مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ عالمیت کی تکمیل ہمارے مدارس میں بخاری شریف پر ہوتی ہے، ہاں شاید دادا مرحوم نے بتایا تھا۔ انھیں کی دعاؤں کی برکت ہوگی کہ میرے ساتھ علم کا نام لگ گیا ہے ورنہ میری طالب علمی ایسے ہچکولوں میں گذری ہے کہ نہ جانے کشتی کہاں غرق ہو جاتی۔

غرض یہ کہ اس وقت مجھے پڑھنے کا جنون تھا میرا بس چلتا تو میں مکتب بھی نہ جاتا، کیونکہ مکتب میں کتابوں کی چال چیونٹی کی تھی، جو کتابیں میرے درس میں ہوتیں میں انھیں چند ہی دنوں میں چاٹ ڈالتا، ریاضی میں کمزور تھا کیونکی گنتی لکھنے سے مجھے مناسبت نہ تھی، میں صرف پڑھنے کو علم سمجھتا تھا، گنتی پڑھنے اور لکھنے کو زائد کام تصور کرتا تھا لیکن ماسٹر صاحب نے سمجھا دیا کہ درجہ پانچ میں حساب کا مضمون سب سے اہم ہے اس میں اگر نمبر کم آ گیا تو باقی مضامین کے زیادہ نمبرات بھی تلافی نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے درجہ پانچ میں آ کر بلکہ درجہ چار ہی سے میں نے اس میں بہت محنت کی اس محنت کے نتیجے میں تحریری حساب میں تو میں بہت چست ہو گیا۔ لیکن زبانی حساب جس کو ''منٹل'' کہا کرتے تھے میں بالکل فیل تھا زبانی حساب میں کبھی نہیں بتا پاتا تھا، ہاں لکھنے میں چونکہ چوکس تھا اس لئے اس میں سب سے آگے ہو گیا تھا اس زمانے کا ایک دلچسپ قصہ اب تک میرے دل پر تازہ ہے اگرچہ موضوع سے ہٹا ہوا ہے لیکن چونکہ اس کا اثر میرے ماضی سے حال تک مسلسل یکساں رہا ہے اس لئے اگر ذکر کر دوں تو چنداں مضائقہ نہیں، بات لمبی ہوتی جا رہی ہے مگر آدمی کو اپنی ذات سے اپنے اوپر بیتی ہوئی کہانیوں سے ایک طرح کی دلچسپی ہوتی ہے اسے انھیں یاد کرنے میں، انھیں دہرانے میں لذت محسوس ہوتی ہے اس لئے ان میں انتخاب کرنے کی صلاحیت ذرا کم

ہی ہوتی ہے اور میں تو انتخاب کرنے کی استعداد رکھتا ہی نہیں جیسے پہلے بے تحاشا پڑھا ہے اب بے تحاشا سنا رہا ہوں۔

ہاں تو بات یہ ہوئی کہ درجہ چار میں ماسٹر صاحب نے دو حساب پڑھائے، ایک کا نام ذو اضعاف اقل تھا اور دوسرے کا نام عاد اعظم تھا۔ اب صرف نام یاد ہے، اس کا طریقہ وغیرہ کچھ یاد نہیں ہے۔ طریقۂ حساب ذرا مشکل تھا بڑی دیر میں اس کے قواعد وکلیات سمجھ میں آئے لیکن جب سمجھ میں آ گئے تو بہت لذیذ معلوم ہوئے، جمعرات کا دن تھا ماسٹر صاحب نے صبح کے وقت جمعرات اور جمعہ کی چھٹی کا حوالہ دے کر دونوں کے کئی کئی سوالات لکھوائے کہ سنیچر کو حل کر کے لے آنا، اس دن اتفاق سے میرے کسی رشتہ دار کے یہاں کوئی تقریب تھی مجھے تقریبات سے بہت وحشت تھی جب تک مجھے زبردستی نہ لیجایا جاتا میں کسی تقریب میں نہ جاتا، میرے گھر کے سب لوگ اس تقریب میں چلے گئے تھے، اس وقت افراد کی تعداد بھی گھر میں کم ہی تھی، بس والد صاحب اور دادا، اور دو مجھ سے بڑی بہنیں، اور پانچواں میں، گھر کی کل کائنات یہی تھی۔ چاروں اس تقریب میں چلے گئے، میں گھر پر اکیلا تھا ظہر کے بعد میں کاپی لے کر حساب کے سوالات حل کرنے کیلئے بیٹھ گیا اس میں مجھے اتنا استغراق ہوا کہ گرد وپیش کا سارا ماحول فراموش ہو گیا۔ میرا ایک ساتھی گھر میں داخل ہوا مجھے کچھ احساس نہیں ہوا وہ میرے پاس آ کر چپکے سے بیٹھ گیا اس کا بھی مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔ وہ ساتھی ایسا تھا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرا حساب دیکھے، لیکن وہ کتنی دیر تک دیکھتا رہا یہ اس کے بتانے کے بعد مجھے معلوم ہوا، وہ دیر تک خاموش دم سادھے بیٹھا رہا، پھر اچانک ایک رسالہ میری کاپی پر رکھ دیا جس کے سرورق پر ایک بھیانک چہرہ اور سر کی تصویر تھی، میں تقریباً چیخ پڑا، میرا دل دھک دھک کر رہا تھا وہ ساتھی بھی گھبرا گیا۔ ایک تو اچانک میری کاپی پر ایک اجنبی چیز کا آ جانا پھر جو اس پر تصویر بنی تھی وہ بھوت بن کر میرے دماغ کو چمٹ گئی۔ استغراق تام سے افاقہ ایسا جبری ہوا کہ اب تک جب وہ تصویر کبھی سامنے آ جاتی ہے تو وہی سابقہ کیفیت عود کرنے لگتی ہے، یہ رسالہ ”پاسبان“ تھا، جو پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے ماہانہ نکلا کرتا تھا، والد صاحب

اس کے خریدار تھے اور یہ تصویر ٹیگور کی تھی جس کی نہ جانے کتنی کتنی مدح ہوتی ہے، اور اس رسالے میں بھی تمام مداحی تھی، مگر میرے ذہن میں اب تک وہ ایک بھوت ہی ہے۔

غالبًا پرائمری ہی کا دور تھا، درجہ پنجم میں رہا ہوں گا استاذ محترم مولانا عبدالستار صاحب کے یہاں الفرقان کا کا شاہ ولی اللہ نمبر نظر آیا، میں مانگ کر گھر لایا اس کے مضامین بہت معیاری تھے، لیکن عادت کے مطابق ایک طرف سے پڑھنا شروع کیا اس میں مولانا مودودی صاحب کا بھی ایک مضمون تھا، اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ خوب سمجھ میں بھی آیا، مگر حضرت مہدی کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا تھا وہ نہ اس وقت سمجھ سکا اور نہ اب تک وہ سمجھ میں آیا، حضرت مہدی کے سلسلے میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے سلسلے میں حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ’’علامات قیامت‘‘ کے نام سے اس سے پہلے پڑھ چکا تھا۔ مودودی صاحب نے اس کے خلاف دعویٰ پیش کیا تھا اور دلائل میں صرف ان کے قیاسات تھے، اس سے طبیعت کو بے اطمینانی ہوئی، دوسرے ان کے بعض جملے جو تصوف کے متعلق تھے دل میں بہت چبھے تھے، اور تیسری چیز جس نے ان سے مجھے دور کیا ان کا اس مضمون میں وہ لب ولہجہ تھا جس سے میں نے اس وقت یہی سمجھا کہ یہ شخص خود کو مجدد کے درجے میں لانا چاہتا ہے، یہ ان کی پہلی تحریر تھی جو میں نے پڑھی اور طبیعت کو ان سے ایک بعد محسوس ہوا، پھر تو اس کے بعد ان کی بیش تر تحریریں پڑھنے کا تفاق ہوا مگر یہ تاثر کم نہیں ہوا بلکہ بڑھتا ہی گیا۔

اس میں مسعود عالم ندوی کا بھی مضمون پڑھ کر تکلیف ہوئی تھی، بعد میں جب مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی کتاب ’’ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت‘‘ پڑھنے کا اتفاق ہوا، تو مسعود عالم صاحب نے ہندوستانی علماء کی شاہ ولی اللہ صاحب سے پہلے جو تصویر بنائی تھی اور اس سے جو تکلیف محسوس ہو رہی تھی اس کا اثر ختم ہو، اور احساس ہوا کہ ہلدی کی گانٹھ پا کر پنساری کی دکان سجانے والوں سے ہوشیار رہنا چاہئے۔

اس دوران گھر کے اندر جو کتابیں اور رسائل میں نے پڑھے اور بار بار پڑھے ان

میں ایک ماہنامہ احسن رامپور تھا۔ اس کے بارہ پندرہ شمارے گھر میں تھے، شاید اب بھی ہوں گے۔ یہ ایک ادبی ماہنامہ تھا، والد صاحب کچھ شاعری کر لیتے تھے، تخلص ان کا کوثر تھا۔ ان کے استاذ ابر احسنی گنوری تھے انھوں نے اپنے استاذ مولانا علی احسن صاحب، احسن مارہروی کی یادگار میں اپنے شاگردوں اور اپنے خواجہ تاش بھائیوں کے تعاون سے رامپور سے اس کو نکالا تھا۔ گھر پر جو پرچے تھے ۱۹۵۱ء کے تھے، اس میں ادبی مضامین اور افسانے بہت اچھے ہوا کرتے تھے، اردو ادب سے دلچسپی کا آغاز اسی رسالے سے ہوا۔ اس کے تمام شمارے میں نے بہت اہتمام اور شوق سے پڑھے تھے۔

ہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ مجھے اشعار سے نہ مناسبت تھی نہ دلچسپی! پہلے سمجھ میں بھی کم ہی آتے تھے، نثری مضامین پڑھتے وقت درمیان میں کوئی شعر آجاتا تو اسے میں چھوڑ دیتا تھا۔ اب بھی جس مضمون یا کتاب میں موقع بے موقع اشعار کی بھرمار ہوتی ہے اس کا پڑھنا میرے لئے مجاہدہ ہوتا ہے، میرے گھر پر حفیظ جالندھری کی کتاب شاہنامہ اسلام تھی۔ اس میں نظم کئے گئے تاریخی واقعات کی سندیں حاشیہ میں سیرت النبی وغیرہ کے حوالے سے پیش کی گئی تھیں، لمبے لمبے حاشیے تھے جتنے مضامین نظم میں تھے تقریباً وہ سبھی حاشیہ کی نثریں موجود تھے۔ میں شاہنامہ کی نظم کبھی پوری نہیں پڑھ سکا، البتہ اس کا حاشیہ بار بار پڑھا۔ اب بھی وہ نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ اسی طرح اس وقت مسدس حالی اور شکوہ جواب شکوہ کا چرچا خوب تھا، مسدس حالی کا جو نسخہ میں نے پڑھا، اس میں بھی حواشی تھے وہ تو خوب پڑھے، مگر اصل کتاب نہیں پڑھ سکا۔ شکوہ جواب شکوہ اس وقت پڑھا جب میں ادیب کا امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا۔

درجہ پانچ میں اردو کی کتاب بیسک ریڈر کا پانچواں حصہ نصاب میں داخل تھا، اس میں جو نظمیں تھی جیسے ماں کا خواب، جگنو، حب وطن وغیرہ ان کے پڑھنے کی مجبوری تھی۔ پڑھتا تھا مگر مطلب خوب سمجھ میں نہیں آتا تھا، ماسٹر صاحب خوب سمجھا دیتے تھے اس وقت سمجھ میں آ بھی جاتا تھا، مگر مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے ذہن سے جلد ہی نکل جاتا تھا، کسی

صاحب نے اس وقت اس کی شرح کلید کے نام سے لکھی تھی میں نے اپنے ایک ساتھی کے پاس دیکھی، میں نے اس سے پڑھنے کے لئے مانگی اس نے انکار کردیا، میں والد صاحب کے سر ہوگیا۔ وہ کہیں سے خرید لائے، پھر میں نے اس میں اشعار کی شرح اتنی مرتبہ پڑھی کہ یاد ہوگئی اور اشعار سے کچھ کچھ مناسبت محسوس ہونے لگی۔ ایک دن دیکھا تو میری کلید غائب تھی، مجھے بہت صدمہ ہوا مگر چند دنوں کے بعد اسی پٹی پر جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، پھٹی چری مل گئی، میرے ایک ساتھی نے جس کو مجھ سے حسد تھا، ایسا کیا تھا۔

میرے مطالعہ کے لئے نہ کسی وقت کی پابندی تھی نہ کسی خاص طریقہ کی، گاؤں کا رہنے والا، جسے نہ علماء کی صحبت نصیب اور نہ علم کے آداب معلوم، اور نہ اس کے گھر میں تحصیل علم کے لوازم و آداب موجود، بس جب جی میں آیا کتاب لے کر پڑھنے لگا، کھڑا ہو کر پڑھتا تو ایک ایک گھنٹہ گذر جاتا، بیٹھتا تو بیٹھا ہی رہ جاتا۔ لیٹ کر مطالعہ کرتا تو کرتا ہی چلا جاتا، کھانا کھاتا رہتا اور پڑھتا رہتا میری بہنیں میرے ہاتھ سے کتاب چھین لیتیں اور میں بے بس ہوجاتا، کھیلنے اور گھومنے پھرنے کا شوق نہ تھا۔ ساتھیوں میں پڑ کر کبھی ادھر ادھر نکل جاتا، ورنہ زیادہ تر گھر میں ہی گھسا رہتا۔ عصر کے بعد بھی کتاب میں جٹا رہتا۔ زبان سے پڑھنے کی عادت نہ تھی، نگاہ سطروں پر دوڑتی رہتی اور معانی دل میں اترتے رہتے، میری بہنیں اعتراض کرتیں کہ تم پڑھتے نہیں ہو، پڑھنا زبان سے ہوتا ہے اور تمھارا منھ تک نہیں ہلتا انھوں نے مجھے پابند کیا کہ میں بآواز بلند پڑھا کروں، عصر کے بعد وہ دونوں روٹی پکاتیں اور میں کھٹولے پر بیٹھا کوئی کتاب سناتا، مگر اس میں پڑھنے کی رفتار اور مقدار بہت ہلکی اور کم ہوتی، میں نے کہہ دیا کہ تم لوگ میرے پڑھنے کو مانو یا نہ مانو، میں زبان سے نہیں پڑھوں گا، پھر وہ توے پر روٹیاں سینکتیں اور میں کتاب سے آنکھ سینکتا، میرے والد منع کرتے کہ عصر کے بعد پڑھنے سے بینائی کمزور ہوجاتی ہے، صحت کا خیال رکھو مگر میرا جنون اس کا متحمل نہ تھا اس وقت میں کثرت سے بیمار بھی ہوا کرتا میرا جسم سدا کا کمزور ہے، ہر تین ماہ یا چھ ماہ پر تیز بخار آیا کرتا جو کم از کم ایک ہفتہ تک بستر پر ڈالے رہتا اکثر نمونیہ کا بھی شکار ہوتا لیکن پڑھنا بھی عجب

جنون ہے بیماری کی حالت میں مطالعہ کی رفتار کچھ بڑھ ہی جایا کرتی۔

میری والدہ نہیں تھیں میری نانی بہت بوڑھی تھیں اور مجھ پر حد سے زیادہ مہربان و شفیق! تقریباً ہر روز میری حاضری ان کے یہاں ضروری تھی کوئی دن ناغہ ہوتا تو وہ بے چین ہوجاتیں، میں بیمار ہوتا تو لاٹھی ٹیکتی میرے گھر آجاتیں، اور گھنٹوں سرہانے بیٹھی رہتیں، مجھے بھی ان سے بہت محبت تھی میرے پڑھنے کا جنون انھیں معلوم تھا، مگر جب انھیں محسوس ہوا کہ یہ اپنی صحت سے بے نیاز ہوکر پڑھتا ہے تو سمجھانے لگیں کہ اتنا نہیں پڑھتے، دو ایک مرتبہ انھوں نے سمجھایا تو میں نے ان کے پاس جانا چھوڑ دیا، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ مجھے حجاب سا ہوگیا، میں نے نانہال کا رخ کرنا ہی بند کردیا، حالانکہ میرا دل نہایت مضطرب رہتا، مگر کسی طرح ہمت نہ ہوتی کہ وہاں جاؤں، دو ماہ اسی حجاب اور اضطراب میں گزر گئے، میں پریشان ہوگیا، نانی خود گھر پر آتیں اور میں سنتے ہی بھاگ جاتا کہ پڑھنے کو منع کریں گی۔ بالآخر گرفتاری ہوئی سامنا ہوا، انھوں نے پڑھنے سے منع نہیں کیا، البتہ گھر پر نہ آنے کی شکایت کی پھر حجاب اٹھ گیا، یہ دور میرے لئے سخت اضطراب کا تھا۔

یہاں یہ بھی ذکر کروں کہ میں گھریلو کاموں میں نکما تھا، کوئی کام ٹھکانے کا مجھ سے بن نہیں پاتا تھا، کوئی سامان دکان سے لیتا تو اچھے برے کا کچھ پتہ نہ چل پاتا۔ گوشت ہمیشہ والد صاحب لایا کرتے، بہنیں کوستیں کہ تمہاری عمر کے لڑکے قصاب کی دکان سے گوشت لاتے ہیں تم بھی لایا کرو، میں طرح دے جاتا۔ جس دن والد صاحب کہیں چلے جاتے اس دن گھر میں گوشت نہ آتا، ایسے ہی کسی دن میری بڑی بہن نے زبردستی قصاب کی دکان پر مجھے بھیج دیا، میں شرمیلا اور کمزور دل کا، دکان پر بھیڑ تھی، میں چپکے سے بیٹھ گیا، جب سب لوگ گوشت لے کر چلے گئے تو قصاب نے مجھ سے پوچھا کہ کچھ چاہئے، میں نے کہا ہاں گوشت چاہئے، اس نے بچا کھچا گوشت میرے ہاتھ میں تھما دیا، میں لے کر گھر آگیا، بہن نے دیکھا تو بہت خفا ہوئی اور مجھے قصاب کی دکان پر جانے سے نجات مل گئی۔ مجھے اپنی اس ناکارگی پر افسوس ہوتا تھا لیکن خوشی بھی ہوتی تھی کہ یہ ناکارگی پڑھنے کیلئے بڑی معاون تھی،

کوئی کسی کام کی فرمائش کرتا ہی نہ تھا کہ مجھ سے کام بگڑتا تھا، کام کا نہ تھا اس لئے وقت خوب فارغ رہتا تھا۔

میرے لئے سب سے زیادہ سخت دن وہ ہوتا تھا جس دن تانا تنا جاتا تھا، اس میں حاضری سے باوجود میری ناکارگی کے معافی نہ تھی، اور اس سے غیر حاضری کا کوئی عذر بھی قبول نہ ہوتا، تانا ایک باغ میں تنا جاتا، اس کا علم اور کتاب سے کوئی ربط نہ تھا بلکہ دونوں میں تضاد تھا، والد صاحب کا حکم ہوتا کہ اس میں حاضر رہوں اور میری طبیعت بہانے ڈھونڈتی، مگر حاضر ہونا ہی پڑتا، میرے والد نے مجھے کبھی نہیں مارا، مگر تانے میں غیر حاضری پر ایک روز مار کھانی پڑی، میں وہاں بھی کوئی کتاب لے کر جاتا، اور والد صاحب کی نگاہ سے بچا کر پڑھ لیتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں تانا میں حاضری کے باوجود اس کے ڈھنگ سے بے ڈھنگا ہی رہا۔

اسی زمانے میں والد صاحب نے میرے اوپر پابندی عائد کی کہ جو پڑھتے ہو، شام کو مجھے سنایا کرو، میرا حافظہ اچھا تھا شام کو سب سنا دیا کرتا، دو تین روز میں والد صاحب خود گھبرا گئے ۔ حکم دیا کہ اچھا جو پڑھتے ہو اس کا خلاصہ روزانہ لکھ لیا کرو لیکن یہ کام مجھ سے بالکل نہیں ہوسکا۔ لکھنے سے کوئی مناسبت نہ تھی، لکھنے میں وقت لگتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ جتنی دیر لکھوں گا اتنی دیر میں میں بہت کچھ پڑھ لوں گا اس لئے قلم کبھی ہاتھ میں نہیں لیا بس پڑھی ہوئی باتیں دماغ میں اتارتا رہا۔ اگر اس وقت کچھ نوٹ تیار کرتا رہتا تو آج میرے پاس علم کا بڑا ذخیرہ ہوتا۔ مگر مجھے تو پڑھنے کی دھن تھی۔

میرے گھر میں ''ہمدرد صحت'' کے کچھ شمارے تھے، یہ رسالہ ہمدرد دواخانہ دہلی سے حکیم عبدالحمید صاحب کی ادارت میں کبھی نکلا کرتا تھا اس میں طبی مضامین کے علاوہ دوسرے بھی کارآمد مضامین ہوا کرتے، اس میں ایک مضمون تھا کہ آپ مطالعہ کیسے کریں؟ اس عنوان کے تحت مطالعہ کے بارے میں بہت سی مفید باتیں لکھی تھیں میں نے اسے بہت غور سے پڑھا اس میں ایک بات یہ بھی لکھی تھی کہ کتاب میں یا مضمون میں جو بات پسند آئے یا

ضرورت کی ہوا سے ایک کاپی پر نوٹ کر لینا چاہئے۔ یہ بات اچھی تو بہت لگی مگر عمل کبھی نہیں ہوا۔ ایک بات اور لکھی تھی کہ کتاب کا جو پیراگراف زیادہ ضرورت کا ہو اس پر پنسل سے ہلکا نشان لگا دو جب پوری کتاب کا مطالعہ ہو جائے تو ان مقامات کو پھر پڑھو، مکرر سہ کرر پڑھو، اس طرح وہ بات محفوظ ہو جائے گی یہ مشورہ بھی بہت اچھا ہے، مگر مجھ سے اس پر بھی عمل نہ ہو سکا۔ مطالعہ کی روانی میں کبھی اس کا دھیان ہی نہ رہا۔ رہا یہ کہ اسے مکرر پڑھا جائے تو کم کوئی کتاب ہوگی، جس کو میں نے ایک ہی بار پڑھا ہو، اکثر کتابوں کو بار بار پڑھا ہے۔ ذہن میں باقی رکھنے کے لئے تکرار مطالعہ شرط ہے، کسی چیز کو ایک بار پڑھ لینا ہرگز کافی نہیں ہے بار بار پڑھنا چاہئے تب بات ذہن نشین ہوگی بار بار پڑھنے سے معانی کے ساتھ الفاظ پر بھی عبور حاصل ہوتا، ان کا محل استعمال معلوم ہوتا ہے انکے معانی کی باریکیاں کھلتی ہیں اسلوب ملتا ہے اور ہر بار کوئی نہ کوئی نئی بات ملتی ہے۔

کتابوں کے پسندیدہ اقتباسات نوٹ کرنا، ضروری مضامین کی فہرست بنا لینا، ان لوگوں کے لئے ضروری ے جو تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتے ہوں یا جن کا لکھنے کا ارادہ ہو، مجھے کبھی یہ تصور ہی نہیں آیا کہ مجھے کبھی قلم بھی پکڑنا ہوگا۔ درجات پرائمری تو بچپن کی بالکل بے شعوری کا دور تھا، اس وقت تو یہ حال تھا کہ بچے جس طرح بے دردی سے اناپ شناپ کھاتے چلے جاتے ہیں، اور نتیجہ کی کوئی پروا نہیں کرتے ویسے ہی میں صرف پڑھنا جانتا تھا اس کے نتیجے میں مجھے کیا ہونا ہے، عالم بننا ہے، مصنف بننا ہے، مدرس بننا ہے، واعظ بننا ہے اس کا دور و نزدیک کوئی واہمہ تک نہ تھا۔ بس پڑھو اور پڑھتے چلے جاؤ، پر عمل تھا بعد میں جب کچھ شعوری طالب علمی کا دور آیا اور مطالعہ کا معیار بلند ہوا، اس میں پختگی آئی تب بھی کبھی یہ خیال نہ آیا کہ تقدیر الہی کبھی ہاتھوں میں قلم بھی تھمائے گی، بلکہ اب جب کہ بہت کچھ لکھنے لگا ہوں تب بھی مطالعہ کی وارفتگی میں تصنیف و تالیف سب بھول جاتا ہوں مطالعہ کے وقت روح پر ایک بے خودی سی طاری ہوتی ہے۔ اور طبیعت اس سے نتائج اخذ کرنے سے بے نیاز ہو جاتی ہے، تالیف و تصنیف کے لئے مجھے الگ سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ بس بکثرت مطالعہ

کا یہ فائدہ ہے کہ مصادر و مآخذ معلوم ہیں، ان کی تلاش و جستجو میں کچھ زیادہ کاوش کرنی نہیں پڑتی، کوئی مضمون مرتب کرنا ہوتا ہے تو اس کے تمام مواد اور متعلقات بیک وقت پیش نظر ہو جاتے ہیں، یہ کثرت مطالعہ ہی کی برکت ہے۔

بہر حال پڑھنا میرا ذوق ہے اور لکھنا مجبوری! جب ضرورت نے مجبور کیا تب لکھا۔ پہلے مجبوریاں کم تھیں اس لئے کم لکھتا تھا، اب مجبوریاں بڑھ گئیں اس لئے زیادہ لکھتا ہوں۔

یہاں تک پرائمری درجات کا دور ختم ہوا۔ میں نے پرائمری درجہ پانچ کا امتحان ۲۲ر اپریل ۱۹۶۲ء کو دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں نمایاں کامیابی عطا فرمائی یہ امتحان ڈسٹرکٹ بورڈ کے ماتحت ہوا کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

دوسرا باب

مکتب کی تعلیم

حافظہ کو میں نے چھیڑا ہے تو اس نے پچھلی تمام یادوں پر سے پردہ ہٹا دیا، اب وہ یادیں مصر ہیں کہ انھیں بھی قید تنہائی سے رہائی ملے، مطالعہ کی ابتدائی داستان جب مجمع عام میں آ گئی اور اس کے ساتھ لگی لپٹی بعض غیر متعلق یادیں بھی صفحہ قرطاس پر آ گئیں، تو اب جو یادیں دماغ کے محافظ خانہ میں باقی رہ گئی ہیں وہی کیوں دبکی پڑی رہیں، ان کا بھی تقاضا ہے کہ الفاظ کا لباس پہن کر تماش بینوں کے سامنے جلوہ گر ہوں۔ دل نے اس تقاضے کو تسلیم کیا اور قلم کو حکم دیا کہ اور کچھ لکھنے سے پہلے اسے لکھو۔ اس داستان میں میرا ماحول ملے گا، بچپن کی بے چارگی و مسکینی ملے گی، مکتب میں اساتذہ کے سامنے بیٹھنے کا ذکر آئے گا، جس زمانے سے گزر کر میں عمر کی اس منزل تک پہونچا ہوں وہ پھر تازہ ہو جائے گا۔

میری پیدائش کی تاریخ والد صاحب کی کسی کاپی میں لکھی ہے، بچپن میں مَیں نے اسے دیکھا تھا تاریخ ہے ۵/فروری ۱۹۵۱ء دن دوشنبہ کا تھا۔ میری بڑی والدہ بتاتی تھیں کہ تم ۲۸/کا دن گزار کر رات میں پیدا ہوئے تھے، جو رات ابتداء سے انتہا تک اندھیری ہوتی ہے چاند ایک لمحہ کیلئے بھی افق پر سر نہیں ابھارتا۔ میں نے بعد میں ۵/فروری کی مطابقت تقویم میں دیکھی تو وہ ۲۸/ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ کی تاریخ پڑتی ہے۔

میری بڑی والدہ کہتی تھیں کہ تم اندھیری رات میں پیدا ہوئے تو عورتوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ چور ہوگا، چوروں کی رات میں پیدا ہوا ہے۔ سنا ہے کہ ۲۹/ویں رات میں چور چوری کرنے نکلتا ہے، اگر اس رات میں وہ کامیاب ہو گیا تو پورا مہینہ اس کے حق میں ''بخیر'' ہوتا ہے۔ بڑی والدہ کو یہ سن کر صدمہ ہوا، انھوں نے اس کا تذکرہ بڑے والد صاحب

سے کیا، وہ ایک ذاکروشاغل بزرگ تھے۔ انھوں نے بے ساختہ فرمایا کہ ٹھیک ہے وہ چور ہوگا ،لیکن کسی چیز کا؟ علم کا! علم بھی رات کے سناٹے اور تنہائی میں حاصل ہوتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو عالم ہوگا۔ یہ بات بچپن ہی میں بڑے والد صاحب مرحوم نے بھی اور بڑی والدہ نے بھی متعدد بار مجھے سنائی۔ اس وقت اس کا ذکر ہوتا جب میرے پڑھنے کی دھن کی کبھی شکایت ہوتی۔ میری عمر غالباً ڈھائی سال کی تھی یا اس سے کچھ زائد رہی ہوگی کہ میری والدہ کا انتقال ہوگیا۔ مجھے ان کی شکل وصورت یاد نہیں ہے، البتہ یہ یاد ہے کہ والد صاحب گھر کی دہلیز میں دروازے کے باہر کی طرف باچشم تر کھڑے تھے، اور میری نانی اندر کی طرف کھڑی رو رہی تھیں، اور میں سراپا حیرت بنا کھڑا تھا اس کے علاوہ کچھ یاد نہیں، جنازہ گھر سے نکلا، نماز جنازہ ہوئی، تدفین ہوئی، اس کا کوئی دھندلا سا نقش بھی ذہن میں نہیں ہے اس وقت سیلاب تھا، قبرستان غرقاب تھی، مسجد قدم رسول کے پاس تدفین ہوئی تھی۔

پھر بچپن کیسا گزرا؟ والد صاحب نے ماں کی شفقت سے نوازا، دو بہنیں مجھ سے بڑی تھیں، بڑی کا نام سعید النساء اور اس سے چھوٹی کا واجد النساء نام تھا۔ مجھ سے چھوٹا ایک بھائی غالباً دس ماہ کا تھا اس کا نام ممتاز احمد تھا۔ اب یاد نہیں کہ وہ کتنے دن زندہ رہا، پھر وہ بھی اماں کے پاس چلا گیا، ماں کا صدمہ یاد نہیں، ہاں ممتاز احمد کا صدمہ خوب یاد ہے، اس کے مرنے کا مجھے بہت رنج ہوا۔ والد صاحب میری بہت دلجوئی کرتے تھے میں ہر وقت ان سے لپٹا رہتا تھا، وہ لیٹتے تو میں انھیں کی چارپائی پر رہتا۔ ان کے جسم پر سوار رہتا وہ اس وقت بہت اچھی اچھی باتیں کرتے، میں پوچھتا کہ ممتاز کہاں گیا؟ وہ بتاتے کہ جنت میں! پھر جنت کے اوصاف وحالات بتاتے، وہاں کی راحت کو وہاں کے آرام کو، وہاں کے میووں، درختوں، نہروں اور باغات کا ذکر کرتے، میں پوچھتا کہ جنت کہاں ہے؟ وہ بتاتے کہ آسمان پر ہے پھر میں غور سے آسمان کو دیکھنے لگتا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس وقت بارہا چشم تصور سے آسمانوں پر جنت کو دیکھا ہے اور اس میں ممتاز کو کھیلتے کودتے اور ہنستے دھوم مچاتے پایا ہے، میں والد سے کہتا کہ میں بھی وہیں جاؤں گا، کہتے جب وقت آئے گا تم بھی پہونچ جاؤ

گے۔ میں وقت کا انتظار کرتے کرتے سوجاتا اور والد صاحب اٹھ کر عشاء کی نماز پڑھنے چلے جاتے، بڑا معصوم ہوتا ہے بچپنا۔

مجھ سے محبت کرنے والے کئی ایک تھے، میری چھوٹی پھوپھی، بالکل ماں کی طرح چاہتی تھی، پھوپھی کی جب شادی ہوگئی اور وہ خیرآباد جا بسی، تو اکثر میں بھی پیچھے پیچھے خیرآباد چلا جاتا، میرے دل میں محبت کا گھاؤ بہت گہرا لگتا ہے، بڑی مشکلوں سے خیرآباد مجھ سے چھڑایا گیا، اب اس کی جگہ بڑی بہن نے لے لی، نانیہال میں نانی اور خالہ نے بہت دلار اور پیار کیا، ان سب کی مہربانیاں دل کی گہرائی میں پیوست ہیں۔ اب یہ سب خدا کے حضور پہونچ گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر مہربانی فرمائے۔ اب صرف والد صاحب کا دم رہ گیا ہے اللہ تعالیٰ ان کے سایۂ رحمت کو باقی رکھے۔(۱)

میرے خاندان میں علم کا کوئی چرچا نہ تھا، بس قرآن شریف ناظرہ اور اردو کی چند کتابیں پڑھ لینا منتہائے کمال تھا، اگر کسی نے بہشتی زیور پڑھ لی تو گویا وہ عالم ہے، فقیہ ہے، دادا کو بہشتی زیور پر عبور تھا، اس لئے مسائل میں مولویوں سے ٹکر لیتے تھے، ناظرہ ان کا خوب رواں تھا۔ قرآن کریم کی تلاوت پابندی سے کرتے تھے حاجی تھے، میاں جی تھے کیوں کہ نکاح پڑھایا کرتے تھے، ذاکر وشاغل تھے، حافظ حامد حسن صاحب کہنڈہ ضلع اعظم گڑھ کے ایک صاحب نسبت بزرگ تھے، ان سے بیعت تھے۔ نماز باجماعت کے بہت پابند تھے، اکثر نمازوں کی امامت بھی کرتے تھے والد صاحب کی تعلیم بھی اتنی ہی تھی، مگر وہ کچھ شاعری بھی کرتے تھے اس لئے پڑھنے لکھنے کا شغل ان کا زیادہ تھا، اس سے زیادہ پورے دادیہال اور نانیہال میں علم کا چرچا نہ تھا۔

یاد نہیں کب مجھے قاعدہ بغدادی شروع کرایا گیا، البتہ اس کا پڑھنا یاد ہے، والد صاحب اور بڑی بہن مجھے پڑھاتی تھی میرے بڑے والد کا لڑکا محمد بلال میرا ہم عمر تھا۔ مجھ

---

(۱) والد صاحب بھی ۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ مطابق ۵/ جون ۲۰۰۸ء (جمعرات) کو آغوشِ رحمت میں پہونچ گئے۔ رحمه الله وغفر له

سے چند ماہ بڑا! ہم دونوں میں باہم تعلق اور انس بہت تھا، اس کو بڑے والد نے مکتب میں بیٹھا دیا۔ مجھے جب معلوم ہوا تو میں بضد ہوگیا کہ مجھے بھی مدرسہ میں بیٹھایا جائے۔ والد صاحب کہیں گئے ہوئے تھے دادا نے کہا کہ تمھارے باپ آئیں گے تو لیجا کر بیٹھا دیں گے، میں رونے لگا دادا کو ترس آیا، وہ حلوائی کی دکان سے بتاشا لائے اور مجھے مکتب میں پہونچا دیا۔ اب ہم دونوں پڑھنے لگے، میرا سبق آگے تھا کیونکہ میں گھر پر کچھ پڑھ کر آیا تھا۔ حافظ عبدالغنی مرحوم استاذ تھے، حافظ صاحب نے کسی کو میرا ساتھی بنادیا وہ پڑھنے میں کمزور تھا۔ دوایک ماہ پڑھا ہوگا کہ میری طبیعت مکتب سے اچاٹ ہوگئی، ساتھی کی وجہ سے سبق کم ہوتا تھا۔ میں نے والد صاحب سے شکایت کی اور اڑ گیا کہ اب مدرسہ نہ جاؤں گا، پھر گھر پر ہی پڑھنے لگا، قاعدہ بغدادی چند روز میں ختم ہوگیا، اور تیسواں پارہ بے ترتیب شروع ہوا، اور اردو کی ابتدائی کتاب بھی شروع کرادی، یہاں تک پہونچنے کے بعد پھر مدرسہ بھیج دیا گیا، وہاں بہت مشکل سے سورۂ قریش تک پہونچا تھا کہ پھر طبیعت ہٹ گئی اور گھر بیٹھ گیا، اب والد صاحب نے اہتمام سے پڑھانا شروع کیا۔ آدھا قرآن شریف گھر پر پڑھ لیا بلکہ غالبًا پورا پڑھا اور اردو کے ابتدائی رسالے بھی ہوگئے، تختی بھی لکھنے لگا، پھر مدرسہ پہونچا دیا گیا۔ اب قرآن شریف رواں ہوگیا تھا کسی کا ساتھی نہیں بنایا گیا بہت جلد قرآن شریف دو تین مرتبہ ختم کرلیا۔ یہ سال اس طرح پورا ہوگیا اگلے سال باقاعدہ درجہ ایک میں نام لکھا گیا۔ ہر لکھی ہوئی چیز کے پڑھنے کا چسکا یہیں سے ہوا۔ میں کبھی مدرسہ میں اور کبھی گھر پر رہا مگر ایک چیز جس میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ محمد بلال کا تعلق تھا، پڑھنے میں اس کی رفتار بہت سست تھی، میں آگے بڑھ گیا اس نے غالبًا دو یا تین درجہ پڑھ کر تعلیم ترک کردی۔ میں جب درجہ دو میں آیا، تو استاذ بدل گئے، اب میں مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم کی درسگاہ میں پہونچا دیا گیا مولوی صاحب بہت نیک، متقی اور یکسو انسان تھے۔ بڑی محنت سے پڑھاتے تھے، بچے ان سے بہت ڈرتے تھے وہ بچوں کا مزاج دینی بنایا کرتے تھے، نماز پڑھنی انھیں نے سکھائی، دو سال ان کی خدمت میں رہ کر درجہ دو اور درجہ تین کی تعلیم پائی۔

مجھے کھیل کود کا ذوق بالکل نہ تھا۔ میرے ساتھی اگر مجبور نہ کرتے تو شاید میں کسی کھیل میں حصہ نہ لیتا۔ لیکن ساتھیوں کو یہ کب گوارا ہوتا کہ ان کا کوئی ساتھی کھیل سے الگ رہے، کئی کھیل میں میری شرکت رہی مگر ہر ایک میں پھسڈی رہا، کبڈی بھی کھیلی، اور ناکام رہا، فٹبال میں بھی شریک ہوا مگر گول کیپری کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکا، کیونکہ میں دوڑتے ہوئے پاؤں سے گیند کو مار نہیں پاتا تھا، گیند کہیں ہوتی اور میرا پاؤں کہیں مارتا، والی بال کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی، رات میں بچے ایک کھیل کھیلتے تھے اس کا نام ''گُرکھیت'' تھا، اس میں بھی شریک ہوا ہوں، لیکن عدم مناسبت کا یہ حال ہے کہ اب اس کی حقیقت تک بھول گیا ہوں، میرے کئی ساتھی چڑیئے کے شکار کے شوقین تھے بعض مچھلی مارتے تھے، کبھی کبھی زبردستی مجھے بھی تالاب پر یا کھیتوں اور باغوں میں لے جاتے، مگر میری برکت ایسی ہوتی، جب جب میں ساتھ گیا شکار سے عموماً محرومی رہی، ایک بار پتنگ اڑانے کی مشق کئی دن تک کرتا رہا، مگر بالکل ناکام رہا، پریتی ہاتھ سے رکھ دی اور پھر کبھی نہیں اٹھائی۔

البتہ ایک کھیل بہت شوق سے کھیلتا رہا اور یہ کھیل ایسا تھا کہ اس میں کوئی میرا ساتھی نہ تھا صرف محمد بلال میرا ساتھ دیتا، یہ کھیل مدتوں چلتا رہا درجہ پانچ پڑھنے تک اس کا سلسلہ جاری رہا، اب سناؤں گا تو پڑھنے والے مسکرائیں گے، مگر ایک زمانے میں وہ کھیل میرے حواس پر مسلط تھا، مکتب کی چھٹی ہوتی تو میں عموماً پڑھنے میں لگا رہتا اور اگر کوئی چیز مجھے اس سے ہٹاتی تھی تو وہ یہی کھیل تھا۔

اب سنئے وہ کھیل کیا تھا؟ میرے بچپن میں گاؤں کی آبادی زیادہ پھیلی ہوئی نہ تھی، بہت سی زمینوں کی احاطہ بندی تو تھی مگر ان میں کوئی عمارت نہیں تھی، بعض بنجر زمینیں ادھر ادھر خالی پڑی تھیں۔ ان احاطوں میں اور خالی زمینوں میں ایک مخصوص طرح کے خاردار پودے بہت زیادہ اگ آتے تھے، اب بھی اگتے ہیں مگر ان کیلئے اب زمین تنگ ہوگئی ہے، یہ پودے کمر تک آتے تھے، ان میں زرد رنگ کے پھول عجب بہار دکھاتے بس ایک تنا ہوتا اس پر بھی کانٹے ہوتے اس کے پتوں پر بھی کانٹے ہوتے ہم لوگ اسے ''بھڑ بھڑوا'' کہتے، اس کا ایک

پوداجہاں اُگ آتا کچھ دنوں کے بعد وہاں کی خالی زمین پورے طور سے بھرجاتی، جب ہوا تیز چلتی تو یہ پودے خوب لہراتے، میرا کھیل انھیں پودوں پر ہوتا، بانس کی ایک پتلی سی چھڑی لیکر میں بھڑبھڑوا سے بھرے ہوئے کسی احاطہ میں چلاجاتا، وہاں مکمل تنہائی ہوتی، کیونکہ ان کانٹوں سے الجھنے کون آتا، میں ایک کنارے کھڑاہوجاتا اور زور سے پکارتا، پڑھو، اگر ہوا چلتی ہوتی اور پودے جھومتے ہوتے تو میں فرض کرلیتا کہ سب پڑھ رہے ہیں، میں اس منظر سے خوش ہوتا۔ شاباشی کے کلمات کہتا، بلال ساتھ میں ہوتا تو اس سے کہتا کہ دیکھو کتنی محنت سے پڑھ رہے ہیں، اور اگر ان کا جھومنا بند ہوجاتا تو میں چھڑی سے انھیں مارنا شروع کردیتا، سب کی گردنیں جھولتی چلی جاتیں اور کہتا جاتا کہ نہیں پڑھوگے تو یہی سزا ملے گی، آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ اس مشغلہ میں گزرجاتا۔ کبھی مارنا کبھی ڈانٹنا، کبھی چمکارنا، کبھی ترغیب دینا، جب واپس آتا تو کہہ کرآتا کہ اچھا فلاں وقت پھر آؤں گا سبق یاد کرکے رکھنا، اگر ذرا بھی غلطی ہوئی تو پھر پٹائی ہوگی۔ یہ مشغلہ مدتوں جاری رہا۔ بھڑبھڑوا کا موسم ختم ہوجاتا اور اس کے پودے سوکھ کر ختم ہوجاتے تو میرے اوپر ایک بے کیفی سی طاری ہوجاتی اور جب وہ ہرے بھرے ہونے لگتے تو مجھ پر پھر وہی نشاط طاری ہوجاتا۔

جس وقت میں نے ہوش وادراک کی آنکھ کھولی، اس وقت مجھے دولت وغربت کا کوئی احساس نہ تھا۔ اپنے گھر میں کھانے کو بافراط مل جاتا تھا، کئی کئی کمروں کا مکان تھا، پہننے کیلئے کپڑے بھی تھے، اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ غربت میں پلا ہوں، لیکن اب جو حالت دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ غربت چاہے نہ رہی ہو لیکن کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور مکان وغیرہ کی ایسی سادگی تھی کہ آج اسے غربت ہی کہا جائے گا۔ اس وقت تو کچھ شعور نہیں تھا لیکن اب دیکھتا ہوں تو مزاج میں سستی اور ناکارگی کچھ عام مقدار سے زاید ہی ہے۔ اس لئے مستقبل میں کچھ بننے کا حوصلہ وخیال شاید نہیں آتا تھا، اور کبھی اس کا خیال آتا بھی تو وسوسہ سے ترقی کرکے عزم نہیں بنتا تھا، کاہل اور نکمی طبیعت ہے، بے حس اور جامد! میں نے شاید اپنے ارادے سے کچھ بننے کی کوشش نہیں کی، فطرت نے مطالعہ کی راہ پر ڈالا میں اس پر

بے تحاشا دوڑا، اس کے بعد زندگی کی جن جن راہوں پر چلا ہوں، اپنے ارادہ سے نہیں خارجی دباؤ اور حالات کے تجاذب نے ان پر مجھے ڈال دیا، اور اب تک اسی طرح چلا جارہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی زندگی دوسروں کیلئے سبق آموز نہیں ہوسکتی، یہ حقیقت میں تو کاہلی اور بے حسی ہے، مگر اب پڑھ لکھ لینے کے بعد اپنے جی کو بہلانے کے لئے اسے قناعت، تفویض و توکل اور رضا بالقضاء وغیرہ خوشنما عنوانات دے لیتا ہوں۔ خیر یہ الگ موضوع ہے، کہنا یہ چاہتا تھا کہ میری زندگی ایک بدوی اور دیہاتی زندگی تھی، معمولی کھانا کھانا، معمولی لباس پہننا، جہاں تہاں پڑا رہنا، البتہ کچھ باتوں کا لحاظ رہتا اور یہ خاندانی اثر تھا، گاؤں دیہات میں بڑوں کی بھی اور بچوں کی بھی زبان عموماً اچھی نہیں ہوتی، تعلیم کی کمی، پڑھے لکھوں کی صحبت سے دوری، اور دوسرے اسباب وعوامل کی وجہ سے دیہاتی طرز کلام جو ہوتا ہے وہ تو خیر ہے ہی۔ زبانوں پر گالیاں بہت چڑھ جاتی ہیں، بات بات پر زبان سے بے تکلف گالیاں ابلتی ہیں میرے خاندان میں گالیاں بکنے والا کوئی فرد نہ تھا، حالانکہ گردوپیش میں ایسے افراد کی کمی نہ تھی، گھر میں دادا اور بڑے والد کا تعلق ایک بزرگ سے تھا، اس کے علاوہ کچھ اوپر سے بھی اچھے حالات تھے، اس لئے اس بلا سے ہمارا خاندان محفوظ تھا، میری یاد میں صرف ایک بار میرے منہ سے گالی کا سب سے ہلکا ایک لفظ نکل گیا تھا، تو میں کئی دن تک شرمسار رہا۔

بزرگوں سے تعلق کی بات آئی تو ایک بات اور یاد آگئی وہ بات میرے لئے بہت خوشگوار ہے گو کہ اب تک اس کا انتظار ہی ہے مگر کہتے ہیں کہ انتظار میں بھی حظ ہے میں بھی منتظر ہوں۔

میرے دادا اور میرے بڑے والد اور خاندان کے بعض اور بزرگوں کا تعلق کھنڈہ کے ایک نقشبندی شیخ حضرت حافظ حامد حسن صاحب سے تھا، ان کے تعلق کی وجہ سے یہ دونوں حضرات ذکروشغل اور وظائف ومراقبہ میں لگے رہتے، مجھے ہوش ہوا تو حافظ صاحب کا وصال ہو چکا تھا ان کے خلیفہ حضرت صوفی عبدالرؤف صاحب مئوی علیہ الرحمۃ ہمارے یہاں آتے تھے، اور بڑے والد ان کے یہاں جایا کرتے تھے، میں نے انھیں بچپن میں کئی

مرتبہ دیکھا ہے۔ ان کے پاس بیٹھا ہوں، عجب نورانی چہرہ تھا، خوبصورت دمکتا ہوا اس پر نہایت حسین وجمیل سفید بڑی بڑی گول داڑھی، میں نے اتنا نورانی چہرہ کم دیکھا ہے، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اندر سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں، بچوں سے بہت پیار کرتے تھے ان سے خوب میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔

ایک بار بڑے والد صاحب کے گھر چھوٹے سے کھٹولے پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے نیچے چٹائی پر ان کے پاؤں سے لگ کر بڑے والد صاحب کے دو بیٹے بیٹھے ہوئے تھے اور ایک کنارے میں بھی دبکا ہوا تھا انھوں نے باری باری ہر ایک کے سر پر دست شفقت رکھا ان کا ہاتھ کیا تھا جیسے دبیز ریشمی مخمل، پوچھا تمھارا کیا نام ہے؟ بتایا محمد بلال، فرمایا بلال موذن، حضرت بلال ؓ حضور ﷺ کے موذن تھے، پھر پوچھا اور تمھارا کیا نام ہے اس نے کہا ابوہریرہ، مسکرانے لگے فرمایا بلی کا باپ! پھر حضرت ابوہریرہ ؓ کا ذکر کیا، اخیر میں میرے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا کہ تمھارا کیا نام ہے، عرض کیا اعجاز احمد، فرمایا تم احمد کے معجزے ہو، ہم لوگوں کو بہت خوشی ہوئی، میں اور بلال کچھ دنوں تک اس کا مذاکرہ کرتے اور خوش ہوتے رہے۔ ابوہریرہ اس وقت بہت چھوٹا تھا اسے شاید یہ بات یاد بھی نہ ہوگی۔

اللہ کا کرنا دیکھئے، حق تعالیٰ نے ان بزرگ کی بات بلال کے حق میں سن لی، بلوغ کے پہلے سے بلال نے مسجد میں اذان دینی شروع کی اور آج تک وہ اذان دے رہا ہے، نہایت مستعدی سے بلا ناغہ پابندی وقت کے ساتھ۔

ابوہریرہ کو اللہ تعالیٰ نے نہایت اچھی دینی صلاحیت سے نوازا، بہت متقی پابند نماز، صاحب اوقات، دینی معلومات بھی خوب ہیں نہایت متواضع اور خدمت گزار!

تیسرا آدمی منتظر ہے کہ اس کے حق میں بھی ان بزرگ کا قول مقبول ہو، بظاہر تو آثار نہیں نظر آتے باقی اللہ کیلئے کچھ مشکل نہیں۔

ہاں بچپن کی ایک اور عجیب بات ذکر کروں، گھر میں دینداری کا چرچا تو بحمد اللہ تھا ہی، دینی کتابوں کا مطالعہ بھی خوب ہوتا رہتا، ممتاز احمد کے انتقال کے بعد والد صاحب کی گفتگو

سے یہ بات ذہن میں خوب پختہ ہوگئی تھی کہ جب کوئی بچہ مرجاتا ہے تو وہ سیدھا بے کھٹکے جنت میں جاتا ہے اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، اور بالغ ہونے کے بعد طرح طرح کے گناہوں میں گھر جاتا ہے، تو جنت میں اس کا ابتدائی داخلہ مشتبہ ہوجاتا ہے، اس بات نے دل میں اشتیاق پیدا کیا کہ بچپن مین ہی موت واقع ہوجائے اس کیلئے دعائیں کیا کرتا، جب بیمار ہوتا تو خوش ہوتا کہ شاید اسی میں مرجاؤں، اور سیدھا جنت میں پہونچ جاؤں، بیماری میں جنت کا تصور خوب رہتا، بار بار بیمار پڑنے اور دعائیں کرنے کے بعد بھی جب موت نہیں آئی تو سوچا کہ کسی خاص وقت میں دعا کرنی چاہئے۔ شب برأت آئی، استاذ محترم مولانا عبدالستار صاحب نے تقریر میں اس کی فضیلت بیان کی کہ اس رات میں دعائیں قبول ہوتی ہیں، مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی کتاب ’’پردہ کی باتیں‘‘ میں بھی شب برأت کی برکت پڑھی تھی، مغرب کے بعد میں نے اپنے بھائی **محمد بلال** سے اس کا ذکر کیا کہ آج چلو مرنے کی دعا کریں کہ نابالغی ہی میں ہم لوگ مرجائیں، بالغ ہونے کے بعد نہ جانے کس مصیبت میں پڑیں، بلال نے میری تجویز پر صاد کی، ہم دونوں بانس کی سیڑھی سے کوٹھے پر چڑھ گئے اور سیڑھی کھینچ لی کہ کوئی دوسرا نہ آجائے اور ہماری دعا میں خلل پڑجائے، کیونکہ عزم تھا کہ آج اس دعا کو قبول کرواہی لینا ہے۔

پہلے دو رکعت نماز پڑھی گئی اس کے بعد دعا کے تمام آداب برتے گئے اپنی زبان میں اللہ کی خوب تعریف کی، دہرا دہرا کر خوب درود شریف پڑھا، پھر خوب گریہ وزاری کے ساتھ دعا شروع کی..... واقعی ہم دونوں آنسووں سے رو رہے تھے..... بڑی دیر تک، کس بات کی؟ نابالغی میں مرنے کی! پھر یقین تھا کہ ہم دونوں جلد ہی مرجائیں گے اس وقت ڈر کی وجہ سے کسی کو اس دعا کے بارے میں بتایا نہیں تھا، مگر اب تک دونوں جی رہے ہیں اور مصائب میں مبتلا ہو رہے ہیں نہ جانے کیا ہو! اللہ تعالیٰ درگزر کا معاملہ فرمائیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ مجھے کھیل سے دلچسپی نہیں تھی اپنے ساتھیوں میں مبتلا ہوکر کھیل میں شریک ہوا ہوں، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں کوئی موقع پاکر اپنی پڑھی ہوئی معلومات

کوساتھیوں کے سامنے دہرانے لگتا، اس وقت سب کھیل کو دبھول کر باتوں کے سننے میں لگ جاتے، میں بھی باتوں میں باتیں نکالتا جاتا، بعد میں یہ طریقہ میں نے مستقلاً اختیار کرلیا تھا کہ جو کچھ پڑھتا تھا سے اپنے دوستوں کے درمیان دہرا کر یاد کرلیا کرتا تھا، اس سے مجھے بہت نفع پہونچا ہے۔

بچپن ہی سے میرے دل میں علماء اور بزرگوں کی قدر ومنزلت ہے، گاؤں میں اس وقت مولوی کم تھے، بعض علماء باہر سے کبھی کبھی تشریف لاتے تو میں برابر ان کے ساتھ رہتا، ان کی باتیں سنتا۔ مبارکپور سے مولانا عبدالباری صاحب مرحوم اور مولانا عبدالستار صاحب مرحوم زیادہ تشریف لاتے، کبھی مولانا محمد عثمان صاحب ساحر مرحوم اور مولانا بشیرالدین مرحوم بھی آتے تھے۔ مئو سے مولانا قاری ریاست علی صاحب علیہ الرحمہ بھی تشریف لاتے، یہ حضرات جب آجاتے تو میں تھوڑی دیر کیلئے بھی ان سے جدا ہونا گوارا نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ مولانا ابوالقاسم صاحب شاہجہاں پوری مرحوم کو دعوت دی گئی، وہ تشریف لائے اور دو دن تک ان کا قیام رہا، میں ان دودنوں میں کھانے پینے سے بے پروا ہوکر انھیں کے ساتھ لگا رہا، گرمی کا موسم تھا، باوجود بہت چھوٹا ہونے کے ان کے پیچھے کھڑا ہوکر پنکھا جھلتا تھا، میں اکثر ان بزرگوں اور علماء کے قریب رہنے کی کوشش کرتا مگر پیچھے رہتا، سامنے کم آتا تھا، کچھ اس میں میری مجوبانہ طبیعت کا بھی دخل تھا، اور کچھ ایک عجیب وغریب خیال تھا اس وقت کے لحاظ سے اسے عجیب ہی کہا جائے گا جبکہ میں اپنی عمر کی پہلی دہائی میں تھا، چونکہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت، صحابہ کے حالات اور بزرگوں کی زندگیاں اپنی استعداد بھر پڑھ چکا تھا، اور ان علماء کے پاس بیٹھ بیٹھ کر بہت کچھ سن چکا تھا اس لئے میرے طبیعت میں یہ بات راسخ تھی کہ بزرگوں کو کشف ہوتا ہے، یہ بہت سی باتیں بے بتائے بھی جان جاتے ہیں، تو میں ڈرتا رہتا تھا کہ کہیں یہ لوگ میری وہ غلطیاں اور میرے وہ معائب جان نہ لیں اور ان پر ٹوک نہ دیں جنھیں اپنی دانست میں صرف میں جانتا تھا اور انھیں چھپانے کی حتی الامکان ہر کوشش کرتا تھا، اگرچہ ایسا تجربہ کبھی ہوا نہیں، مگر ڈر ہمیشہ غالب رہتا تھا اسی لئے سامنے آنے سے گھبراتا۔ اور

دل ہی دل میں اللہ سے دعا کرتا رہتا تھا کہ بارالٰہا! میرے عیبوں کو چھپائے رکھئے۔

ولید پور کے مولانا شکر اللہ صاحب مرحوم بہت کثرت سے آتے تھے اور بہت اچھی اور علمی باتیں کرتے تھے، ان کی ظرافت میں بھی علم ہوتا تھا، مجھے جیسے ہی معلوم ہوتا کہ وہ آئے ہیں زیادہ تر وہ میرے استاذ مولانا عبدالستار صاحب مدظلہ کے گھر آتے تھے، میں فوراً پہونچتا تھا، وہ چونکہ خیرآباد میں مدرس تھے، اس لئے ان کا آنا عموماً جمعرات کو دوپہر میں یا جمعہ کے دن ہوتا، اس وقت ہمارا مکتب بھی بند ہوتا اس لئے موقع خوب ملتا تھا۔

میری کثرت حاضری کی وجہ سے ان بزرگوں نے مجھے پہچان لیا تھا، مجھے یاد تو نہیں ہے لیکن کئی حضرات نے گاؤں کے دوسرے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون لڑکا ہے، جو ہر وقت یہیں ڈٹا رہتا ہے، میرے استاد حافظ احمد کریم صاحب مرحوم بتاتے کہ اس لڑکے میں بوڑھی ہڈی ہے، زیادہ تر بوڑھوں ہی کی مجلس میں رہتا ہے۔ حضرت مولانا قاری ریاست علی صاحب علیہ الرحمہ نے کئی مرتبہ مجھے بوڑھی ہڈی والا کہہ کر پکارا۔

میں گھر کے کاموں کے سلسلے میں کام چور مشہور تھا، میں پڑھتا ہوتا اور میری بہنیں کسی کام کی فرمائش کرتیں، میں ٹال جاتا، وہ خوب خفا ہوتیں اور اگر کوئی عالم باہر کا آجاتا تو کہتیں کہ اب اس کا گھر میں پتہ نہیں رہے گا، فلاں مولانا صاحب آگئے اب یہ وہیں پڑا رہے گا، بس کھانے کا وقت ہوتا تو میں گھر بھاگ آتا۔

مجھے اسی زمانے میں بہت سے علماء کے نام اور ان کے اجمالی حالات معلوم ہوگئے تھے، میں درجہ پرائمری پانچ میں تھا کہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور سے جلسہ کا اشتہار آیا۔ اس میں پہلا نام مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی علیہ الرحمہ کا تھا، مجاہد ملت سے ان کی تقریروں سے، ان کے زور بیان سے میں واقف ہو چکا تھا، میں نے والد صاحب سے اصرار کیا کہ میں مبارک پور جلسے میں جاؤں گا، انھوں نے ازراہ شفقت انکار نہیں کیا بلکہ خود اپنے ساتھ لے کر مبارک پور گئے، مبارک پور ہمارے گاؤں سے نو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت سواریاں بہت کم تھیں، زیادہ لوگ پیدل یا سائیکل سے یہ راستہ طے کرتے

تھے، والد صاحب کے پاس سائیکل نہ تھی وہ پیدل ہی لے کر مجھے چلے میرے دل میں مجاہد ملت کو دیکھنے اوران کی تقریر سننے کا ایسا شوق سمایا ہوا تھا کہ نو کیلومیٹر کی یہ مسافت ذرا بھی نہیں محسوس ہوئی، اچھلتا کودتا مبارک پور پہونچ گیا، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ مجاہد ملت تشریف نہیں لائیں گے وہ بیمار ہوکر امریکہ بسلسلہ علاج تشریف لے گئے، اس خبر سے ایسی افسردگی طاری ہوئی کہ پھر جلسہ میں جانے کا جی نہیں چاہا، حالانکہ اس وقت کے زبردست خطیب وواعظ مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہاں پوری اس میں تشریف فرما تھے، ان کی تقریروں کی دھوم مچی ہوئی تھی، اوراس میں شبہ نہیں کہ وہ بے مثال خطیب تھے، نہایت شیریں بیان تھے، جلسہ میں میں بیٹھا ضرور! مگر دل پر جو افسردگی چھائی تھی اس نے مولانا ابوالوفا صاحب کی تقریر کو بے مزہ بنادیا ا،س کے بعد مولانا ابوالوفا صاحب مدتوں رہے، ان کے جلسوں حاضری کی سعادت بھی ملتی رہی، مگران کی تقریر جو روز اول پھیکی ہوگئی ہمیشہ پھیکی ہی رہی، کبھی ان کی تقریریں اول سے آخر تک نہیں سن سکا۔

☆☆☆☆☆

تیسرا باب

درجہ فارسی اور عربی کے ڈیڑھ سال

جیسا کہ میں نے اوپر کہیں عرض کیا ہے کہ میں درجہ پانچ پرائمری میں نمایاں طور پر کامیاب ہوا تھا۔ ماسٹر شفیع احمد صاحب مجھے مانتے بھی تھے، امتحان کے بعد لڑکوں کے سامنے تین راستے ہوتے تھے، ایک دو طالب علم فارسی پڑھنے لگتے، اور شوال آنے پر کسی عربی مدرسہ میں داخلہ لے لیتے اس وقت ایسے لڑکے بہت کم ہوتے کچھ انگریزی کی تیاری کرکے ولید پور یا محمد آباد کے انگریزی اسکولوں میں درجہ چھ میں داخلہ کرا لیتے، امتحان اپریل میں ہوتا، اور داخلہ جولائی میں۔ دو مہینوں میں ماسٹر صاحب ایسے لڑکوں کو انگریزی کی اتنی تیاری کرا دیتے کہ وہ درجہ چھ میں داخلہ کے لائق ہو جاتے، اور زیادہ تر لڑکے تعلیم موقوف کرکے اپنے گھر کے کام میں لگ جاتے۔

امتحان میں کامیابی کے بعد ماسٹر صاحب نے میرے سامنے ہی والد صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا بہت تیز ہے، اسے انگریزی تعلیم دلوایئے، آگے چل کر یہ بہت اچھا ثابت ہوگا، والد صاحب نے قبول کرلیا، اس وقت مکتب میں درجہ پانچ تک انگریزی کی کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی تھی، جبکہ اسکول میں داخلہ کیلئے انگریزی شرط تھی۔ والد صاحب نے ماسٹر صاحب کے حسب ہدایت کوئی انگزیزی ریڈر انگریزی لکھنے کی کاپی اور اس کا مخصوص قلم خرید کر مجھے دیدیا، اور میں اس ساز وسامان کو لیکر ماسٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگیا وہ نہایت دلسوزی اور شفقت سے مجھے پڑھانے لگے، کئی دن پڑھتے گزر گئے تھے کہ ایک روز میں اپنے ایک ساتھی کے گھر پہونچا وہ پچھلے سال پانچ پاس کرکے انگریزی اسکول میں

پڑھنے لگا تھا۔ میں جب اس کے پاس پہونچا تو وہ برش سے ایک گائے کی تصویر بنا رہا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو، کہنے لگا کہ پکچر بنا رہا ہوں، میں نے پوچھا کہ کیا یہ تصویر بنانی پڑتی ہے اس نے کہا کہ اسکول میں تو یہ ضروری ہے میں نے اس سے کہا کہ تصویر بنانی تو حرام ہے، دوزخ کے کھٹکا میں حدیث ہے کہ جو کوئی جاندار کی تصویر بنائے گا، اسے قیامت کے دن مجبور کیا جائے گا کہ اس میں روح ڈالے، حضور ﷺ نے تو اس سے منع کیا ہے۔ یہ دیکھ اور کہہ کر میں گھر آیا اور والد صاحب سے ساری صورت حال بتائی، اور میں نے انگریزی پڑھنے سے صاف انکار کر دیا، والد صاحب میری بہت دلداری کرتے تھے، انھوں نے خوشی ظاہر کی اور رات کو مغرب کے بعد حافظ احمد کریم صاحب مرحوم کے گھر جب سب لوگ جمع ہوئے میں بھی وہاں حاضر تھا، والد صاحب نے مولانا عبدالستار صاحب سے ساری بات کہی، مولانا بہت خوش ہوئے انھوں نے فرمایا کہ آمدنامہ اور فارسی کی پہلی دے کر اسے کل میرے گھر بھیج دو، میں اسے پڑھادوں گا، مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی، مولانا عبدالستار صاحب بہت ذی استعداد عالم تھے، عرصہ تک انھوں نے مدرسہ میں پڑھایا تھا، عربی کی کتابیں بھی وہ خوب پڑھا چکے تھے میرے والد صاحب نے ان سے پڑھا تھا مگر میں نے جب سے ہوش سنبھالا، انھیں پڑھاتے ہوئے کبھی نہیں پایا ان کے پڑھانے کا شہرہ عام تھا، مگر تدریس موقوف ہو چکی تھی وہ اس وقت مدرسہ کے ناظم تھے بچے سب سے زیادہ انھیں سے ڈرتے تھے، جن بچوں کو فارسی پڑھنی ہوتی تھی انھیں مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم پڑھاتے تھے، اب جو خلاف توقع مولانا عبدالستار صاحب نے فرمایا کہ میں پڑھاؤں گا تو بہت خوشی ہوئی۔

دوسرے روز میں فارسی کی پہلی اور آمدنامہ لیکر مولانا کے گھر پہونچا، مولانا نے دونوں کتابیں شروع کرادیں۔ مولانا کے پڑھانے کا انداز بہت اچھا تھا۔ ایک ماہ میں آمدنامہ پوری ہوگئی۔ اور اسکے کچھ دنوں کے بعد فارسی کی پہلی بھی پوری ہوگئی میرا وہ ساتھی جسے میں نے تصویر بناتے ہوئے دیکھا تھا اس نے بھی اسکول کی تعلیم ترک کر دی اور فارسی اس نے مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم سے پڑھی، کچھ مہینوں کے بعد وہ میرے ہی ساتھ پڑھنے لگا

وہ زیادہ نیک تھا، وہ اس وقت پنج وقتہ نماز کا پابند تھا، میری نمازوں میں ناغہ ہوتا رہتا تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد اس نے یہ تعلیم بھی ترک کردی۔

مولانا کے گھر میری تعلیم کا طریقہ بھی کچھ نادر ہی تھا، میں مدرسہ کے وقت تک ان کے گھر پہونچ جاتا تھا، ان کے دو مکان تھے ایک رہائشی مکان تھا، اور ایک احاطہ کہلاتا تھا، احاطے میں بھی چند کمرے بنے ہوئے تھے اس میں مولانا کے بہت بوڑھے اور بزرگ والد حاجی عبدالغفور صاحب رہتے تھے، حاجی صاحب باوجود بڑھاپے کے شدت کے نماز باجماعت کے پابند تھے، سب سے پہلے مسجد پہونچتے تھے مزاج میں قدرے تندی تھی، حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے غالبًا شاگرد تھے، اور ان سے بیعت بھی تھے، ہم بچے ان سے بہت ڈرتے تھے جب وہ مسجد پہونچ جاتے تو جو بچے نماز نہ پڑھتے، ادھر سے گزرتے بھی نہ تھے، میرے لئے ایک بڑا مجاہدہ ان کا سامنا کرنا تھا، حالانکہ انھوں نے مجھے کبھی نہ ڈانٹا، نہ جھڑکا، مگر رعب ہمہ وقت چھایا رہتا، مولانا اس وقت ناشتہ کرکے کرگہہ میں کپڑا بننے کیلئے بیٹھ جایا کرتے تھے، مجھے حکم تھا کہ آؤں تو جاکر ان کو اپنی صورت دکھادوں، سلام کرلوں، اور پھر احاطہ میں آکر رہوں وہ جب مناسب سمجھیں گے آکر پڑھادیں گے، کرگہہ میں بنتے ہوئے انھوں نے کبھی نہیں پڑھایا میں یہی کرتا، ان کو سلام کرکے احاطہ میں بیٹھ کر سبق یاد کرتا سبق یاد ہوجاتا، تو میں طاق پر رکھی ہوئی کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا۔ اس گھر میں چار طاق تھے، چاروں پر مختلف چھوٹی بڑی کتابیں دینی رسائل، اور بعض اخبارات رکھے ہوئے تھے میں مولانا کے آنے تک انھیں میں مشغول رہتا، اطلاع کے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد مولانا تشریف لاتے، میری ایک نگاہ ہمیشہ دروازے کی طرف لگی رہتی، جیسے ہی مولانا کی آہٹ محسوس ہوتی میں خارجی کتابیں بند کرکے طاق پر رکھ دیتا، اور درسی کتابیں پڑھنے لگتا، ڈرتا تھا کہ دیکھ لیں گے تو خفا ہونگے، بیٹھتے ہی سبق سنتے پھر سبق پڑھاتے، دونوں سبق کے سننے اور پڑھانے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت نہ لگتا۔ پڑھا کر وہ چلے جاتے میں تھوڑی دیر پڑھتے ہوئے سبق کو دہراتا اور پھر خارجی کتابوں میں منہمک ہوجاتا اس دوران میں نے چند

رسالے اور کچھ کتابیں خوب پڑھیں جن کے تأثرات اب تک میری زندگی، اور میرے ذہن میں موجود ہیں مولانا کے صاحبزادے مولانا عزیزالرحمٰن صاحب جو ابھی حال میں دیوبند سے فارغ ہوئے تھے، اور اس وقت جہانا گنج میں مدرس تھے انھیں امتحان کے انعام میں سوانح قاسمی ملی تھی، یہ اس کی دوسری جلد تھی، پہلی جلد وہاں نہ تھی، اسی دوسری جلد کو میں پڑھتا رہتا اتنی دلچسپ تھی کہ ختم ہوتی تو دوبارہ شروع کر دیتا، میرا خیال ہے کہ ڈیڑھ سال کے عرصہ میں میں نے اسے دس مرتبہ پڑھا تھا، اس کے مضامین مجھے سب یاد ہو گئے تھے۔

مولانا کے طاق پر ترجمہ شیخ الہند مع فوائد عثمانی بھی تھا، میں اسے بھی پڑھتا رہتا، ترجمہ پورا پڑھنے کی توفیق تو نہ ہوتی، اس لئے کہ ترجمہ کی زبان سے میں مانوس نہ تھا، لیکن تفسیر عثمانی بہت پڑھتا تھا، ان دونوں کا اثر میرے دل پر غیر معمولی ہوا۔

اس زمانے میں کانپور سے ماہنامہ نظام نکلا کرتا تھا، اس کے خریدار والد صاحب بھی تھے اور مولانا بھی، اس کے بہت سے شمارے وہاں تھے، حالانکہ جب وہ آتا تھا اسی وقت میں پڑھ لیا کرتا تھا لیکن جب یہاں زیادہ مقدار میں دیکھا تو انھیں بھی پڑھا کرتا، اس میں ایک سلسلہ مضمون قسط وار مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری صدر المدرسین مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کا ''اسبال ازار'' کے موضوع پر شائع ہو رہا تھا، کہ ٹخنے سے نیچے لنگی یا پاجامہ لٹکانا جائز نہیں ہے۔ یہ مضمون کئی قسطوں میں نکلا میں سب پڑھ چکا تھا، ایک دن دادا مرحوم نے کسی کی لنگی ٹخنے سے نیچے دیکھی تو اس پر خفا ہونے لگے، میں نے ان سے مضمون کا تذکرہ کر دیا، انھوں نے کہا مجھے پڑھ کر سناؤ، میں نے بالاستیعاب اسے پڑھا، وہ بہت خوش ہوئے متأثر ہوئے اور مجھے تاکید کی کہ دیکھو لنگی کبھی ٹخنوں سے نیچے تک نہ جائے، یہ بات میرے دل میں اس طرح جمی کہ کبھی بھول سے بھی لنگی یا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے نہیں جاتا اگر کبھی جلدی میں سوتے وقت ایسا ہو جاتا ہے تو طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔

نظام میں حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی مدظلہ (۱) کے فتاوی شائع ہوا

---

(۱) حضرت مفتی صاحب کا ۱۷؍ ربیع الآخر ۱۴۱۷ھ مطابق ۳؍ ستمبر ۱۹۹۶ء کو افریقہ میں انتقال ہو گیا۔

کرتے تھے انھیں بہت شوق سے پڑھا کرتا تھا، نظام نے دو خاص نمبر بھی بہت وقیع شائع کئے تھے۔ ایک تصوف نمبر اور دوسرا قرآن نمبر تصوف نمبر پہلے شائع ہوا تھا اس کا میں نے بار بار مطالعہ کیا، طبیعت نے اس کا بہت گہرا اثر قبول کیا تھا۔

اس وقت مرادآباد سے حرمین نامی ایک ماہنامہ نکلتا تھا، اس کی جلدیں بھی مولانا کے یہاں تھیں، اس کا معیار زیادہ اچھا نہ تھا مگر مجھے تو پڑھنے کی دھن تھی جو ملتا، پڑھتا چلا جاتا۔ میرٹھ سے قاضی زین العابدین سجاد میرٹھیؒ ایک رسالہ ''الحرم'' نکالتے تھے، اس کے بھی کچھ شمارے مل گئے تھے، یہی چاروں اس وقت کی کائنات تھی، اور میں انھیں میں مسلسل ڈیڑھ سال تک گم رہا۔

آمدنامہ ختم ہوا، فارسی کی پہلی مکمل ہوئی ایک پرانی کتاب صرف فارسی میرے گھر پر تھی اس میں صرفی قواعد لکھے تھے۔ مولانا نے اسے بھی پڑھایا، اس کے بعد مولانا نے گلستاں شروع کرادی۔ اس کا دیباچہ بہت دشوار ہے، مگر مولانا کی عمدگی تعلیم نے اسے دشوار نہیں محسوس ہونے دیا بہت جلد قابو مل گیا، چند دنوں کے بعد بوستاں شروع کرادی، طریقہ وہی تھا جو پہلے میں ذکر کرچکا ہوں اس دوران کبھی کبھی مولانا عزیز الرحمٰن صاحب سے بھی دوایک سبق پڑھے گلستاں کے غالباً دو یا تین باب ہوئے تھے کہ گاؤں کے مکتب میں ایک نئے فارغ التحصیل عالم مولوی ممتاز احمد صاحب مدرس ہوکر آگئے، یہ رشتے میں مولانا کے بھتیجے لگتے تھے مجھ سے مولانا نے فرمایا کہ میرے پاس وقت کم رہتا ہے بوستاں تو تم مجھ سے پڑھو اور گلستاں مدرسہ میں جاکر مولوی ممتاز احمد صاحب سے پڑھ لیا کرو۔ مجھ پر یہ حکم گراں گزرا، مجھے یہ بھی ڈر ہوا کہ کہیں مجھے مدرسہ میں باقاعدہ بیٹھنے کا حکم نہ دے دیں، مگر انھوں نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ میں مدرسہ میں جاتا، مولوی صاحب سے گلستاں کا سبق پڑھتا اور پھر مولانا کے گھر واپس آجاتا، اور معمول کے مطابق رہتا مولوی صاحب نے سات باب تک کتاب پڑھائی، آٹھواں باب نہ جانے کیوں نہیں پڑھ سکا، مولانا نے حکم دیا کہ مالا بدمنہ بھی انہیں سے پڑھ لو، چنانچہ وہ بھی پڑھ لی یہ کتاب پوری پڑھی، بوستاں مولانا نے چار باب

پڑھا کر موقوف کردیا اور فرمایا کہ اب عربی شروع کرو، میرا اندازہ ہے کہ یہ ساری کتابیں سات آٹھ ماہ میں ہوئی تھیں، وہ بھی اس طرح کہ مولانا کی مصروفیات کی وجہ سے ناغہ بہت ہوتا تھا۔ ویسے میری حاضری میں کبھی فرق نہیں آتا، میں دونوں وقت پابندی سے حاضر ہوتا۔

میزان شروع کرائی، عام طور سے دستور ہے کہ کتاب پوری زبانی یاد کرائی جاتی ہے لیکن مولانا نے مجھے اس کا پابند نہیں کیا، میں قواعد کو اپنے لفظوں میں محفوظ کرلیتا، ان کی مشق کرلیتا، انھیں مولانا کو سنادیتا مولانا کچھ سوالات کرلیتے انھیں اطمینان ہوجاتا، تو آگے سبق پڑھادیتے۔ مجھے ساری میزان میں گردان یاد کرنے میں بہت دشواری ہوئی فعل ماضی کے چودہ صیغے مولانا کا حکم تھا کہ ایک سانس میں پانچ مرتبہ دہرانے کے بقدر یاد کرو، مجھے رٹنے سے فطری طور پر بُعد ہے، بہت محنت سے رٹتا تھا مگر ایک سانس میں پانچ مرتبہ تو کیا پانچ سانس میں ایک مرتبہ بھی پورا نہیں کرپاتا تھا، پورے تعلیم کے دوران مولانا نے اس پر مجھے بہت لتاڑا ہے، ایک ہفتہ میں کسی طرح ماضی کی گردان یاد ہوئی، اس وقت میرے اوپر مایوسی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی میں بار بار سوچتا تھا کہ میں پڑھ نہیں سکوں گا، خود مولانا کا حال یہ تھا کہ وہ گردانتے تھے تو نہ کہیں اٹکتے تھے، نہ بھٹکتے تھے، بس ایک روانی سی رہتی تھی، بہرحال ایک ہفتہ کے بعد تعلیم کی گاڑی حسب معمول لائن پر آگئی، پھر میزان بہت جلد ختم ہوگئی، منشعب شروع ہوئی، اس کے ساتھ نحو میر کا بھی آغاز ہوا، نحو میر بھی رٹتا نہیں تھا، بس قواعد اور ان کی مثالیں ذہن نشین کرلیتا، اور انھیں سنادیتا، منشعب ختم ہونے کے بعد پنج گنج پڑھی، نحو میر ختم ہوتے ہوتے رمضان کا مہینہ آگیا، اور مولانا نے اسباق موقوف کردیئے، صرف میں تو عربی اول کے معیار کے مطابق درک حاصل ہوگیا، مگر نحو میر میں کمزوری رہ گئی، شعبان شروع ہونے والا تھا کہ مولانا نے فرمایا کہ عربی ادب کی کوئی کتاب پڑھ لینی چاہئے، پھر انھوں نے اپنے پاس سے ایک کتاب نکالی، جس کی زیارت نہ اس سے پہلے کبھی ہوئی اور نہ اس کے بعد کبھی ہوئی، اس کا نام تھا ''**التھجی والمطالعہ**'' ہلکی پھلکی کتاب تھی، مگر اس کا معیار **دروس الادب** کے دونوں حصوں سے بلند تھا، اس کی معتد بہ مقدار انھوں نے

پندرہ بیس دن میں پڑھا دی، بس میری تعلیم کی کل کائنات یہی تھی، **شرح مأۃ عامل** کا نام بھی اس وقت کان میں نہیں پڑا تھا، کبھی کسی کتاب میں اس کا نام ضرور آیا تھا، مگر میں نے اس کا تلفظ غلط کیا تھا۔ شرح مات عامل، اس لئے میں نے کہا کہ اس کا نام تک نہ سنا تھا۔

جن دنوں میں گلستاں، بوستاں پڑھ رہا تھا ایک نیا شوق میرے اندر پیدا ہوا، یہ شوق پہلوانی کا تھا۔

میرے ایک ماموں کشتی لڑاتے تھے، ان کا اکھاڑہ تھا، اب مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے ترغیب دی، یا از خود میں نے اپنی جسم کی کمزوری کو دور کرنے کیلئے اکھاڑے میں آنا جانا شروع کر دیا، ماموں نے کسرت کرنے کا طریقہ سکھایا، کشتی کے ہاتھ بتائے، حیرت انگیز طور پر میری طاقت میں اضافہ ہونے لگا، داؤ پیچ بھی خاصے معلوم ہو گئے ایک اہیر کا لڑکا جو تن و توش میں مجھ سے ڈیڑھ گنا تھا ماموں نے اس کو میری جوڑی قرار دیا، ہم دونوں میں زور آمائی ہوتی تھی، میں اپنے داؤ پیچ سے اسے پچھاڑ دیتا تھا، اور اس سے چوک جاتا تو اپنی طاقت سے وہ مجھے دبا لیتا یہ سلسلہ کم وبیش دو یا تین ماہ چلا کشتی سے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی، پہلوان بننے کا خواب تو کیا دیکھتا، مگر طاقت کے بڑھنے سے خوشی ہوئی تھی، یہ اکھاڑہ صرف شام کو بعد نماز مغرب جمتا تھا۔

ایک دن صبح غسل کئے بغیر میں مولانا کے یہاں پڑھنے چلا گیا میری گردن پر پہلوانی کی مٹی لگی ہوئی تھی، ہمارے گاؤں کے مشہور طبیب جو دیوبند کے فاضل بھی تھے اور استاذ محترم سے ان کی گہری دوستی تھی، عموماً دونوں ایک دوسرے کے یہاں آیا جایا کرتے تھے روزانہ دونوں کی ملاقات ہونی ضروری تھی، سردی کے ایام تھے، پوال بچھی ہوئی تھی اس کے گوشے میں بیٹھا میں سبق یاد کر رہا تھا، اتنے میں مولانا اور حکیم بشیر الدین صاحب مرحوم باتیں کرتے ہوئے داخل ہوئے، انھوں نے میری گردن پر مٹی لگی ہوئی دیکھی تو پوچھا کہ کشتی لڑتے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں، مجھ سے تو انھوں نے کچھ نہیں کہا، دونوں بزرگ دوسری طرف بیٹھ کر پہلوانی ہی کے موضوع پر باتیں کرنے لگے، حکیم صاحب کہہ رہے تھے

کہ دنیا میں سب سے غبی پہلوان ہوتا ہے، اوراس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی گردن پر اتنے ہاتھ پڑے ہوتے ہیں، اوراس پر مٹی لگا کر اتنا رگڑا جاتا ہے کہ وہ تمام اعصابی ریشے جو سارے بدن کو دماغ سے جوڑتے ہیں بے حس اورمردہ ہوجاتے ہیں، اس کی وجہ سے بڑی غباوت ان میں پیدا ہوجاتی ہے، میں یہ گفتگو سن رہا تھا اوراسی وقت دل میں عہد کر رہا تھا کہ بس پہلوانی بس، اب اکھاڑے میں نہیں جانا، جسم کی کمزوری گوارا، مگر غباوت برداشت نہیں! چنانچہ پھر کبھی رخ نہیں کیا، حالانکہ ماموں کو توقعات تھیں، انھوں نے کئی مرتبہ کہا بھی! اہیر کے اس لڑکے نے بھی بار بار کہا، جس کو میری جوڑ کا بنایا گیا تھا مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا، اوراب دیکھتا ہوں تو ماموں کی پہلوانی کو بڑھاپے نے دبالیا ہے، اوراہیر کا لڑکا تو بس ہڈیوں کا ایک پنجر ہے جس پر کھال چپکی ہوئی ہے، ہاں اس کی بیوی اس کا نعم البدل ہے، اس سے موٹی، اس سے لمبی، دونوں اکثر ساتھ ہی رہتے ہیں، بیوی آگے، شوہر پیچھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گائے کے پیچھے مریل بچھڑا اچل رہا ہو، مجھے دیکھتا ہے تو سلام کرتا ہے میں پوچھتا ہوں کہ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے، تو ایک مردہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آتی ہے، اوروہ بھی ناتمام! انقلاب ہیں زمانے کے۔

تعلیم کے اس وقفہ میں جلسوں اورمشاعروں کا مجھے شوق ہوگیا تھا، جلسے بکثرت ہوا کرتے تھے، خود بھیرا میں اس کے علاوہ ولید پور میں، خیرآباد میں، مبارک پور میں، کم کوئی جلسہ مجھ سے چھوٹتا تھا۔ کبھی علمائے دیوبند کے جلسے ہوتے تو کبھی علمائے بریلی کے، میں دونوں میں یکساں پابندی سے جاتا۔ والد صاحب کی طرف سے بریلی کے جلسے میں جانے کی پابندی تھی، مگر میں چوری چھپے چلا جاتا تھا، انھیں معلوم ہوجاتا مگر نظر انداز کردیتے، ایک مرتبہ خیرآباد میں بریلویوں کا جلسہ تھا، اس میں ایک نیا نام دیکھا کمیل اشرف کچھوچھوی، میں اس میں جانے کیلئے بیتاب ہوگیا، والد صاحب سے اجازت ملنے کا کوئی سوال نہیں تھا، جاڑے کا موسم تھا چند ساتھیوں کو تیار کیا بھیرا اورخیرآباد کے درمیان ٹونس ندی حائل ہے، کشتی سے اسے پار کرنا ہوتا تھا، جاتے وقت ملاح سے بات کرلی تھی کہ تم آج یہیں ندی پر

رہو ہم لوگ ایک بجے کے بعد آئیں گے تو ہم کو پار کر دینا، ملاح نے ہم بچوں کی رعایت کی وہیں ندی کے کنارے ایک چھپر میں پڑ کر وہ سو گیا۔ کمیل اشرف کی تقریر بشریت رسول کی نفی پر بڑی مرتب، مرصع اور دلآویز ہوئی، اتنی مرتب اور دلکش تقریر تھی کہ مجھے اول سے آخر تک وہ یاد ہوگئی، بولنے کا انداز میرے دل میں کھب گیا، میں ان کے بیان کردہ دلائل سے تو متأثر نہیں ہوا کیوں کہ میرے پاس ان کے تمام دلائل کے جواب موجود تھے، مگر اسلوب و انداز نے مجھے مسحور کر دیا تھا، رات ہی میں واپس آ گیا، دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، اس لئے ادھر ادھر باقی رات گزار دی اور جیسے ہی والد صاحب فجر کی نماز کے لئے اٹھ کر باہر نکلے، میں گھر میں گھس کر اس طرح سو گیا جیسے پوری رات بستر پر ہی رہا ہوں، والد صاحب نماز پڑھ کر آئے میری تو نماز اس وقت تک معاف تھی، جب سو کر اٹھا تو انھوں نے خفگی کے لہجے میں سوال کیا کہ رات کہاں تھے؟ جھوٹ کی عادت نہ تھی، نہ اس کا یارا تھا، سچ سچ بتا دیا، وہ خفا ہونے لگے، میں نے سوچا کہ ان کی خفگی دور کرنے کی صورت بس یہی ہے کہ انھیں جلسہ کا حال اور اپنی یادداشت کا کمال بتادوں، میں نے تقریر کی دلآویزی اور یادداشت کو بتایا، تو فرمانے لگے اچھا سناؤ، میں نے من وعن پوری تقریر دہرادی، وہ دلچسپی سے سنتے رہے پھر میری خطا معاف ہوگئی۔

مجھے میلوں ٹھیلوں اور عوامی مجامع سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، مگر میں اس وقت کان کا مریض ہو گیا تھا، یعنی قوالی، راگ اور نغمہ کا شوق بہت ہو گیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں دو قوال بہت مشہور و معروف تھے اور دونوں واقعی بہت اچھا گاتے تھے، ایک موسیٰ قوال اور ایک عبدالکریم قوال۔ دونوں کی ایک ایک پارٹی تھی، گاؤں کے پردھان محمد علی تھے، ان کی سرکاری عہدے داروں سے بالخصوص بی، ڈی، او سے بڑی دوستی تھی، یہ عہدے دار آتے تو قوالی کی محفل جمتی تھی، میں ان محفلوں میں بڑے انہماک سے شریک ہوتا تھا، مجھے مزامیر اور باجوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ڈھولک کی تھاپ اور ہرمونیم کی روں روں توں توں میں مجھے ذرا بھی لطف نہ آتا، بلکہ وحشت ہوتی، بس گانے والے کی خوش آوازی اسکی طرز ادا اس کے زیر و بم پر

میں جھومتا، راگ اور نغمہ کا یہ شوق مجھے بعد میں محرم کے ماتمی جلوسوں میں بھی لیجانے لگا، میرے گھرانے میں تعزیہ کی حیثیت وہ تھی کہ گھر کے بچوں کو اس کی صورت دیکھنی بھی ممنوع تھی۔ تعزیہ دیکھنا اور خنزیر دیکھنا یکساں سمجھا جاتا تھا، ماتمی نوحوں کا سننا بدترین جرم تھا مگر اس میں نوحہ پڑھنے والے یہی موسیٰ و کریم ہوتے اور ان کی پارٹی ہوتی، دو تعزیے گاؤں میں نکلتے، ایک کے ساتھ موسی کی پارٹی ہوتی ایک ساتھ کریم کی! مجھے موسیٰ کی نغمہ سرائی زیادہ پسند تھی، میں چوری سے رات میں شریک ہوجاتا، یہ پروگرام پوری رات کا ہوتا، ایک سال آدھی رات تک شریک رہا، دوسرے سال پوری رات گنوائی، اس دن صبح کو فجر کے بعد جب آخری نوحہ ہورہا تھا، میں نے ایک ایسی چیز دیکھی کہ اس کے بعد ان ماتمی نوحوں سے بالکل بیزار ہوگیا اور اس کا تأثر اتنا شدید ہوا کہ راگ اور نغمہ سے طبیعت اچٹ گئی، اب کوئی کتنا ہی اچھا گانے والا ہو، طبیعت کو جنبش نہیں ہوتی،، مجلس کی رعایت میں کبھی میں بھی واہ واہ، سبحان اللہ کہدوں، یہ الگ بات ہے مگر نہ دل کو خواہش ہوتی اور نہ سن کر طبیعت پھڑکتی۔

وہ چیز عجیب تھی جس کا مجھے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، موسیٰ کا ایک چیلا بہت اچھا گاتا تھا۔ وہی آخری نوحہ پڑھ رہا تھا اور اس کی پارٹی اسے دہرا رہی تھی، میں نے دیکھا کہ اس کے منہ سے نہایت کثیف اور سیاہ دھواں نکل رہا ہے، جب وہ پڑھنے کیلئے منہ کھولتا تو دھویں کا مرغولہ نکلتا اور فضا میں تحلیل ہوجاتا، میں نے اس کے ساتھیوں کو دیکھا ان کے منہ سے بھی ویسے ہی مرغولے نکل رہے ہیں، یہ دیکھ کر مجھے بہت وحشت ہوئی طبیعت پر ہول طاری ہوگیا میں الٹے پاؤں وہاں سے بھاگا اور پھر کبھی نہیں گیا۔ **وللہ الحمد**

مشاعروں سے بھی دلچسپی تھی مگر جلسوں سے کم، میرے گاؤں بھیرہ میں ایک بزم انجمن رشیدیہ کے نام سے والد صاحب وغیرہ نے قائم کر رکھی تھی اس کی طرف سے مشاعرہ کا اہتمام ہوتا، اس میں قرب ونواح کے شعراء شریک ہوتے تھے، مشاعروں کی شرکت بس انھیں مشاعروں کی حد تک محدود تھی۔

☆☆☆☆☆

چوتھا باب

جامعہ احیاء العلوم مبارک پور میں

پہلا سال (عربی دوم)

شعبان کے اخیر میں حضرت الاستاذ نے جب اسباق بند کئے، تو حکم دیا کہ اگلے سال مبارک پور چلے جاؤ، وہاں اچھی تعلیم ہوتی ہے، بھیرہ سے وہاں کے تعلقات بھی زیادہ ہیں اس وقت میری عمر ۱۳؍سال کی ہوچکی تھی، لیکن چونکہ گھر اور گاؤں سے باہر اس وقت تک قدم نکالا نہیں تھا اس لئے طبیعت کا عجیب رنگ ہورہا تھا، گھر کا چھوٹنا شاق ہورہا تھا اور نئے میدان علم میں داخل ہونے کی خوشی حاصل ہورہی تھی رمضان کا مہینہ تو خوابوں میں گزر گیا، شوال ہوتے ہی مدرسہ جانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں، میرے ایک دوست حافظ ابوبکر صاحب مجھ سے ایک سال پہلے سے وہاں درجۂ حفظ میں داخلہ لے کر پڑھ رہے تھے، انھیں کو میں نے رہبر بنایا، ان سے وہاں کے حالات پوچھے، وہاں کا ماحول پوچھا، انھوں نے اطمینان دلایا، گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں ہے سب اپنے لوگ ہیں اساتذہ کے بارے میں دریافت کیا جو کچھ جانتے تھے بتایا، اساتذہ سب اچھے ہیں لیکن ان میں زیادہ تعریف مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ کی کی، ہمارے گاؤں کے ایک اور صاحب مولانا شمس الحق صاحب ......جواب جوگیشوری بمبئی میں امام ہیں...... اس وقت وہاں پڑھتے تھے، اسی سال وہاں کی تعلیم مکمل کرکے تکمیل فضیلت کے لئے دیوبند چلے گئے تھے۔

۸؍شوال کو بتایا کہ مدرسہ کھلتا ہے اسی روز جاکر داخلہ کرالینا چاہئے، تاکہ بعد میں دقت نہ ہو، میں اور حافظ ابوبکر ۸؍کو مدرسہ پہونچ گئے، ناظم صاحب مولانا عبدالباری

صاحب علیہ الرحمہ ابوبکر کو تو پہچانتے ہی تھے، مجھے بھی پہچانتے تھے، انھوں نے بہت حوصلہ افزائی کی باتیں کی اور ایک چھوٹے سے پرچے پر کچھ لکھ کر دیا کہ لے جاؤ، مولانا محمد مسلم صاحب کو یہ پرچہ دے دو، وہ تمہارا امتحان لیں گے، میں امتحان کا نام سن کر گھبرا گیا، ہاتھ پاؤں کانپ گئے، حافظ ابوبکر تسلی دیتے ہوئے دارالاہتمام سے لے کر نکلے، نکلتے ہی پانی کے نل (ہینڈ پائپ) کے پاس مولانا سے ملاقات ہوگئی، حافظ ابوبکر نے وہ پرچہ ان کے ہاتھ میں دیدیا، وہ لوٹا لیکر استنجا سے فارغ ہوکر آرہے تھے، حافظ ابوبکر نے ان کے ہاتھ سے لوٹا لے لیا، مولانا کھڑے کھڑے میری طرف متوجہ ہوگئے، میں گھبرا گیا، بزدل اور شرمیلا تو ابتدا سے ہی تھا، مولانا نے شفقت کے ساتھ کچھ صرفی نحوی سوالات کئے، میں نے جواب دیئے، جو غالباً درست تھے، پھر انھوں نے ایک سوال ایسا کردیا جس کی مجھے کوئی توقع نہ تھی، اور نہ اس طرح کا سوال میں نے کبھی سنا تھا انھوں نے پوچھا کہ **دخلتُ فی المدرسۃ** کی ترکیب کرو، میں نے ترکیب کا نام بھی نہ سنا تھا نہ اس کی حقیقت جانتا تھا، مجھ سے اگر مولانا پوچھتے کہ **دخلتُ** کیا ہے؟ **فی** کیا چیز ہے؟ **المدرسۃ** پر کون سا اعراب ہے؟ تو میں بتادیتا مگر ترکیب؟ یہ لفظ تو میں نے سنا بھی نہ تھا میں دم بخود کھڑا رہ گیا، میں کچھ بول نہ سکا، تھوڑی دیر تک وہ پوچھتے رہے پھر انھوں نے پوچھا کہ **شرح مأۃ عامل** پڑھی ہے، صحیح تلفظ کے ساتھ یہ نام پہلی مرتبہ کان پڑ رہا تھا، میں نے نفی میں جواب دیا، اس پر فرمایا کہ جب تم نے **شرح مأۃ عامل** نہیں پڑھی ہے تو عربی دوم میں کیسے چل سکو گے؟ پھر پوچھا کہ اچھا ادب میں کون سی کتاب پڑھی ہے، میں اردو ادب تو جانتا تھا، عربی ادب سے اس وقت تک واقف نہ تھا لیکن اسی پر قیاس کر کے میں نے بتادیا، **التہجی والمطالعہ** یہ نام مولانا نے نہیں سنا تھا، انھوں نے پوچھا **دروس الادب** پڑھی میں نے عرض کیا نہیں؟ مولانا کچھ دیر تأمل کرتے رہے پھر فرمایا کہ اچھا عربی دوم لکھے دیتا ہوں لیکن شرح مأۃ عامل پڑھ لینا، ورنہ عربی اول میں واپس کردیئے جاؤ گے، میں بہت پریشان ہوا، رقعہ ناظم صاحب کو دیدیا، عربی دوم میں داخلہ ہوگیا، لیکن **شرح مأۃ** پھانس بن کر چبھ گئی، ابھی تعلیم ایک ہفتہ کے بعد شروع

ہوگی، میں گھر چلا آیا، اور سیدھا مولانا کے پاس پہونچا، ان سے تمام روداد کہہ سنائی فرمانے لگے ہاں جی! شرح مأۃ عامل پڑھنی ضروری تھی؟ مگر وقت ختم ہوگیا تھا، میں نے عرض کیا اب پڑھا دیجئے، فرمایا چلو ایک ہفتہ سہی، انھوں نے اپنی کتاب نکالی اور مجھے دیدی پہلے بسم اللہ کی ترکیب بتائی، میری عقل چکراگئی، اس سے کیا فائدہ؟ مگر بہرحال یہ کام ضروری تھا، سب کتابیں اور سب مطالعے بالائے طاق رکھ کر ترکیب کو یاد کرنا شروع کیا، مگر ذرا بھی مناسبت نہ ہوئی ایک ہفتہ روتے، گھبراتے گزر گیا، بڑی مشکل سے ایک صفحہ کی ترکیب ہوسکی، میں مدرسہ چلا آیا، شرح مأۃ عامل کا یہ نسخہ بہت مفصل حاشیہ کا تھا اسے میں بہت غور سے دیکھتا تھا، فارسی زبان میں یہ حاشیہ تھا خدا خدا کر کے کچھ مناسبت پیدا ہوئی مدرسہ میں اسباق شروع ہوتے ہوتے کچھ دن گزر گئے، اب لڑکوں کی تعداد خاصی ہوچکی تھی، نئے لڑکے داخل ہوچکے تھے، پرانے بھی آرہے تھے۔

مبارک پور میں باہر کے طلبہ کے کھانے کا نظم دو طرح کا تھا، بالغ طلبہ مدرسہ کے مطبخ سے کھانا پاتے تھے، اور نابالغ لڑکے مبارک پور کے مخیّر حضرات کے مہمان ہوتے، مبارکپور کے اصحاب خیر میں یہ بڑی خصوصیت تھی کہ وہ چھوٹے بچوں کو مدرسہ سے مانگ لیتے اور جب تک وہ گھروں میں جانے کی صلاحیت رکھتے وہیں جاکر کھاتے یہ طالب علم ان کے گھر کا ایک فرد بن جاتا، بڑی عزت سے کھلاتے کھانے کی ہر چیز میں اس کا حصہ رکھا جاتا، بعض طلبہ جن سے لوگوں کا دل خوب کھل جاتا، بالغ ہونے کے بعد بھی وہیں کھاتے اسی بنیاد پر کتنے رشتے وجود میں آگئے، یہ بڑا بابرکت تعلق ہوتا تھا، اور بحمد اللہ کبھی اس طریقۂ نظم میں کوئی ناگوار بات سننے میں نہیں آئی۔ میں بھی اس وقت نابالغ تھا مجھے حکم ہوا کہ قاری محمد یٰسین صاحب اور مولانا عبدالستار صاحب کے گھر جاکر کھانا کھایا کروں، یہ دونوں حقیقی بھائی تھے، دور سے ہمارے خاندان کی ان کے یہاں رشتہ داری بھی تھی، مجھ پر یہ حکم بہت گراں گزرا، دوسرے کے گھر جاکر روزانہ دونوں وقت کھانا کھانا میرے لئے زبردست مجاہدہ تھا، میں تو اپنے گھر بھی جب والد صاحب نے دوسرا نکاح کرلیا تھا، کھانا مانگتے ہوئے شرماتا تھا یہاں تو

دو وقت صورت سوال بن کر جانا پڑے گا، مگر ناظم صاحب کا حکم تھا، قاری محمد یٰسین صاحب اور مولانا عبدالستار صاحب کا کاروبار مشترک تھا، مگر رہائش اور کھانے پکانے کا انتظام الگ الگ تھا، ان کے والد حافظ عبدالرشید صاحب بھی حیات تھے بہت بوڑھے ہو چکے تھے، میں دوپہر کے وقت قاری محمد یٰسین صاحب کے یہاں اور شام کو مولانا عبدالستار صاحب کے یہاں کھانا کھاتا تھا، دونوں جگہ بہت عزت وتکریم تھی، بڑی دلداری ودلنوازی تھی کوئی تکلف نہ تھا، دونوں حضرات کی بیویاں ماں کی طرح بیٹھ کر کھلاتی تھیں، بڑا اُنس محسوس ہوتا تھا، مگر میں اپنی وحشی طبیعت سے مجبور تھا، میں جاتا، چپکے سے کھاتا، نہ کچھ بولتا، نہ کسی طرف دیکھتا، نہ کھانے کے سلسلہ میں کچھ کہتا جو ملتا بس کھا کر چلا آتا، دونوں بوڑھی خاتون کبھی میرے پاس بیٹھ جاتیں اور محبت کی باتیں کرتیں مگر میں گونگا بنا سنتا رہتا، زیادہ سے زیادہ ہاں نہیں میں جواب دیدیتا، گھر کے سب لوگ مجھ کو نرا بیوقوف سمجھتے اور ٹھیک سمجھتے تھے۔

کبھی کبھی میرا بے ڈھنگا پن کھل جاتا تھا، حماقت ظاہر ہو جاتی تھی اس طرح کے دو واقعے اب تک ذہن میں محفوظ ہیں۔ قاری محمد یٰسین صاحب مرحوم کے گھر پانی کا نل نہیں تھا، کنواں تھا، مجھے کنویں سے پانی نکالنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا، کنویں میں جھانکنے سے بھی میں ڈرتا تھا، میں کھانا کھانے جاتا تو قاری صاحب کی اہلیہ کھانا نکال کر رکھتیں، اکثر مجھی سے کہتیں کہ نکال لو اتنے میں تازہ پانی بھر کر میرے پاس رکھ دیتیں، انھوں نے کبھی اس کی فرمائش نہیں کی کہ کنویں سے پانی نکال لو، انھیں موقع نہ ہوتا تو قاری صاحب کے بھتیجے فیض الحسن صاحب کی اہلیہ پانی نکال کر رکھ دیتیں۔ ایک بار میں گیا تو اتفاقاً دونوں کسی کام میں مشغول تھیں، میں نے خود سے کھانا نکال کر کھانا شروع کر دیا، اور کنویں سے پانی نکالنا کسی کو یاد نہ رہا، مجھے یاد تھا مگر میں کیسے کہتا، میں نے سوچا کہ کھا کر انگلی وغیرہ اچھی طرح صاف کر کے چل دوں گا، اور مدرسہ میں جا کر پانی پی لوں گا، مجھے کیا معلوم تھا کہ شامت آجائے گی بڑے میاں حافظ عبدالرشید صاحب عصا ٹیکتے ہوئے میری طرف نکل آئے، ایک نظر ڈالتے ہی پوچھا کہ پانی نہیں ہے، میں خاموش رہا، وہ بہوؤں پر خفا ہونے لگے، کہ تم لوگوں

سے اتنا نہیں ہوتا کہ پانی نکال کردے دو، وہ دونوں ایک ساتھ دوڑیں، فوراً پانی نکالنے لگیں، اب حافظ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے اور ڈانٹنا شروع کیا کہ تم سے خود نہیں ہوسکا کہ پانی نکال لیتے، ان کا ڈانٹنا بالکل بجا تھا میں بہت شرمندہ ہوا، لیکن اس کے باوجود کبھی کنویں کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہوئی، اور پھر عورتیں بھی ہوشیار ہوگئیں کہ ایک احمق کی خدمت کرنی ہے، سب کرکے دیدو تو یہ کھالے گا۔

دوسرا قصہ مولانا عبدالستار صاحب کے گھر پیش آیا، ایک روز شام کے کھانے میں دال تھی اور قیمہ تھا، میں کھانے میں نمک کا بیش وکم ہونا نہیں پہچانتا تھا، نمک زیادہ ہوتا تو احساس ہوجاتا لیکن پھیکے کا ادراک نہیں ہوتا تھا دال آئی اور میں کھانے لگا، کچھ عجیب سا مزہ لگ رہا تھا، میں غور کرتا رہا کہ کیا بات ہے کہ اس کے مزہ میں بہت فرق ہے، بہت سوچنے کے بعد میں نے کہا ہونہ ہو نمک کم ہو، میں نے بزرگ خاتون سے کہہ دیا، کھا کر چلا گیا ہوتا کچھ نہ بولے ہوتا تو کچھ عزت رہ جاتی، مگر میرا بولنا تھا اور عزت کا جانا تھا، میں نے کہا کہ شاید کھانے میں نمک کم ہے، انھوں نے پکار کر اپنی بیٹی سے کہا، جو عمر میں مجھ سے کچھ زیادہ تھی، مگر بہت سیف زبان تھی، اس سے کہا ذرا دیکھ تو دال میں نمک کم ہے اس نے چکھا اور صاعقہ بن کر میرے سر پر ٹوٹی کہ کتنا بیوقوف ہے یہ! اسے کچھ پتہ نہیں چلتا، دال میں نمک ہے ہی نہیں اور یہ کہتا ہے کہ کم ہے۔ بزرگ خاتون نے اس کو ڈانٹا، اور میری دلجوئی کی، مگر اس دن میں نے بہت خفت محسوس کی میں برابر دعا کرتا رہا کہ یا اللہ مطبخ سے جو کچھ روکھا پھیکا کچا پکا مل جائے گا، کھالوں گا، کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاؤں گا، مگر اس سے نجات دیجئے، کھانا ان دونوں گھروں میں اچھا پکتا تھا، مگر میں برابر یہی دعا کرتا تھا دو سال تک یہ سلسلہ قائم رہا جب عربی چہارم میں آیا تو یہ سلسلہ موقوف ہوگیا، اور مدرسہ کے مطبخ میں میرا کھانا کردیا گیا، اس دن جیسی خوشی ہوئی میں بیان نہیں کرسکتا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان دونوں گھروں میں میری دلداری کی حد کردی گئی، ان کے گھر کے بچے اتنے اہتمام سے نہیں کھلائے جاتے تھے، جتنا اہتمام میرے لئے ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ اب

تو یہ سب حضرات اور بزرگ خاتون اللہ کے حضور پہونچ گئیں، حق تعالیٰ انھیں جنت نصیب فرمائے، میرا دل ان کے احسانات سے جھکا ہوا ہے۔

دوپہر کے کھانے کیلئے جاتا تو مشہور بریلوی عالم اور مقرر مولانا مظفر حسین صاحب سے ملاقات ہوجاتی، یہ ظفر ادیبی کے نام سے معروف تھے۔ بریلویوں میں نسبتاً معتدل سمجھے جاتے تھے، کسی دیوبندی سے سلام کرنے سے ان کا نکاح نہیں ٹوٹتا تھا، مولانا عبدالستار صاحب کے مکان سے تھوڑا آگے ان کا مکان تھا یہ اشرفیہ میں پڑھاتے تھے۔ ایک خاص جگہ سے روزانہ ساتھ ہوجاتا تھا ان سے کتابوں کی باتیں ہوتیں، مولانا ابوالکلام آزاد اور علمائے دیوبند کی کتابیں پڑھا کرتے تھے، اسی سلسلے میں باتیں ہوتیں۔ ۱۴۱۰ء میں سفر حج میں جدہ میں ان سے ملاقات ہوئی اہلیہ کے ساتھ تھے اور آگے پیچھے کوئی نہ تھا، میں نے بڑھ کر ملاقات کی تو پہچان گئے۔

مدرسہ میں آنے کے بعد سب سے زیادہ فکر مجھے شرح مأۃ عامل کی تھی۔ میں نے ناظم صاحب سے اس کے بارے میں گزارش کی انھوں نے فرمایا کہ تم بے فکر رہو، میں انتظام کردوں گا، پہلے تم کتب خانہ سے اپنی درسی کتابیں لے لو۔ اس سال حسب ذیل کتابیں ششماہی تک پڑھنی تھیں، (۱) ہدایۃ النحو (۲) کبریٰ، (۳) القرأۃ الرشیدہ دوم، (۴) علم الصیغہ، ششماہی کے بعد علی الترتیب نورالایضاح، مرقات، القرأۃ الرشیدہ سوم، فصول اکبری، (خاصیات ابواب) ان کے علاوہ ایک گھنٹہ تجوید۔ (یہ اختیاری مضمون تھا)

یہ سب کتابیں کتب خانہ سے حاصل کرلیں، احیاء العلوم کا کتب خانہ خاصا بڑا ہے، اسے دیکھ کر طبیعت بہت للچائی میں نے ناظم کتب خانہ سے کتابوں کے لئے کہا تو انھوں نے فرصت نہ ہونے کا عذر کیا، اور کہا کہ جب پڑھائی شروع ہوجائے گی تو کتابیں دی جائیں گی۔ میں نے ایک نگاہ تمام الماریوں پر ڈال لی، رجسٹر بھی سب دیکھ ڈالا، یہاں تو بڑی غذا ہے۔

اسباق کی ترتیب یوں تھی۔

ہدایۃ النحو	مولانا عبدالکافی صاحب ابن مولانا عبدالباری صاحب ناظم مدرسہ	پہلا گھنٹہ
کبریٰ	حضرت مولانا عبدالمنان صاحب باسوپاری رحمہ اللہ	دوسرا گھنٹہ
القرأۃ الرشیدہ دوم	حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مبارکپوری مدظلہ	تیسرا گھنٹہ
تجوید	مولانا قاری حماد الاعظمی صاحب مدظلہ	چوتھا گھنٹہ
علم الصیغہ	حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بمھوری رحمہ اللہ	پانچواں گھنٹہ

مولانا عبدالکافی صاحب اسی سال غالباً دیوبند سے فارغ ہوکر آئے تھے، مولانا عبدالباری صاحب نے انھیں اعزازی مدرس بنایا تھا، وہ بہت محنت سے مطالعہ کر کے آتے تھے، اور بڑی کوشش سے سمجھاتے تھے، مگر ہمارے ساتھیوں کو اطمینان نہیں ہوتا تھا، بعض طلبہ تو جان بوجھ کر انھیں دق کرتے تھے۔ میں تو نیا تھا یوں بھی طبیعت میں حجاب تھا، میں سبق میں کچھ نہ بولتا تھا، آسان چیزیں تو بخوبی سمجھ میں آجاتیں تھیں مگر کچھ باتیں جو ذرا مشکل تھیں اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی تھیں، میں تو اسے اپنی سمجھ کا قصور تصور کرتا تھا، مگر میرے ساتھی مصر تھے کہ مولانا اچھی طرح سمجھا نہیں پاتے، بہرحال کتاب وہیں رہی۔ شش ماہی امتحان کے کچھ بعد کتاب ختم ہوئی، پھر نورالایضاح شروع ہوئی، اس میں طلبہ نے اشکالات کم کئے، جب سالانہ امتحان کا وقت آیا تو بڑی گھبراہٹ ہوئی اس کا تکرار شروع ہوا (لفظ تکرار مؤنث ہے ہمارے مدرسوں کی اصطلاح میں تکرار بمعنی مذاکرہ ہے، اوراس کا استعمال مذکر ہے) میرے ساتھیوں میں تین جیدالاستعداد تھے، حافظ الطاف حسین صاحب تکرار کراتے تھے، میں اس میں شریک ہوتا تھا، ہدایۃ النحو کی چند بحثیں سمجھ میں نہیں آئی تھیں، انھیں میں نے حضرت مولانا عبدالمنان صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے چند مجالس میں اتنے عمدہ انداز میں وہ بحثیں سمجھائیں کہ وہ بالکل ذہن نشین ہوگئیں، پھر پوری ہدایۃ النحو حل ہوگئی، میں نے ان خاص خاص بحثوں کو ہدایۃ النحو کی جلد میں جو زائد کاغذ لگا ہوا تھا اس پر مفصل لکھ دیا، مجھے معلوم ہوا کہ بعد میں اس تحریر کی نقلیں بہت سے طالب علموں نے لیں، اور عرصۂ طویل تک وہ متداول رہیں۔

کبریٰ فن منطق کی پہلی کتاب تھی حضرت مولانا عبدالمنان صاحب رحمہ اللہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے قدیم ترین مدرس تھے، یہیں پڑھا، پھر دارالعلوم دیوبند گئے وہاں سے فراغت کے بعد یہیں مدرس ہوگئے، درجات فارسی سے بخاری شریف تک تمام کتابیں پڑھائیں۔ بہت محنت کرتے تھے، ہم لوگوں کا سبق ان کیلئے تفریح کا گھنٹہ تھا، خوب لطائف وظرائف سناتے تھے، اس گھنٹے سے بہت دلچسپی تھی، کسی حال میں اس گھنٹے کو چھوڑنا گوارا نہ تھا، آدھ گھنٹہ تفریحی باتیں ہوتیں، جن میں علمی نکات بھی ہوتے، مسائل بھی ہوتے، سنجیدہ ظرافت بھی ہوتی، پھر آدھ گھنٹے میں پڑھاتے اور ایسا پڑھاتے کہ سب سے آسان فن منطق ہی معلوم ہوتا، اصطلاحات کو کاپی پر نوٹ بھی کراتے، ہنستے کھیلتے کبریٰ ختم ہوگئی، اور منطق کی اصطلاحات ہم نے پی لیں، اس کے بعد مرقات شروع ہوئی، اصطلاحات تو سب پہلے ہی یاد ہوگئی تھیں، ان کو بخوبی سمجھ بھی لیا تھا، مرقات میں کچھ زائد چیزیں ہیں انھیں بھی مولانا نے گھول کر پلا دیا۔

مرقات میں کوئی چیز مشکل نہیں معلوم ہوئی صرف چاروں شکلیں اور ان کی ضربیں دشوار معلوم ہوئیں، وہ کسی طرح یاد نہ ہوتی تھیں، اس سلسلے میں بہت پریشانی محسوس ہوئی، مولانا سے پوچھتا وہ تو سمجھا چکے تھے اور میں سمجھ بھی چکا تھا، مگر زبانی یاد کرنے کا مسئلہ پریشان کن تھا، کئی دن تک میرے ذہن پر یہ مسئلہ مسلط رہا، ایک دن بعد نماز عصر مدرسہ کے برآمدہ میں تنہا بیٹھا اسی مسئلہ میں غرق تھا کہ اچانک ذہن کے افق پر ایک روشنی چمکی اور ایسے اصول وکلیات ذہن میں ابھرنے لگے کہ وہیں بیٹھے بیٹھے تمام شکلیں اور ان کی تمام مثالیں ترتیب کے ساتھ حافظے کے خزانے میں محفوظ ہوگئیں، پھر مجھے ایک دن بھی انھیں یاد نہیں کرنا پڑا، انھیں قواعد کی روشنی میں شکل اور اس کی ہر ضرب بے تکلف ذہن میں آگئی، یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو میرے لئے بالکل نیا تھا، اس سے مجھے بیحد مسرت ہوئی، اور اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی کس کس طرح مشکلات کو حل کرتی ہے۔

القرأۃ الرشیدہ مصری ادیبوں کی تیار کردہ ریڈریں ہیں، ان میں طلبہ کی استعداد کے

اعتبار سے بہت مناسب تدریج ہے، آسانی سے دشواری کی طرف یہ کتابیں چلی ہیں، جیسے جیسے طلبہ کی ذہنی صلاحیت اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اس کے حصوں کا معیار بھی بلند ہوجاتا ہے اس کے چار حصے ہیں، پہلا حصہ ہمارے مدرسہ میں عربی اول مین ششماہی امتحان کے بعد سے ہے، دوسرا اور تیسرا حصہ عربی دوم میں ہے، حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مبارک پوری اسے پڑھاتے تھے، مولانا نہایت سیدھے سادے، ذی استعداد اور بالکل نوجوان مدرس تھے، سبق کی تقریر بہت عمدہ کرتے تھے، تدریس کی صلاحیت بہت عمدہ تھی، عربی ادب سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے، القرأۃ الرشیدہ کے مشکل الفاظ کو پہلے خود اپنی کاپی پر لکھتے، لفظ کا معنی اس کا مادہ مجرد میں اس کا باب اور پھر اس کا معنی، اسم ہے تو واحد اور اس کی جمع، مذکر ہے تو اس کا مونث، اس کا فعل کس باب سے آئے گا، اور اس کے کیا معنی ہوں گے، یہ تفصیلات ہوا کرتیں، اپنی کاپی پر لکھتے مگر زبانی لکھواتے اسی التزام کے ساتھ دونوں حصے پڑھائے، القرأۃ الرشیدہ میں عبارت پر اعراب اور حرکات لگے ہوتے ہیں، تاہم نحوی ترکیب پوچھ لیا کرتے تھے، ترجمہ بہت عمدہ کراتے نہ بالکل بامحاورہ کہ یہ معلوم ہی نہ ہوسکے کہ کس لفظ کا ترجمہ کیا ہے اور نہ اتنا تحت اللفظ کہ ترجمہ سے مطلب واضح ہی نہ ہو، ہر لفظ کا ترجمہ الگ الگ واضح ہوجاتا، اور ساتھ ہی ساتھ مطلب بھی کھل جاتا، پھر ترجمہ مکرر سہ کرر کراتے، اس لئے دوران درس ہی پورا سبق یاد ہوجاتا، اس درس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ جمعرات کو گھنٹے میں اردو سے عربی میں ترجمہ کراتے، میرے ساتھی جو عربی اول بھی یہیں پڑھے ہوئے تھے، وہ خوب منجھے ہوئے تھے، وہ آسانی سے ترجمہ کرلیتے تھے اور میرے لئے یہ پہلا اتفاق تھا، اتفاق دیکھئے کہ پہلی ہی جمعرات کو مولانا نے لکھوایا ’’باسی روٹی‘‘ روٹی کی عربی مجھے معلوم تھی، مگر باسی کی معلوم نہ تھی، اور اس وقت کسی اردو عربی لغت سے استفادہ کی نوبت آئی نہیں تھی، میں حیران تھا کہ کیا کروں میری جو شامت آئی میں نے اپنے ایک ساتھی سے باسی کی عربی پوچھ دی وہ زور سے ہنس پڑا، مولانا متوجہ ہوگئے کہ کیا بات ہے وہ کہنے لگا کہ اس کو باسی کی عربی معلوم نہیں، پرانے طلبہ کیلئے وہ پرانی ہوچکی تھی، میں جانتا ہی نہ تھا ان کا ہنسنا بھی

بجا تھا، مولانا مجھے ڈانٹنے لگے کہ تم باسی کی عربی نہیں جانتے تو عربی دوم میں کیسے آگئے، تم کو عربی اول میں کردیا جائے گا، میں گھبرایا کہ یااللہ کہیں یہ نیچے گراہی نہ دیں، خیر ہنس کراور مجھے ذلیل کرکے اس نے عربی بتادی، میں نے طے کرلیا کہ اب کسی سے کچھ نہ پوچھوں گا، مولانا ہی کے پاس اردو عربی کا ایک چھوٹا سا لغت تھا، القاموس الجدید اسے ان سے لیکر میں مسلسل الٹتا پلٹتا رہا، یہاں تک کہ اس کا ایک بڑا حصہ میرے ذہن میں محفوظ ہوگیا، پھر کبھی خفت نہیں اٹھانی پڑی، مولانا نے مجھے دومرتبہ ڈانٹا، ایک مرتبہ تو یہ، اور دوسری بار جب سالانہ امتحان قریب تھا اس کی تیاری ہورہی تھی، القرأۃ الرشیدہ میں ایک لفظ وافـــیٰ آیا، نہ جانے اس وقت ذہن کہاں سو گیا تھا، بہت زور لگایا مگر سمجھ میں نہیں آیا، میں بھولی ہوئی بات طلبہ سے بالکل نہیں اور اساتذہ سے بھی کم پوچھتا تھا، از خود ہی حل کرنے کی کوشش کرتا رہا، بہت کوشش کی مگر وہ حل نہیں ہوا، مجبور ہوا تو مولانا کے پاس پوچھنے چلا گیا، بہت خفا ہوئے کہ اتنا آسان لفظ تم کو سمجھ میں نہیں آتا، باب مفاعلت سے ماضی ہے، میں بہت شرمندہ ہوا، پھر بحمداللہ پوچھنے کی نوبت نہیں آئی۔

تجوید قدرے پڑھ کر آیا تھا، مولانا عزیز الرحمٰن صاحب نے کچھ دنوں بھیرہ میں ہم لوگوں کو تجوید پڑھائی تھی، میں قرآن صحیح پڑھ لیتا تھا بہت سے قواعد بھی معلوم تھے، قاری حماد صاحب نے تجوید کی مشق کرائی اور تجوید کی متعدد کتابیں پڑھائیں۔ قاری صاحب شیخوپور کے رہنے والے ہیں، جہاں اب میں مدرس ہوں، اسی سال دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر آئے تھے، اور شعبہ تجوید میں ان کا تقرر ہوا تھا، بہت مہربان اور شفیق تھے بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔

اس جماعت کی سب سے اہم کتاب ہم لوگوں کیلئے علم الصیغہ تھی، کیونکہ اس کا سبق مولانا محمد مسلم صاحب کے پاس تھا، مولانا اگرچہ نوجوان تھے مگر طلبہ پر ان کا اثر سب سے زیادہ تھا، ان کا ایک خاص رعب اور وقار تھا، ان کا انداز تعلیم بہت ہی پیارا اور دلنشیں تھا، اپنے فطری رعب ووقار کے باوجود طلبہ میں بہت مقبول ومحبوب تھے، انھوں نے پہلے ہی

دن اپنے درس کے کچھ قواعد بیان کر دیئے، ان میں ایک بات یہ تھی کہ علم الصیغہ کی عبارت کے ترجمہ کو پورے طور پر حفظ کرنا ہے، دوسرے یہ کہ بغیر معقول عذر کے ناغہ کبھی نہیں کرنا ہے۔ کتاب شروع ہوئی اور ختم تک ایک انداز پر چلتی رہی فوائد نافعہ تک پڑھائی، اس کے بعد فصول اکبری کا وہ حصہ پڑھایا جس میں ابواب کی خاصیت بیان کی گئی ہے، علم الصیغہ ہم لوگوں نے بہت اچھی طرح حفظ کر لی تھی، اس کو زبانی پڑھ لیا کرتے تھے، صیغوں کی مشق بھی خوب ہوگئی تھی، ، تعلیلات کی گتھیاں مولانا نے اس قدر سلجھادی تھیں کہ جیسے ہی کوئی لفظ آتا، اس کا مادہ اس کی اصل اور اس کی تعلیل فوراً سامنے آجاتی۔ ہم لوگوں کو اس پر ایک طرح کا ناز ہوگیا، اپنے سے اوپر کی جماعتوں کو بھی ہم لوگ تعلیلات کے مسئلے میں پیچھے چھوڑ دیتے تھے، مولانا بھی بہت خوش رہتے تھے، لیکن ناز سے جو سر اٹھاتا ہے، اس کی گردن توڑ دی جاتی ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہی ایک واقعہ ہوا، جس دن علم الصیغہ ختم ہوئی ساتھیوں نے مطالبہ کیا کہ آج کچھ مٹھائی وغیرہ آنی چاہئے، کیلے کا موسم تھا، مولانا نے کیلے کی تجویز رکھی اور غالباً انھیں نے پیسے دئے، جماعت میں جو طلبہ خرید وفروخت اور اشیاء کے پہچاننے میں ہوشیار تھے، وہ تو بازار چلے گئے، میں اس فن میں غبی ترین طالب علم، بیٹھا رہا۔ اتنی دیر خاموش کیا بیٹھتے، مولانا نے کچھ صیغے کچھ تعلیلات پوچھنی شروع کیں، پہلے اور طلبہ سے پوچھتے رہے، اگر کسی نے بتا دیا تو خیر ورنہ وہ سوال منتقل ہوتے ہوئے، آخر میں مجھ تک آتا، میں بتا دیتا، مولانا خوش ہوجاتے دو تین سوال کے بعد ایک سوال ایسا کیا، جس سے میں چکرا گیا، حسب معمول دوسروں سے پوچھا کہ مُصْطَفَيْنَ کون سا اسم ہے؟ کون سا صیغہ ہے کیا اصل ہے؟ کیا تعلیل ہوئی ہے؟ مجھے پسینہ آنے لگا، کیونکہ میرا ذہن کسی طرح اس کے کسی سوال کی تحقیق نہیں کر پارہا تھا، میں بوکھلا گیا، اور بوکھلاہٹ میں جو کچھ سوچ سکتا تھا، اس سے بھی محروم ہوگیا، سوال کھسکتا رہا، آخر میرے اوپر رکا، میں بھی خاموش رہا، مولانا نے چھڑی اٹھائی، اور میرے بازو پر ایک جمادی، پورے سال میں غلطی پر یہ پہلی چھڑی تھی، میرا سر ندامت سے جھک گیا، مولانا نے بتایا کہ یہ اقتعال سے جمع مذکر اسم مفعول ہے، حالت نصب یا حالت

جر میں ہے، مادہ اس کا ص۔ف۔و ہے، فاء کلمہ کے صاد ہونے کی وجہ سے تاء افتعال طا سے بدل گئی ہے، اس کی اصل مصطفوین ہے، واؤ چوتھی جگہ پر ہے اس لئے اس کو یاء سے بدل دیا، پھر یا متحرک اس کے ماقبل مفتوح، اسے الف سے بدل کر اجتماع ساکنین کی وجہ سے گرادیا، جو ناز ہو گیا تھا وہ ٹوٹ گیا۔

جامعہ عربیہ احیاء العلوم کا وہ دور تعلیم وتدریس کے اعتبار سے ایک بہترین دور تھا، اساتذہ سب باکمال تھے، طلبہ بھی اچھے تھے اساتذہ میں استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب علیہ الرحمۃ، مولانا محمد یحییٰ صاحب علیہ الرحمہ، مولانا زین العابدین صاحب مدظلہ، مولانا عبدالمنان صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ، مولانا جمیل احمد صاحب مدظلہ تھے یہ سب چندے آفتاب چندے ماہتاب تھے، مدرسہ کے ماحول میں فی الجملہ آزادی تھی، نگرانی وغیرہ کا زیادہ اہتمام نہ تھا، لیکن اساتذہ نے طلبہ میں اتنا ذوق پیدا کردیا تھا کہ وہ خود بخود پڑھنے لکھنے میں لگے رہتے تھے۔

نماز مغرب کے بعد فوراً کھانا تقسیم ہوتا تھا، جاگیر والے اپنی جاگیروں پر چلے جاتے تھے، کھانے سے فراغت کے بعد طلبہ کتابیں لیکر بیٹھ جاتے تکرار ہوتا، سبق یاد کیا جاتا، عشاء کی نماز کے بعد پھر پڑھنے بیٹھ جاتے اور حسب ضرورت ۱۲/۱۱؍ بجے رات تک پڑھتے، میں عشاء کے بعد کچھ دیر حضرت مولانا عبدالمنان صاحب مدظلہ کی خدمت میں جا بیٹھتا، مولانا کی باتوں میں بڑا لطف آتا، کچھ دیر وہ تعلیم کی، تربیت کی اور دوسرے موضوعات پر باتیں کرتے، پھر وہ اپنے مطالعہ میں لگ جاتے اور ہم لوگ اپنی کتابوں میں، وہاں سے جب اٹھتے ایک حوصلہ لے کر اٹھتے، میں درسی کتابوں سے جلد فارغ ہو جاتا، پھر دوسری کتابیں دیکھنے میں لگ جاتا اور عموماً بارہ ایک بجے تک جاگتا، ایک بجے کے بعد ہی سونے کی نوبت آتی۔

صبح فجر کی نماز کیلئے طلبہ کو اٹھانے کا زیادہ اہتمام نہ تھا اسی لئے بعض کاہل پڑے ہی رہ جاتے، مگر عام طور سے لڑکے اٹھ جاتے تھے، اکثر مولانا محمد مسلم صاحب ایک آواز لگاتے، ان کی آواز میں اعجاز مسیحائی تھا، جہاں تک آواز پہونچتی طلبہ اٹھتے چلے جاتے، کبھی کبھی مولانا

شمس الدین صاحب جو اس وقت نائب ناظم تھے، اٹھانے آجاتے، غرض فجر کی نماز میں طلبہ تقریباً سبھی شریک ہوجاتے، نماز کے بعد تلاوت کی جاتی جن کو نیند زیادہ ستاتی، وہ سوجاتے ورنہ پڑھتے رہتے، میں اگلے سبق کا مطالعہ کرتا تھا، ناشتہ کا انتظام مدرسہ کی طرف سے نہیں تھا ، اطراف کے طلبہ گھروں سے کچھ لاتے تھے وہی کھا لیتے ورنہ ایک دو ہوٹل تھے، پانچ نئے پیسے کی چائے، اور اتنے ہی کی چند میٹھی پکوڑیاں ملتی تھیں، انھیں کھا لیتے تھے ورنہ اس کی بھی ضرورت نہ تھی۔ گھنٹہ ہوتا اور سبق میں لگ جاتے، چار گھنٹوں کے بعد وقفہ ہوتا، اور بلا تاخیر جاگیر والے جاگیر پر چلے جاتے، میں وہاں سے لوٹتا تو میرا ایک ساتھی جو پڑھنے میں کمزور تھا اور بالکل خاموش رہا کرتا تھا، مولوی محمد طیب نیپالی! میرے کمرے میں آجاتا، ظہر کے بعد والے گھنٹے میں علم الصیغہ کا سبق تھا، وہ عبارت پر انگلی بڑھاتا جاتا، میں اس کا ترجمہ کرتا جاتا، دو تین مرتبہ میں ترجمہ کردیتا، کرادیتا، وہ چلا جاتا، میں بھی کتاب اٹھا کر جامع مسجد چلا جاتا، جو مدرسہ سے قریب ہی ہے، کچھ دیر بیٹھ کر علم الصیغہ یاد کرتا، جب ایک گھنٹہ ظہر کی اذان میں باقی رہتا تو میں سوجاتا، بعد نماز ظہر دو ایک مرتبہ سبق دہرا لیتا، اس طرح سبق خوب پختہ ہوجاتا۔

اسباق شروع ہونے کے بعد میں نے ناظم صاحب سے شرح مأۃ عامل کا تذکرہ پھر کیا، ناظم صاحب نے فرمایا کہ میں نے مولوی عبدالکافی سے کہدیا ہے، وہ تمھیں پڑھادیں گے، میں مولوی صاحب سے ملا، انھوں نے فرمایا کہ جب تم دوپہر کا کھانا کھا کر آتے ہو، اسی وقت پڑھادوں گا، میں کھانا کھا کر آتا، تو اسی وقت مولوی محمد طیب آجاتے، ان کے ساتھ پانچ دس منٹ صرف ہوتے، اس کے بعد مولوی عبدالکافی صاحب آجاتے، میں ان سے کہتا کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوجایا کروں، وہ فرماتے کہ نہیں میں تمھارے کمرے میں آجایا کرتا ہوں، یہی ٹھیک ہے، میں شرح مأۃ عامل کا مطالعہ محنت سے کرتا، انھیں بتانے کی ضرورت کم پیش آتی تھی، چونکہ قدرے بے تکلفی ہوگئی تھی، اس لئے ان کی بتائی ترکیبوں پر ردوکد بھی کرتا، یہ سلسلہ ششماہی امتحان تک ناغوں کے ساتھ چلتا رہا، نوع عاشر تک پڑھ کر

چھوڑ دیا، ترکیبوں پر خوب قابو ہو گیا، شرح مأۃ کے سبق سے فارغ ہوتا تو مسجد جاتا۔

مدرسہ کے طلبہ کی بہت پہلے حضرت مولانا شکر اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے دور میں ایک انجمن ''جمعیۃ الطلبہ'' کے نام سے تھی۔ پھر نہ جانے اس کا نظام کب بکھر گیا، مولانا محمد مسلم صاحب استاذ ہو کر تشریف لائے تو اس کی تجدید ہوئی، مولانا ہی اس کے سرپرست تھے، مولانا نے اس کا نظام اس طرح بنایا کہ عربی و فارسی درجات کے طلبہ جمعرات کو بعد نماز عشاء انجمن کا جلسہ کریں گے، اس میں ہر طالب علم کو لازم ہوگا کہ کچھ نہ کچھ تقریر کرے، ہر جلسہ کا ایک صدر ہوگا جس کی ذمہ داری ہوگی کہ طلبہ کی تقریروں پر رجسٹر کارروائی میں تبصرہ لکھے، ان کی غلطیوں کی نشان دہی کرے ان کو صحیح مشورے دے، کوئی طالب علم بغیر اجازت اس سے غیر حاضر نہ ہو، اور مسلسل دو ہفتہ رخصت نہیں ملے گی، ان جلسوں سے طلبہ کو زبان و بیان کا بہت فائدہ ہوتا، تذکیر و تانیث کی غلطیاں معلوم ہوتیں، الفاظ کا صحیح تلفظ کرنا آجاتا، نحوی غلطیوں سے بچنے کا سلیقہ آجاتا، بعض طلبہ اس سلسلے میں بہت خوردہ گیر تھے، ان کی موجودگی میں کسی لفظ کا غلط استعمال یا غلط تلفظ اگر ہو جاتا تو اسے فوراً نوٹ کرتے اور تقریر ختم ہوتے ہی اس پر تنبیہ کرتے، مثلاً عربی زبان میں لفظ حرکت، راء کے زبر کے ساتھ ہے، اردو میں عموماً لوگ حرکت را کے سکون کے ساتھ بولتے ہیں، یہ غلطی بھی نوٹ کی جاتی۔ عربی زبان میں مقصد صاد کے زیر کے ساتھ ہے، اردو میں اس کا تلفظ مقصد کیا جاتا ہے صاد کے زبر کے ساتھ، یہ غلطی بھی برداشت نہ تھی، میرے خیال میں یہ غلو تھا، اسی طرح حروف کے مخارج میں غلطی ہوتی تو اس پر بھی ٹوکا جاتا، پہلے سال تو میں کچھ مجحوب مجحوب سا تھا، ان جلسوں میں میری حاضری بھی بہت کم ہوئی، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے، لیکن دوسرے سال سے میری حاضری مستقل ہو گئی تھی مجھے اس غلو سے اختلاف ہوا، اتفاق دیکھئے کہ جس طالب علم کو اصلاحات کا یہ غلو تھا وہ میرا ہم سبق تھا، اور ذہین و فطین تھا مجھ سے اس کی چشمک ہو گئی، پہلے تو چشمک رہی اس کے بعد طبیعتوں میں حسد پیدا ہو گیا، حسد اسے بھی تھا اور مجھے بھی! وہ میری بات کو ناپسند کرتا میں اس کی بات کو! پہلے اور دوسرے سال تقریر کرنے میں وہ مجھ سے بہت

فائق تھا میں اس کا پاسنگ بھی نہ تھا، لیکن میرا مطالعہ اس کے مقابلے میں بہت وسیع تھا، میں نے اس کی تنبیہات سے اختلاف کیا، میں نے کہا کہ اردو میں الفاظ اگر چہ عربی وفارسی اور دوسری زبانوں سے آئے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ اردو میں منتقل ہوکر بھی ان کا تلفظ وہی رہے جو اصل عربی اور فارسی میں تھا، اردو کے اہل زبان نے ان میں تصرفات کئے ہیں۔ اور یہ تصرفات مقبول ہیں، چنانچہ ایک لفظ عربی میں کچھ معنی رکھتا ہے اردو میں اس کا معنی دوسرا ہوجاتا ہے، اسی طرح ممکن ہے عربی میں تلفظ کچھ ہو اہل زبان نے اردو میں اس کا تلفظ دوسرے طور پر کیا ہو، عربی میں افراط وتفریط ہے اردو والوں نے اسے لیا تو افراتفری کردیا، صرف ط کو حذف ہی نہیں کیا بلکہ الف کو زبر بھی دے دیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ نے ''نقوش سلیمانی'' میں کافی بحث کی ہے، مدرسہ کے کتب خانہ میں یہ کتاب نہ تھی میں نے کہیں اور سے لاکر اس کو بطور سند کے پیش کیا، اس کے بعد غلو مدھم پڑ گیا۔

دوگروپ میں منقسم ہوکر طلبہ جلسہ کرتے تھے اس کا قاعدہ یہ تھا کہ جو جلسہ پہلے ختم ہوجاتا، اس کے شرکاء اٹھ کر دوسرے جلسہ میں شریک ہوجاتے، باہمی چشمک نے اس قاعدہ کو بگاڑ رکھا تھا، ہر گروپ چاہتا تھا کہ اس کے گروپ میں دوسرے گروپ والا شریک ہو، اس کشمکش میں جلسہ دیر تک چلتا رہتا نہ اس گروپ کی تقریریں ختم ہوتیں اور نہ اس گروپ کی، چشمک تو صرف دو ایک طالب علموں میں ہوتی، مگر وہ اپنے ساتھ پوری جماعت کو مبتلا کردیتے۔

جمعیۃ الطلباء کے نظم کو چلانے کیلئے انتخاب کا طریقہ رائج تھا، یعنی طلبہ میں پانچ عہدے متعین تھے، ان کیلئے انتخابی کارروائی ہوتی تھی، صدر، نائب صدر، ناظم، نائب ناظم، ناظم کتب خانہ، جمعیۃ الطلبہ کا ایک مستقل دستور العمل تھا، اس میں ان عہدوں کی تفصیلات، ان کی ذمہ داریاں اور ان کے اختیارات تفصیل کے ساتھ لکھے ہوئے تھے، انھیں کے مطابق عمل درآمد تھا، میں جس سال پہونچا انتخاب میں بڑے جھگڑے پیدا ہوگئے تھے، طلبہ باقاعدہ دوگروپ میں منقسم ہوگئے تھے، انتخاب میں سخت اختلاف ہوا، کئی دن تک انتخابی کارروائی

ہوتی رہی ، بالآخر کثرت رائے سے حافظ توفیق احمد صاحب صدر اور مولوی فیاض احمد صاحب ناظم منتخب ہوئے ، اور مولوی عبدالمعید صاحب ناظم کتب خانہ!

اس انتخاب کے بعد جمعیۃ الطلبہ کا نظام بظاہر درست ہوگیا، مگر اختلاف کی خلیج اندر اندر وسیع ہوتی رہی، اس اختلاف کا اثر کبھی کبھی ظاہر ہوتا تھا مگر جب اساتذہ اچھے ہوں اور تعلیم کا نظم عمدگی کے ساتھ چل رہا ہو، تو یہ اختلافات زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے ۔ ناظم صاحب اور مولانا محمد مسلم صاحب کی حکمت عملی اور رعب وہیبت کی وجہ سے معاملہ دبا رہا، مگر ختم نہ ہوا۔

اخیر سال میں طلبہ اپنی انجمن کا سالانہ جلسہ کرتے ، جس کی صدارت کے لئے کسی نامور عالم کو دعوت دیتے ، پچھلے سال انجمن کا جلسہ بہت اہتمام کے ساتھ منعقد ہوا تھا، اس میں دیوبند سے مولانا انظر شاہ کشمیری کو دعوت دی گئی تھی ، اس وقت ان کی تقریر کا بہت شہرہ ہوا تھا، میں اس سال گھر پر تھا جلسہ میں جانے کا ارادہ تھا مگر کسی وجہ سے نہ جاسکا تھا، اس سال اس سے چھوٹے پیمانے پر جلسہ کرنے کا فیصلہ ہوا، مولانا قاری فیاض احمد صاحب ناظم مدرسہ مخزن العلوم دلدارنگر غازیپور کو دعوت دی گئی، مختصر پیمانے پر اچھا جلسہ ہوا۔

میں کبھی اب تک گھر سے باہر رہا نہیں تھا، اب جو مسلسل باہر رہنا پڑا اور اس میں بھی جاگیر کا لاحقہ میرے ساتھ لگ گیا، اس سے میری طبیعت بہت گھبرائی تھی ، شروع کے چھ ماہ تو یہ کیفیت رہی ، علاوہ سبق کے اوقات کے کسی وقت جی نہیں لگتا تھا، یہ بھی نہ تھا کہ گھر چلے جانے کی طبیعت چاہتی ہو، بس ایک اضطراب سا رہتا، بار بار دل بھر آتا تھا، طلبہ کے سامنے تو کسی طرح خود کو قابو میں رکھتا، مگر جونہی تنہائی ہوتی وہ اضطراب آنکھوں کے راستے ٹپکنے لگتا ، زیادہ اضطراب بڑھتا تو جامع مسجد کے اندرونی حصے میں دروازوں کو بند کرکے پڑا رہتا، اور خوب جی کھول کر روتا اپنے اس اضطراب کو کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ شرم آتی تھی ، کوئی اور پناہ گاہ تو ملتی نہ تھی، بس اللہ کا گھر میرا مونس ودمساز ہوتا، مبارک پور کی جامع مسجد میں جتنے خوبصورت سبک اور مرصع نقش ونگار ہیں، میں نے ایسے نقش ونگار کہیں اور نہیں دیکھے ،

میں انھیں غور سے دیکھتا، اور جتنا زیادہ دیکھتا، ان کے حسن و جمال میں اضافہ ہوتا رہتا، کبھی کبھی گھنٹوں اسی میں محو رہتا اور اتنی دیر کیلئے اپنا اضطراب بھول جاتا۔

اس اضطراب کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ میں ہر جمعرات کو علم الصیغہ کے گھنٹے کے بعد گھر کیلئے روانہ ہوجاتا، احیاء العلوم میں جمعرات کو بھی دونوں وقت تعلیم ہوتی تھی، مبارک پور سے بھیرہ نو کیلومیٹر پر ہے، اس وقت وہ سڑک بہت خراب تھی اس پر سواریوں کا کوئی خاص نظم نہ تھا، کبھی کبھی یکے دکھائی دیتے تھے، اکا دکا رکشہ بھی نظر آجاتا تھا میرا سفر زیادہ تر پیدل ہی ہوا کرتا، گاؤں کے قریب آکر ٹونس ندی کو بھی پار کرنا ہوتا، کشتی رہا کرتی تھی، ہر جمعرات کو گھر آجاتا، اور جمعہ کا دن گزار کر سنیچر کو اس طرح گھر سے نکلتا کہ کبریٰ کے سبق تک مدرسہ پہونچ جاؤں، کبریٰ کا سبق چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

غالبًا ششماہی امتحان کے بعد میری طبیعت خراب ہوئی، ابتداءً میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا، چلتا پھرتا تھا مگر ٹانگوں میں اور جسم میں کمزوری محسوس ہوتی تھی، قاری صاحب کی درسگاہ پہلی منزل پر تھی، اور اس کی مشرقی کھڑکی مطبخ کی جانب کھلتی تھی وہاں مسالہ بھونا جاتا، یا گوشت پکایا جاتا، تو مجھے بڑی اذیت محسوس ہوتی، جمعرات کو بدقت تمام گھر گیا، والد صاحب سے اس کا ذکر کیا انھوں نے حکیم بشیرالدین صاحب مرحوم کو دکھایا وہ گھبرا گئے، مجھے ان کا لفظ یاد ہے انھوں نے کہا ارے! اس کو تو ’’یرقان اسود‘‘ ہوگیا ہے، ان کا علاج شروع ہوا دو تین ہفتوں تک بلکہ پورے ماہ تک مدرسہ نہیں جاسکا، ایک ماہ کے بعد مدرسہ گیا تو راستے بھر روتا ہوا گیا، پھر کچھ دنوں کے بعد گھر آیا تو دادا جان کی طبیعت بہت خراب تھی، ان کی شدت علالت کی وجہ سے رک گیا اور ان کا ایک ہفتہ کے بعد انتقال ہوگیا۔

انالله وانا اليه راجعون.

اس طرح پڑھائی کا اچھا خاصا نقصان ہوگیا مگر اخیر سال میں محنت کر کے سب کی تلافی کرلی، امتحان میں الحمدللہ کامیابی ہوئی۔

تعلیم باقاعدہ شروع ہوجانے کے بعد مطالعہ کا مشغلہ پھر جاری ہوگیا لیکن پہلے کی

طرح اس کا زور وشور اور انہماک نہ تھا، ایک تو نئے ہونے کی وجہ سے اضطراب کا مستقل آزار تھا، بہت سا وقت اس کی نذر ہو جاتا تھا، دوسرے اس وقت چھوٹا ہونے کی وجہ سے مدرسہ کے کتب خانہ سے حسب دلخواہ کتابیں نہیں مل پاتی تھیں، مانگنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی البتہ انجمن کے کتب خانے سے...... جو بہت چھوٹا تھا...... استفادے کا موقع مل جاتا تھا لیکن وہ روز نہیں کھلتا تھا، اور صرف عصر کے بعد کھلتا تھا، جتنی دیر کھلا رہتا میں اسی میں بیٹھا کتابیں دیکھتا رہتا، جب بند ہوتا تو ایک کتاب لیکر نکلتا ایک کتاب سے زیادہ کی اجازت نہ تھی۔ ابھی عربی کتابوں کے پڑھنے کی صلاحیت نہ تھی اس لئے سارا زور اردو کی کتابوں پر صرف ہوتا، اردو کے رسائل وجرائد جو انجمن کے کتب خانہ میں آتے تھے انھیں بالالتزام پڑھتا تھا، مطالعہ کے باب میں یہ سال میرا بہت کمزور گزرا، تاہم کوئی دن ایسا بھی نہیں گزرا کہ مطالعہ سے خالی رہا ہوں، مطالعہ سے میری مراد دَرْسی کتابوں کے علاوہ کا مشغلہ تھا۔

☆☆☆☆☆

پانچواں باب

عربی سوم (شوال ۱۳۸۵ھ تا شعبان ۱۳۸۶ھ)

پہلا سال پورا ہوتے ہوتے مدرسہ میں جی لگنے لگا، کچھ دوستیاں بھی ہوگئیں۔ سالانہ تعطیل میں گھر پر رہا، گھر پر پڑھنے کی وہی دلچسپیاں برقرار رہیں، اب کتابوں کی تلاش میں حکیم بشیر الدین صاحب مرحوم کے گھر پہونچا، ان کے یہاں کتابیں تو کم تھیں، مگر رسالہ دار العلوم دیوبند کے شمارے بہت تھے، انھیں خوب پڑھا۔ انھیں میں مولانا مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ کا سلسلۂ مضمون ''احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن'' کی متعدد قسطیں پڑھیں، ان کا مضمون مجھے بہت پسند آیا، اس کی جو قسطیں موجود تھیں، میں نے بارہا پڑھیں، بعد میں وہ ساری قسطیں جمع کر کے میں نے کتاب مرتب کردی۔

شوال آیا، تو شروع ہی میں، میں مدرسہ چلا گیا، اب ناظم کتب خانہ سے تعلق ہوگیا تھا، کتب خانہ سے استفادہ کی راہ ہموار ہوگئی تھی۔ کتابیں لے لے کر پڑھنے لگا، اور پڑھ کر واپس کردیتا، تعلیم شروع ہونے تک یہی کام رہا۔ ابھی عربی زبان میں دستگاہ نہیں ہوئی تھی، اس وقت مطالعہ زیادہ تر اُردو کی کتابوں کا ہوتا تھا، کبھی کبھی کوئی فارسی کتاب کتب خانے سے نکال لاتا، مگر اس کے مطالعے میں روانی باقی نہ رہتی۔

اس سال مجھے قدوری، کافیہ، القرأۃ الرشیدہ چہارم، نفحۃ الیمن، شرح تہذیب، ترجمہ کلام ابتدائی پندرہ پارے اور شرح جامی بحث فعل پڑھنی تھی، اسباق کی تقسیم یوں تھی:

القرأۃ الرشیدہ	حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوری	پہلا گھنٹہ
ترجمہ کلام	حضرت مولانا شمس الدین صاحب مبارکپوری	دوسرا گھنٹہ

کافیہ	حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مبارکپوری	تیسرا گھنٹہ
شرح تہذیب	// // //	چوتھا گھنٹہ
قدوری	حضرت مولانا عبد المنان صاحب باسوپاری	پانچواں گھنٹہ
تجوید	مولانا قاری حماد الاعظمی صاحب	چھٹا گھنٹہ

حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ:

اس سال اساتذہ میں دو نام آپ نئے دیکھ رہے ہیں، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب اور حضرت مولانا شمس الدین صاحب۔ جی چاہتا ہے کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب کا تعارف کرادوں، حیران ہوں کہ کن الفاظ سے ان کا تعارف شروع کروں، وہ ایک نادرۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے، باکمال و بے مثال! ان کی شان بہت بلند تھی، مبارکپور کے مضافات میں، اس سے تقریباً تین کلومیٹر دور ایک بستی رسول پور نامی ہے وہیں کے رہنے والے تھے، ان کے والد محترم مولانا احمد حسین صاحب بھی نامور اور دیدہ ور عالم تھے، عرصہ دراز تک ڈھاکہ میں مدرس رہے، ان کے خاندان کے بعض دوسرے حضرات بھی بڑے عالم تھے، ان کے بڑے والد مولانا عبد العلیم صاحب مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں صدر مدرس تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے مولوی عبد الباقی صاحب اعظم گڈھ میں مشہور وکیل اور وکیلوں کے سرپرست تھے، مولانا محمد یحییٰ صاحب اسی علم پرور گھرانے کے ایک فرد تھے۔ ذہانت وفطانت میں فائق، فلسفہ اور علم ہیئت کے امام، ادب ولغت کے ماہر، تفسیر کے بہترین مدرس، نکتہ رس، دقیقہ سنج، ہمیشہ غور وفکر میں ڈوبے ہوئے، بس کیا عرض کروں کہ وہ کتنے عجیب تھے، نکلتا ہوا قد، تیر کی طرح سیدھا، لمبوترا چہرہ، اس پر قدرے اونچی ناک، داڑھی سفید اور ہلکی، رنگ گہرا سانولا، آنکھیں نیم باز، ہونٹ پتلے، لیکن قدرے بڑے جن پر پان کی سرخی نمایاں، دانت موجود تھے، مگر سب پانوں کے رنگ سے رنگین، بدن پر چھینٹ کی شیروانی اور اسی کی ٹوپی، گردن پر چھوٹی سی چادر پڑی ہوئی جس کے کنارے دونوں طرف

سینے پر لٹکتے ہوئے ، پاؤں میں خالطہ پاجامہ جس کی مہری بہت زیادہ چوڑی نہ ہوتی ، خوبصورت جوتا، چلنے میں قدم بالکل برابر رکھتے کہ اگر ناپنے والا ناپے تو شاید ایک سوت کا بھی فرق نہ آئے، بڑی بڑی مسافت اپنے قدم سے ناپ لیتے ،طبیعت بہت نفیس و نستعلیق ہر چیز مرتب ومہذب ، جوتے پاؤں سے نکالتے تو بالکل برابر رکھتے ، ذرا بھی آگے پیچھے نہ ہوتے ، دونوں کے درمیان فاصلہ ہمیشہ یکساں ہوتا۔ پڑھاتے تو تقریر مختصر ہوتی ،مگر عام فہم اور دلنشیں ،صرف مغز بولتے تھے ،مشکل مسائل کونہایت آسان مثالوں سے سمجھا دیتے ،اور مثالیں اتنی دلچسپ ہوتیں کہ آدمی انھیں بھولنا چاہے تو نہ بھول سکے ،مگر اتنی نازک ہوتیں کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا بیان بھی نہ کرسکے فلسفہ کی کتاب ہدیہ سعیدیہ پڑھاتے اور اسے ناول سے زیادہ آسان اور دلچسپ بنادیتے تھے ،طلبہ ان کے سبق کے لئے بےتاب رہتے ، جس سال جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں میرا داخلہ ہوا تھا ، اس سال میرا کوئی سبق ان کے یہاں نہیں تھا۔ لیکن یہ سوچ کر خوشی ہوتی تھی کہ اگلے سال ایک سبق ان کے یہاں ہوگا۔ ان کے اسباق مخصوص تھے ،جنھیں کوئی دوسرا استاذ مانگنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ الاّ یہ کہ وہ خود ہی بخشش کردیں۔ **القرأة الرشيده حصه** چہارم جس کا معیار ادب خاصا بلند ہے ان کا خاص سبق تھا، پھر شش ماہی امتحان کے بعد اسی گھنٹے میں وہ **نفحة اليمن** پڑھاتے تھے۔

اُس سال جب داخلے شروع ہوئے تو دیکھا کہ ان کی درس گاہ جس کی دیواریں ننگی کھڑی تھیں۔ اب انھیں لباس پہنایا جارہا ہے ،مولانا بڑے انہماک سے نگرانی فرمارہے تھے۔ سبق شروع ہوتے ہوتے پلاسٹر کا کام مکمل ہوگیا۔ فرش پر نیا ٹاٹ بچھایا گیا۔ ان کی نشست گاہ کے پاس ایک الماری دیوار میں بنی ہوئی تھی ، اس الماری کے ایک جانب اپنی بیٹھک کی داہنی سمت میں ایک باریک سا گہرا سوراخ بنوایا۔ مستری نے کہا کہ یہ کیوں بنوا رہے ہیں ،فرمایا تم کیا جانو میں کس مصلحت سے بنوا رہا ہوں ، یہ ان کی خاص ادا تھی ، جب کوئی انوکھا کام کرتے اور کوئی پوچھ دیتا تو خفگی کی صورت میں جواب دیتے کہ تم سے کیا مطلب؟ اس وقت مخاطب سمجھ جاتا کہ کوئی ضروری مصلحت ذہن میں ہے۔ پھر انتظار

رہتا کہ اس کی کیا حکمت ظاہر ہوتی ہے۔

ان کے یہاں ہم لوگوں کا پہلا گھنٹہ تھا، وہ اپنے گھر سے روزانہ پیدل چل کر گھنٹے کے وقت مدرسہ میں پہونچ آتے تھے۔ آتے تو پہلے سیدھے دفتر جاتے، وہاں رجسٹر پر دستخط کرتے، وہاں سے درس گاہ میں آتے، دروازے کے باہر کھڑے ہوکر درس گاہ کا ایک جائزہ لیتے، طلبہ انھیں دیکھ کر سلام کرتے، اور قرینے سے بیٹھ جاتے، درس گاہ میں اگر کوئی چیز بے قرینے ہوتی، یا ناپسند ہوتی تو اس پر نگاہ جما کر کھڑے رہتے، اندر نہ آتے، طلبہ سمجھ جاتے کہ کوئی بات قابل گرفت ہے۔ طلبہ ان کی نگاہ دیکھتے اور مرکز نگاہ دیکھتے اور تاڑ لیتے کہ فلاں چیز غیر مرتب ہے۔ اس کی فوراً اصلاح کردی جاتی، تب تشریف لاتے، ایک روز تشریف لائے اور درس گاہ کے اندر داخل نہیں ہوئے، ایک کنارے جہاں جوتا اتارتے تھے، وہاں کھڑے ہوگئے اور غور سے نشست گاہ کے بائیں طرف والی تپائی کے پاس فرش پر نگاہ جمادی، ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بات ہے؟ تپائی ٹھیک تھی، مگر اسے کچھ ادھر اُدھر کرکے مزید درست کردیا گیا، مگر اب بھی کھڑے ہیں، نہ کچھ بولتے اور نہ کچھ حرکت کرتے، ہم لوگوں کو بڑی گھبراہٹ ہوئی کہ الٰہی خیر! کہیں ناراض نہ ہونے لگیں، وہ فرش پر دیکھ رہے تھے، ہم لوگوں نے بھی وہاں نگاہ جمادی تو دیکھا کہ کچھ سفید سفید دانے شکر کے پڑے ہوئے ہیں۔ جلدی سے انھیں چن لیا گیا، تو اپنی جگہ تشریف لائے، اس واقعہ نے طلبہ کو اتنا چوکنا کردیا کہ ان کے آنے سے پہلے درس گاہ میں ایک تنکا بھی پڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر شاید سال بھر ہم لوگوں کے سامنے اس کی نوبت نہیں آئی۔

مولانا پان کھاتے تھے اور ان کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا۔ وہ پان کے اندر چونا اور کتھا کو ایک ساتھ ملادینے کے قائل نہ تھے، کہتے تھے کہ اس طرح پان سڑ جاتا ہے اور خراب ہوجاتا ہے، وہ دن بھر کے لئے گھر سے پان لگا کر خاصدان میں بھر کر لاتے تھے۔ بازار کا پان بالکل نہیں کھاتے تھے، اور حتی الامکان اپنا پان کسی کو نہیں دیتے تھے کہ اور لوگ تو ہر طرح کا پان کھالیتے ہیں، اور مولانا نپی تلی تعداد لاتے تھے۔ ان کے یہاں پان کا بیڑا بنانا

ایک فن تھا، پان اس طرح موڑا جاتا تھا کہ کتھا اور چونا ایک دوسرے سے نہ ملیں، اس طرح پان خواہ کتنی دیر تک خاصدان میں رہتا خراب نہ ہوتا، اور لذت اس کی یکساں برقرار رہتی۔

مولانا نے اپنے ذوق کے لحاظ سے اگالدان کا بھی انتظام کیا تھا، دو اگالدان تھے، ایک پیتل کا نہایت صاف شفاف جس پر کہیں پان کی پیک کی ہلکی سی بوند بھی نہیں ہوتی تھی۔ اسے اس وقت استعمال کرتے جب چارپائی پر استراحت فرماتے، مولانا کھانسی کے مریض تھے، اکثر بلغم کے اخراج کی ضرورت پیش آتی، اس لئے وہ اگالدان چارپائی کے پاس اس طرح رکھا رہتا کہ تھوکنے میں ذرا بھی تکلف نہ ہو، دوسرا اگالدان مٹی کی ہانڈی کا تھا، یہ ہانڈی بھی نہایت صاف ستھری تھی، اس میں آدھی مقدار تک اوپلے کی راکھ رکھ لی تھی۔ اپنی نشست گاہ میں بیٹھتے تو اسے استعمال کرتے، ایک دن درس گاہ میں تشریف لائے، تو اپنے جھولے سے ایک لکڑی ایک بالشت کے بقدر پتلی سی گول بنائی ہوئی نکالی، اس کا ایک سرا نوک والا تھا اور دوسرے سرے پر چھوٹا سا دھاگا باندھ رکھا تھا، انھوں نے لکڑی کو اس سوراخ میں ڈال دیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، وہ لکڑی اس سائز سے بنی ہوئی تھی کہ سوراخ اس سے بالکل پُر ہوگیا اور دھاگا باہر لٹکتا رہا، ہم لوگوں نے یہ عمل تو دیکھا لیکن کس کی ہمت تھی کہ جو اس کی حکمت دریافت کرتا۔ انتظار تھا کہ وہ خود ہی ظاہر کریں گے۔ سبق ختم ہوا، تو انھوں نے لکڑی نکالی اور ہانڈی والے اگالدان میں اسے ڈال کر اٹھایا تو پان کی پیک جو راکھ پر پھیل پھیل کر پپڑی جیسی بن گئی تھی وہ بالکل صاف اوپر اٹھ آئی، اور باقی راکھ بے داغ بچ گئی۔ اسے ایک طالب علم کے حوالے کیا کہ باہر پھینک آؤ، تب اس سوراخ اور اس لکڑی کی حکمت سمجھ میں آئی۔

مولانا کے یہاں چھوٹی چھوٹی چیزوں کا بھی بہت معقول نظم تھا، یہی ان کا مزاج تھا، ان کو اس میں تکلف نہ ہوتا، ان کی ذہانت اس میں عجیب عجیب جدت طرازیاں کرتی، ایک مرتبہ ان کے پاس دور سے غالباً الہ آباد سے ایک صاحب آئے، طلبہ میں یہ خبر عام ہوئی کہ ان کے شاگرد ہیں، وہ گلوب بنانے کے ماہر تھے، مٹی کا گلوب بنا کر اس پر ساری دنیا کا نقشہ بنایا کرتے تھے، انھیں اس سلسلے میں مولانا سے کچھ دریافت کرنا تھا، مولانا بازار میں

غبارے کی دکان پر تشریف لے گئے، اور ایک غبارہ گلوب کی شکل کا خریدا، اور اس میں ہوا بھر کر پوری دنیا کا، اس کے براعظموں کا، اس کے سمندروں کا نقشہ بنا کر جو چیز انھیں دریافت کرنی تھی، اسے حل کر دیا، اور اس کی ہوا نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔

مولانا کو روشنائی بنانے میں کمال حاصل تھا، ایسی پکی روشنائی بناتے تھے کہ مٹائے نہ مٹتی تھی، دھوئے نہ دھلتی تھی۔ اس روشنائی سے لکھے ہوئے حروف پر خواہ کتنا ہی پانی پڑ جائے، یا اس پر کتنی ہی مدت گذر جائے، اس کی آب وتاب میں کمی نہ آتی تھی، مولانا بہت عمدہ خطاط بھی تھے، ساتھ ہی نہایت ماہر فن جلد ساز بھی تھے، ان کے ہاتھ کی باندھی ہوئی جلدیں اتنی خوبصورت اور مضبوط ہوتی تھیں کہ پرانے جلد ساز بھی دیکھ کر متحیر رہ جاتے تھے، لیکن اپنے فن کے سلسلے میں مشہور تھا کہ انھیں بخل ہے، کسی کو سکھاتے نہیں تھے۔ مبارک پور میں ایک جلد ساز تھا اس نے بہت کوشش کی کہ مولانا سے کچھ سیکھ لے مگر کامیاب نہ ہوا، وہ سکھاتے تھے مگر ان کے ذہن میں غالبًا کچھ شرطیں تھیں۔

قلم بھی خوب بناتے تھے، ان کے داماد نے ان سے خطاطی سیکھنی چاہی تو فرمایا کہ سرکنڈے لاؤ، وہ قلم کی سائز کے سرکنڈے لائے، مولانا نے انھیں دیکھا تو فیل کر دیا کہ ان میں سے کوئی بھی قلم بنانے کے لائق نہیں، پھر انھوں نے اسکے گُر بتائے۔

جو کچھ وہ بنا دیتے تھے وہ نمونہ کی چیز ہوتی، اور جس چیز کی انھیں دھن ہو جاتی، اس میں عجیب عجیب باریکیاں نکالتے، ایک مرتبہ چونا اور کتھا وغیرہ رکھنے کیلئے مٹی کی بہت خوبصورت کلھیا بنائی، اس کی مٹی میں خدا جانے کیا کیا مسالے استعمال کئے کہ آگ میں پکنے کے بعد خوب مضبوط ہو، اسے ایک متعین وقت تک دھوپ میں رکھتے، پھر سائے میں محفوظ رکھ دیتے، اس کا ذکر مولانا نے ہم لوگوں سے بھی کیا تھا، ایک روز درس گاہ میں آ کر بیٹھے تو کتاب نہیں کھولی چہرے پر رنج وملال کے آثار تھے، مولانا جب کسی سوچ میں ہوتے، تو ان پر استغراق کی کیفیت طاری ہو جاتی، کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمانے لگے کہ ”توڑ دیا، کچھ سوچا بھی نہیں۔ توڑ دیا، کم از کم پوچھے ہوتا کہ یہ کیا ہے“؟ انھیں الفاظ کو وہ تھوڑے

وقفے سے دہراتے رہے، ہمارے ساتھیوں میں ایک صاحب مولانا سے ذرا بے تکلف تھے، انھوں نے پوچھ لیا کہ کیا توڑ دیا؟ انھوں نے بتایا کہ ایک عورت اپنے بچے کو ساتھ لے کر ان کے گھر آئی تھی، وہ بچہ کھیلتے کھیلتے ان کلھیوں کے پاس گیا اور مولانا کی ساری محنت اس نے اکارت کردی، اسی پر مولانا کو افسوس ہورہا تھا، مولانا کی استغراقی کیفیت اکثر ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ ایک بار اپنے مکان کے کسی حصے کی تعمیر کرارہے تھے، دوپہر کے وقفے میں انھوں نے تعمیری کوئی سامان دے کر ہم چند ساتھیوں کو گھر بھیجا، سامان پہونچا کر ہم لوگ آرہے تھے کہ راستے میں دیکھا کہ مولانا بھی تشریف لارہے ہیں، انھوں نے مدرسہ سے چھٹی لے لی تھی، مولانا کو دیکھا تو ہم لوگ رک گئے۔ مولانا بھی کھڑے ہوگئے، اور کہا کہ ایک چیز بھول آیا ہوں، کھڑکی بن رہی ہے، اس کے لئے سریا لینی تھی، سریا کا ایک چھوٹا سا نمونہ نکالا کہ فلاں دکان پر جاکر اتنی موٹی سریا تین تین فٹ کی بارہ لے لینا، اتنے میں وہ کچھ سوچنے لگے، اب وہ سوچے جارہے ہیں اور کہے جارہے ہیں کہ، تین تین فٹ کی بارہ تین تین فٹ کی بارہ، پانچ سات منٹ تک یہی دہراتے رہے، اس سے افاقہ ہوا تو فرمایا کہ دیکھو یہ تھوڑی سی چپٹی ہے، تم جو لینا وہ گول گول ہو، چپٹی نہ ہو، گول گول ہو چپٹی نہ ہو، اسے دس منٹ تک دہراتے رہے اور پھر فرمایا کہ کہ اچھا جاؤ۔

مولانا کی مبارک پور میں ایک حافظ صاحب سے دوستی تھی، انھیں بھی باتوں میں استغراق ہوتا، گرمی کا موسم تھا، مولانا عصر کے بعد گھر جارہے تھے، ان حافظ صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ ایک طرف کھڑے ہوکر باتیں کرنے لگے، مغرب کی اذان ہونے لگی، نماز کے بعد مولانا نے کہا کہ اب گھر چلتا ہوں، حافظ صاحب نے کہا کہ چلئے کچھ دور پہونچادوں، پھر دونوں کو خبر نہیں رہی کہ کہاں تک پہونچے، یہاں تک کہ رسول پور آگیا۔ حافظ صاحب لوٹنے لگے تو مولانا انھیں کچھ دور پہونچانے چلے یہاں تک کہ مبارک پور آگئے، اسی آمدورفت میں رات پوری ہوگئی، نہ یہ اپنے گھر گئے نہ وہ، پھر مولانا مدرسہ میں آگئے۔

ایک مرتبہ دیکھا کہ مولانا اوپر اپنی درس گاہ میں جانے کیلئے زینہ چڑھ رہے ہیں،

دوتین زینہ چڑھے ہوں گے کہ مولانا قاضی اطہر صاحب کے فرزند حاجی ظفر مسعود کتاب لے کر اوپر جانے کیلئے آ گئے، مولانا کھڑے ہوگئے اور ظفر مسعود ہدایہ اخیرین کی جلد لئے نیچے کھڑے ہوگئے، مولانا کچھ فرمانے لگے، کھڑے کھڑے تھک گئے تو وہ بیٹھ گئے۔ ظفر مسعود کھڑے رہے اسی میں گھنٹہ ختم ہوگیا۔

مولانا ستاروں کے سلسلے میں بڑی معلومات رکھتے تھے، کبھی رات کو مدرسہ میں رہ جاتے تھے اور طلبہ یا اساتذہ ان کے پاس ہوتے، تو انھیں بہت سے ستاروں کی شناخت کراتے، رات میں بہت کم سوتے تھے، مولانا شعبدوں کے بھی ماہر تھے۔ ایک مرتبہ اپنی ہتھیلی پر تیل رکھا تو وہ دوسری طرف ظاہر ہونے لگا۔ ایک سینک ہتھیلی میں چبھوئی تو وہ ہاتھ کے نیچے سے نکلتی محسوس ہوئی، فرمایا کہ یہ شعبدہ ہے اس میں کچھ کمال نہیں ہے۔

چھوٹی چھوٹی چیزوں پر مولانا کی نگاہ خوب رہتی، اور اس کا ہم لوگوں کو بھی خوگر بناتے، تعلیم کے سلسلے میں بھی مولانا کا حال یہی تھا۔ سبق میں وہ باتیں جنھیں عموماً زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، مولانا بہت اہتمام سے ان کی وضاحت کرتے، عربی جملوں میں حروف جارہ جنھیں ’’صلہ‘‘ کہتے ہیں ان کے استعمال کی اہمیت اور ان کے مختلف مواقع میں استعمال کرنے سے معانی میں جو فرق پیدا ہوتا ہے، اس میں خوب پُختہ کر دیتے، چھوٹی چھوٹی گُر کی باتیں خوب بتاتے تھے۔

مولانا دمہ کے مریض تھے، اس بیماری کے علاوہ عموماً ان کی صحت اچھی تھی، ان کی زندگی ایک نظام اور دستور کی پابند تھی، کھانا پینا، سونا اٹھنا، سب باقاعدہ تھا، اور ان کو اپنے اصولوں بلکہ صحیح لفظوں میں اپنے نفس پر بہت قابو تھا، ہر کام ناپ تول کر کرتے تھے، باتیں بہت سوچ کر کرتے تھے۔

ہم لوگوں کو **القرأۃ الرشیدہ** حصہ چہارم پڑھائی، طالب علم کو مطالعہ کا پابند کرتے تھے۔ خود کم بتاتے تھے، مگر جو کچھ بتاتے تھے وہ اتنے گُر کی بات ہوتی کہ اس سے بہت سی گرہیں کھلتیں۔ بہت سی گتھیاں سلجھتیں۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں غور وتدبر کا مادہ انھیں بخشا تھا،

وہیں سمجھانے بلکہ یاد کرانے کا بھی ملکہ عطا فرمایا تھا، پہلا گھنٹہ ان ہی کی خدمت میں تھا، ان کی درس گاہ میں جاتے ہوئے خوشی ہوتی تھی۔

حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب علیہ الرحمہ کی ولادت ۱۳۲۸ھ میں ہوئی تھی۔ ابتدائی نوشت وخواند گھر پر والدہ ماجدہ سے سیکھی، پھر جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخل کیے گئے، حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوری، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری اور حضرت مولانا محمد صدیق صاحب برئی پوری وغیرہ سے عربی کی کتابیں قدوری تک پڑھیں۔ اس وقت ان کے والد ماجد ڈھاکہ میں رہتے تھے، ان کے ساتھ ڈھاکہ گئے اور متوسطات تک تعلیم وہاں حاصل کی۔ پھر مدرسۃ الشرع سنبھل اور اس کے بعد مدرسہ اسلامیہ امروہہ میں داخل ہوئے، اور وہیں مولانا انوار الحق صاحب امروہوی اور دیگر اساتذہ سے پڑھ کر سند تکمیل حاصل کی، امروہہ ہی میں طب وحکمت کی تعلیم مولانا حکیم محمد اسمٰعیل صاحب عباسی سے حاصل کی، اس کے بعد دار المبلغین لکھنؤ میں حضرت مولانا عبد الشکور صاحب امام اہلسنت ؒ سے پڑھا، اسی درمیان قدرے انگریزی بھی سیکھی، علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت رکھتے تھے، معقولات میں منطق وفلسفہ، ہیئت، ریاضی، مناظرہ، مرایا اسطرلاب کے جامع تھے، علم ہیئت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ فقہ، تفسیر، حدیث، معانی وبلاغت اور عربی ادب میں پوری مہارت رکھتے تھے، عربی کے بڑے اچھے شاعر تھے۔

انھوں نے تعلیم وتدریس کے ساتھ قدرے تصنیف کا کام بھی کیا ہے، کچھ علمی وتحقیقی مقالات شائع بھی ہوئے ہیں۔ علم صرف کے مشہور فارسی متن ”زبدہ“ کی اردو میں عمدہ کے نام سے ایک شرح ڈھاکہ میں طالب علمی کے زمانے میں لکھی تھی اور رفاہ عام پریس گورکھپور میں چھپی تھی۔ ایک رسالہ تحقیق رویت ہلال اور اختلاف مطالع کے نام سے لکھا، اس رسالہ میں رویت قبل زوال اور بعد زوال، تشکلات قمریہ، کسوف خسوف، اختلاف مطالع وغیرہ کا ذکر ہے، یہ پورا رسالہ فتاویٰ ثنائیہ جلد اول میں چھپا ہے، شرح سبعہ معلقہ عربی ناتمام، اور اس کے علاوہ دائمی جنتری اور دائمی نقشہ اوقات مرتب کیا تھا۔

مولانا دبلے پتلے تھے لیکن ہڈیاں چوڑی تھیں، زندگی بہت پابند اصول اور محتاط تھی، اس لئے عموماً بیمار کم ہوتے تھے، مگر سل اور دق کا مرض مستقل تھا۔ یہ احتیاط ہی کا اثر تھا کہ باوجود اس مہلک مرض کے کھانستے کھنکھارتے بہت کم تھے۔

۱۳۸۷ھ کا سال تھا، اس سال ہم لوگوں کی کوئی کتاب مولانا کے درس میں نہ تھی، لیکن پچھلے سال چونکہ ان کے یہاں مستقل حاضری رہ چکی تھی، اس لئے باوجود ان کے رعب کے اکثر حاضری ہوتی رہتی تھی۔

ایک دن شام کو سنا کہ مولانا کی طبیعت خراب ہے، آج گھر نہیں گئے ہیں، مولانا معمولاً ہمیشہ شام کو پیدل ہی گھر تشریف لے جاتے تھے، آج معلوم ہوا کہ مدرسہ میں رہیں گے، ہم لوگ رات میں حاضر خدمت ہوئے۔ طبیعت نحیف تھی، خاموش لیٹے ہوئے تھے۔ رات میں ہوشیار طلبہ کی ڈیوٹی لگی کہ مولانا کے پاس رہیں، مجھے اس دن بہت دکھ ہوا کہ میرا شمار ہوشیار اور کارآمد طلبہ میں نہ تھا۔ اس لئے اس خدمت سے برطرف رہا۔ اپنی اس نالائقی پر ہمیشہ نالاں رہا کہ اساتذہ کی خدمت کا سلیقہ نہ تھا اور اس کی سمجھ نہ تھی، غالباً دو تین روز تک مولانا مدرسہ میں ہی علیل رہے، امتحان ششماہی قریب تھا، طلبہ دیر رات تک پڑھتے تھے، میں اس رات شاید پوری رات جاگتا رہا، صبح صادق کے وقت مولانا کے خدمت گزاروں میں سے ایک طالب علم دوڑتا ہوا آیا کہ مولانا کی طبیعت زیادہ خراب ہے، میں دوڑتا ہوا پہونچا، چہرے کی کیفیت دیکھ کر فوراً سمجھ گیا کہ یہ آخری وقت ہے، اس سے کچھ ہی دنوں پہلے میں نے اپنے دادا مرحوم کو نزع کی کیفیت میں دیکھا تھا، وہی کیفیت مجھے مولانا کے چہرے پر بھی معلوم ہوئی۔ یاد نہیں کون صاحب سورۂ یٰسین پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ایک ہلکی سی ہچکی محسوس ہوئی اور زندگی کی آخری سانس باہر آگئی، اور پھر دروازہ بند ہوگیا، اس آسانی سے دم نکلا کہ لوگوں کو احساس ہی نہیں ہوا۔

جب یہ یقین ہوگیا کہ روح قید حیات سے آزاد ہوگئی، تو مدرسہ میں ایک سوگواری پھیل گئی۔ فجر کی نماز کے بعد مولانا کے جسد خاکی کو طلبہ واساتذہ نے اپنے کندھوں پر اٹھایا،

بدن پھول جیسا ہلکا تھا، بہت سکون واطمینان کے ساتھ رسول پور پہونچادیا۔ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ کی نماز پڑھی گئی، اور علماء وصلحاء کے ہاتھوں دفن کئے گئے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو روح وریحاں سے نوازے۔ آمین

مولانا کا انتقال ۱۱ر صفر ۱۳۸۷ھ کو بروز دوشنبہ ہوا۔ ہم لوگوں کو بہت صدمہ ہوا۔ خاص طور سے اس بات کا شوق تھا کہ اگلے سال مولانا کے درس میں پھر حاضری ہوگی، مگر وہ خوشی جاتی رہی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی روح کو دائمی خوشی عطا فرمائیں۔

کلام اللہ شریف کا ترجمہ حضرت مولانا شمس الدین الحسینی نور اللہ مرقدہٗ پڑھاتے تھے، مولانا بہت محنت سے مطالعہ کرتے تھے، اور بہت محبت وشفقت سے پڑھاتے تھے، بہت منکسر المزاج تھے، کسی قدر نسیان کا اثر ذہن ودماغ پر تھا، باتیں بھول جاتے تھے، اسی لئے مطالعہ مکرر سہ کرر کیا کرتے تھے، کوئی چیز اگر بھول جاتے اور کوئی طالب علم یاد دلاتا تو بہت شکر گزار ہوتے، احسان مندی کے اظہار میں انھیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا، مولانا مدرسہ کے نائب ناظم تھے، ان کی مشغولیات بہت تھیں، مگر پورے سال سبق کی پابندی کی، پندرہ پارے کا ترجمہ انھوں نے پڑھایا اور بہت اچھا پڑھایا۔

قدوری حضرت مولانا عبد المنان صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں ہم لوگ پڑھتے تھے، یہ ان اساتذہ میں سے تھے، جو پڑھاتے نہیں بلکہ گھول کر پلاتے ہیں، بہت دلچسپ اور آسان انداز تھا ان کے پڑھانے کا، ان کے یہاں کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ دن بھر ان کی گھنٹی کا انتظار رہتا تھا، قدوری بقدر نصاب ہوچکی تھی...... نصاب **کتاب العتاق** تک تھا ...... اور ابھی وقت بہت بچ گیا تھا، اگر چاہتے تو پوری کتاب ختم کرادیتے، مگر ہم لوگوں نے درخواست کی کہ اگلے سال اصول فقہ کی پہلی کتاب نور الانوار دفعۃً آجائے گی، اصول الشاشی وہاں نصاب میں نہ تھی، عرض کیا گیا کہ سالانہ امتحان تک جتنا وقت ہے اس میں اصول الشاشی پڑھادیں، تاکہ اصول فقہ سے فی الجملہ مناسبت پیدا ہوجائے، مولانا کو طلبہ کی رعایت خاطر کا بہت لحاظ تھا، انھوں نے خوشی سے قبول کرلیا، اور اصول الشاشی کا درس شروع ہوگیا، کیا

مزے کا پڑھاتے تھے، کتاب کچھ مشکل نہ معلوم ہوئی، فن سے مناسبت کے آثار ظاہر ہونے لگے، کتاب پوری تو نہیں ہوئی، مگر اس کا معتد بہ حصہ پڑھا دیا، اور ہم لوگوں کو بڑی مسرت ہوئی۔

نوجوان اساتذہ میں ان دنوں حضرت مولانا محمد مسلم علیہ الرحمہ اور حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مدظلہ طلبہ کے درمیان بہت مقبول اور معروف تھے، دونوں کی طبیعت، دونوں کا مزاج، اندازِ تعلیم، طرزِ تربیت سب کچھ جداگانہ تھا، مگر طلبہ کو دونوں سے مناسبت تھی، دونوں طلبہ پر بہت شفیق تھے، مگر ایک کی شفقت قدرے جلال لئے ہوئے تھی، اور ایک کی شفقت سراپا جمال تھی۔ اس سال حضرت مولانا محمد مسلم صاحب کے درس میں ہم لوگوں کی کوئی کتاب نہ تھی، اس کا افسوس رہا کرتا تھا، مگر حضرت مولانا جمیل احمد صاحب کے درس میں دو کتابیں تھیں، جس کی بڑی خوشی تھی، مولانا ہم لوگوں کو کافیہ اور شرح تہذیب پڑھاتے تھے، مولانا کے درس کا انداز اور اساتذہ سے ذرا مختلف تھا، جتنا پڑھانا ہوتا، مولانا بہت محنت سے اس کا مطالعہ کرتے، پوری تقریر ذہن میں مرتب کرتے، مطالعہ کی کتاب جو عموماً ان کی ذاتی ہوتی، اس پر جابجا تقریر کے خاص خاص اشارات بہت اختصار سے نوٹ کر لیتے، تحریر مولانا کی بہت پاکیزہ تھی، بین السطور یا حاشیہ میں ان کی صاف ستھری تحریروں کا نقش اب بھی ذہن میں مرتسم ہے، ان تحریروں کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی تھیں، ان اشارات سے معانی کی گتھیاں سلجھتی تھیں۔ درسگاہ میں تشریف لاتے، درس کی جگہ بیٹھ جاتے، طلبہ قرینے سے اپنی اپنی جگہ لے لیتے، حکم ہوتا عبارت پڑھو، عبارت پڑھی جاتی، عبارت کی غلطیوں کو سرسری انداز میں بتاتے جاتے، چہرے پر کبیدگی کی شکنیں بہت کم پڑتیں، عبارت پوری ہوتی، اور مولانا کی مرتب اور مرصع تقریر ایک خاص آہنگ میں شروع ہو جاتی، ایک ایک بات کو اس خوبی اور عمدگی سے سمجھاتے کہ دل مین اترتی چلی جاتی، مولانا ہر بات کو تین مرتبہ سمجھاتے اور انھیں الفاظ میں سمجھاتے، جن الفاظ کو وہ پہلی مرتبہ بول چکے ہوتے، ذہین طلبہ تو پہلی ہی مرتبہ کی تقریر میں بات سمجھ جاتے، دوسری اور تیسری مرتبہ کی تقریر بسا اوقات انھیں

زائد معلوم ہوتی، لیکن عام طلبہ کے لحاظ سے وہ بہت مفید ہوتی، چونکہ الفاظ بھی مکرر ہوتے تھے، اس لئے طلبہ کو الفاظ تک یاد ہو جاتے تھے، درس کا یہ طریقہ ذرا صبر آزما ہے مگر بہت مفید ہے۔ ایک بات کی جب تقریر ہو چکتی، تو کتاب میں اتنی عبارت کا ترجمہ کر دیتے، پھر آگے تقریر شروع کرتے، اس طرح ہر ہر مسئلہ کو الگ الگ کر کے ذہن نشین کراتے۔

مولانا کی آنکھوں میں حیا بہت تھی، وہ عموماً تمام طلبہ کے چہروں پر نگاہ نہیں ڈالتے تھے، ان کے ارد گرد تین تپائیاں ہوتیں، سامنے کی تپائی پر دائیں اور بائیں ان کی نگاہ گھومتی رہتی، جو طلبہ دائیں اور بائیں طرف کی تپائیوں پر کتابیں رکھے بیٹھے ہوتے ان پر کبھی کبھی کوئی خاص بات ہوتی، تو نگاہ پڑتی، ورنہ وہ عموماً محروم رہتے، میں مولانا کے بائیں طرف بالکل دیوار سے لگ کر بیٹھتا، دیوار میں ایک الماری تھی، میں درس کی کتاب تو تپائی پر رکھتا، اور غیر درسی کوئی کتاب جو اس وقت زیر مطالعہ ہوتی الماری میں کھول کر رکھ لیتا، مولانا کی پہلی تقریر میں بہت غور سے سنتا، پہلی ہی مرتبہ وہ تقریر نہ یہ کہ سمجھ میں آجاتی، بلکہ یاد بھی ہو جاتی، جب دوسری مرتبہ مولانا کی تقریر شروع ہوتی، تو میں غیر درسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہو جاتا، اس طرح دو کتابوں کی خواندگی وقفے وقفے سے ہوتی رہتی، میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولانا کو خبر نہیں ہوتی تھی، لیکن یہ ہے کہ مولانا کا تحمل بہت بڑھا ہوا تھا، اور ہم لوگ اس کا فائدہ اٹھا لیا کرتے تھے۔

کافیہ صبح کے آخری گھنٹے میں تھی، اور شرح تہذیب غالباً شام کے آخری گھنٹے میں، گرمیوں میں مدرسہ کا وقت صرف صبح کا ہوتا، مولانا نے محسوس کیا کہ شرح تہذیب میں طلبہ کمزور ہیں، اول تو منطق کی کتاب! منطق سے طلبہ یونہی دلچسپی کم تھی، پھر تہذیب اور اس کی شرح دونوں الجھی ہوئی تحریر! مولانا نے بجا محسوس کیا، فرمایا کہ جب تک ایک وقت مدرسہ ہے، ظہر کے بعد عصر سے ایک گھنٹہ پہلے میرے گھر آجایا کرو، شرح تہذیب جہاں تک ہو چکی ہے، دوبارہ پڑھا دوں گا، چھٹی کے وقت پڑھی ہوئی کتاب کو دوبارہ پڑھنا طلبہ کے لئے بہت گراں ہوتا ہے، مگر مولانا کے پاس ہم لوگوں کے لئے ایسی دلچسپیاں جمع تھیں، کہ گرانی ہونا

کیا معنی؟ سب کو خوشی ہوئی، مولانا کا مکان مدرسہ سے قدرے فاصلے پر پورہ دلہن میں تھا، پڑھنے کیلئے اس سے بھی آگے جانا تھا، گرمیوں کی تمازت میں وہاں تک جانا ایک کارِ دشوار تھا، مگر ایک تو مولانا کی شفقت ومحبت، دوسرے جہاں جانا تھا وہ مولانا کا آموں کا باغ تھا، خوب گھنا سایہ، ٹھنڈا پانی، پھر مولانا کی طرف سے آموں کی حلاوت! طلبہ بخوشی کشاں کشاں جاتے، تعلیم کی تعلیم ہوتی اور تفریح کی تفریح ہوتی، ایک مہینہ کا وقت یوں آنکھوں میں نکل گیا جیسے ابھی چند دن ہوئے ہیں، سبق روز ہوتا، اس میں تفریح کی وجہ سے کوئی کمی نہ ہوتی، شرح تہذیب کا خطبہ والا حصہ تو گویا زبانی یاد کرادیا، ان کی یہ محنت امتحان میں بہت کام آئی۔

عربی سوم کے نصاب میں اس وقت عربی کی پانچ کتابیں تھیں، ترجمہ کلام پاک کے ابتدائی پندرہ پارے (۲) قدوری (۳) کافیہ (۴) القرأۃ الرشیدہ رابعہ بعدہ نفحۃ الیمن (۵) شرح تہذیب، ایک گھنٹہ خالی ہوتا تھا، پڑھنے والے چاہتے تو اس گھنٹے میں تجوید وقرأت پڑھتے، اور چاہتے تو گھنٹہ خالی ہی رہتا، عموماً طلبہ تجوید کے سبق میں شریک ہوتے۔

تجوید کے استاذ مولانا قاری حماد الاعظمی تھے، ایک سال پہلے ان کا مدرسہ میں تقرر ہوا تھا، دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد یہاں مسند درس پر تشریف لائے ان کا درس طلبہ میں مقبول تھا بہت محنت سے پڑھاتے تھے، مگر ساتھ ساتھ طلبہ کے مزاج کی رعایت بھی کرتے تھے، میں تو پچھلے سال ہی سے ان کے درس میں شریک تھا، آج جو کچھ حروف کی ادائیگی ہوجاتی ہے اور مخارج وصفات کا لحاظ ہوجاتا ہے انھیں کے درس کا فیض ہے، اس درس میں قرآن کریم کے مختلف رکوعات کی مشق ہوئی، کتابیں پڑھیں، مگر قرأت حفص کے مطابق پورے قرآن کا اجراء بصورت حدر نہیں ہوسکا۔

میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں شوال ۱۳۸۳ھ میں داخل ہوا تھا، اس وقت میری عمر ۱۳؍سال تھی، عربی دوم میں داخلہ ہوا تھا، عربی سوم میں داخلہ ہوا تو میں عمر کے چودھویں سال میں داخل ہوچکا تھا، عمر کا یہ مرحلہ بڑا نازک ہوتا ہے، اسی مرحلے میں بگڑنے کا بہت اندیشہ ہوتا ہے، مدرسہ میں تربیت ونگرانی کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا، ایک ماحول تھا اسی میں بہت

سے طلبہ بن بھی جاتے تھے اور بعض بگڑ بھی جاتے تھے، مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا، اور جو بھی مل جائے اسے پڑھنے کا جنون تھا اس مرحلے میں چند غلط قسم کی صحبتوں کا شکار رہا، اس سے بہت نقصان ہوا یہ غلط صحبتیں پڑھنے کے شوق ہی کی راہ سے آئیں۔

اس کی تفصیل بقدر ضرورت یہ ہے کہ مدرسہ کے طلبہ کی مشق تقریر کیلئے انجمن بنام جمعیۃ الطلبہ قائم تھی، اس کی ایک اپنی لائبریری بھی تھی، کتابوں کا شوق مجھے اس لائبریری تک لے گیا، سال کے شروع میں انجمن کے ناظم وصدر کا انتخاب ہوتا، انتخاب کا یہ عمل طلبہ میں اختلاف اور جھگڑے کا ذریعہ بنتا تھا، چنانچہ عربی سوم کے سال اس اختلاف نے ایک سنگین صورت اختیار کرلی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسہ سے ۱۳؍طلبہ کا اخراج ہوگیا، جو صاحب انجمن کی نظامت کے عہدے پر پچھلے سال سے فائز تھے، وہ ناظم صاحب کے خادم خاص تھے، ان کے جو لوگ مخالف تھے ان کا اخراج ہوگیا، میں ناتجربہ کار اور بے وقوف لڑکا تھا، اختلاف کے جال میں میں بھی پھنسا، مجھے لائبریری کا ناظم بنادیا گیا، میں خوش تھا کہ لائبریری کی ساری کتابیں میرے تصرف میں ہیں، خوب جی بھر کر پڑھوں گا، اور پڑھا بھی میں نے خوب، لیکن اس کے علاوہ اور جو کچھ مجھے بھگتنا پڑا وہ ناگفتنی ہے، اس کی کچھ جھلکیاں آئندہ آئیں گی۔

اس دور میں مجھے عربی سے زیادہ اردو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، نثر تو خوب پڑھ لیتا اور سمجھ لیتا مگر شاعری کے سمجھنے میں کورا تھا، اشعار بالخصوص غزل کے اشعار میرے پلے نہ پڑتے تھے، اس وقت مدرسہ میں ایک طالب علم تھا جس کو اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے اور وہ سمجھتا بھی خوب تھا میری حرص اس کے پاس مجھے لے گئی، میں نے درخواست کی کہ غالبؔ اور مومنؔ کے اشعار مجھے سمجھادے، اس نے قبول کرلیا، لیکن ساتھ ہی مشورہ دیا کہ تم ''ادیب'' کے امتحان کے لئے فارم بھردو، نثر میں تمھیں کچھ محنت نہیں کرنی ہے، نظم میں پڑھادوں گا، کچھ فلاں صاحب سے پڑھ لینا، وہ باقاعدہ کلاس کے تحت اسے پڑھاتے ہیں، مجھے تو پڑھنے کا جنون تھا، میں نے بے تامل ان کی بات مان لی، ادیب کا فارم بھرنے کیلئے فوٹو کی ضرورت تھی، میری طبیعت فوٹو سے ہچکچائی، فوٹو تو جائز نہیں ہے، اس طالب علم نے مجھے سمجھایا اور میں

تیار ہوگیا، مبارک پور میں اس وقت کوئی فوٹو گرافر نہ تھا اس کیلئے اعظم گڑھ جانا تھا وہی طالب علم مجھے اپنے ساتھ اعظم گڑھ لے جانے کیلئے تیار ہوا، اتنا پیسہ نہ تھا کہ ہم لوگ کرایہ خرچ کر کے اعظم گڑھ جاتے، پیدل ہی نکل گئے، وہاں ایک فوٹو گرافر کی دکان سے وہ واقف تھا، فوٹو کھنچوایا، اور پیدل ہی واپس آگئے، فارم بھر دیا گیا اور دیوان غالب ومومن اور کلیات اقبال کا درس شروع ہوگیا اس امتحان کی تیاری کی نحوست یہ ہوئی کہ درسیات سے بے اعتنائی شروع ہوگئی سبق میں حاضری تو ضرور ہوتی، مگر سبق کے بعد تکرار ومطالعہ میں خاصی کمی آگئی، اور انجمن کے اختلافات کی پارٹی بندی کی نحوست بھی پھیلی، یہ طالب علم اس سے ناراض ہے، وہ طالب علم اس کی ٹانگ کھینچ رہا ہے اس سے مزاج فاسد ہوگیا، پارٹیاں سجتیں، سازشیں ہوتیں، ان دونوں چیزوں نے میری طبیعت کو بہت نقصان پہونچایا۔

ادیب کا امتحان دیا اور اچھے درجے سے کامیاب ہوا، اس نقصان کا اتنا فائدہ ہوا کہ اردو شاعری کے سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہوگیا، ساتھ ہی مضمون نگاری کا ملکہ حاصل ہوگیا لیکن اصل تعلیم میں نقصان ہوا، اخیر سال میں جب امتحان سالانہ کا وقت آیا تب کچھ آنکھ کھلی، ہم گیارہ ساتھی تھے ان میں تکرار ومذاکرہ کرانے والے طلبہ تین تھے، ایک صاحب اپنے بعض خاص حالات کی وجہ سے بجھ کر رہ گئے تھے اس لئے وہ تکرار سے دستکش ہوگئے، ایک صاحب اور تھے انھوں نے تکرار شروع کرایا، تیسرا میں تھا، میں نے سال بھر درسیات میں کم دلچسپی لی تھی اس لئے تکرار ومذاکرہ کا عمل میرے لئے مشکل ہوگیا تھا، ساتھ ہی میری بدعنوانیوں کی وجہ سے ساتھیوں میں زیادہ تر مجھ سے ناراض تھے، اس لئے وہ مجھ سے تکرار کا تقاضا بھی نہ کرتے تھے، میں تقریباً اکیلا ہوگیا تھا، میرے ساتھ صرف دو طالب علم تھے، خیر میں نے تکرار شروع کرایا میرے دوسرے ساتھی کچھ دنوں تک چلتے رہے، مگر امتحان سے ایک ڈیڑھ ہفتہ قبل بیماری کا بہانہ بنا کر وہ بھی خاموش ہوگئے، اب رفقاء پریشان تھے، مجھ سے ناراض تھے اور مجھے چھوڑ رکھا تھا، اس لئے میرے پاس آنے میں ہتک محسوس کر رہے تھے، لیکن مجبوری تھی بغیر تکرار کے گاڑی چلنے والی نہ تھی، دو ایک روز صبر کیا، مگر مرتا کیا نہ کرتا، بالآخر میرے تکرار

میں شامل ہونے کی اجازت چاہی، مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا، سب طلبہ میری طرف آ گئے میں نے محنت سے کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، مگر جب بنیاد ہی درست نہ تھی تو دیوار کیا سیدھی ہوتی، شرح تہذیب اور قدوری تو نکل جاتی، کافیہ میں بہت پریشانی ہوتی، ٹھکانے سے پڑھی تو تھی ہی نہیں، قاعدے سے سمجھ میں بھی نہ آتی، اور سمجھانا تو اور مشکل تھا، مجھے اپنی حماقت پر بہت ندامت ہوئی، اللہ کے حضور توبہ کیا، اور عہد کیا کہ آئندہ پوری محنت کو کام میں لاؤں گا، کافیہ کی جتنی شرحیں مل سکیں انھیں دیکھنے کی کوشش کرتا مگر ان سے میرا کام نہ چلتا، مدرسہ کے کتب خانہ میں کافیہ کے فارسی حاشیہ شریفیہ کا عربی میں ترجمہ تھا، حاشیہ شریفیہ کی فارسی بہت ادق تھی، نیز کافیہ کے حاشیہ پر اس طرح چھپا تھا کہ متن کہیں اور حاشیہ کسی اور صفحے پر، اس سے استفادہ بالکل نہیں ہوسکا تھا، عربی میں اس کا ترجمہ مشہور فلسفی اور منطقی عالم جو عربی کے بڑے ادیب بھی تھے، حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی کے صاحبزادے مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی نے کیا تھا، جس کا نام تسہیل الکافیہ ہے، یہ ترجمہ بہت سہل تھا اس کی عربی بے تکلف سمجھ میں آجاتی تھی، میں نے اسے کتب خانے سے نکال لیا، اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا، اکثر مقامات اس سے حل ہوگئے، نہ صرف حل ہوئے بلکہ بیان کرنے کا ملکہ بھی اس کی برکت سے حاصل ہوا۔

غیبی مدد

تسہیل الکافیہ کی مدد سے کافیہ کا تکرار آسان ہوگیا، لیکن تکرار جب حال کی بحث تک پہونچا اور میں نے اس کا مطالعہ شروع کیا تو ایسا لگا، جیسے میں نے یہ بحث پڑھی ہی نہیں، مطالعہ کرتے کرتے دماغ تھک گیا، جس طرح تھکا بیل ہل جوتتا جوتتا بیٹھ جاتا ہے، اور ہزار تدبیروں کے بعد بھی نہیں اٹھتا، بعینہ وہی حال میرا تھا۔ دماغ تھک کر بیٹھ گیا تھا، اس کے سامنے حروف آتے تھے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، ظہر کی نماز کے بعد سب طلبہ کے درمیان اس بحث کو سمجھانا تھا، وہ صاحب جو بیمار ہوگئے تھے وہ بھی اس تکرار میں آکر لیٹے رہتے تھے، جب میرا دماغ تھک گیا تو میں کتاب لے کر ایک ایسی مسجد میں چلا گیا، جو اہل حدیث

کی مسجد کہلاتی تھی مگر اس میں نماز باجماعت کا انتظام واہتمام نہ تھا اور مشہور تھا کہ اس میں جن بہت رہتے ہیں ہلکی گرمی کا موسم تھا، میں اکیلا تھا کتاب دیکھنے لگا مگر دماغ کا اب بھی وہی حال تھا میں نے جھنجھلا کر کتاب رکھ دی، اور لیٹ گیا، تھوڑی دیر میں نیند آگئی جیسے نیند آئی، خواب میں دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ سفید ریش خوبصورت عمامہ باندھ کر تشریف لائے دل میں یہ بات جمی کہ یہ صاحب کافیہ علامہ ابن حاجب ہیں، مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اب ان سے یہ بحث براہ راست پڑھوں گا، خواب میں یہ خبر کہاں کہ یہ خواب ہے وہ تو آنکھ کھلنے پر کھلتا ہے کہ یہ خواب تھا۔ انھوں نے آتے ہی فرمایا کہ کون سا مسئلہ تمھیں سمجھ میں نہیں آتا میں نے کتاب کھول کر حال کی بحث سامنے رکھ دی انھوں نے اس کی نہایت واضح اور مفصل تقریر کی، پورا مسئلہ ذہن نشین ہوگیا اتنی خوشی ہوئی کہ میں اسے بیان نہیں کرسکتا، دو خوشی، ایک تو مسئلہ حل ہونے کی، اور دوسری صاحب کافیہ کی شاگردی کی! وہ صاحب تو سمجھا کر چلے گئے، اور خوشی کی بیتابی میں میری آنکھ کھل گئی، اب سمجھ میں آیا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ خواب کا معاملہ تھا میں نے جھٹ کتاب کھولی مگر اتنی دیر میں ان کی پوری تقریر فراموش ہوچکی تھی، کچھ یاد نہیں آیا، اب میرے اوپر جانکنی جیسی کیفیت طاری تھی ابھی خوش تھا مگر وہ خواب کی خوشی تھی، اس کے ایک لمحے کے بعد کربناک اذیت میں مبتلا تھا، جیسے جان نکل رہی ہو، یہ بیداری کی تکلیف تھی مجھے اپنے اوپر غصہ آرہا تھا، مایوسی ہورہی تھی میں نے کتاب اٹھائی، اور جامع مسجد میں آگیا، ظہر کی اذان ہوچکی تھی اسی اذیت میں نماز ادا کی، طلبہ سب موجود تھے، اکٹھا ہوکر بیٹھ گئے، میں بھی مردہ جیسی حالت میں ان کے درمیان بیٹھ گیا، چہرے پر ہوائی اڑ رہی تھی، میں کہنا چاہ رہا تھا کہ آج کچھ حل نہیں ہوسکا اس لئے تکرار موقوف! مگر جونہی کتاب کھولی، اور ایک نگاہ متعلقہ مسئلہ پر ڈالی، اچانک محسوس ہوا کہ سب کچھ دماغ میں موجود ہے، پھر تو اس کو میں نے اس طرح سمجھایا کہ جیسے کوئی کہنہ مشق استاذ پڑھاتا ہو، طلبہ حیران تھے کہ آج جیسا تکرار پہلے نہیں ہوا تھا، میں نے اس وقت بعض مصلحتوں سے اسے ظاہر نہیں کیا لیکن آج بھی یہ واقعہ میرے سامنے اس طرح تازہ ہے جیسے کل کی بات ہو۔

بہر حال حالات میں مد و جزر آتا رہا، اور امتحان کا وقت قریب آتا رہا، اس اخیر وقت میں غیر معمولی محنت کرنی پڑی، اندیشہ تھا کہ خدانخواستہ اگر کسی کتاب میں ناکام ہوگیا، یا نمبر کم آئے تو بہت بے عزتی ہوگی، محنت بھی کرتا رہا، حماقتوں سے توبہ بھی کرتا رہا دعائیں بھی بہت کیں اس وقت احیاء العلوم میں عربی سوم کی کتابوں کا امتحان تقریری ہوا کرتا تھا، صرف ترجمہ کلام پاک اور شرح تہذیب کا امتحان تحریری ہوتا تھا، آج جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں اس واقعہ پر چالیس سال سے زیادہ بیت چکے ہیں، یاد نہیں کہ قدوری کا امتحان کس نے لیا، لیکن خوب یاد ہے کہ کافیہ اور القرأۃ لرشیدہ کا امتحان حضرت مولانا افتخار احمد صاحب علیہ الرحمہ نے لیا تھا جو اس وقت دارالعلوم مئو میں استاذ تھے، مولانا کے سامنے القرأۃ الرشیدہ لے کر بیٹھا انھوں نے نہ کہیں سے عبارت پڑھوائی، نہ ترجمہ پوچھا، صرف مفردات پوچھتے رہے، معانی بھی، صرفی ونحوی تحقیق بھی، اور اس تیزی سے پوچھتے رہے کہ دم لینے کی مہلت نہ ملتی تھی، لیکن اخیر کی محنت اور اللہ کی مہربانی تھی کہ میں کہیں رکا نہیں، ادھر سے سوال ہوتا اور معاً ادھر سے جواب ہوتا، میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے جواب میں کتنی غلطی رہی ہوگی، لیکن میرا اندازہ ہے کہ سو کے قریب ان کے سوال رہے ہوں گے انھوں نے نمبر پورا دیا۔

دوسرے وقت میں کافیہ کا امتحان تھا انھوں نے ’’توابع‘‘ کی پوری بحث پڑھوائی اور پھر مطلب پوچھا میں نے شروع سے آخر تک پوری تقریر کر دی دیر تو بہت لگی مگر بہت خوش ہوئے اور پورا نمبر اس میں بھی دیا۔

مولانا مرحوم نے اس امتحان کو تا زندگی یاد رکھا اور عام مجمعوں میں بے تکلف فرما دیا کرتے تھے کہ میں انھیں طالب علمی کے زمانے سے جانتا ہوں ان پر پورا اعتماد ہے، اخیر تک مولانا نے بہت محبت فرمائی، مرض الموت میں کئی بار حاضری ہوئی، صبر و شکر کے پیکر تھے، پہلی مرتبہ حاضری ہوئی تو فرمانے لگے کہ آج مجھے بہت خوشی ہے میں نے گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ آج بہت بڑے عالم آرہے ہیں ان کا خاص اہتمام کرو۔

دو کتابوں کا تحریری امتحان ہوا ترجمہ کلام پاک سے مجھے بہت مناسبت تھی اس کا پرچہ

تفصیل سے حل کیا تھا یہ پرچہ ہمارے علاقے کے مشہور وممتاز مدرس عالم حضرت مولانا نذیر احمد صاحب خیرآبادی علیہ الرحمہ کا بنایا ہوا تھا، کاپیاں انھیں کے پاس گئی تھیں، انھوں نے میری کاپی پر حضرت مولانا عبدالباری صاحب علیہ الرحمۃ ناظم مدرسہ کے نام ایک خط لکھا تھا کہ یہ طالب علم بہت باصلاحیت ہے، فراغت کے بعد اگر اسے مدرسہ میں خدمت کیلئے رکھ لیا جائے تو مدرسے کو رونق ہوگی، ناظم صاحب علیہ الرحمہ نے خوش ہوکر مجھے اس تحریر کے بارے میں بتایا تھا، مگر یہ نہیں ظاہر کیا تھا کہ مولانا نے کیا لکھا ہے، بعد میں حضرت مولانا مرحوم نے مجھے بتایا۔

شرح تہذیب منطق کی کتاب ہے اس میں حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مدظلہ نے اتنی محنت کرادی تھی کہ میرے لئے اس میں کچھ دشواری نہ تھی میں نے اس کا پرچہ عربی میں لکھنے کی نیت کرڈالی، نگرانی کرنے والے بعض اساتذہ نے مجھے عربی لکھتے ہوئے دیکھا، تو انھیں تعجب ہوا، انھوں نے بعض دوسرے اساتذہ سے ذکر کیا تو وہ فرمانے لگے کہ اردو میں مافی الضمیر ادا کرنا تو مشکل ہے، عربی میں کیسے کیا کرے گا؟ اور بات بالکل درست تھی، اس وقت طلبہ میں عربی تحریر وتقریر کا کوئی تصور نہ تھا عربی ششم کے ایک طالب علم نے پچھلے سال ایک پرچہ عربی میں حل کیا تھا، تو اضحوکہ بن گیا تھا، میں عربی سوم کا طالب علم تھا میں کیا لکھتا، مگر جب نتیجہ آیا تو اپنے ساتھیوں میں سب سے اچھا نمبر آیا، سو نمبر میں ۹۰ر ملے تھے جبکہ میرے کسی ساتھی کو ۴۵ر سے زیادہ نہیں ملے تھے، میں نے یہ سمجھا کہ ممتحن نے میری عربی کی وجہ سے خصوصی رعایت کردی ہے اس کتاب کے بارے میں معلوم نہ ہوسکا کہ کن صاحب نے اس کا امتحان لیا ہے۔

ایک نئی دھن:

تعلیمی سال گزر گیا مگر شرح تہذیب کے عربی میں پرچہ لکھنے اور ایک استاد کے تبصرہ نے مجھ میں ایک نیا جنون پیدا کردیا، وہ یہ کہ اب عربی تحریر وتقریر کی مشق کرنی چاہئے، تقریر کیلئے تو ایک درجے میں ماحول چاہئے، مگر تحریر کیلئے یکسوئی کافی تھی، میں نے ندوۃ العلماء

کے نصاب کی معلم الانشاء کے تینوں حصے خرید لئے اس میں عربی عبارتوں کا اردو میں ترجمہ کر لینا تو بہت آسان تھا مگر اردو کو عربی میں منتقل کرنا میرے لئے نہایت دشوار تھا، مشق وتمرین کی عربی عبارتوں سے اس مشکل کام میں قدرے سہولت ملتی تھی مگر اس کے لئے اردو، عربی لغت ہونا ضروری تھا اور میرے پاس ایسی کوئی کتاب نہ تھی، اس وقت اس موضوع پر دو کتابیں مدرسہ کے کتب خانے میں تھیں ایک مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی کی ’’اردو عربی لغات‘‘ اور دوسری مولانا وحید الزماں صاحب کی ’’القاموس الجدید‘‘ یہ دونوں مختصر تھیں، اور دونوں مفید تھیں، مگر مجھے القاموس الجدید زیادہ پسند تھی، اسے میں مولانا جمیل احمد صاحب مدظلہ کے پاس دیکھا کرتا تھا، امتحان کے بعد میں گھر آ گیا۔ یہاں اس موضوع پر کوئی کتاب نہ تھی معلم الانشاء پر محنت ہوتی رہی، میرے گاؤں میں ایک بزرگ صاحب مکتبہ تھے، والد صاحب سے ان کا دوستانہ تھا، وہ کتابیں فروخت کرتے تھے میں نے گزشتہ سطور میں کہیں ان کا ذکر کیا ہے کہ مکتب کے دور میں مَیں ان کے یہاں گھنٹوں پڑا رہا کرتا تھا، میں نے والد صاحب سے اجازت لے کر عربی چہارم کی درسیات کا آرڈر انھیں دے دیا تھا، اس کے ساتھ القاموس الجدید بھی لکھوادی تھی، کہ وہ آجائے گی، تو عربی تحریر میں آسانی ہوگی، رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو چکا تھا، مجھے بڑی بے تابی تھی انھوں نے اطمینان دلایا تھا کہ ۱۵/ر کے بعد کتابیں آجائیں گی مگر نہ آئیں میں پریشان تھا، عشرۂ اخیر شروع ہوا تو میں نے اعتکاف کرلیا، دوسرے ہی دن حافظ صاحب کتابیں لے کر آ گئے، وہ پریشان تھے کہ ایک کتاب غلط آ گئی تم نے قطبی کہا تھا، اور یہ **بالقطبی** ہے، میں نے کہا کچھ حرج نہیں یہی چاہئے تھی، مجھے القاموس الجدید کی تلاش تھی وہ القاموس الجدید جو میں نے استاذ محترم کے پاس دیکھی تھی، بہت چھوٹی تقطیع میں تھی یہ القاموس متوسط سائز میں بہت خوبصورت، روشن اور رنگین ٹائیٹل کے ساتھ تھی، دیکھ کر آنکھیں چمک اٹھیں میں نے سوچا شاید دوسرا ایڈیشن ہو، ہاتھوں میں لے کر اسے دیکھا تو بجائے اردو سے عربی میں ہونے کے عربی سے اردو تھی، میری ساری خوشی اچانک سرد پڑ گئی، بے ساختہ میرے منھ سے نکلا یہ غلط آ گئی، وہ گھبرائے، اس میں ان کی غلطی نہ تھی، بات یہ

تھی کہ میرے علم میں صرف وہی القاموس الجدید تھی جو اردو سے عربی ہے، یہ دوسری ابھی لکھی ہی نہ گئی تھی میں نے وہی جو میرے ذہن میں تھی لکھ دی، یہ ابھی حال میں لکھی گئی، اور تازہ ایڈیشن اس کا چھپا تھا، کتب خانہ والے نے دیوبند سے اسی کو بھیج دیا، میں سراسیمہ ہوا کہ میرا سارا منصوبہ فیل ہوگیا، اب کیا کروں؟ فوری طور پر میری مطلوبہ کتاب آ بھی نہیں سکتی، پھر میرے شوق وآرزو نے مسئلہ کا حل نکال لیا، میں نے اسی کتاب پر محنت کی اور عربی الفاظ کے جو معانی اردو میں لکھے گئے تھے، میں ایک کاپی میں ان اردو الفاظ کو اصل بنا کر ان کی عربی لکھنے لگا اس میں مجھے بہت محنت کرنی پڑی مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ پوری کتاب مجھے تقریباً حفظ ہوگئی، تین چار روز تک یہ عمل جاری رہا، پھر مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کے الفاظ ومعانی پر حاوی ہوگیا ہوں، تو معلم الانشاء کے اردو تمرینی جملوں کو عربی میں منتقل کرنے لگا اور یہ کام بھی بہت تیزی سے کیا، اعتکاف کی یکسوئی نصیب تھی، عبادت وتلاوت کی جگہ میں اسی کام میں لگا رہا رمضان کی برکت سے مجھے جلد مناسبت ہوگئی، اردو میں مضامین لکھ لیا کرتا تھا، اب عربی میں بھی لکھنے لگا، دیکھتے دیکھتے اعتکاف کے ایام گزر گئے، عید کے بعد بھی اسی مشغلے میں رہا، اب لکھنے بھی لگا اور کچھ کچھ بولنے بھی لگا۔

☆☆☆☆☆

چھٹا باب

عربی چہارم (شوال ۱۳۸۶ھ تا شعبان ۱۳۸۷ھ)

مدرسہ کھلنے کا وقت ہوا تو میں حاضر مدرسہ ہوگیا، اس سال کتابوں کا نقشہ کچھ یوں تھا۔

شرح جامی	حضرت مولانا محمد مسلم صاحب نور اللہ مرقدہٗ	پہلا گھنٹہ
نور الانوار	حضرت مولانا عبد المنان صاحب نور اللہ مرقدہٗ	دوسرا گھنٹہ
مقامات حریری	حضرت مولانا زین العابدین صاحب مدظلہ	تیسرا گھنٹہ
شرح وقایہ	حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مدظلہ	چوتھا گھنٹہ
قطبی	حضرت مولانا محمد مسلم صاحب نور اللہ مرقدہٗ	پانچواں گھنٹہ
ترجمہ کلام پاک	حضرت مولانا زین العابدین صاحب مدظلہ	چھٹا گھنٹہ

یہ سال ایک نئے ولولہ کے ساتھ شروع کیا، پچھلے سال کی حماقتوں سے توبہ کی، خارجی کتابوں کے پڑھنے کی تو مجبوری تھی، اس سے صبر نہیں ہوسکتا تھا، مگر غلط صحبتوں سے اجتناب کا تہیہ کرلیا تھا، عربی کا ذوق بھی خوب ہو چکا تھا اس کیلئے عربی مجلّات کا انتخاب کرلیا تھا، مکہ مکرمہ سے **مجلۃ الحج** نکلتا تھا، دیوبند سے مولانا وحید الزماں صاحب **دعوۃ الحق** نکالتے تھے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء سے **الرائد** منگوانا شروع کیا، یہ تینوں مستقل مطالعہ میں رہتے تھے اس کے علاوہ جدید عرب مصنفین کی کتابیں جو مل جاتیں انھیں بھی بالاستیعاب پڑھتا۔

اردو کتابوں کی کوئی گنتی نہ تھی خاص طور سے سیرۃ النبی کا مطالعہ کیا اور بار بار کیا بالخصوص تیسری اور چوتھی جلد کا متعدد مرتبہ مطالعہ کیا، اس کے بعض بعض اجزا بطور وظیفہ کے

عرصہ تک پڑھتا رہا۔ اسی سال ’’الجمعیۃ‘‘ کا جمعہ ایڈیشن وحید الدین خان کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا، ہر سنیچر کو مبارک پور مولانا نجم الدین احیائی (۱) مرحوم کے مکتبہ الہلال پر آجاتا تھا، میں اسے پابندی سے خریدتا تھا، اس کا انتظار ہفتہ بھر رہتا، اس رسالہ سے بڑا حوصلہ ملتا تھا۔

عربی لغات کی جو کتابیں مجھ جیسے طالب علم کو مل سکتی تھیں، سب جمع کرلی تھیں، المنجد، القاموس المحیط، مصباح اللغات، بیان اللسان از قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، القاموس الجدید عربی سے اردو اور اردو سے عربی، لغات جدیدہ از سید سلیمان ندوی، یہ سب کتابیں ہمہ وقت میرے مطالعہ میں رہتیں۔

درسیات کے سلسلے میں پروگرام یہ بنایا تھا کہ ہر کتاب مطالعہ کرکے پڑھنی ہے اساتذہ سے سنا تھا کہ عربی چہارم تک استعداد بننے کا وقت ہے، اگر اس جماعت تک استعداد بن گئی تو آگے ترقی ہوتی رہے گی اور اگر نہ بن سکی تو آگے طالب علم گرتا ہی چلا جائے گا اس کے پیش نظر دل میں یہ بات جمی تھی کہ ہر کتاب از خود مطالعہ میں حل کرکے درسگاہ میں حاضر ہونا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی پختہ عزم تھا کہ ابتدائے سال سے تکرار و مذاکرہ کی پابندی کرنی ہے چنانچہ اس پر عمل شروع کردیا گیا، یہ کل تین منصوبے تھے عربی تحریر کی مشق وتمرین، درس

---

(۱) یادش بخیر! مولانا نجم الدین صاحب احیائی، میرے استاذ حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ کے گاؤں بمہور کے رہنے والے تھے، اسی سال انھوں نے مبارک پور میں ہلال بکڈ پو کے نام سے اپنا تجارتی مکتبہ جاری کیا تھا، سانولے رنگ کے دبلے پتلے منحنی آدمی تھے، مگر صلاحیت اور جوش عمل سے معمور تھے۔ انھوں نے صرف تجارتی مکتبہ نہیں کھولا، بلکہ تصنیف وتالیف کا ایک مرکز بھی قائم کیا تھا، خود صاحب ذوق تھے، اور مدرسہ کے طلبہ کو لکھنے پڑھنے کی ترغیب دیتے اور مضمون نگاری سکھاتے، متعدد نوجوانوں نے ان کی تربیت میں قلم پکڑنا سیکھا۔ بہت نفیس انسان تھے، انھوں نے مشہور بریلوی خطیب مولوی ارشد القادری کی طوفان خیز اور بدترین بہتان پر مشتمل کتاب ’’زلزلہ‘‘ کا جواب ’’زلزلہ در زلزلہ‘‘ کے نام سے لکھا ہے، جس نے زلزلہ کی ہوا اکھاڑ دی، کم عمری ہی میں ۱۹/شعبان ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۰/مئی ۱۹۸۵ء بروز جمعہ ان کا انتقال ہوگیا، رحمہ اللہ۔ زلزلہ کے علاوہ متعدد تصانیف ان کی یادگار ہیں۔

سے پہلے مطالعہ، اور درس کے بعد تکرار و مذاکرہ! اس سے بہت فائدہ ہوا، استعداد تو جیسے آناً فاناً ترقی کرتی چلی گئی، ساری کتابیں بحمد اللہ مطالعہ میں حل ہوجاتی تھیں۔

عربی کے مطالعہ اور تحریر کی رفتار بھی ماشاء اللہ اچھی رہی، انشاء پردازی اور لغات پر خاصا عبور ہوگیا، اس وقت لغات مجھے اس طرح مستحضر ہوگئے تھے کہ ہمارے بعض رفقاء کہتے تھے کہ لغت دیکھنے کی الجھن میں کون پڑے جس لفظ کی ضرورت ہو تم سے پوچھ لینا کافی ہے۔

مولوی کا امتحان

غالباً عربی سوم کا سال قریب اختتام کے تھا، کہ ایک روز ہم کئی ساتھیوں کی طلبی دار الاہتمام میں ہوئی، وہاں مبارک پور کے خوش الحان قاری انوار الحق صاحب علیہ الرحمہ موجود تھے، قاری صاحب موصوف پہلے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں شعبۂ تجوید وقرأت کے استاذ تھے، پھر جامعہ اسلامیہ بنارس میں مدرس ہوکر چلے گئے تھے، قاری صاحب جامعہ اسلامیہ کی طرف سے بھیجے گئے تھے، جامعہ اسلامیہ کا الحاق گورنمنٹ کے عربی فارسی بورڈ سے تھا، لیکن اس میں عربی فارسی کے طلبہ نہیں تھے، الہ آباد بورڈ سے امتحان دلانے کے لئے انھیں طلبہ کی ضرورت تھی، اسی مقصد کے لئے وہ مبارک پور بھیجے گئے، کہ احیاء العلوم سے طلبہ مل جائیں گے، بنارس کے اہل انتظام کے مولانا عبد الباری صاحب مرحوم سے گہرے اور مضبوط روابط تھے، انھیں یقین تھا کہ یہاں سے بے تکلف، ان کے معیار کے طلبہ مل جائیں گے، جامعہ عربیہ احیاء العلوم اس دور کا بہت معیاری اور مرکزی مدرسہ تھا جو تعلیم کی خوبی اور انتظام کی عمدگی میں معروف تھا، اور اس کا الحاق الہ آباد بورڈ سے نہ تھا۔

ناظم صاحب نے ہم پانچ طالب علموں سے امتحان کے فارم بھروائے، چند ایک نے جو اوپر کی جماعتوں کے طالب علم تھے، عالم کا فارم بھرا، اور میرے ہم درس رفقاء نے جن میں مَیں بھی شامل تھا، ''مولوی'' کے فارم بھرے، قاری صاحب خوش خوش کامیاب واپس ہوئے، ہم لوگوں نے اس عمل کو کوئی اہمیت نہ دی تھی، جیسے منجملہ اور کھیلوں کے ایک کھیل یہ بھی ہو، اس میں کیا کرنا ہے؟ کن کتابوں کی تیاری کرنی ہے؟ کیا کیا پڑھنا ہے؟ اس کی

طرف دھیان گیا ہی نہیں، جس طرح جس معمول پر زندگی چل رہی تھی، چلتی رہی، ہاں اتنا یاد ہے کہ عربی سوم و چہارم میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان کے معیار سے کافی بلند بعض کتابیں تھیں، مثلاً حدیث میں مؤطا امام محمد اور آثار السنن!

شعبان میں سالانہ تعطیل ہوئی اور میں گھر آ گیا، تو خیال آیا کہ اس تعطیل میں کچھ کتابیں کسی استاذ عالم سے پڑھ لینی چاہئے، تاکہ امتحان کے وقت بالکل اندھیرا نہ رہے، تعطیلات میں اساتذہ سمٹ کر گھر آ جاتے ہیں، میرے قریبی گاؤں خیرآباد میں مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی سے مجھے مناسبت تھی، اس وقت وہ مرادآباد کے مدرسہ حیات العلوم میں استاذ اور مفتی تھے اور اس کے چندے کے لئے ہمارے گھر اور گاؤں میں آیا کرتے تھے، یہاں چند در چند قرابتیں بھی تھیں، اس لئے گاؤں والوں سے اور خصوصیت سے والد صاحب سے گہرا تعلق تھا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ مؤطا امام محمد کے اسباق پڑھا دیجئے، انھوں نے قبول کیا، میں ان کے گھر جا کر پڑھنے لگا۔ چند روز یہ اسباق پڑھے ہوں گے کہ ان کے مشاغل اور اپنی کاہلی کی وجہ سے یہ سلسلہ رک گیا، لیکن میں نے اپنی عادت کے مطابق پوری کتاب کا مطالعہ کر ڈالا، آثار السنن کے بارے میں یاد نہیں آتا کہ وہ ملی یا نہیں؟

عربی چہارم کی تعلیم ایک نئے جذبے اور ولولے کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ میں بھول گیا تھا کہ اس سال ''مولوی'' کا امتحان ہونے والا ہے، تعلیمی یکسوئی اور مطالعہ و مذاکرہ کا انہماک چل رہا تھا کہ ایک روز چرچا ہوا کہ قاری انوار الحق صاحب بنارس سے کوئی پیغام لے کر آئے ہیں، میں سہم گیا۔ معلوم ہوا کہ فارم بھرنے والوں کی حاضری بنارس میں ہونی ہے، الہ آباد بورڈ کی جانب سے مدرسہ کے بارے میں تحقیقات ہوں گی کہ یہاں طلبہ ہیں یا نہیں؟ ایک ہفتہ کے لئے ہم لوگوں کو بنارس جانا ہے، ساتھی بہت خوش ہوئے کہ اس بہانے بنارس کی سیر ہوگی، ابھی تک کوئی بڑا شہر دیکھا نہ تھا، مبارک پور شہر نہ تھا ایک قصبہ تھا، مگر مجھے سیر و تفریح سے کوئی مناسبت نہ تھی، اس لئے وحشت ہوئی مگر چار و نا چار جانا ہی تھا۔

قاری صاحب کی سرکردگی میں پانچ چھ طلبہ کا قافلہ تیار ہوگیا، چھوٹی لائن کی ٹرین سے مئو کا ٹکٹ لیا گیا، مئو سے پھر دوسری ٹرین پکڑ کر بنارس جانا تھا، قاری صاحب بہت خوش مزاج تھے، راستے میں انھوں نے بچوں کی خوب دلداری کی، طلبہ نے ان سے درخواست کی کہ وہ نعتیں سنائیں، وہ بے تکلف تیار ہوگئے اور بنارس تک وقتاً فوقتاً نغمہ سرائی کرتے رہے، قاری صاحب بہت خوش الحان تھے، ڈبہ کے تمام مسافر کیا مسلم اور غیر مسلم سب ان کے گرویدہ ہوگئے۔

اس وقت جامعہ اسلامیہ مدن پورہ میں تھا، وہیں ہم لوگ ٹھہرائے گئے، غالباً ایک ہفتہ ہم لوگ ٹھہرے، پھر جب امتحان کا وقت آیا تو ہم لوگ دوبارہ بنارس لے جائے گئے، پھر وہاں سے الہ آباد گئے جہاں امتحانی مرکز تھا۔

امتحان کی تیاری تو سرے سے ہوئی ہی نہ تھی، کسی طرح امتحان کی کاپیاں لکھ دی گئیں، یقین تھا کہ فیل ہوں گے مگر اپنے بارے میں مجھے یاد ہے کہ سکنڈ ڈویژن سے پاس ہوا، اس ایک امتحان کے بعد الہ آباد بورڈ کا اور کوئی امتحان نہیں دیا۔

عربیت کا ذوق

گزر چکا ہے کہ عربی سوم کا پوار سال لہو ولعب اور لایعنی کاموں کی نذر ہوگیا تھا، سال کے آخر میں کتابوں کے مذاکرے میں جب دشواری کا سامنا ہوا تو تنبہ ہوا، اس سال تعطیل میں رمضان شریف کے عشرۂ اخیرہ میں اعتکاف کیا، اور اس اعتکاف میں عربیت پر خاصی محنت کی۔ عربی چہارم میں آیا تو زندگی اور محنت کا آغاز تو ہوا، درسی کتابوں میں محنت ویکسوئی کی جو ترتیب بنائی تھی وہ تو بنی ہی! ساتھ ہی عربی تکلم وانشاء کے شوق نے طویل انگڑائی لی، اس سال اردو کا مطالعہ قدرے کم کیا، عربی کے مطالعہ کی مقدار بڑھادی تھی، ساتھ ہی عربی تکلم کی مشق بھی شروع کردی تھی۔ اس وقت جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں عربی تکلم وانشاء کا نہ کوئی اہتمام تھا اور نہ ترغیب وتشویق تھی، ایک میں تھا کہ عربی بولنے کا جنون میرے سر میں ہورہا تھا، اور ایک طالب علم عربی پنجم کا تھا، یہ صاحب ایلیا ضلع بنارس کے رہنے والے

مولوی مشتاق احمد تھے، ہم دونوں اکٹھا ہوتے تو باہم عربی بولنے کی کوشش کرتے، اور سننے والوں کی نظر میں تفریح کا سامان بن جاتے، مگر انھیں کوئی پرواہوتی اور نہ مجھے! ہم اپنی گفتگو میں محو ہوتے۔

میں تلاش کرتا رہتا کہ کوئی عربی بولنے والا ملے، اسی دوران تبلیغی جماعت کے دورے میں عرب کے کچھ لوگ آئے، ان میں ایک صاحب مراکش کے رہنے والے تھے، اور ایک صاحب شام کے! مراکشی ذرا معمر تھے اور شامی نوجوان! دونوں فصیح عربی بولتے تھے، میں سایہ کی طرح دونوں کے ساتھ لگ گیا، درس کے علاوہ ہمہ وقت ان کے پاس بیٹھا، عربی میں باتیں کرتا رہتا، وہ بڑی شفقت کا معاملہ کرتے، تین چار دن یہ لوگ جامع مسجد میں رہے، میرا زیادہ وقت انھیں کے پاس گزرتا، اچھی خاصی مشق ہوگئی تھی، تین چار دن کے بعد یہ لوگ اعظم گڈھ چلے گئے، میں منتظر تھا کہ جمعرات آئے تو میں بھی اعظم گڈھ پہونچوں، چنانچہ جمعرات کی چھٹی ہوتے ہی میں نے سائیکل اٹھائی اور اعظم گڈھ جامع مسجد پہونچ گیا، وہ دونوں مل کر بہت خوش ہوئے، پھر میں ان کے ساتھ سنیچر تک رہا، مجھے بڑی خوشی تھی کہ میں عربی بولنے پر بے تکلف قادر ہوگیا ہوں۔

چند اہم واقعات

اس سال درسی اور غیر درسی کتابوں کے مطالعہ میں چند واقعات ایسے پیش آئے جو دل ودماغ پر اب تک نقش ہیں، ان واقعات کو کاغذ میں محفوظ کردینا چاہتا ہوں۔

(۱)...... طالب علمی کا دور بھی عجیب دور ہے، کبھی کسی جگہ آدمی اٹکتا ہے تو دیر تک اٹکا رہتا ہے اور جب نکل جاتا ہے تو سوچتا ہے کہ یہ کون سی اٹکنے کی جگہ تھی، میں مجلّہ الحج پڑھ رہا تھا، رات کے بارہ بجے کا عمل تھا اس میں ایک لفظ آیا ’’ثوان‘‘ اس پر اٹک گیا، پہلے سیاق وسباق سے سمجھنے کی کوشش کی مگر نہیں حل ہوا، پھر لغت کی کتابیں الٹنی پلٹنی شروع کیں، مگر مادہ ہی نہیں سمجھ میں آرہا تھا کافی دیر تک جھک مارتا رہا، لغت کی ہر کتاب دیکھ لی لیکن کچھ سراغ نہ ملا، مادے میں جو جو احتمالات تھے سب ڈھونڈ لئے مگر اندھیرا، خیال ہوا کہ پہلا حرف ثاء ہے

پورا باب پڑھ ڈالوں، شاید کہیں مل جائے، اس کے تحت ابتدائی کلمات مفردہ سب پر نگاہ دوڑائی لیکن اندھیرا ہی رہا، پھر سوچا کہ مفرد کی جمع جو درمیان سطر میں لکھی رہتی ہے اس پر محنت کروں اس کے لئے لغت کی سب سے مختصر کتاب لغات جدیدہ جو حضرت مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کی مرتب کردہ ہے دیکھنی شروع کی، اس میں لفظ ''ثوان'' نظر آ گیا، معلوم ہوا کہ وہ ثانیہ کی جمع ہے جس کے معنی سکنڈ کے ہیں اب طبیعت کو انشراح ہو گیا، اس کاوش میں مجھے ڈیڑھ گھنٹے لگ گئے، آج یہ بہت معمولی بات معلوم ہوتی ہے، مگر اس وقت یہ مسئلہ بہت اہم اور مشکل تھا۔

(۲)...... اسی طرح ایک مسئلہ قطبی میں الجھ گیا تھا، میں تین دن تک اس پر غور کرتا رہا، اس وقت قطبی کی کوئی شرح اردو میں نہ تھی، عربی میں اس کا ایک حاشیہ قطبی پر تھا، اسے دیکھا مگر الجھن دور نہ ہوئی، میں سوال کرنے سے بہت شرماتا تھا، حالانکہ یہ بات حصول علم کے راستے میں مضر ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کو اتنا زبردست علم کیونکر حاصل ہوا، جواب میں آپ نے فرمایا بلسان سئول و قلب عقول، بہت پوچھنے والی زبان، اور بہت سمجھنے والی ذہانت سے! یہ بات مجھے اس وقت بھی معلوم تھی مگر طبیعت کا شرمیلا پن غالب تھا اور اب بھی غالب ہے، مجھے کچھ پوچھنے میں ہچکچاہٹ ہوتی ہے، اس وقت اس کی تاویل میں میں یہ سوچا کرتا تھا کہ مصنف نے اپنی حد تک سمجھا کر لکھنے کی کوشش کی ہے، پھر حاشیہ اور شرح والوں نے اسے مزید صاف کیا ہے، تیسرے نمبر پر استاذ نے محنت کی اور اس مقام کو حل کیا، اتنے کے بعد بھی میں نہ سمجھوں، تو تف ہے میرے اوپر! میں الجھا رہا، میں اس دوران استاذ سے پوچھنے نہیں گیا، تین دن کے بعد جب عاجز آ گیا تب استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے مولانا کے سامنے کتاب کھولی اور مسئلہ حل ہو گیا، پھر پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہی لیکن شرما حضوری میں میں نے متعلقہ مسئلہ اور عبارت دریافت کی، مولانا نے وہی تقریر فرما دی جو ابھی میں سمجھ چکا تھا۔

میں اس مسئلہ میں بہت متحیر ہوا کہ تین روز کوشش کے باوجود وہ بات میری سمجھ میں نہ آئی اور یہاں اچانک کیسے سمجھ میں آ گئی ، مدرسہ کے سب سے بڑے عالم استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں کسی مناسبت سے یہ بات میں نے ذکر کی تو فرمایا کہ طالب علم کے اندر سمجھنے کی استعداد پہلے سے موجود ہوتی ہے، پھر یہ کہ وہ اس پر محنت کر چکا ہوتا ہے استاذ کے ذہن میں وہ بات روشن ہوتی ہے جب استاذ کے سامنے پہونچتا ہے تو وہ بات بطور تجلی کے صاحب استعداد طالب علم کے ذہن میں منتقل ہوجاتی ہے۔

(۳)......حضرت مولانا محمد مسلم صاحب نوراللہ مرقدہ کے یہاں شرح جامی کا پہلا گھنٹہ تھا، میں رات کو دیر تک جاگتا تھا فجر کی نماز کے بعد تلاوت سے فارغ ہوکر کچھ دیر سو جاتا تھا، وقت سے آدھ گھنٹے پہلے اٹھتا اور شرح جامی کا مطالعہ کرتا پھر درس میں حاضر ہوتا، ناشتہ کا کوئی معمول نہ تھا ایک روز وقت سے چند ہی منٹ پہلے آنکھ کھلی جلدی جلدی عبارت دیکھ لی اطمینان سے مطالعہ کر کے کتاب حل کرنے کا موقع نہ مل سکا میں ساتھیوں کے ساتھ درسگاہ میں حاضر ہوا تو ایک دوسرا رنگ دکھائی دیا، مولانا کے استاذ حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساحرؔ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ درسگاہ میں موجود تھے ہمارے مولانا سمٹے سمٹائے ادب سے بیٹھے تھے حضرت مولانا محمد عثمان صاحب اس وقت دھولیہ میں پڑھاتے تھے، ایک سال کے بعد وہ احیاء العلوم میں آ گئے اور ہم لوگوں کے براہ راست استاد ہوئے ، درس کا وقت ہوگیا استاد شاگرد سب خاموش بیٹھے تھے، مولانا محمد مسلم صاحب ادب کی وجہ سے درس شروع نہیں کر رہے تھے اچانک مولانا کی ذہانت نے رخ بدلا فرمانے لگے تم میں سے آج کون سبق پڑھائے گا، اس وقت جماعت میں مولانا کی نگاہ دو یا تین طالب علموں پر تھی جو یہ خدمت انجام دے سکتے تھے، مگر ہر طرف سناٹا تھا، مولانا کی نگاہ میں اس وقت تک میں نہ تھا میں نے دیکھا کہ سب خاموش ہیں تو دبی زبان سے میں نے حامی بھری فرمایا پڑھو، میں نے دس بارہ سطریں پڑھیں، فرمایا بس مطلب کی تقریر کرو، میں نے ڈرتے

کانپتے مختصر الفاظ میں سبق کی تقریر کردی، کہیں کہیں مولانا نے اصلاح فرمائی اور فرمایا بس جاؤ، آج کا سبق اتنا ہی رہا، جسے مولانا نے مسلّم رکھا۔

حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کی رحلت

اس سال ہم لوگوں کا کوئی سبق حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب علیہ الرحمۃ کی خدمت میں نہ تھا اس کا قلق رہتا تھا اور ساتھ ہی یہ خوشی ہوتی تھی کہ اگلے سال ان کے پاس سبق ہوگا، انشاء اللہ، کیونکہ عربی پنجم کی کتاب دیوان متنبّی کا درس مستقلاً مولانا کے پاس ہوتا تھا مولانا سل کے مریض تھے غالباً امتحان ششماہی گزر چکا تھا، مولانا کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی، مولانا نے چند روز مدرسہ میں اقامت اختیار کی درسگاہ میں چارپائی بچھادی گئی، اسی پر آرام فرماتے تھے غالباً علاج کی سہولت کیلئے وہاں اقامت اختیار کی تھی، کیونکہ معالج مبارک پور ہی کے تھے، مولانا کا گاؤں قصبہ سے تین چار کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا۔

ایک رات حالت بہت تشویشناک ہوگئی تھی، طلبہ نے زیادہ تر جاگ کر رات گزاری، اخیر رات میں میں سو گیا تھا اچانک فجر سے پہلے شور ہوا کہ مولانا کی طبیعت بہت نازک ہوگئی ہے، میں دوڑتا ہوا حاضر خدمت ہوا، اور بھی کئی طلبہ دوڑے، کئی پہلے سے موجود تھے میں نے چہرہ دیکھا تو سمجھ گیا کہ آخری وقت ہے میں کہنا چاہ رہا تھا کہ سورہ یٰسین پڑھنی چاہئے کہ اتنے میں ہچکی آئی اور مولانا ہمیشہ کیلئے سو گئے، مدرسہ میں کہرام مچ گیا۔

صبح مولانا کے جسد خاکی کو طلبہ کندھوں پر اٹھا کر رسول پور لے گئے، ظہر کی نماز کے بعد جنازہ کی نماز ہوئی اور تدفین عمل میں آئی۔

مناظرہ اس سال قابل ذکر ایک اور واقعہ ہوا، ہوا یہ کہ ایک روز میں اپنے کمرے میں .... یہ کمرہ مولانا جمیل احمد صاب مدظلہ کی درسگاہ تھا............ بیٹھا مطالعہ میں منہمک تھا کہ انجمن جمعیۃ الطلبہ کے صدر صاحب آئے، انھوں نے مجھ سے کہا کہ عربی کی چند تفسیروں کے نام لکھوادو، میں نے پوچھا خیریت تو ہے؟ کیا ضرورت پیش آگئی ہے۔

وہ میں بعد میں بتاؤں گا اس وقت کچھ عربی تفسیروں کے نام لکھ کر مجھے دے دو۔

میں نے حکم کی تعمیل میں سولہ تفسیروں کے نام لکھ کر دیدیئے، وہ دوسرے وقت پھر آئے اور کہا کہ کل ایک بریلوی طالب علم سے میری بحث ہوگئی ہے، وہ آج سمہودی (سمہودی مبارک پور کے جنوب میں ایک جگہ کا نام ہے جو اس وقت آباد نہ تھی وہاں عیدگاہ ہے اور ایک قبرستان ہے، قبرستان میں ایک مسجد بھی ہے) پر آئے گا، تم بھی علم غیب کے بارے میں مطالعہ کرلو، آج اس سے بحث کرنی ہے اس وقت بریلویوں کے سلسلے میں میرا مطالعہ اچھا تھا، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے تمام مطبوعہ مناظرے پڑھ چکا تھا، مولانا محمد حنیف رہبر مبارک پوری کی کتاب **المقامع الحدید** ازبر تھی، میں تیار ہوگیا، عصر کی نماز کے بعد سمہودی پر تفریح کیلئے جانے کا طلبہ کا معمول تھا، میں بہت کم جاتا تھا مگر آج گیا، بریلوی طلبہ نہیں آئے تو صدر صاحب کو خفت ہوئی، انھوں نے دو ایک طالب علموں کو ساتھ لیا اور مدرسہ اشرفیہ مبارک پور میں جاکر اس طالب علم کو بلا لائے، اس کے ساتھ بھی چند طالب علم تھے، اس تلاش و انتظار میں مغرب کا وقت ہوگیا، ہلکی سی بارش بھی ہوگئی تھی، قبرستان والی مسجد میں ہم لوگ جمع ہوئے، وہیں اکٹھے مغرب کی نماز پڑھی، نماز ہمارے ہی آدمی نے پڑھائی، نماز کے بعد بیٹھ گئے، پروگرام یہ بنا کہ صدر صاحب گفتگو شروع کریں گے، اور کسی مناسب موقع پر میں دخل دے کر گفتگو کو اپنی طرف موڑلوں گا، بات شروع ہوئی اور دوسرے ہی لمحے میں ہمارے صدر صاحب نے بے تکان بولنا شروع کیا انھوں نے یہ بھی کہا کہ جس آیت ''**وعلمک مالم تکن تعلم** '' کا حوالہ آپ نے دیا تھا، ہم نے اس کی تفسیر فلاں اور فلاں کتاب میں دیکھی، اور فرفر انھوں نے سولہوں تفسیر کا نام لے لیا۔ میں ان کی برجستگی پر حیران تھا، اس پر بحث کچھ اور آگے بڑھی، صدر صاحب کے پاس صرف الفاظ ہی کا ذخیرہ تھا، وہ بھی اب ختم ہورہا تھا تو میں گفتگو کے درمیان دخل انداز ہوا اور علمی پیرائے میں بحث شروع کردی، وہ **وعلمک مالم تکن تعلم** سے میں ''ما'' کے عموم سے استدلال کررہا تھا، اور ثابت کررہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو **جمیع ماکان ومایکون** کا علم حاصل تھا، اس آیت سے یہ بات ثابت ہورہی ہے۔ وہ دورے کا طالب علم تھا، طلبہ نے بتایا تھا کہ

منطق سے اسے خصوصی مناسبت ہے، میں نے عرض کیا **علمک مالم تکن تعلم** کون سا قضیہ ہے، شخصیہ ہے، ؟طبعیہ ہے، ؟محصورہ ہے ؟مہملہ ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ قضیہ مہملہ ہے کیونکہ **ما** کے افراد کی تعداد کل اور بعض کے ذریعے ظاہر نہیں کی گئی ہے، اور آپ نے پڑھا ہوگا کہ قضیہ مہملہ، جزئیہ کے حکم میں ہوتا ہے پس **جمیع ما کان وما یکون** کہاں ثابت ہوا، بعض ثابت ہوا اور اس پر ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔

اس پر کچھ اور بحث بڑھی جواب یاد نہیں، انھوں نے اپنی تائید میں عربی کی ایک عبارت کسی بزرگ عالم کی پیش کی، میں نے کہا آپ اس کا جو مطلب سمجھ رہے ہیں وہ نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے، اس پر وہ الجھ گئے اور مجھے دیر تک الجھائے رکھا، وہ میرا بیان کیا ہوا مطلب ماننے کیلئے تیار نہ تھے حالانکہ میں بہت وضاحت سے ایک ایک لفظ کا ترجمہ اور ترکیب کرکے بتا رہا تھا، میں نے کہا کہ آپ کی منطق سے مناسبت تو میں نے سنی ہے، لیکن عربی ادب سے آپ کو مناسبت نہیں، دیر ہوگئی تھی، انھوں نے کہا کل اس پر بات ہوگی۔ عشاء کا وقت ہوگیا تھا وہیں عشاء کی نماز پڑھی گئی، اور واپس ہوئے، وہ راستے میں مجھ سے پوچھتے رہے کہ آپ کیا پڑھتے ہیں؟ میں نے بتایا کہ عربی چہارم کا طالب علم ہوں، ان سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ دورۂ حدیث کا طالب علم ہوں، وہ مجھ سے بہت مرعوب اور متأثر معلوم ہوتے تھے، میں بھی اپنا غلبہ دیکھ کر کچھ مزید تعلّی کا اظہار کر رہا تھا، یہ طے ہوا تھا کہ کل عصر کے بعد فوراً آجائیں گے اور بحث آگے چلے گی۔

ہم لوگ خوش خوش مدرسے میں آگئے، صبح حضرت ناظم صاحب کی طرف سے تحریری اعلان آویزاں ہوا، کہ معلوم ہوا ہے کہ کل کچھ طلبہ بریلوی طلبہ سے مناظرہ کرنے گئے تھے، اور آج بھی مناظرہ کرنا طے ہے، آج کوئی نہ جائے ورنہ اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

ہم لوگوں کے پیروں تلے زمین کھسک گئی، اب کیا ہوگا بہت بے عزتی ہوگی، ہمارے صدر صاحب کی ذہانت یہاں کام کرگئی مجھ سے کہا کہ ایک بریلوی شخص کی طرف سے اشرفیہ

کے ناظم دارالاقامہ مولوی احمد علی صاحب.....جو طلبہ کے باب میں بہت سخت گیر ہیں .....کے نام ایک خط لکھو کہ ابھی تو شیعہ سنی کے مسئلے میں اشرفیہ کے ایک طالب نے فتنہ برپا کیا تھا جس کی سزا قصبہ کے تمام بریلویوں کو بھگتنی پڑی ہے، اب ایک طالب علم نے دیوبندیوں سے بھی لڑائی ٹھان دی ہے، کیا قصبہ میں یہ باہر کے طلبہ ایک اور فساد کرانا چاہتے ہیں۔

میں نے اس مضمون کا خط بہت زوردار لہجے میں پورہ صوفی کے ایک بریلوی کی طرف سے لکھا، صدر صاحب نے اسے لفافے میں بند کرکے مولانا احمد علی صاحب کے پاس پہنچوادیا، پھر ہم لوگ بے فکر ہوگئے اپنے معمول کے مطابق ہمارے مدرسہ کے طلبہ سمہو دی تفریح کیلئے گئے، اشرفیہ سے کوئی نہیں آیا، وہاں کے طلبہ یہاں آتے بھی نہ تھے وہ تو مناظرہ کی ضرورت سے آ گئے تھے۔

خط میں شیعہ سنی فساد کا جو حوالہ دیا گیا ہے، اس کا واقعہ یہ ہوا کہ پچھلے سال مبارک پور کے ایک فتنہ پرداز شخص نے ایک ذہین اور خطیب بریلوی طالب علم سیّد ہاشمی کچھوچھوی کو آلۂ کار بنا کر ایک رسالہ شیعوں کے خلاف ''متعہ'' کے نام سے لکھ کر شائع کیا۔ اس سے مبارک پور کے شیعوں میں کھلبلی مچی، ابھی یہ کھلبلی چل ہی رہی تھی کہ ایک اور کتابچہ ''دوشیعہ مسافر'' کے نام سے شائع ہوا، اس پر شیعہ پارٹی بہت برافروختہ ہوئی، انھوں نے جواب میں ایک جلسہ کیا، ان کا خطیب آیا اور سنیوں کے خلاف زہر اگل کر چلا گیا، اب سنیوں کو طیش آیا، چونکہ کتاب پر بریلوی طالب علم کا نام تھا اس لئے بریلویوں نے ایک جلسہ کیا، اور اس میں خطیب یہ طالب علم تھا، اسے خطابت کا خوب ملکہ تھا، اس نے بڑی شعلہ بار تقریر کی، میں نے وہ تقریر نہیں سنی، جمعرات کا دن تھا میں گھر گیا ہوا تھا، اس تقریر کا قصبہ میں گھر گھر چرچا ہوا، بہت شاباشی ملی چند ہفتوں کے بعد شیعوں نے پھر جوابی جلسہ کیا، اور شیعہ خطیب نے بہت کھل کر تبرابازی کی، شیعوں کی تعداد مبارک پور میں بہت کم ہے، سنیوں نے سارا جلسہ بھر رکھا تھا جب اس کا تبرا شباب پر پہونچا اور خلیفۂ ثالث حضرت امیرالمومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا نام لے

کراس نے تبرا شروع کیا، تو سنی بے تاب ہوگئے، اور جلسے میں ہڑبونگ مچ گئی شیعہ شاید پہلے سے تیار تھے، حرب وضرب اور پھر بھگدڑ مچ گئی، جلسہ تو ختم ہوگیا مگر شیعہ سنی منافرت کی آگ بہت بھڑک گئی، اس کے بعد جب تعزیہ کا موسم آیا تو فساد پھوٹ پڑا، اور کئی جانیں گئیں، اس فساد میں خاص نشانہ پر بریلوی تھے اسی فساد کے چند مہینوں کے بعد ہم لوگوں کا مناظرہ ہوا تھا۔

کئی دن کے بعد معلوم ہوا کہ اشرفیہ کے ناظم دارالاقامہ نے مناظرہ میں شریک ہونے والوں کے ساتھ بہت سختی کا سلوک کیا اور اخراج کی دھمکی دی، خیر قصہ رفت وگزشت ہوا۔

جلسہ : پچھلے سال انجمن جمعیۃ الطلبہ کا معاملہ کئی طلبہ کے اخراج اور مختلف نزاعات کے باعث بہت پھیکا رہا، اس سال بڑے پیمانہ پر سالانہ جلسہ کا پروگرام بنایا گیا، صدارت کیلئے مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی کا نام تجویز ہوا، مولانا تشریف لائے، بڑے زور وشور کا جلسہ ہوا، میری تقریر بھی اس جلسہ میں طے کی گئی تھی، عنوان تھا ’’اسلام میں عورت کا مقام‘‘ اس موضوع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کا ایک مضمون تھا میں نے اسے رٹ لیا تھا، مگر جب تقریر کرنے کیلئے کھڑا ہوا تو چند سطریں دہرانے کے بعد بھول گیا، لیکن میں رکا نہیں رٹی ہوئی تقریر کو چھوڑ دیا اور مطالعہ سے جو کچھ معلومات اس موضوع سے متعلق تھیں انھیں بیان کرتا چلا گیا، مجمع کو شاید میرے بھولنے کا اندازہ نہ ہوا ہو، لیکن مولانا اخلاق حسین صاحب نے اس وقت جمعیۃ الطلبہ کے ناظم سے جو ان کی خدمت میں موجود تھے، فرمایا کہ یہ طالب علم بھول گیا مگر اسے معلومات ہیں، اب یہ اپنی معلومات بیان کررہا ہے، بیان کرنے کو کچھ دیر تک میں نے بیان کردیا، مگر عالم یہ تھا کہ سخت سردی کا موسم تھا اور میری بنیائن پسینے سے بھیگ گئی تھی۔

طالب علمی میں تدریس

مجھے پڑھنے کے ساتھ پڑھانے بھی ذوق تھا، پچھلے سال بعض طلبہ کو بے ضابطہ

طور پر کچھ کتابیں پڑھایا کرتا تھا مگر اس میں باقاعدگی نہ تھی، عربی چہارم کے ایک طالب علم نے ندوے کی منثورات کے کچھ اسباق پڑھے تھے، بعض طلبہ نے ہدایۃ النحو کے کچھ اسباق پڑھے، بعض چھوٹے طلبہ نے ابتدائی فارسی وعربی کی کتابیں پڑھیں اس سال تعلیم شروع ہونے کے بعد مجھ سے بڑی عمر کے ایک طالب علم میرے پاس آئے اور کہا کہ مولانا زین العابدین صاحب نے فرمایا ہے کہ مقامات حریری اور ترجمہ کلام پاک آپ سے میں پڑھ لیا کروں، مجھے تعجب ہوا کہ مولانا نے یہ حکم کیونکر دیا، انھوں نے مزید وضاحت کی کہ میرا امتحان داخلہ مولانا نے لیا تھا، میں نے مقامات اور ترجمہ کلام پاک نہیں پڑھا تھا، مولانا نے فرمایا کہ تم پنجم کی جماعت میں چل سکتے ہو مگر شرط یہ ہے کہ مقامات حریری اور ترجمہ پڑھ لو، اب اسباق شروع ہوئے تو مولانا سے میں نے عرض کیا کہ آپ پڑھا دیں انھوں نے آپ کا نام لیا، انھیں آپ پر اعتماد ہے، میں نے کہا کہ میں عربی چہارم کا طالب علم ہوں اور آپ پنجم کے، کہنے لگے اس سے کچھ نہیں ہوتا میں بے تکلف آپ سے استفادہ کروں گا، یہ دونوں کتابیں مولانا ہی کے یہاں زیر درس تھیں، میں ان کے یہاں پڑھتا تھا، اور دوسرے وقت میں انھیں پڑھاتا تھا، اور ان کا بھی کمال تھا کہ طالب علمانہ آداب کے ساتھ پڑھتے تھے، حالانکہ عمر اور رتبے دونوں میں مجھ سے بڑھے ہوئے تھے، یہ سلسلہ تقریباً پورے سال چلتا رہا۔

قاضی اطہر مبارک پوری علیہ الرحمہ سے تلمذ

یہ سال میرے عربی تحریر وتقریر کے ذوق کا سال تھا، اس موضوع پر میں بہت کوشش اور محنت کرتا تھا، عربی ادب کی جدید مطبوعات جن تک میری رسائی ہوتی بغور پڑھتا، تراکیب واسالیب اور تعبیرات کو اخذ کرنے کی کوشش کرتا، عربی میں مضامین لکھتا چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ۱۵راگست یوم آزادی پر مدرسہ میں ایک جلسہ ہونے والا تھا، اس کیلئے میں عربی میں ایک مقالہ تیار کیا تھا، اس وقت میں جمعیۃ الطلبہ کا نائب ناظم تھا، انجمن کے پروگراموں کے اعلانات نائب ناظم کی ذمہ داری تھی، میں وہ اعلانات عربی میں لکھا کرتا۔

اس وقت مشہور مورخ وادیب حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری علیہ الرحمہ بمبئی

میں رہتے تھے وہاں سے البلاغ نامی رسالہ نکالتے تھے، اوران کی عرب وہند کے تعلقات پر کتابیں شائع ہورہی تھیں وہ وہاں سے چھٹیوں میں ماہ دوماہ کے لئے گھر تشریف لاتے تھے، عربی کے وہ بڑے ادیب تھے، لکھنے اور بولنے پر انھیں قدرت تھی اس سال وہ جب بمبئی سے تشریف لائے تو ہمت کرکے میں ان کی خدمت میں پہونچ گیا وہ طلبہ کو بہت عزیز رکھتے تھے، بے تکلف تو تھے ہی، طلبہ کو بہت جلد بے تکلف کرلیتے تھے، میں شرمیلا اور بزدل طالب علم تھا، جاکر خاموش بیٹھ گیا، انھوں نے ہمت افزائی کی اور پوچھا کہ کیا کام ہے؟ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ عربی ادب وانشاء کا مجھے شوق ہے میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں مجھے کوئی کتاب آپ پڑھادیں، فرمایا کہ کیا پڑھتے ہو، میں نے عرض کیا مقامات حریری! کہا بس کافی ہے یہی کتاب لے کر صبح کو فجر کے بعد میرے پاس آجاؤ، میں پڑھادیا کروں گا، میں نے دل میں سوچا کہ مقامات حریری تو میں پڑھتا ہوں اسے کیا پڑھنا ہے مگر میں ادب کی وجہ سے خاموش رہا۔

دوسرے دن میں مقامات حریری لے کر ان کے گھر پہونچ گیا، گرمی کا موسم تھا وہ باہر چارپائی پر بیٹھے کچھ لوگوں سے باتیں کررہے تھے مجھے دیکھتے ہی یکسو ہوگئے، میں نے کتاب کی عبارت دوسطر کے بقدر پڑھی، انھوں نے لفظ لفظ کی تشریح شروع کی مادہ بتایا، پھر اس سے کون کون سے باب مشتق ہوتے ہیں، ان کے معانی میں کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں ان سے کیا کیا اسماء مشتق ہوتے ہیں ان کے معانی، ان کے استعمالات، پھر قدیم عربی اور جدید عربی میں معنی کے لحاظ سے کیا فرق ہوا ہے؟ غرض ایک ایک لفظ کی اتنی تفصیل بیان کی، جیسے قدیم وجدید عربی لغات پر مشتمل کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں، میں بغور سنتا رہا اور الفاظ ومعانی کی ایک نئی دنیا مجھ پر روشن ہوتی رہی، دوسطر میں تقریباً آدھ پون گھنٹہ لگ گیا، میرا حافظہ اچھا تھا، وہ باتیں مجھے یاد ہوگئیں، پھر ہر روز اسی انداز میں سبق چلتا رہا قاضی صاحب کہیں چلے جاتے تو میرے سبق کا ناغہ ہوجاتا اور مجھے قلق ہوتا، یہ سلسلہ ایک ماہ سے کچھ زیادہ ہوتا رہا پھر قاضی صاحب بمبئی چلے گئے، مگر میرے لئے عربی ادب کی تعلیم وتحصیل کا ایک نیا راستہ

بنا گئے، جس سے مجھے بہت فائدہ ہوا، اگر میں اسی راہ پر چلتا رہتا تو آج عربی کا ایک خاصا ادیب ہوتا، مگر بعد میں ایسے حالات آئے کہ میری زندگی ایک اور راہ پر مڑ گئی، اس کی تفصیل میں آگے چل کر لکھوں گا۔

یہ سال بحمد اللہ اچھا گزرا، کوئی خاص ناگواری پیش نہیں آئی، طالب علمی شد و مد سے قائم رہی، عربی کتب کے مطالعہ کے ساتھ اردو کی معیاری کتابیں زیر مطالعہ رہیں، خصوصیت سے علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی علیہما الرحمۃ کی ''سیرۃ النبی'' کو سال بھر پڑھتا رہا، اس کے مطالعہ سے اردو ادب کا بھی فائدہ ہوا، اور معلومات کی دنیا بھی روشن ہوئی۔

اسی سال مقالات شبلی کی تمام جلدیں بغور پڑھیں، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مجاہد ملت کی قصص القرآن پڑھی، مولانا مودودی کی کتابیں تفہیمات، تنقیحات، سیاسی کشمکش اور تفہیم القرآن کی جتنی جلدیں آچکی تھیں سب پڑھیں، مولانا امین احسن اصلاحی کی کتابیں پڑھیں مولانا علی میاں کی متعدد کتابیں پڑھیں، جماعت اسلامی کا لٹریچر ایک صاحب لالا کر مجھے دیتے تھے، میں نے اس کی مطبوعات کا اکثر حصہ پڑھ لیا تھا۔

امتحان سالانہ

چونکہ اس سال شروع ہی سے مطالعہ و مذاکرہ کا نظام درست تھا، اس لئے اخیر سال میں زحمت نہیں ہوئی، تکرار تمام تر میرے ہی ذمے رہا، درس کی تمام کتابیں بحمد اللہ یاد ہوگئی تھیں، ایک ایک کتاب کا تکرار مکرر سہ کرر ہوگیا تھا، اس سال ایک خاص عمل کا التزام کیا، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی علیہ الرحمۃ کے حالات میں کہیں پڑھا تھا کہ امتحان سے پہلے والی رات میں وہ پوری کتاب کا از اول تا آخر مطالعہ کرلیا کرتے تھے، اس سال میں نے بھی یہی معمول بنایا، جس کتاب کا جب امتحان ہوتا، اس سے ایک روز پہلے پوری کتاب کا مطالعہ کر لینے کا منصوبہ بنایا امتحان شروع ہونے سے دو تین دن پہلے ہر کتاب کے تکرار سے فارغ ہوگیا تھا۔

امتحان کے دنوں میں بھی طلبہ بہت کچھ پوچھ پاچھ کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے

پوری کتاب کا مطالعہ مشکل ہوتا، اس لئے میں نے یہ دستور بنایا کہ ہر روز میں دوسرے دن کی کتاب لے کر مدرسہ کے باہر کہیں جا کر چھپ جاتا، اور مسلسل پڑھتا رہتا، جو کچھ بچ جاتا رات میں اسے پورا کرلیا کرتا۔

امتحان سے پہلے ایک لطیفہ

امتحان کا پہلا دن کل ہے، آج میں نے فجر کے بعد کتاب لی، اور طلبہ کی نگاہوں سے بچتا ہوا سمہو دی چلا گیا، صبح کو اس طرف کوئی طالب علم نہ جاتا تھا، میں عیدگاہ میں ایک درخت کے نیچے رومال بچھا کر بیٹھ گیا اور نورالانوار کے مطالعہ میں منہمک ہوگیا۔ گرمیوں کا موسم تھا ایک بجے تک کتاب میں منہمک رہا، نہ کوئی ناشتہ نہ پانی، ایک بجے تک بھوک چمک اٹھی، یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان و پاکستان کی جنگ گزر چکی تھی مگر نتیجے میں گرانی، قحط اور پریشانی چھوڑ گئی تھی، سرکاری غلے کی دکانوں پر گیہوں بہت کم ملتا اس کی جگہ باجرے کی فراوانی تھی، مدرسے میں باجرے کی روٹی بکثرت پکا کرتی تھی یہ سیاہ رنگ کی روٹی ہوتی اور اتنی کمزور اور بودی کہ جہاں سے پکڑیئے وہیں سے ٹوٹ جاتی، اس وقت اسی پر گزارا ہو رہا تھا، دال بھی مخصوص قسم کی ہوتی، نہ جانے کن کن دالوں کا ملغوبہ! وہ بھی کالی ہوتی مجھے ارہر اور چنے کی دال کے علاوہ کوئی دال پسند نہ تھی، اس وقت مدرسے میں دوپہر کی چھٹی ساڑھے گیارہ بجے ہوتی تھی، اس کے بعد فوراً کھانا ملتا تھا، ہم پانچ چھ ساتھی ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے، میں سوچتا ہوا آرہا تھا کہ میرے ساتھی کھانا کھا کر قیلولہ کررہے ہوں گے، میرا حصہ چوکی پر موجود ہوگا، میں آیا تو وہی رنگ تھا جو میں سوچتا ہوا آرہا تھا، چوکی کے پاس پہونچا تو باجرے کی روٹیوں کے سیاہی مائل ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے اور کالی پتیلی میں کالی دال اپنا جلوہ دکھا رہی تھی میں دھک سے ہوگیا، میری بھوک بلبلا کر رہ گئی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا، میرے کئی ساتھی جاگ رہے تھے، انھوں نے آنکھیں کھول دیں، میں نے پوچھا آج گوشت نہیں ہے کہنے لگے آج گوشت کا دن نہیں، جو ہے کھالو میں صبر کرکے لقمے اٹھانے لگا، کھاتا کیا یوں کہئے زہر مار کرلیا، آج کی بے بسی پر میری آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن بحمداللہ نہ بے صبری کی نہ دل

میں کوئی ناروا خیال آیا۔ وہ وقت بیت گیا اب سوچتا ہوں، تو عجیب سا محسوس ہوتا ہے، اپنے طلبہ کو یہ واقعہ سناتا ہوں آج پہلی مرتبہ قلمبند کر رہا ہوں وہ دور بہت صبر آزما تھا۔

مطبخ کے نظام میں میری شمولیت:

پچھلے صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ میرے کھانے کا انتظام، جاگیر کے نظام کے تحت تھا، جاگیر کی تشریح وہیں گزر چکی ہے، اس نظام کے تحت میں دو سال رہا۔

شرح جامی کے درجے میں مَیں کمسنوں کی فہرست سے خارج ہوگیا ناظم صاحب نے حکم دیا کہ اب تمھیں مدرسہ کے مطبخ سے کھانا ملے گا، اس حکم سے کتنی خوشی ہوئی اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، مطبخ کا کھانا جاگیر کے کھانے کے مقابلے میں بہت کمتر تھا مگر میں خوش تھا، مجھے اعتراف ہے کہ جاگیر کے دونوں گھروں میں میری عزت و منزلت میری حیثیت سے بہت زائد تھی، مگر میں کیا کروں؟ میں کسی اور ہی حال میں تھا۔

مطبخ کا کھانا ان دنوں بس ایسا ہوتا تھا کہ بھوک کا مسئلہ اس سے بقدر ضرورت حل ہوجاتا تھا اس وقت ملکی حالات بھی کچھ ایسے تھے اور مدارس بھی مالی بحران میں مبتلا تھے، اکثر مدارس کا ایسا ہی حال سننے میں آتا تھا، لیکن بحمد اللہ کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ تعلیم ترک کردی جائے یا کم از کم مدرسہ ہی بدل دیا جائے، میں نے کبھی کھانے کی شکایت نہیں کی، ایک مرتبہ بعض طلبہ کے ورغلانے سے میں نے ناظم صاحب سے کھانے کے مسئلے پر ہلکی سی گفتگو کی تھی، مگر بہت ڈر اور شرما کر پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔

طلبہ کے ساتھ میرا طرز عمل

طلبہ کے درمیان میں تکرار و مذاکرہ کیلئے معروف تھا، طلبہ بکثرت مجھ سے کتاب کے سوالات کرتے تھے، بالخصوص امتحان کے زمانے میں، مکتبی تعلیم کے دوران میرے استاذ حضرت مولوی محمد یوسف صاحب علیہ الرحمہ نے یہ بات خوب ذہن نشین کرادی تھی کہ علم وہ دولت ہے جو خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتی بڑھتی ہے، علم کی ایک بات ایک کو بتائی، پھر وہی

دوسرے کو بتائی پھر تیسرے، چوتھے کو، تو ان سب نے تو ایک ایک بار سنا، اور تمھیں بکثرت دہرانے کی وجہ سے خوب یاد ہوگئی، اور علم کی جو بات یاد ہوجاتی ہے پھر اس سے مزید شاخیں ذہن نکالتا ہے اور علم بڑھتا چلا جاتا ہے میں نے اسی وقت سے اس بات کو گرہ میں باندھ لیا تھا، میں کسی پوچھنے والے سے نہ چیں بچیں ہوتا نہ اکتاتا نہ گھبراتا، بلکہ ایک ہی سوال اگر کوئی بار بار کرتا یا کئی لوگ باری باری ایک ہی سوال دہراتے، تو بھی مجھے اکتاہٹ نہ ہوتی، بلکہ پورے انشراح اور تفصیل سے بتاتا اس سے مجھے بہت فوائد حاصل ہوئے، ایک فائدہ یہ ہوتا کہ وہ بات اچھی طرح یاد ہوجاتی دوسرا یہ کہ سمجھانے کے نئے نئے اسلوب ذہن میں آتے، تیسرے یہ کہ ذہن میں وہ بات محفوظ رہتی، تو بہت کچھ اس پر غور کرنے کا موقع ملتا اور اس سے نئی نئی باتیں سمجھ میں آتیں، چوتھا یہ کہ طلبہ میں محبوبیت حاصل ہوتی، اعتماد پیدا ہوتا اور آخر میں یہ کہ اساتذہ کی پسندیدگی حاصل ہوتی۔

اب سنئے! شرح جامی کا امتحان تھا، فجر کی نماز کے بعد میں شرح جامی کے خاص خاص امتحانی مقامات دیکھنا چاہتا تھا کہ ایک طالب علم آیا اس نے ایک سوال کیا، میں نے پورے اطمینان سے اسے سمجھایا، پھر دوسرا وہی سوال لایا، پھر تیسرا، پھر چوتھا، سب یکے بعد دیگرے آتے گئے، اور میں ہر ایک کو یکساں تفصیل وانشراح سے سمجھاتا رہا، اتنے میں امتحان کی گھنٹی ہوگئی، جب امتحان ہال میں داخلہ ہوا اور پرچۂ سوالات ہاتھ میں آیا تو دوسرے سوالات کے ساتھ وہ سوال بھی تھا، جو مجھے اچھی طرح ازبر ہوگیا تھا اسی اطمینان سے میں نے سوالات کے جواب لکھے اور ماشاءاللہ بہت اچھا پرچہ ہوا۔

قطبی سے سب طلبہ گھبراتے تھے، اس کا ایک سوال بہت مشکل تھا، میں نے اس کا مفصل جواب لکھا، لکھ چکنے کے بعد احساس ہوا کہ میں نے الٹا لکھ دیا، پھر میں نے مکرر اپنی دانست میں درست کر کے لکھا، میں نے وقت زیادہ لیا مگر اساتذہ نے میری رعایت کی، دل میں خلش تھی، میری عادت تھی کہ لکھ لینے کے بعد میں کتاب میں اس مسئلے کو دوبارہ نہیں دیکھتا تھا، مگر آج خلش تھی، میں نے قطبی کا وہ مقام دیکھا تو معلوم ہوا کہ پہلا جواب صحیح تھا

جسے میں نے قلم زد کردیا تھا اور دوسرا جواب غلط تھا میں بہت سراسیمہ ہوا، مگر اب کیا ہوسکتا تھا لیکن نتیجہ آیا تو صد فی صد نمبر تھا۔

نورالانوار کا پرچہ جس نے بھی بنایا تھا جان بوجھ کر مشکل بنایا تھا، نورالانوار کا متن ’’المنار‘‘ خود بہت مختصر اور چیستاں سا ہے، ممتحن نے اس میں سے بھی کچھ کلمات حذف کرکے مشکل تر بنا دیا تھا، میں نے سوال دیکھا تو چکرایا اور جن استاد نے نورالانوار پڑھائی تھی، ان سے پوچھا وہ دیکھ کر ناراض ہوئے میں نے پوری کتاب کا تکرار کرایا تھا پھر تازہ تازہ دہرایا تھا، میں نے حذف شدہ کلمات کو لکھ کر تفصیل سے جواب لکھا، ممتحن نے بہت تحسین کی اور نمبر پورا دیا۔

سیرۃ النبی کی خریداری

میں نے سیرۃ النبی کا زیادہ تر حصہ اس سال پڑھ لیا تھا، تیسرا اور چوتھا حصہ متعدد بار پڑھا تھا، یہ سیرۃ النبی کا پہلا ایڈیشن تھا جس کی بڑے سائز میں عمدہ دبیز کاغذ پر طباعت ہوئی تھی، جلی حروف، روشن ورق بہت دیدہ زیب! لیکن مدرسہ کا مملوک نسخہ تھا، میں نے چاہا کہ پوری کتاب خرید لوں، اس وقت تمام حصوں کی قیمت بغیر جلد کے نوے روپے تھی مبارک پور کے ایک جلد ساز تھے ان کے پاس سیرۃ النبی تھی انھوں نے مجھے آدھی قیمت پر دینا منظور کرلیا، والد صاحب سے میں نے عرض کیا، انھوں نے قدرے توقف کے بعد اجازت دیدی، میں نے کتاب لے لی، یہ امتحانی دور تھا، تیاریاں چل رہی تھیں میں نے ان سے کہا کہ خوبصورت جلد باندھئے اور امتحان ختم ہونے سے پہلے مجھے نہ دیجئے ورنہ اس کی مشغولیت امتحان کی تیاری میں رکاوٹ بن جائے گی، انھوں نے بہت اہتمام سے خوبصورت جلد باندھی اور جب مدرسہ میں تعطیل ہوگئی اور میں گھر جانے لگا تو انھوں نے مجھے کتاب حوالے کی اب یہ میری کتاب تھی اس وقت سرخوشی کا جو عالم تھا مت پوچھئے، جیسے دولت فراواں حاصل ہوگئی، انھیں گھر لے گیا اور از سرِ نو مطالعہ شروع کیا، مجھے جلد اور تیز

پڑھنے کی مشق تھی میں ہر روز ایک جلد کا مکمل مطالعہ کرلیا کرتا ہر وقت پڑھتا رہتا، نماز اور رفع ضروریات کا وقت مستثنیٰ تھا، کھاتے وقت مطالعہ جاری رہتا، جب تک پوری کتاب ختم نہ ہوتی آنکھیں نیند سے آشنا نہ ہوتیں اس وقت جاگنے کی بھی خوب مشق تھی۔

چھ دن میں چھ جلدیں پوری ہوگئیں، خاص خاص مضامین پھر دہرانے لگا ایک طالب علم نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ اس کے لئے چند تقریریں لکھدوں، سیرۃ النبی سے اخذ کرکے متعدد موضوعات پر آدھ آدھ گھنٹے کی چھ سات تقریریں بھی لکھیں، مجھے اپنے پاس اپنی تحریروں کے محفوظ کرنے کا نہ پہلے اہتمام تھا نہ اب ہے ان میں سے کوئی تقریر میرے پاس نہیں ہے۔

اب تو اللہ نے اپنے فضل سے میری لغویات کا محافظ بنا کر **عزیزم مولانا ضیاء الحق سلّمہٗ عرف حاجی بابو** کی صورت میں ایک نعمت بخشی ہے، انھیں کے اہتمام کی وجہ سے تحریروں کا بڑا حصہ محفوظ ہوا، اور شائع بھی ہوا، ورنہ میں نے درسیات اور غیر درسیات سب پر ضرورت کے وقت بہت کچھ لکھا، اب میرے طلبہ کے پاس ہو تو ہو، میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

ساتواں باب

عربی پنجم (شوال ۱۳۸۷ھ تا شعبان ۱۳۸۸ھ)

عربی چہارم کا سال بعافیت گزرا، اس میں ناگوار امور کم پیش آئے، رمضان گھر پر گزار کر ۸/شوال کو پھر مدرسہ حاضر ہوگیا، اس سال درسی کتابوں کی ترتیب اس طرح تھی۔

دیوان متنبّی	حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساحرؔ مبارکپوری علیہ الرحمہ	پہلا گھنٹہ
ہدایہ اول	حضرت مولانا عبدالمنان صاحب نوراللہ مرقدہٗ	دوسرا گھنٹہ
ہدایہ ثانی	حضرت مولانا زین العابدین صاحب مدظلہ	تیسرا گھنٹہ
سلم العلوم	حضرت مولانا زین العابدین صاحب مدظلہ	چوتھا گھنٹہ
ہدیہ سعیدیہ	حضرت مولانا محمد مسلم صاحب نوراللہ مرقدہٗ	پانچواں گھنٹہ
مختصر المعانی	حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مدظلہ	چھٹا گھنٹہ

یہ تفصیل گھنٹوں کی ترتیب پر میں نے لکھی ہے چالیس سال کا عرصہ گزر گیا ہے، ممکن ہے ترتیب میں حافظہ نے خطا کی ہو لیکن اس کے علاوہ تفصیل بالکل یقینی ہے۔

دیوان متنبّی، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے درس کی کتاب تھی مگر ان کا انتقال ہوگیا، تو حضرت مولانا محمد عثمان صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ تشریف لائیں، حضرت مولانا نے منظور فرمالیا، مولانا عربی اور اردو کے بڑے ادیب اور شاعر تھے ان کے یہاں دیوان متنبّی کا سبق بہت عمدگی کے ساتھ ہوا۔

ہدایہ اول حضرت مولانا عبدالمنان صاحب علیہ الرحمہ اپنے دستور کے مطابق

پڑھاتے نہیں گھول کر پلاتے تھے، ہدایہ ثانی کا سبق حضرت مولانا زین العابدین معروفی کے پاس تھا، مولانا بہت ذہین وفطین تھے، حافظہ ان کا بہت قوی تھا، اور معلومات بہت وسیع رکھتے تھے، سبق کی تشریح مختصر الفاظ میں کرتے، مگر بہت جامع کرتے، مولانا کا رعب طلبہ پر بہت تھا، سبق کا ناغہ کبھی نہ ہوتا۔ بہت اہتمام سے مطالعہ کرتے اور دلچسپی سے پڑھاتے۔

سلم العلوم فن منطق کی کتاب ہے، اس سے انھیں بہت مناسبت تھی، خوب پڑھاتے تھے، سلم کے ختم ہونے کے بعد اس کی شرح ملاحسن پڑھائی۔ اس سبق میں ان کی ذہانت کے جوہر خوب کھلتے تھے۔

حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ اور حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مدظلہ کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے، یہ دونوں اپنے رنگ میں منفرد تھے، اور دونوں طلبہ کے درمیان معیار تھے۔

ایک ناگوار واقعہ:

اس سال جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کی پُرسکون تعلیمی فضا میں ایک ناگوار حادثہ ایسا پیش آیا، جس نے بہت دنوں تک تکدر کی گرد اُڑائی۔

ہوا یہ کہ طالب علموں کو ایک استاذ کی تدریس پر اطمینان نہ تھا، ان میں کچھ دنوں تک چہ میگوئیاں ہوتی رہیں، کان بھرے جاتے رہے، پھر پارٹی بنا کر ایک اجتماعی درخواست دارالاہتمام میں دے ڈالی کہ کتاب سمجھ میں نہیں آتی ہے، اس لئے کتاب وہاں سے ہٹادی جائے، پھر اس میں زور پیدا کرنے کے لئے ایک اور جماعت کو آمادہ کیا گیا، اور اس سے بھی درخواست دلوادی گئی۔ دارالاہتمام کی جانب سے معاملہ کی تحقیقات کرائی گئی، اس کا نتیجہ کیا نکلا وہ طلبہ کو معلوم نہ ہوسکا۔ پھر اللہ جانے یہ معاملہ کیونکر مجلس شوریٰ تک پہونچ گیا، مجلس شوریٰ کا ہنگامی اجلاس ہوا، جو رات بھر چلتا رہا، صبح طلبہ کو بلاکر پوچھ گچھ کی گئی، طلبہ بھی بھرے بیٹھے تھے، گرم گرم بحثیں ہوئیں، لیکن کتاب نہیں ہٹائی گئی، اِدھر طلبہ بھی پھیکے پڑے، اُدھر استاذ کے دل میں بھی گرہ پڑی، پھر سالانہ امتحان تک بڑی بے لطفی رہی، یہ بڑا سنگین وقت تھا

۔ طلبہ سمجھتے نہیں اور کسی وقتی جوش میں یا کسی کے بہکاوے میں آ کر بے جا حرکت کرتے ہیں، اور استاذ کی کبیدگی کی وجہ سے محرومی خریدتے ہیں۔

میں نے اپنی مدرسی کے زمانے میں ہمیشہ اس کا اہتمام کیا ہے کہ طلبہ کسی استاذ کے خلاف اجتماعی طور پر صف آرائی نہ کریں، انفرادی طور پر کوئی غلطی یا نادانی ہوتی ہے تو اس کی صفائی آسان ہوتی ہے، لیکن اجتماعی فساد کا اثر بڑا شدید ہوتا ہے۔

مولانا عبداللطیف صاحب علیہ الرحمہ کی تشریف آوری

طلبہ کی اس بے جا حرکت سے مدرسہ کے اساتذہ کو تکلیف تھی بالخصوص حضرت مولانا شمس الدین الحسینی صاحب علیہ الرحمہ نائب ناظم مدرسہ کو زیادہ فکر تھی، وہ ایک روز مئو سے حضرت مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی علیہ الرحمہ کو دعوت دے کر مدرسہ میں لے آئے تا کہ طلبہ کو وہ فہمائش کریں، چنانچہ ہم لوگوں کے درمیان ان کا عمومی خطاب ہوا، طالب علمی کی نادانی تھی کہ ان کی بعض باتیں طلبہ کو اچھی نہیں لگیں، انھیں بھی اطمینان نہیں ہوا، مغرب کی نماز کے بعد دارالاہتمام میں پھر ایک خصوصی خطاب کیا۔ اس خطاب میں طلبہ نے ان سے کچھ سوالات کئے، جن پر وہ ناراض ہوئے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا ان سوالات سے متأثر تھے اور فرما رہے تھے کہ یہ لڑکے ذہین ہیں، فراغت کے بعد میرا ان سے بکثرت ملنا ہوا، مجھے ڈر تھا کہ وہ ناراض نہ ہوں، مگر ہمیشہ وہ انشراح سے ملے۔

فخر المحدثین حضرت مولانا سیّد فخر الدین صاحب علیہ الرحمہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی تشریف آوری:

اس سال انجمن جمعیۃ الطلبہ کا نظام غیر رسمی طور پر میرے تصرف میں تھا۔ اس کے سرپرست حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ تھے، اس سال طلبہ کے دل و دماغ میں ان کی حیثیت سے بلند تر بات سوجھی، سال ختم کے قریب تھا انجمن کا سالانہ جلسہ ہونا طے

تھا، مشورے ہورہے تھے کہ کس کو صدارت کیلئے بلایا جائے، یاد نہیں کس نے تجویز رکھی کہ اس سال دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحب کو تکلیف دی جائے، میرے تو تصور میں یہ بات نہیں تھی کہ اتنے عظیم المرتبت بزرگ کو جو عمر کی آخری منزلوں میں ہیں اور انتہائی نحیف ونزار بھی ہیں تکلیف دی جائے، ہمارے ساتھی جو دیوبند سے آتے تھے حضرت شیخ الحدیث کو کاغذ کا آدمی کہتے تھے، لیکن اللہ جانے وہ کون سی ساعت تھی کہ حق تعالیٰ کے حضور یہ تجویز قبول ہوگئی، حضرت مولانا محمد مسلم صاحب نے اس تجویز کو بنظر استحسان دیکھا، حضرت کو خط لکھا گیا، حضرت نے منظور فرمالیا، طے یہ ہوا کہ ہوائی جہاز سے حضرت کو لایا جائے گا، دیوبند سے دلی گاڑی سے، دلی سے بنارس ہوائی جہاز سے، پھر بنارس سے مبارک پور گاڑی سے! دارالعلوم مئو کے ارباب حل وعقد کو معلوم ہوا تو انھوں نے بھی اس سعادت میں شرکت چاہی، اور حضرت سے درخواست کی کہ انجمن کے جلسے کے بعد دارالعلوم مئو میں بخاری شریف کا آخری درس دیں، حضرت نے منظور فرمایا، اب حضرت کی آمد ورفت کے اخراجات نصف نصف دو جگہوں پر تقسیم ہوگئے، حضرت پروگرام کے مطابق مبارک پور تشریف لائے، طلبہ میں اساتذہ میں خوشی کا عجیب سماں تھا، جو بات سوچی نہیں جاسکتی تھی اسے اپنے سامنے موجود دیکھ رہے تھے، ہم لوگوں نے جلسہ کا جو اشتہار طبع کرایا تھا، اس میں حضرت شیخ الحدیث کے شاگرد خاص حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساحؔر مبارک پوری نے شیخ کیلئے مقفیٰ اور مسجع القاب لکھے تھے، جو مبالغہ نہیں مبنی بر حقیقت تھے، مولانا نے ایک استقبالیہ نظم بھی لکھی تھی نہایت عقیدت مندانہ اور مرصع! مبارک پور کے مشہور خوش آواز قاری حضرت مولانا قاری انوار الحق صاحب علیہ الرحمہ نے جب اسے جلسہ میں پڑھا تو عقیدت ومحبت کا ایک سماں بندھ گیا، مجمع میں حضرت شیخ الحدیث کا وجود اس قدر نورانی اور تابناک تھا کہ گویا آدمیوں کے ہجوم میں فرشتہ اتر آیا ہے سب کی نگاہیں ان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

ہم لوگوں نے اپنی سعادت کیلئے حضرت شیخ الحدیث سے درخواست کی کہ ہدایہ اول کا آخری سبق پڑھادیں، حضرت نہایت بشاشت سے تیار ہوگئے، چنانچہ بندہ نے عبارت

پڑھی اور حضرت نے آخری سبق کی تقریر فرمائی پھر دعا کی۔

جلسہ کے بعد حضرت مئو تشریف لے گئے وہاں بخاری شریف کا آخری درس دیا پھر غازیپور والوں کی درخواست پر وہاں بھی تشریف لے گئے پھر بنارس سے ہوائی جہاز کے ذریعے دلی تشریف لے گئے۔

تقریریں لکھیں:

یہ سال بڑے ہنگامے کا گزرا، تبدیلی اسباق کا ہنگامہ لکھ چکا ہوں انجمن کے معاملات کی وجہ سے طلبہ میں دو گروپ پہلے سے موجود تھے اس ہنگامہ کی وجہ سے ان گروپوں میں شدت آگئی تھی، دونوں گروپوں کے درمیان نزاع کی بری شکل سامنے آجاتی، لیکن اس بڑے جلسے اور حضرت شیخ الحدیث صاحب نور اللہ مرقدہ کی آمد کی برکت سے فتنہ دب گیا جیسے ہی جلسہ ختم ہوا، امتحان سالانہ کی تیاری شروع ہوگئی طلبہ تکرار کے علاوہ درس اور تقریریں لکھنے کا کام مجھ سے لیتے رہتے تھے اس سال ایک طالب علم نے جو عربی ششم میں پڑھتا تھا تقریریں لکھنے کی فرمائش کی، گرمی کا موسم شدید تھا اس وقت درسگاہوں میں پنکھے نہیں تھے، میں طلبہ کی فرمائش رد نہیں کرتا تھا، لیکن گرما کی شدت مسلسل محنت سے مانع بن رہی تھی، اس طالب علم کو شوق فراواں تھا، اس نے کہا کہ میں پنکھا جھلوں گا تم لکھو چنانچہ میں نے لگ کر مسلسل محنت کی اور پانچ تقریریں لمبی لمبی خلافت کے موضوع پر لکھیں، پہلی تقریر **انی جاعل فی الارض خلیفه** کے عنوان پر، پھر چار تقریریں علی الترتیب خلفاء راشدین کی خلافت پر!

میرے اندر بڑا عیب تھا اور ہے کہ اپنی تحریریں محفوظ نہیں رکھ پاتا یہ تقریریں بھی میری دسترس میں نہیں ہیں، میرا خیال ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں کم وبیش بیس پچیس تقریریں میں نے مختلف موضوعات پر لکھی تھیں، اور مدرسی کے دور میں اس سے کچھ زیادہ ہی، مگر اب سوچتا ہوں تو خیال نہیں آتا کہ وہ کہاں ملیں گی۔

تجوید کی تکمیل: میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ عربی سوم تک باقاعدہ درجہ تجوید وقرأت میں میرا داخلہ رہا، عربی چہارم کے تمام گھنٹے عربی کتابوں سے پر ہوگئے،

قرأت کی اوقات درس میں گنجائش نہ رہی، لیکن استاذ سے تعلق برقرار رہا، خارج میں کچھ مشق کرلیا کرتے تھے، مگر کوئی باضابطہ نظام نہ تھا اسی لئے اس سال تجوید کے سالانہ امتحان میں شریک نہ ہوسکے، عربی پنجم کے سال میں قاری صاحب کے یہاں گنجائش نہ تھی اس وقت احیاء العلوم کے طلبہ میں عام دستور تھا کہ دلہن پورہ جاکر وہاں کے قاری صاحبان سے اعزازی درس لیا کرتے تھے، اس درس کو بھی مدرسہ کی جانب سے منظوری حاصل تھی مدرسہ کے امتحان میں یہ طلبہ شریک ہوتے تھے اور مدرسہ سے انھیں سند ملتی تھی۔

دلہن پورہ میں دو قاری بہت مایہ ناز اور بڑے استاذ تھے ایک حضرت قاری عبدالحی صاحب نوراللہ مرقدہ دوسرے حضرت قاری محمد ادریس صاحب نوراللہ مرقدہٗ، ان دونوں حضرات کے شاگرد بکثرت تھے، ہم نے جب دلہن پورہ کا رخ کیا تو حضرت قاری عبدالحی صاحب کا انتقال دو سال پہلے ہو چکا تھا، ہمارے ساتھیوں نے قاری محمد ادریس صاحب سے درخواست کی، قاری صاحب نے بخوشی منظور فرمالیا ہم لوگ مغرب کی نماز کے بعد فوراً پہونچ جاتے تھے قاری صاحب ایک گھنٹہ پڑھاتے تھے، اس طرح قرأت حفص کی تکمیل ہوگئی، **الحمدللہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات۔**

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے احاطہ میں یہ میرا آخری سال تھا، جو شعبان ۱۳۸۸ھ میں پورا ہوا، اس کے بعد دیوبند جانا ہے، دیوبند جانے کی ناتمام داستان بہت دنوں پہلے میں نے لکھی تھی وہ تحریر میری قسمت سے محفوظ رہ گئی جو کسی طرح عزیزم مولوی ضیاء الحق سلمہٗ کے ہاتھ لگ گئی اس طرح اب تک محفوظ ہے، انھیں اوراق کے ساتھ اسے بھی نتھی کرنے کا ارادہ ہے، اس سے پہلے چاہتا ہوں کہ احیاء العلوم مبارک پور سے جو مجھے تعلق ہے اور اس کے جو مجھ پر احسانات ہیں انھیں اس تفصیل کے بعد اجمالاً لکھوں۔

احیاء العلوم؟ وماادراک ما احیاء العلوم؟ ھی نعمۃ کبیرۃ انعم اللہ بھا علینا وعلی المسلمین، میں جب مکتب کی تعلیم سے فارغ ہوا تو اب کیا کرنا ہے؟

پڑھنا تو متعین ہے، کیا پڑھنا ہے اس میں تردد تھا، یہ بات میں پچھلے اوراق میں کہیں لکھ چکا ہوں، اس وقت میں نے ایک خواب دیکھا تھا، میں نے دیکھا کہ میں حج کرنے گیا ہوں اور ایک ایسی عمارت میں پہونچا ہوں جس کا صحن چوکور ہے اور بہت وسیع ہے، اس کے چاروں طرف عمارتیں بنی ہوئی ہیں میں بہت خوش تھا کہ میں مکہ مکرمہ آگیا ہوں، بس اتنے ہی میں میری آنکھ کھل گئی، خواب ذہن سے نکل گیا اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد ایک جلسہ کی تقریب سے میرا جانا مبارک پور ہوا، مدرسہ میں پہونچا تو بعینہ وہی نقشہ تھا جو میں نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا تھا اس وقت تک ابھی احیاء العلوم میں داخلہ کی بات میں نے سوچی نہ تھی ممکن ہے والد صاحب کے ذہن میں رہی ہو، پھر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہاں میرا داخلہ ہوا، تو خیال ہوا کہ علم دین کی زیارت یہیں مقدر ہے، ابتداءً بچپن کی وجہ سے طبیعت بہت گھبرائی مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ گھبرا کر بھاگ جانے کو یا گھر چلے جانے کو جی چاہا ہو، پھر تو ایسی محبت اور دلبستگی ہوئی کہ مدرسہ سے نکلنے کو جی نہ چاہتا تھا، یہی گھر دوار بن گیا، یہاں کے در و بام سے ایسا تعلق ہو گیا کہ گویا یہ مدرسہ روح وزندگی میں داخل ہو گیا، اس کے بغیر میرے وجود کا تصور نہیں، یہاں کے اساتذہ سے طلبہ سے، یہاں کے اسٹاف سے، سب سے ایسا تعلق ہوا جیسے سب گھر کے ممبران ہوں۔

یہیں شعور کی آنکھ کھلی، یہیں اس میں پختگی آئی، اور یہاں جو مزاج بن گیا اس کی چھاپ اب بھی باقی ہے، مدرسے کا جب تصور آتا ہے تو لوح ذہن پر پہلے یہی مدرسہ ابھرتا ہے، ابھی کچھ عرصہ پہلے تک میں خواب میں جب بھی اپنے کو پڑھاتے یا پڑھتے دیکھتا تو اسی مدرسے میں دیکھتا، اللہ تعالیٰ اس مدرسہ کو اس کے اساتذہ وطلبہ اور اہل انتظام کو اپنی رحمتوں، مہربانیوں سے نوازیں۔ آمین

☆☆☆☆☆

آٹھواں باب

شوق اور دلچسپیاں

میں کہیں لکھ چکا ہوں کہ مجھے کھیل کود سے قطعاً دلچسپی نہ تھی، اگر شوق تھا تو پڑھنے اور مطالعہ کرنے کا تھا، اس شوق کے سامنے ہر شوق ماند تھا، ہر دلچسپی فنا تھی، کتاب ہاتھ آجاتی یا کوئی نوشتہ مل جاتا، تو ہر شوق فراموش ہو جاتا، لیکن اس ایک دلچسپی کے بعد چند اور دلچسپیاں بھی تھیں، کچھ عارضی اور وقتی، جو کسی خاص محرک اور کسی وقتی جذبے کے تحت ہوتیں، اور بعض طبعی اور مستقل، جو اکثر احوال میں باقی رہتیں۔ ان دلچسپیوں کا ظہور بچپن ہی سے کم و بیش ہوتا رہا، اس باب میں ان متفرق دلچسپیوں کو لکھنا چاہتا ہوں، شاید کسی کے لئے درسِ عبرت کا سامان ہو، شاید کسی صاحب دل کے دل میں اس خاکسار کے لئے ہمدردی کا کوئی جذبہ یا زبان سے دعائے خیر کا کوئی کلمہ صادر ہو جائے۔

محبت کا اتھاہ جذبہ

ایک بات جسے میں آغازِ شعور سے محسوس کرتا ہوں، اور جس کے محور پر میری زندگی، عمر کے ہر مرحلہ میں گردش کرتی رہی، وہ ہے جذبۂ محبت کی فراوانی! مجھے بارہا یہ محسوس ہوا کہ میرا دل صرف محبت کے لئے وضع ہوا ہے، ہر بچہ اپنے والدین سے محبت کرتا ہے، اپنے بھائی بہنوں سے محبت کرتا ہے، یہ ایک فطری جذبہ ہے، لیکن میں اپنی محبت کو کس طرح بتاؤں؟ میں لکھ چکا ہوں کہ آغازِ شعور سے پہلے ہی میں ماں کی آغوشِ محبت سے محروم ہو گیا تھا، قدرے شعور آیا تو والد کی محبت مجھے کچھ اس طرح تھی، کہ میں ان سے کبھی جدا نہ ہوتا تھا، ہمہ وقت ان

کے ساتھ ساتھ رہتا، جدائی بہت شاق گزرتی، مجھے یاد ہے، جب میں مکتب کے درجہ چار میں پڑھتا تھا، تو والد صاحب علاج کی غرض سے لکھنؤ جا رہے تھے، میں بے قرار تھا، میں نے ساتھ جانے پر اصرار تو نہیں کیا تھا، مگر صدمۂ فراق سے نڈھال ہو رہا تھا، انھوں نے تسلی دی کہ تین روز کے بعد منگل کو آ جاؤں گا، انشاء اللہ۔ میں نے سینے پر صبر کا پتھر رکھ لیا، کچھ تعلیم میں، کچھ مطالعۂ کتب میں، کچھ بہنوں کی خدمت میں بہلتا رہا، مگر منگل کا دن ذہن پر جما رہا، اس طرح جما رہا کہ آج پچپن چھپن سال کے بعد بھی ذہن و دماغ میں اس کی چمک دیکھ رہا ہوں۔ لمحہ لمحہ گنتا رہا، دن بھی لمبا ہوتا، رات بھی طویل ہوتی، مگر آخر سب گزر گئے اور منگل کا دن آ گیا۔ صبح سے دل کی ٹکٹکی لگی ہے، اب آ رہے ہیں، وہ آ رہے ہیں، گھر میں ہوتا اور دروازہ ذرا کھٹکتا تو دوڑ کر باہر جاتا، نہ بھی کھٹکتا تو تصور کی قوت اسے کھٹکا دیتی، اور میرے پاؤں دوڑنے پر مجبور ہو جاتے، شام تک نہیں آئے، اب امید ختم ہوئی اور مجھے بخار آ گیا، شدید بخار! بدن گرمی سے پھنکنے لگا، دادا مرحوم گھبرا گئے، دوڑ کر حکیم صاحب کے یہاں سے دوا لائے، مگر یہ بخار جسم کا نہ تھا کہ دوا سے اتر جاتا، یہ دل کا بخار تھا، جو دوا سے متاثر نہیں ہوتا۔ دوسرے دن شام تک بستر پر پڑا رہا۔ عصر کے وقت ڈاکیہ آیا، اس نے ایک پوسٹ کارڈ دیا۔ یہ والد صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور میرے ہی نام تھا، کہ

> مجھے ایک ضرورت کی وجہ سے دو دن اور ٹھہرنا پڑے گا۔
> میں انشاء اللہ جمعرات کو شام تک آ جاؤں گا۔

بس خط کا ملنا تھا، کہ بخار یکلخت اتر گیا، بدھ کا دن تو گویا گزر چکا تھا، کل آ جائیں گے، یہ خیال آیا اور میں بالکل تندرست ہو گیا، ہنستا کھیلتا، ہشاش بشاش سب کو یہ دو سطر کا خط دکھاتا پھر رہا تھا۔

والدہ کے انتقال کے بعد والد صاحب، دونوں محبتوں کے مرکز ہوئے، اس کے ساتھ دوسری ہستی جس سے میں نے ٹوٹ کر محبت کی وہ میری نانی تھیں۔ میرا ننیہال گاؤں میں ہے، میں روزانہ نانی کے پاس جاتا تھا، جب تک ان کے پاس نہ جاتا چین نہ آتا، کبھی

بیمار ہوتا تو مجھے خوشی ہوتی کہ نانی عصا ٹیکتی ہوئی آئیں گی، کبھی بیمار ہوا، اور وہ نہ آئیں تو بیماری شدت اختیار کرلیتی، اور جب یہ خبر ملتی کہ وہ آرہی ہیں، تو آناً فاناً مجھے صحت ہونے لگتی۔

میں اس وقت سے مریضِ محبت ہوں جب میں جانتا بھی نہ تھا کہ محبت کیا شے ہے؟ اور جب مجھے اس کی خبر ہوئی، تو میں کیا عرض کروں کہ مجھ پر کیا بیتی؟ مجھے خود لفظ ''محبت'' سے محبت ہوگئی۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ مجھے مطالعہ کا شوق کتنا تھا، لیکن یہ مطالعہ نثر تک محدود تھا، نظموں اور اشعار کا مطالعہ نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ سمجھ میں نہیں آتے تھے، سمجھنے کے لئے غور کرنا اور ٹھہرنا پڑتا تھا، جس کی جوش مطالعہ میں گنجائش نہ تھی، مگر جب اپنی محبت کا شعور ہوا، تو میں نے بے تحاشا اشعار کا مطالعہ شروع کردیا، مجھے صرف اس شعر سے دلچسپی تھی جس میں لفظ محبت آیا ہو، حالانکہ لکھنے سے مجھے کوئی مناسبت نہ تھی، میں اسے مطالعہ کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا تھا، مگر لفظ محبت نے مجبور کیا کہ میں اسے اپنے قلم سے لکھتا رہوں، چنانچہ میں نے ایک کاپی بنائی اور اس میں ہر وہ شعر لکھ لیتا تھا، جس میں محبت کا لفظ آیا ہو، میرا خیال ہے کہ میری کاپی محبت کے اشعار سے بھر گئی تھی۔ حصول علم کی غرض سے مبارک پور جانے تک وہ کاپی میرے پاس تھی، مبارک پور پہونچنے کے بعد درسی مشغولیات میں کاپی سے توجہ ہٹ گئی، پھر اللہ جانے وہ کہاں گم ہوگئی، اشعار کے باب میں میرا حافظہ بہت کمزور ہے، مگر محبت کے اشعار اب بھی بکثرت یاد ہیں۔

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مباک پور پڑھنے آیا تو یہاں اساتذہ اور رفقاء کی ایک نئی دنیا ملی، محبت کیلئے بہت سے مراکز ملے، مجھے اپنے اساتذہ سے بھی بے حد محبت تھی، اور رفقاء وطلباء سے بھی! میں اس محبت میں سب کی خدمت کرنا چاہتا تھا مگر طبیعت بودی تھی، سلیقہ بالکل نہ تھا، بدن بھی کمزور تھا، سوچ کر رہ جاتا، اور کتابوں میں ڈوب جاتا۔

دوستیاں اور محبتیں

مبارک پور میں مضافات کے طلبہ بہت رہا کرتے تھے۔ ابراہیم پور، نوادہ، رسول پور،

سریاں، یہ حلقۂ مبارکپور کے مواضعات ہیں۔ مبارک پور کے شمال ومغرب میں انجان شہید، اشرف پور، چھیہیں، چھچھوری، نورالدین پور، بلیاکلیان پور، محی الدین پور، شیخوپور کے طلبہ بہت ہوتے تھے، ان طلبہ میں بیشتر سے محبانہ تعلقات قائم ہوئے۔ جمعرات کو دوپہر کی ہلکی پھلکی تعلیم کے بعد جب جمعہ کی چھٹی ہوتی، تو ابتدا دو سالوں میں گھر کی محبت غالب تھی، کوئی مجبوری نہ ہوتی تو ہر ہفتہ گھر چلا جایا کرتا بعد کے دو سالوں میں طلبہ کی دوستی میں اور ان کی فرمائش پر بکثرت انجان شہید اور اس کے اطراف کے مواضعات میں جاتا رہتا، بالخصوص جب مٹر کی پھلی میں دانے پڑتے، کھیتوں میں گنے تیار ہوتے، اور کلہاڑے جاگتے تب بکثرت جانا ہوتا، اس وقت تقریر کی صلاحیت بھی آچلی تھی، چنانچہ ان گاؤں میں مہمانی کی بہار بھی ہوتی، جمعہ میں تقریریں بھی کرتا اور گاؤں والوں کی محبت کے ذائقے سے بھی محظوظ ہوتا۔

مجھے کیا معلوم تھا کہ طالب علمی کے خاتمے کے ایک مدت بعد اسی علاقہ میں مجھے تدریس کے لئے مقیم ہونا پڑے گا، طالب علمی کے زمانے میں اس علاقے میں مجھے بہت محبت ملی، اور میں نے محبت کی، شاید اسی کا اثر ہے کہ بیس سال سے زائد مدت سے یہیں جو کچھ بن پڑ رہا ہے، دین کی خدمت کر رہا ہوں۔

یادش بخیر! میرے رفیق درس، عمر میں مجھ سے بڑے اور ذہانت میں مجھ سے بڑھ کر، ایک سنجیدہ اور متین شخصیت حافظ الطاف حسین صاحب سے بہت گہرا تعلق رہا، ان کے ساتھ ان کے گاؤں محی الدین پور بارہا گیا، تقریریں کیں، ان کے گھر کا ایک فرد بن کر رہا۔ اس وقت اسی گاؤں کے منشی اقبال احمد صاحب علیہ الرحمہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں شعبہ پرائمری میں ہیڈ ماسٹر اور میرے مبارکپوری ساتھیوں کے استاذ تھے، وہ بھی بہت محبت کا معاملہ کرتے تھے، ان کے بڑے بھائی عفان خاں بھی مہربان تھے، محی الدین پور، شیخوپور سے متصل گاؤں ہے، جب میں یہاں تدریس کے لئے آیا، تو عفان خاں اسی سابق اندازِ مشفقانہ سے ملنے آئے اور اس وقت کا دور یاد کرتے رہے، اور اصرار کرتے رہے کہ میں

ان کے یہاں پہونچا کروں، چنانچہ بکثرت ان کے گھر میری حاضری ہوتی رہی، اور وہ اپنے گھر مجھے پاکر اسی طرح خوش ہوتے رہے جیسے اپنی اولاد سے آدمی خوش ہوتا ہے۔ اب تو وہ جوارِ رحمت میں پہونچ گئے، ان کے چھوٹے بھائی منشی اقبال احمد صاحب بھی آغوشِ رحمت میں جا سوئے۔ خاکسار کو ان دونوں کی نماز جنازہ پڑھانے کا شرف حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ دونوں کی مغفرت فرمائے، ان دونوں کی محبت کو یاد کرتا ہوں تو دل دریائے محبت میں ڈوب ڈوب جاتا ہے۔

اس وقت ہمارے منشی جی کے صاحبزادے عزیزم انصار احمد سلّمہٗ اس دیرینہ محبت کو تازہ کئے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں اپنے فضل ورحمت کے سائے میں رکھے۔

حافظ الطاف حسین صاحب کا تذکرہ مستقل انشاء اللہ آئے گا، ان کے میرے اوپر بڑے احسانات ہیں، اور دوستی بھی بہت پختہ رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

اس زمانہ میں شیخوپور کے رہنے والے میرے استاذ حضرت مولانا قاری حماد الاعظمی مدظلہٗ احیاء العلوم میں مدرس تھے، ان کی مہربانیاں اور شفقتیں بہت تھیں، لیکن طالب علموں میں غالباً یہاں کا کوئی شخص نہ تھا، میرے آخری سال میں ایک چھوٹا طالب علم درجۂ حفظ میں داخل ہوا تھا، وہ اس وقت نجم الدین تھا، اب حافظ قاری نجم الدین صاحب استاذ درجۂ حفظ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور ہیں۔

☆☆☆☆☆

اس اطراف میں اس وقت سب سے زیادہ انجان شہید آنا ہوا، یہ گاؤں مدرسہ کے قریب بھی تھا اور یہاں کے متعدد طلبہ اس وقت مبارک پور میں پڑھتے بھی تھے، اور پھر حافظ الطاف حسین صاحب کی کوئی رشتہ داری بھی یہاں تھی، وہ خود بھی وہاں جاتے تھے، اور ان کے ساتھ میں بھی جایا کرتا تھا۔ ایک بڑی بات اور تھی کہ اس گاؤں میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے خلیفہ حضرت مولانا عبد الحی صاحب چشتی نور اللہ

مرقدہ تھے، ان کی کشش بھی بہت تھی، میں ٹھہرا بچہ، اور وہ بہت بڑے بزرگ، مگر بڑے شفیق اور متواضع تھے، ان کی خدمت میں حاضری ہوتی تو وہ بہت خوش ہوتے، بہت خاموش طبع تھے، اکثر ایسا محسوس ہوتا کہ کسی گہری سوچ میں ہیں، لیکن بہت بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ پاسِ انفاس اور ذکر قلبی میں مشغول رہتے تھے۔

انجان شہید میں خصوصی تعلق مولوی ابوالعاص مرحوم سے تھا، آہ میرا یہ مہربان دوست مرحوم ہو چکا۔ وہ مجھ سے دو سال پڑھنے میں آگے تھا، لیکن میرے اوپر بہت کرم فرما تھا۔ اس کے ساتھ متعدد بار انجان شہید جانا ہوا، اس کے بڑے بھائی حامد خاں بھی بہت کرم فرماتے تھے، شیخوپور آنے کے بعد بھی ابوالعاص سے ملاقاتیں رہیں، اس وقت یہ دوبئی رہا کرتے تھے، وہی طالب علمی والی بے تکلفی قائم تھی، اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت فرمائیں، اس مرحوم کا ذکر آگے بھی آئے گا۔

چھچھوری کے حافظ عبدالغفار سے خصوصی تعلق تھا، یہ مبارک پور پڑھنے آئے تو یتیم تھے، کس تقریب سے خصوصی تعلق ہوا، اب یاد نہیں ہے۔ ان دنوں میری بڑی بہن بیمار تھی، علاج بلریا گنج حکیم محمد ایوب صاحب کا ہو رہا تھا، دوا کی غرض سے بلریا گنج جایا کرتا تھا۔ حافظ عبدالغفار کی والدہ مرحومہ جو ایک بوڑھی خاتون تھیں اپنے بیٹے کی طرح مجھے مانتی تھیں، میں اوّل وقت فجر پڑھ کر مدرسہ سے نکلتا، اور نور الدین پور گھاٹ اتر کر سات آٹھ کیلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے بہت سویرے چھچھوری پہونچ جاتا، بوڑھی والدہ ناشتہ تیار رکھتیں، مجھے ناشتہ سے فارغ کر کے بلریا گنج کے لئے رخصت کرتیں، میں سات بجے حکیم صاحب کے دواخانہ پر پہونچ جاتا، وہاں ہجوم بہت ہوتا، مریض نمبر لگائے بیٹھے رہتے، گیارہ بجے دوا مل پاتی، میں پھر سیدھے چھچھوری آتا، وہاں کھانا کھاتا، اور شام تک مدرسہ ہوتا ہوا گھر پہونچ جاتا۔ یہ تقریباً ۲۵/۳۰ر کیلومیٹر کا دھاوا صبح سے شام تک پیدل مار لیتا

حافظ عبدالغفار کے ساتھ جمعرات جمعہ کو بھی بارہا جانا ہوا۔ کبھی جمعہ میں اور کبھی بعد نماز مغرب یا بعد نماز عشا تقریریں ہوتیں۔

کچھوچھہ سے متصل ایک گاؤں چھیہیں ہے، وہاں کا ایک طالب علم بدرالدین نامی فارسی پڑھتا تھا، وہ مجھ سے مانوس ہوا تو میں نے اسے فارسی کی بعض کتابیں پڑھائیں، اس سال میں عربی چہارم میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے واسطے سے اس کے والد سے تعلق ہوا، اس کی بہن کا نکاح تھا، اس کے والد نے مجھے بھی مدعو کیا، مجھے شادی کی تقریبات بالخصوص بارات سے بہت وحشت تھی، لیکن ان کے اصرار پر میں چلا گیا، غالباً جمعرات کا دن تھا، اس لئے آسانی تھی، رات کی بارات تھی، وہاں پہونچا تو مجمع خاصے پڑھے لکھے انگریزی دانوں کا تھا، جن میں بعض سرکاری عہدیدار بھی تھے، یہ ڈپٹی کلکٹر ہیں، یہ تحصیلدار ہیں، یہ فلاں ہیں اور یہ فلاں ہیں، اور لطف یہ کہ کوئی سنی ہے اور کوئی شیعہ ہے۔ ایک صاحب غالباً ضلعی پیمانے کے کوئی عہدے دار شیعہ تھے، عشاء کے بعد نکاح ہوا، اس کے بعد کھانا کھایا گیا، کھانے سے فراغت کے بعد ایک جگہ ہم لوگ بیٹھے تھے، بدرالدین بھی تھا، ان شیعہ عہدے دار نے بدرالدین کو مخاطب کیا کہ بیٹے کیا پڑھتے ہو؟ اس نے کہا فارسی! کہنے لگے اس شعر کا مطلب بتاؤ

سرداد ونداد دست در دستِ یزید حقا کہ بنائے لاالله ست حسین

بدرالدین بچہ تھا کچھ جواب نہ دے سکا، وہ کچھ کچھ کہتے رہے، میں قریب ہی تھا، میں نے پکار کر کہا، اس بچے سے کیا پوچھتے ہیں آپ مجھ سے بات کیجئے، کہنے لگے میں آپ ہی سے بات کرنا چاہتا ہوں، پھر گفتگو شروع ہوگئی، اور مجمع سمٹنے لگا، چند ایک اس میں شیعہ تھے، وہ اپنی پارٹی بنانے لگے، متعدد لوگ سنی تھے، وہ میرے ساتھ ہوگئے۔ میں نے اس وقت محمود احمد عباسی کی کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' جو ابھی تازہ شائع ہوئی تھی پڑھ رکھی تھی، اس کی روشنی میں مَیں دیر تک بحث کرتا رہا، یہاں تک کہ صبح کے تین بج گئے، تو ایک سنی ڈپٹی کلکٹر نے بحث روک دی اور شیعہ سے کہا کہ آپ کے پاس دلیل کوئی نہیں ہے اس طالب علم نے جو دلائل دئے ہیں، آپ سے کسی کا جواب نہیں بن پڑا ہے، تو صرف لفظوں سے کب تک کھیلئے گا، اب یہ کھیل ختم کیجئے اور بات یہیں پر ختم ہوگئی۔

بات یہ ہے کہ اس وقت میرا حافظہ اچھا تھا، اور کوئی کتاب ایک مرتبہ نہیں پڑھتا تھا،

بلکہ جب تک دوسری کوئی کتاب نہ ملتی اسی کو دہراتا رہتا تھا، اس طرح مضامین خوب مستحضر ہوجاتے تھے، اس وقت میں نے ''خلافت معاویہ ویزید'' متعدد بار پڑھی تھی، اس کے مضامین ومعلومات پر مجھے اعتماد نہ تھا کیونکہ اس کے خلاف کئی مضامین شائع ہو چکے تھے، اور میں انھیں پڑھ چکا تھا، مگر شیعہ کے مقابلے میں اس سے میں نے بہت کام لیا۔

اس علاقے میں اشرف پور بھی متعدد بار جانا ہوا، اشرف پور کے دو طالب علم اس وقت احیاء العلوم میں زیر تعلیم تھے، ایک محمد شعیب اور ایک امام الدین! ان دونوں کی وجہ سے اشرف پور میں کئی جمعے گزارنے کا موقع ملا۔ ایک بار جمعرات کو ہم لوگ مغرب سے پہلے پہونچے، نماز پڑھنے مسجد میں پہونچے، تو جماعت اسلامی کا ایک ہلکا پھلکا اجتماع ہو رہا تھا، مغرب کی نماز کے بعد تقریریں ہونے لگیں، میں بھی ٹھہر گیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ کچھ بیان کروں، مجھے جماعت اسلامی سے مناسبت نہ تھی، اس کا بیشتر مطبوعہ لٹریچر میں پڑھ چکا تھا، میں نے مختصر سی تقریر کی اور اشارات میں جماعت اسلامی کے بعض طریقۂ کار کی نفی کی۔

مبارک پور کے قریبی مواضعات میں ایک موضع بلیا کلیان پور ہے، وہاں کے بھی دو تین طلبہ پڑھتے تھے۔ ایک مولوی محمد احسان تھے، کبھی کبھی ان کے ساتھ بلیا بھی جانا ہوا، جاڑے کا موسم تھا، سخت سردی پڑ رہی تھی، مغرب کے بعد وہاں کی مسجد میں میری تقریر ہونی تھی۔ تقریر میں مَیں نے جہنم کے عذاب کو قدرے تفصیل سے بیان کیا تھا، اس سے فارغ ہوکر ہم لوگ ایک بیٹھک میں پیال پر رضائی اوڑھے بیٹھے تھے، ایک بوڑھے سادہ دیہاتی بھی بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے سر اٹھایا، اور دیہاتی لب ولہجہ میں ایک بات کہی جس پر سب لوگ ہنس پڑے، کہنے لگے کہ مولوی صاحب! ہم لوگوں کو جہنم سے کیا ڈرا رہے ہیں، جہنم پورب سے بھری جائے گی، ہم لوگوں تک آتے آتے بھر جائے گی، پھر جگہ کہاں رہے گی کہ ہم لوگ جائیں۔

میں نے عرض کیا کہ جہنم کے بھرے جانے کا یہ قانون نہیں، وہ اعمال کی بنیاد پر بھری جائے گی، اس مضمون کو قدرے تفصیل سے سمجھایا۔

بحث ومباحثہ

واقعہ یہ ہے کہ مطالعہ کے بعد اگر دلچسپی تھی، تو دوستوں کی فرمائشوں کی تعمیل اور اپنے مطالعہ کا حاصل بیان کرنے سے تھی، اس کے نتیجے میں بسا اوقات بحث ومباحثہ کی بھی نوبت آتی رہتی تھی۔

مبارک پور کے مناظرے کی داستان آپ پڑھ چکے ہیں، ایک شیعہ سے مباحثہ ابھی آپ نے پڑھا، مکتبی دور میں ایک بریلوی رشتہ دار سے مباحثہ رہا کرتا تھا۔ مبارک پور کی طالب علمی کے دور میں باہم بھی بعض اوقات مباحثوں کی نوبت آئی، مباحثے تو آپس میں متعدد ہوئے لیکن ایک مباحثہ کی یاد لوحِ دل پر محفوظ رہ گئی ہے۔

جمعرات کو عشاء کی نماز کے بعد انجمن جمعیۃ الطلبہ کے ہفتہ وار جلسے ہوا کرتے تھے، آخر کے دو سالوں میں ان میں پابندی سے شرکت کرتا تھا، بلکہ میری حیثیت ان جلسوں میں روح رواں کی ہوتی تھی، یہ جلسے عموماً رات کو گیارہ بجے ختم ہوتے تھے، جمعہ کو تعطیل رہتی تھی، اس لئے وہ رات مطالعہ ومذاکرہ سے آزاد رہتی تھی۔ اس رات میں طلبہ کسی ایسے مشغلہ میں مصروف ہوتے جن کی عام دنوں میں گنجائش نہیں ہوتی، ایسی ہی ایک جمعرات تھی، ہماری انجمن کے صدر محترم حافظ توفیق احمد صاحب نے جلسہ سے فارغ ہوکر مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات وخدمات سے متعلق ایک بحث چھیڑی، ہمارا مدرسہ جمعیۃ علماء کا مرکز تھا، سیاسی اعتبار سے اس وقت مدرسہ میں کانگریس کے علاوہ کسی اور پارٹی کا تصور نہ تھا، مولانا عبدالباری صاحب علیہ الرحمہ ناظم مدرسہ کا تعلق جمعیۃ علماء سے بہت گہرا تھا، مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ بھی جمعیۃ کے فداکار تھے، میں نے ابتداء سے حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات وسوانح پڑھ رکھے تھے۔ مولانا آزاد کا انتقال ۱۹۵۸ء میں ہوا تھا، اس وقت میں اردو کی ہر تحریر پڑھ لیتا تھا، گو کہ میری عمر صرف سات سال تھی، مگر پڑھنے کا جنون میرے وجود پر چھا چکا تھا۔

مولانا آزاد کے انتقال کے بعد اردو کے متعدد رسالوں نے خاص نمبر شائع کئے تھے، مجھے سب تو نہیں البتہ ”نئی دنیا“ کا مولانا آزاد نمبر جس کے ایڈیٹر مولانا عبدالوحید صدیقی تھے ہاتھ آ گیا تھا، یہ ایک متوسط ضخامت کا خصوصی شمارہ کتابی سائز پر تھا، اسے مہینوں ساتھ لئے لئے پھرا، اور بتکرار پڑھتا رہا، مجھے مولانا آزاد کی زندگی اسی وقت حفظ ہوگئی تھی، میں ان کے احوال زندگی اور ان کے کارنامے بے تکلف بیان کرسکتا تھا۔ ان کی کتابیں مجھے اس وقت ملیں جب میں مبارک پور آ گیا تھا، پھر غبار خاطر اور تفسیر سورہ فاتحہ بہت انہماک سے پڑھی تھی، اخبارات کا مجھے ذوق نہ تھا، لیکن ہر لکھے ہوئے کاغذ کے پڑھنے کا جنون ان کو بھی شامل تھا۔ گاؤں میں اخبار ”سیاست“ کے علاوہ کوئی اخبار نہیں دیکھا تھا، مبارک پور میں الجمعیۃ اور قومی آواز دیکھنے کو ملا، اس کے علاوہ حضرت اقدس شیخ الاسلام کے متعلق بہت کچھ پڑھ چکا تھا، اس وقت تک ماضی قریب کے علماء میں غالباً سب سے زیادہ دل کا تعلق انھیں بزرگوں سے تھا۔ حافظ توفیق احمد صاحب نے مولانا آزاد پر اعتراضات کی بوچھاڑ کردی، میں حافظ صاحب کا بہت احترام کرتا تھا، وہ مجھ سے عمر میں بھی اور درجے میں بھی بڑے تھے، پھر انجمن کے صدر بھی تھے، مجھے ان کے سامنے بولنے کا یارا نہ تھا، لیکن مولانا آزاد پر ان کا حملہ اتنا جارحانہ تھا کہ میں برداشت نہ کرسکا، میں بے تکان مولانا کے احوال، ان کی ذہانت وذکاوت کے واقعات، ان کے ملکی اور ملی کارنامے خاص طور پر اردو زبان کے سلسلے میں ان کی خدمات اور ان کی شخصیت کی عظمت ورفعت بیان کرنے لگا، وہ ہر تھوڑے وقفہ کے بعد کوئی چبھتا ہوا سوال کردیتے اور میرا سیلانی ذہن ابل پڑتا۔ اس دن صبح کی اذان تک مجلس مباحثہ گرم رہی، اسی وقت کتنی کتابیں کھولی گئیں، اخبار کی فائلیں ڈھونڈھی گئیں، غرض میں نے مولانا آزاد کے دفاع میں اپنی طاقت نچوڑ دی، حافظ صاحب پر غصہ بھی بہت آیا تھا، کہ اتنی محترم شخصیت پر ایسے ایسے جارحانہ اعتراض کئے، جب بحث ختم ہوئی، تو حافظ صاحب نے ایک عجیب بات بتائی، کہنے لگے کہ:

> ”تم تو دن رات مدرسے میں رہتے ہو، عوام سے تمہارا سابقہ پڑتا نہیں، میں اِدھر

اُدھر آتا جاتا رہتا ہوں، ہر طرح کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے، بہت سے لوگ مولانا آزاد پر اعتراض کرتے ہیں، مجھے تو کچھ معلوم نہیں ہے، بس ادھر ادھر کا جواب دے دیتا ہوں، میں نے سوچا کہ تمہیں چھیڑوں، تو بہت سی باتیں اکٹھا معلوم ہو جائیں گی، اب تم نے اتنا بتا دیا ہے کہ میں کسی سے نمٹ سکتا ہوں۔

میں نے کہا اس کیلئے مجھے اتنا غصہ دلانے کی کیا ضرورت تھی، آپ سوالات کر لیتے، میں جواب دے دیتا، بولے، غصہ نہ دلاتا تو نہ تم اتنی باتیں بتا سکتے، جو تم جوش میں بتا گئے، اور نہ ہی میرے ذہن میں اتنے سوالات پیدا ہوتے، اب بحث مکمل ہوگئی۔

اس وقت کے یہ حافظ توفیق احمد صاحب اب جامعہ حسینیہ لال دروازہ جونپور کے سالار قافلہ اور روح رواں ہیں، میرے دل میں ابتداء سے ان کا بڑا احترام تھا، ابتداء میں ایک بہت ذہین اور محنتی طالب علم کی حیثیت سے معروف تھے، کتابوں میں بڑی محنت کرتے تھے، مگر بعد میں جمعیۃ الطلبہ کی قیادت وصدارت نے طبیعت کے رخ کو ادھر سے ہٹا دیا تھا۔

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور کے رفقاء واحباب

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے عہد طالب علمی میں جن طلبہ سے گہرا ربط قائم ہوا، ان میں خاص لوگ یہ ہیں۔

(۱) مولانا فیاض احمد، مندرے، اعظم گڈھ
(۲) مولانا محمد عامر مبارک پوری مرحوم
(۳) مولانا حافظ الطاف حسین صاحب محی الدین پور
(۴) مولانا محمد رضوان صاحب بھوری
(۵) مولانا حافظ توفیق احمد صاحب
(۶) مولانا محمد احمد صاحب دلدار نگر
(۷) مولانا مشتاق احمد صاحب، ایلیا، بنارس

(۸) مولانا ڈاکٹر شمشاد احمد صاحب، آنوک

(۹) مولانا ابوالعاص مرحوم، انجان شہید

(۱۰) حافظ عبدالغفار صاحب، چھیہیں

یہ وہ لوگ ہیں جن سے احیاء العلوم کے بعد بھی تعلق قائم رہا، ان کا تذکرہ بعد میں مستقلاً کروں گا۔ انشاء اللہ

بعض وہ بھی ہیں جن سے احیاء العلوم میں تو خصوصی تعلق رہا، لیکن جب وہاں سے بچھڑے تو میں اپنی دنیا میں گم اور وہ اپنی دنیا میں گم! ایسے دو تین شخص اب حافظے اور یادوں کی محراب میں کبھی کبھی جلوہ گر ہوتے ہیں، ان میں سے دو سے تو کبھی کبھی غائبانہ ربط فون سے یا خط سے ہوا بھی، مگر ایک تو ایسے غائب ہوئے کہ اب تک ان کا کچھ پتہ نہیں، محبت کی داستان سرائی میں ان گمشدہ لوگوں کا ذکر تو ابھی کردوں، اور باقی جن سے ابھی تک تعلقات باقی ہیں، اس داستانِ ناتمام کے تمام ہونے کے بعد ان کا قدرے مفصل ذکر کروں گا۔ انشاء اللہ

یہ میرے حافظے اور یاد میں تین شخص ہیں۔

(۱) مولوی حفظ الرحمٰن صاحب ابراہیم پوری

(۲) مولوی سمیع اللہ صاحب پرتا پگڈھی

(۳) مولوی محمد طیب صاحب نیپالی

(۱) مولوی حفظ الرحمٰن صاحب! مبارک پور کی مضافاتی مگر قدرے دور کی آبادی ابراہیم پور ہے، یہاں کے متعدد طلبہ احیاء العلوم میں زیر تعلیم تھے، مولوی حفظ الرحمٰن صاحب بھی اسی بستی کے تھے، مجھ سے ایک جماعت نیچے تھے، پڑھنے لکھنے کا شوق انھیں بھی تھا، اسی مناسبت سے مجھ سے قریب ہوئے، میں بے تحاشا مطالعہ کرتا تھا، یہ ٹھہر کر پڑھتے تھے، مجھے لکھنے کا ذوق بالکل نہ تھا، انھیں لکھنے کا بھی ذوق تھا، چنانچہ یہ کچھ کچھ لکھتے بھی رہتے تھے، جدید عربی ادب کا انھیں بھی شوق تھا، ان کے والد مولوی محمد یٰسین صاحب

مرحوم بھی ایک صاحب ذوق اور باصلاحیت بزرگ تھے، لیکن تعلیم وتدریس کا مشغلہ نہ تھا، اس لئے علمی دنیا میں ان کا کوئی نام نہ تھا، مگر ان کے پاس کتابیں بہت اچھی اور معیاری تھیں، مجھ سے مولوی حفظ الرحمٰن نے ان کتابوں کا ذکر کیا تھا، تو میں ان کے ساتھ بار بار ان کے گھر گیا، ان سے کتابیں لیں اور ان کا مطالعہ کیا، اب ان کتابوں کے نام تو یاد نہیں، لیکن یہ یاد ہے کہ علامہ طنطاوی کی کئی کتابیں وہاں سے لے کر میں نے پڑھیں، ایسا خیال آتا ہے کہ ایک کتاب جواہر القرآن تھی، وہ مجھے بہت پسند آئی، اور اس کا بار بار مطالعہ کیا۔

مولوی حفظ الرحمٰن صاحب نے اس زمانے میں مدیر صدق مولانا عبد الماجد صاحب دیابادی علیہ الرحمہ سے مراسلت کی طرح ڈالی تھی، سوالات لکھ کر وہ بھیجتے، اور مولانا صدق جدید میں ان کے جوابات شائع کرتے تھے۔

میں عربی پنجم کے بعد دیوبند چلا گیا، وہ نہ معلوم کب ندوہ گئے؟ کب فارغ ہوئے؟ کہاں کہاں رہے؟ اب وہ جے پور میں کسی مدرسے میں مدرس ہیں، کبھی کبھی ٹیلیفون سے بات ہوئی ہے۔

(۲) مولوی سمیع اللہ صاحب پرتاپگڈھی، عربی سوم میں داخل ہوئے تھے، بریلوی تھے، کسی بریلوی مدرسہ میں پڑھ کر آئے تھے، خود کو ایسا ظاہر کر رہے تھے کہ بریلوی نہیں ہیں، کسی مجبوری میں اب تک بریلویوں کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی ہے، کتابوں کی استعداد کمزور تھی مگر تقریر وخطابت میں فرد تھے، پورے مدرسہ میں ایک بھی طالب علم ان کی ٹکر کا خطیب نہ تھا۔ ایسی پُرجوش اور رواں دواں تقریر کرتے تھے، کہ ایک سماں بندھ جاتا تھا، اسی زمانہ میں جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ میں مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم نے تقریری مقابلہ کرایا تھا، متعدد مدرسوں کے طلبہ شریک ہوئے تھے، ہمارے مدرسہ کے بھی دو طالب علم مولوی سمیع اللہ اور مولوی محمد احمد دلدار نگر والے شریک ہوئے، اور پہلا ودوسرا انعام بالترتیب دونوں نے حاصل کیا تھا۔

میں نے پہلے کہیں لکھا ہے کہ عربی سوم کی تعلیم کے دوران ہی کچھ ناگفتنی احوال

میں مبتلا ہوگیا تھا، اس کے نتیجے میں میرے اکثر ساتھی میرے سخت مخالف ہوگئے تھے، لیکن مولوی سمیع اللہ کی رفاقت اور دوستی مسلسل رہی، میں نے کچھ دنوں تک اکیلے انھیں کے ساتھ تکرار کیا تھا، بعد میں دوسرے رفقاء بھی معذرت کرکے میرے ساتھ آگئے۔

عربی چہارم کے سال میں مولوی سمیع اللہ غائب ہوگئے، اور اب کچھ پتہ نہیں کہ وہ کیا ہوئے؟ میں نے کوئی تحقیق بھی نہیں کی، طلبہ میں یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ وہ بریلوی تھے، بریلویوں میں چلے گئے۔

(۳) مولوی محمد طیب صاحب نیپالی، مجھ سے پہلے احیاء العلوم میں داخل ہوئے تھے، کتنا پہلے، یہ مجھے معلوم نہیں، عربی دوم میں میرا ان کا ساتھ ہوا تھا، اس وقت ان پر خاموشی کا تسلط تھا، ایسی خاموشی کہ شاید دو چار دن میں گفتگو کا کوئی کلمہ زبان سے نکالتے رہے ہوں، استعداد کمزور تھی، حضرت مولانا محمد مسلم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا رعب غالب تھا، اس لئے علم الصیغہ میں بہت محنت کرتے تھے، یہ کتاب مولانا کے پاس ظہر کے بعد پہلے گھنٹے میں تھی، میں دوپہر کا کھانا جاگیر سے کھا کر جونہی کمرے میں آتا، میرے پیچھے یہ بھی آجاتے، کتاب کھول کر بیٹھتے اور سبق کی سطر سطر پر انگلی پھیرتے اور میں ترجمہ کرتا رہتا، یہ بھی آہستہ آہستہ دہراتے رہتے، دوتین مرتبہ میں ترجمہ کردیتا، اور یہ کتاب لے کر واپس ہوجاتے، پھر ظہر تک اسے خوب رٹتے، سال بھر یہ سلسلہ چلتا رہا، لیکن یاد نہیں کہ کبھی سبق کے علاوہ اور کوئی حرف تکلم آشنا ہوا ہو۔

عربی دوم اور سوم تک یہی حال رہا، مگر چہارم میں آکر جو بولنا شروع کیا ہے تو پچھلے دنوں کی قضا کر ڈالی، بہت بولتے تھے، اچھی باتیں بھی، اور ان کے علاوہ بھی! مگر مجموعی اعتبار سے خیر اُن میں غالب تھا۔

پھر ہم لوگوں کے ساتھ دیوبند گئے، وہاں سے فراغت کے بعد معلوم ہوا کہ مدینہ یونیورسٹی جاپہونچے، پھر وہاں سے کہاں پہونچے، معلوم نہیں، ایک مدت کے بعد ایک مرتبہ ادھورا رابطہ ہوا تھا، پھر کچھ پتہ نہیں، اللہ تعالیٰ انھیں اچھا رکھے۔

ایک وقتی دلچسپی

۱۹۶۷ء میں عرب اور اسرائیل جنگ ہوئی تھی، اس میں عربوں کو شکست ہوئی اور اسرائیل کا بیت المقدس پر تسلط ہوگیا، یہ اتنا دردناک سانحہ تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان بلبلا اٹھے تھے، خاص طور سے ہندوستان کے مسلمان بے حد متاثر ہوئے تھے، اسرائیل کے مظالم نے فلسطین اور بیت المقدس کے مقامی باشندوں کو گھر سے بے گھر کردیا، یہ جابجا کھلے آسمان کے نیچے، کہیں خیموں میں پناہ گزینوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور کردئے گئے تھے۔ اس درد کو جمعیۃ علماء ہند نے محسوس کیا، جمعیۃ علماء کی طرف سے ملک کے مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ ان پناہ گزینوں اور بے گھروں کیلئے مالی تعاون کریں

ایک تو بیت المقدس قبلۂ اول کے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا صدمہ، پھر وہاں کے مسلمانوں کا حال زار! اہل درد تڑپ تڑپ گئے۔ میں اس وقت عربی چہارم میں تھا، استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ اس وقت سخت مضطرب تھے، ہم لوگوں کو تیار کیا، تقریر لکھ کردیں کہ انھیں کی روشنی میں گاؤں گاؤں جاکر فلسطینی مظلوموں کے لئے چندہ جمع کریں، چنانچہ ان دنوں کوئی جمعرات اور جمعہ خالی نہ جاتا تھا، کہ ہم لوگ اطراف کے مسلمان گاؤں میں نہ پھیل جائیں، ہم میں سے کئی طلبہ کو تقریر وخطابت کا ملکہ تھا، انھیں کی سربراہی میں کئی کئی طلبہ کو ساتھ لگادیتے، اس وقت ہم لوگوں کی شعلہ بیانی عروج پر تھی، ایسی تقریریں ہوتیں کہ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے، ہر جگہ چندہ کیا جاتا، مسلمانوں نے دل کھول کر تعاون کیا، یہ ساری رقم مولانا دہلی بھیج دیتے، وہاں سے مظلوموں تک پہونچانے کا نظم تھا۔

وہ بڑے جوش اور درد کا زمانہ تھا، اخبارات اس موضوع سے بھرے رہتے تھے، مولانا بھی شعلۂ جوالہ بنے ہوئے تھے، وہ خود بھی دورہ کرتے، اور مسلمانوں کو ترغیب دیتے، مولانا مقرر وخطیب نہ تھے، لیکن اس موقع پر دیکھا کہ متعدد جگہوں پر ان کی تقریریں ہوئیں،

یہ تقریریں مختصر ہوتیں، مگر تاثیر سے لبریز ہوتیں۔

اس کے ایک سال کے بعد جمعیۃ علماء کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک انگریزی اخبار نکالا جائے، حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی علیہ الرحمہ نے اس کی تحریک شروع کی، ہمارے استاذ محترم مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ نے اس دعوت پر بھی لبیک کہی، اس کے لئے بڑی رقم کی ضرورت تھی، مولانا نے پھر ہم لوگوں کو اس تحریک میں لگا دیا۔ اس تحریک میں وہ جذبات اور درد کی کیفیت نہ تھی، اس لئے معاملہ پھیکا پھیکا رہا۔ غالباً یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی، اور یہ انگریزی اخبار نہ نکل سکا۔

مبارک پور کی طالب علمی کا تذکرہ یہاں پر تمام ہوتا ہے، اب دیوبند جانے کی تیاری ہے، اسے اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

☆☆☆☆☆

نواں باب

دارالعلوم دیوبند کی تیاری اور داخلہ

(اب جو کچھ لکھ رہا ہوں، یہ آج سے بہت پہلے تقریباً ۲۵ ر سال پہلے کی تحریر ہے، جو خوبیٔ قسمت سے عزیزم مولانا حافظ ضیاء الحق خیرآبادی سلّمہ کے ہاتھ لگ گئی، اس لئے محفوظ رہ گئی۔ اس کو من وعن اس داستان سرائی کا حصہ بناتا ہوں)

(۱)

ہجری ۱۳۸۸ھ اور عیسوی ۱۹۶۸ء کا زمانہ ہے، رمضان کا مہینہ، ایک طالب علم غریب الدیار، مسکین صورت، حقیر و بے مایہ، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے وسیع و عریض صحن میں، مضطربانہ ٹہل رہا ہے، بار بار نگاہ صدر دروازے کی جانب اٹھ جا رہی ہے، ابھی تک وہ نہیں آیا؟ کیا اس نے ارادہ بدل دیا؟ کیا مجھے گھر جانا پڑے گا؟ نہیں، وہ آئے یا نہ آئے، میں گھر نہیں جاؤں گا، مدرسہ کا کتب خانہ دوبارہ نصیب نہ ہوگا، رمضان بھر درس کی مصروفیت سے فراغت رہے گی، سیر ہو کر کتابوں کا مطالعہ کروں گا، یہی سوچتے سوچتے پھر جو اچانک نگاہ اٹھی، تو دروازے سے ایک طالب علم آتا ہوا دکھائی دیا، یہی ہے، جس کا انتظار تھا، رنگت سانولی، قد میانہ، اٹھارہ بیس سال کا سن، چہرے پر خوبصورت چھوٹی سی داڑھی، ہونٹوں پر مسلسل مسکراہٹ، علی گڈھ پاجامہ، چھوٹا سا کرتا، اجمل کیپ! یہ ہیں مولوی الطاف احسن، اساڑھا ضلع اعظم گڈھ، اطراف سرائمیر کے رہنے والے، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے طالب علم! اور دوسرا یہ حقیر و آثم، ان سطور کا راقم، ناآشنائے حقیقت گرفتار مجاز، برائے نام اعجاز!

مولوی الطاف سے پہلی ملاقات شعبان میں، مدرسہ احیاء العلوم کے اسی صحن میں

ہوئی تھی، وہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے طالب علم تھے، مدرسۃ الاصلاح اور دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں عربی زبان اور بعض مضامین کے علاوہ اور کسی بات میں اشتراک نہیں ہے، داخلے کے لئے دارالعلوم دیوبند میں وہیں کے نصاب کا امتحان ہوتا ہے، مولوی الطاف کی تعلیم دوسرے نصاب کے تحت ہوئی ہے، وہ مضطرب تھے کہ امتحان داخلہ کی کٹھن منزل کس طرح سر ہوگی، جبکہ دارالعلوم دیوبند کا نصاب نہ صرف یہ کہ مختلف ہے، بلکہ بدرجہا مشکل بھی ہے، اصلاح والوں نے اپنے نصاب میں وہ کتابیں رکھی ہیں جنھیں ایک متوسط ذہن کا طالب علم مطالعہ سے حل کرسکتا ہے، اس کے برخلاف دارالعلوم کی نصابی کتابیں ایسی ہیں کہ استاذ کی مدد کے بغیر ان کے الفاظ ومعانی کی تہوں میں اترنا مشکل ہے، طالب علم تمرینی اور ورزشی دور میں ہوتا ہے، اگر اسے مشکل مضامین اور ادق کتابوں کے حل کرنے کی استعداد بہم پہونچ گئی، تو سہل مضامین اور آسان کتابوں پر عبور کچھ دشوار نہ ہوگا، دارالعلوم دیوبند کا نصاب جس نے سمجھ کر پڑھ لیا وہ کسی کتاب کے پڑھنے اور پڑھانے میں بند نہیں ہوسکتا، لیکن ندوہ اور اصلاح کا فاضل، اپنا پڑھا ہوا نصاب تو سنبھال لے گا، مگر دوسری جگہ اس کے پاؤں میں زنجیر ہوگی۔

مولوی الطاف احسن، احیاء العلوم میں اس خیال سے آئے تھے کہ کوئی ذی استعداد طالب علم مل جائے، اور آمادہ ہوجائے، تو اس کی رفاقت میں درس نظامیہ کی بعض اہم کتابیں ایک ماہ میں بقدر مناسبت پڑھ لی جائیں، تاکہ امتحان کے وقت بالکل اندھیرا نہ رہے۔ وہ مدرسہ احیاء العلوم میں اجنبی تھے، مدرسہ کے طلبہ نے اپنے روایتی جذبۂ مہمان نوازی کے مطابق الطاف کا استقبال کیا، ان کی ضیافت کی، اور جب انھوں نے اپنا مدعا بتایا تو کسی نے انھیں بتایا کہ ایسا جنونی اور بے دماغ اس مدرسہ میں فلاں ہے، جو کتابوں کا دیوانہ ہے، کتابوں کی دیوانگی میں نہ اسے گھر کا خیال رہتا، اور نہ دوسرے تعلقات کی پروا رہتی، اس کے پاس چلو، چنانچہ میرے ہم سبق رفقاء انھیں لے کر میرے پاس آئے، الطاف کی بات سن کر مجھے بہت مسرت ہوئی، میں نے وعدہ کرلیا، آپ ضرور آئیں، میں آپ کی مدد کرسکوں یا نہ

کرسکوں، آپ کی معیت کی وجہ سے میرا مدرسہ میں رہنا آسان ہوگا، ورنہ مدرسہ کے ناظم صاحب جن سے ہمارے گھریلو تعلقات ہیں، ازراہ شفقت وعنایت مجھے گھر جانے کا حکم دیں گے، اور میرا گھر یہاں سے صرف چھ میل کے فاصلے پر ہے، گھر والے بھی اس پر راضی نہ ہوں گے کہ میں اس قدر قریب رہ کر، گھر سے اور وہ بھی رمضان شریف میں دور رہوں، ہر سال یہی ہوتا ہے، میں رمضان کی تعطیل میں مدرسہ میں رہ کر کتابوں کے ساتھ لگا لپٹا رہنا چاہتا ہوں، مگر گھر والے اصرار کر کے اور ناظم صاحب حکم دے کر مجھے مجبور کر دیتے ہیں، اس سال چونکہ مجھے بھی دیوبند جانا ہے، اور آپ کی تیاری کا بھی عذر ہے، اس لئے امید ہے کہ ہے کہ دونوں جانب سے اجازت مل جائے گی، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے انمول خزانہ میرے قدموں کے نیچے نکل آیا ہو، بہت دیر تک ہم دونوں محو گفتگو رہے، مستقبل کے منصوبے بنتے رہے، رفاقت پر اظہار مسرت ہوتا رہا، ایک دوسرے سے تعاون وتناصر کے عہد و پیمان اُستوار کئے جاتے رہے، چھوٹا سا مدرسہ! محدود آبادی! اساتذہ سے احترام وادب کے ساتھ بے تکلفانہ تعلقات! یہ خبر تھوڑی دیر میں مدرسہ بھر میں آناً فاناً گشت کرگئی، تبصرے ہونے لگے، میں تو اپنی مسرت میں مست تھا، اور دوسروں کا حال یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں! میاں! یہ تو دیوانہ تھا ایک سنکی اور مل گیا، اب دیکھو، یہ دونوں کیا گل کھلاتے ہیں، نہیں بھائی! یہ بہت ہوشیار ہے، اس طرح اپنی پڑھی ہوئی کتابیں خوب پختہ کرلے گا، اور دیوبند جا کر سب ساتھیوں کو مات دیدے گا، ایک نے کہا اجی نہیں! یہ اس کو تیاری کیا کرائے گا؟ دن رات تو غیر درسی کتابوں میں غرق رہے گا، یا پھر کوئی موضوع چھیڑ کر رات بھر اپنی جمع کی ہوئی معلومات اس کو سنائے گا، اور وہ بھی اس کی باتوں میں محو ہو کر اپنا مقصد فراموش کر دے گا، پھر آخر میں خالی ہاتھ واپس جائے گا، دوسرے نے ٹوکا، اجی کچھ نہیں، یہ صاحب رمضان میں آئیں گے ہی نہیں، کہاں کی بات اور کیسا خیال؟ بھلا کوئی گھر والا رمضان میں روکھی پھیکی دال روٹی کھانے کے واسطے مدرسہ میں آنے دے گا، غرض تبصروں کی جھڑی لگ گئی، لیکن میں تھا کہ اپنی مسرتوں کی حلاوت میں گم، ان سارے تبصروں سے بے حس و بے نیاز تھا۔

(۲)

امتحان سالانہ ختم ہوگیا، طلبہ ایک ایک کر کے اپنے اپنے وطن روانہ ہورہے ہیں، ہم گیارہ ساتھی تھے، جو ہدایہ اولین پڑھ کر دیوبند جانے کے منصوبے بنارہے تھے، پروگرام یہ بنا کہ ۷/شوال کو سب ساتھی مدرسہ میں اکٹھا ہوں، اور ۸/کو ایک ساتھ دیوبند روانہ ہوں، یہ پروگرام طے کر کے، سب ایک دوسرے سے الوداعی مصافحہ کر کے رخصت ہوگئے، میں بھی گھر پہونچا، ڈرتے ڈرتے والد صاحب کے سامنے رمضان کا منصوبہ رکھا، ابتداءً انھوں نے انکار کیا، مگر ضرورت اور شوق پر مشتمل میری پُر جوش تقریر نے انھیں راضی کردیا۔ ادھر سے جب اطمینان ہوا، تو ناظم صاحب سے اجازت کا مرحلہ باقی تھا، ناظم صاحب کا رعب دل ودماغ پر اس درجہ چھایا ہوا تھا کہ تمامتر فصاحت وبلاغت ان کے سامنے ہوا ہوجاتی، ساری لسانی وطراری چوکڑی بھول کر دم بخود رہ جاتی، سہما سہما ان کی خدمت میں حاضر ہوا، مختصر الفاظ میں اٹک اٹک کر اپنا مدعا بیان کیا، انھوں نے خلاف توقع بڑی خوشی سے اجازت دے دی، اب خطرے کا کانٹا نکل گیا، اس اجازت کے بعد گھر واپس نہیں ہوا، حالانکہ ابھی شعبان کی ۱۶/تاریخ تھی، کتب خانہ کے جنگل میں گھس گیا، کتابیں نکالتا، پڑھتا، اور جمع کردیتا، اس وقت الجمعیۃ کا جمعہ ایڈیشن وحیدالدین خاں کی ادارت میں بڑے آب وتاب سے نکلتا تھا، وہ سنیچر کو مبارک پور پہونچتا، ہفتہ کا سارا دن اس کی مصروفیت میں کٹ جاتا، مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ پندرہ دن کتنی تیزی سے اُڑ کر نکل گئے۔

پہلی رمضان آگئی، اور الطاف نہیں آئے، میں مضطرب تھا، دن بھر سراپا انتظار بنارہا، خطرہ تھا کہ اگر الطاف نہ آئے، تو میرے لئے پیچیدگی پیدا ہوسکتی ہے، دل کی گہرائیوں سے دعا نکل رہی تھی، دل کی لگی پوری ہوکر رہتی ہے، بالآخر انتظار کی گھڑی تمام ہوئی، مولوی الطاف دروازے سے نمودار ہوئے، کھوئی ہوئی بہار پھر چمن دل میں خیمہ زن ہوئی، دوڑ کر ملا، جلدی جلدی انتظار کی بے تابیاں بیان کیں، الطاف مسکرا مسکرا کر تاخیر کی معذرت کرتے رہے، اور میں تھا کہ ان کے آنے کی خوشی میں سارا گلہ بھول گیا تھا۔

تم گلے سے مل گئے، سارا گلہ جاتا رہا

پھر تو ہر روز، روزِ عید تھا، اور ہر شب، شب قدر! مختصر المعانی، ملا حسن اور دیوان متنبّی کی ورق گردانی ہونے لگی، الطاف تو دن بھر درسی کتابوں میں غرق رہتے، میں اپنی ڈیوٹی انجام دے کر غیر درسی کتابوں میں کھو جاتا، یاد آتا ہے کہ قصبہ میں بازار والی مسجد کی امامت بھی ذمے پڑی تھی، تراویح بھی پڑھاتا تھا، وہ مسجد مدرسے سے کسی قدر فاصلے پر تھی، اتنا آنا جانا بھی بہت کھلتا تھا، مگر مرتا کیا نہ کرتا، ناظم صاحب کا حکم تھا، جاتا اور طالب علمی میں جیسی نماز پڑھی جاتی ہے، پڑھا کر چلا آتا، رمضان کے مبارک ایام تھے، ہم دونوں سب عبادتوں سے بے نیاز محض کتابوں کے ہو کر رہ گئے تھے، نہ یہ خبر ہوتی کہ دن کب گزرا، اور نہ یہ ہوش رہتا کہ رات کیسے کٹی، خاموش فضا ملی، مولوی الطاف تو مدرسہ میں اجنبی تھے، میں چار سال کا قدیم طالب علم تھا، لیکن ہر شخص کو معلوم تھا کہ یہ بے سلیقہ اور بے ڈھنگا طالب علم ہے، نہ قصبہ کی گلیوں سے واقف ہے، نہ اسے خرید وفروخت کا کوئی سلیقہ ہے، دکان پر کھڑا ہونا، اس کے لئے مجرم بننے کے مترادف ہے، کسی کام سے کوئی بھیجتا، تو اس کا کام بگڑ جانا میرے لئے لازم حال تھا، اس لئے ہر شخص نے نکما اور ناکارہ سمجھ کر مجھے ہر خدمت سے معاف کر رکھا تھا، ایک لحاظ سے یہ بات میرے لئے سخت تکلیف دہ تھی کہ میں اپنے مخدوموں، بزرگوں اور اساتذہ کی خدمت سے اپنے بے سلیقہ پن کی وجہ سے بالکل قاصر تھا۔ دوسرے ساتھیوں کو دیکھتا کہ اساتذہ ان سے کام لیتے، وہ ان کی خدمات سے خوش ہوتے، ان کے کاموں کی تحسین کرتے، اور وہ اس راہ سے اساتذہ کے قرب کی دولت سے مالامال ہوتے، مجھے حسرت ہوتی، دل پر رنج وغم کی بدلیاں چھاتیں، اپنی کم نصیبی پر افسوس ہوتا، اور اس کی تلافی کی تدبیریں سوچا کرتا، دل ہی دل میں منصوبے گانٹھا کرتا کہ کوئی موقع آیا تو یوں سبقت کروں گا، لپک کر یوں خدمت کروں گا، مگر جب نوبت آتی تو میں کھڑا منہ دیکھتا رہ جاتا اور حریفانِ تیز گام دوڑ کر میرے عزائم کی بنی بنائی پختہ عمارت کو ڈھا کر آگے بڑھ جاتے، اور میں اس کے ملبے پر کھڑا کف افسوس ملنے کے سوا اور کچھ نہ کر پاتا، گو یہ صورت حال میرے

لئے از حد ناخوشگوار تھی، اور میں ہمیشہ اپنے تئیں اسی یقین پر قائم رہا کہ میرے جیسا شخص اساتذہ کی نگاہوں میں بار نہیں پا سکتا، اور نہ کبھی اس کی سرخروئی کی کوئی صورت بن سکتی، شرمندگی، حرماں نصیبی اور بے وقعتی کے علاوہ اور کچھ میرے مقسوم میں نہیں ہے۔

لیکن اس کا ایک فائدہ کبھی کبھی دل کو خوش کر جاتا تھا، گو کہ وہ خوشی بس ایسی ہوتی، جیسے سخت اندھیری بدلیوں میں کبھی کوئی بجلی کوند جائے۔ فائدہ یہ کہ میں نکما اور ناکارہ قرار پاکر جب ہر کام سے معاف کر دیا گیا، اور کتابیں پڑھنے کا بے پناہ شوق دل میں ہر وقت موجیں مارتا رہتا تھا، تو اس شوق کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوتی، اگر اور کاموں کا کوئی سلیقہ ہوتا، تو ہرگز اس طرح کتابوں کے اوراق سے لپٹا نہ رہ سکتا، جیسے مواقع اس صورت حال میں مجھے ملے ہیں۔ پڑھنا میرا ذوق ہے، لکھنے سے مناسبت نہیں ہے، والد صاحب ہمیشہ تاکید کرتے کہ حاصل مطالعہ لکھ لیا کرو، علوم کا ذخیرہ ہاتھ میں رہے گا، لیکن میں سوچا کرتا کہ جتنی دیر میں ایک صفحہ لکھوں گا، نہ جانے کتنے صفحے پڑھ لوں گا، کاش ان کی بات مان لی ہوتی، تو اب حافظے کے دغا دے جانے کے بعد اس کا فائدہ حاصل ہوتا، لیکن افسوس بالائے افسوس میری بے حسی پر یہ ہے کہ نہ بھولنے کا کوئی رنج ہے اور نہ حافظہ خراب ہونے پر کوئی افسوس ہے، بس اب بھی اگر کوئی دھن ہے تو یہی کہ کوئی اچھی کتاب مل جائے، فراغت ہو، اور میں ہوں، نہ جانے اس کا کیا فائدہ؟ مگر اپنی مہمل طبیعت کو دیکھتا ہوں، تو سود و زیاں کی سودے بازی سے اسے کوئی مناسبت نہیں، مطالعہ اور علم مقصود ہے، اور وہ خود فائدہ ہے، بھولنا انسان کی فطرت ہے، دس باتیں پڑھے گا، تو ایک یاد رہے گی، سفر آگے کو جاری ہے، پیچھے مڑ کر کون دیکھے کہ کون کون سی منزلیں گزریں۔

بہر حال میری یہ بے ہنری اس وقت خوب کام آئی، ناظم صاحب کی اجازت سے ہم دونوں بالائی منزل کے ایک کمرے میں مقیم تھے، نیچے دار الاہتمام میں سفراء مدارس، مہمانوں اور قصبہ کے لوگوں کا ہجوم رہتا، ہر وقت چپراسیوں اور بعض خدام کی پکار پڑتی رہتی، مگر ان میں ایک ناکارہ ایسا بھی تھا، جو کبھی آواز دئے جانے کا مستحق نہیں سمجھا گیا، اب بھی

سوچتا ہوں، تو ذہن کے پردے پر اس وقت کی تصویریں صاف دکھائی دے رہی ہیں، نیچے دسترخوان پر الوان واقسام کی نعمتیں چنی جارہی ہیں، رمضان میں یوں بھی دسترخوان کی وسعت بڑھ جاتی ہے، اس میں تنوع پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کم سے کم حیثیت کا مسلمان بھی کرتا ہے، اور یہاں تو ناظم صاحب کا دسترخوان تھا، جو اپنی کشادہ دستی اور حسن میزبانی میں مشہور تھے، مگر ہم دونوں ...... یادش بخیر...... الطاف کے پاس ایک عجیب وغریب برتن تھا، جسے وہ ''کوکر'' کہتے تھے، نہ میں نے اس سے پہلے کبھی ایسا کوکر دیکھا تھا اور نہ اس کے بعد! ہو بہو ٹفن کیریر سمجھئے، اس میں چار ڈبے تھے، نیچے کے ڈبے میں پانی بھرا جاتا تھا، اس کے اوپر تین ڈبوں میں حسب مرضی چاول، دال اور گوشت یا ترکاری مع ان کے لوازم کے ڈال دیا جاتا، پھر سب کو باہم پیوست کر کے، ایک طویل القامت ڈبے میں ڈال کر اسے اوپر سے بند کر دیا جاتا، اس طویل ڈبے کے نچلے حصے میں ایک انگیٹھی تھی، اس میں کوئلہ جلا دیا جاتا، گھنٹے بھر میں بھاپ کے اثر سے سب کچھ پک کر تیار ہو جاتا، روکھا پھیکا! بے لذت! ہم لوگ اسی حالت میں اسے کھا لیا کرتے، اور بس! یہی سحری میں بھی اور یہی افطار میں بھی!

(۳)

ماضی کی دور دراز وادیوں میں، ادراک کی نگاہوں پر حافظہ کی دوربین چڑھا کر دیکھتا ہوں، تو بھی ان کتابوں کا تشخص صاف طور پر نہیں ابھرتا، جن کی محویت میں صبح کی حدیں شام کے ساتھ، اور شام کا دامن صبح کے ساتھ اس طرح پیوست رہا کرتا تھا کہ حد فاصل قائم کرنا مشکل ہو جاتا، البتہ اتنا نمایاں طور پر نظر آتا ہے کہ اس وقت تاریخ اور ادب عربی کا ذوق غالب تھا، انھیں دونوں موضوعات پر عموماً ذہنی اور دماغی سفر ہوا کرتا تھا، اگر اس وقت یادداشت کا کوئی روزنامچہ مرتب کئے ہوتا، تو آج مطالعہ کی داستانِ بہار سنانے میں بڑی سہولت ہوتی، لیکن تحریر سے بے نیازی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ اپنی یادداشت تو کیا رکھتا، مدرسہ کے کتب خانہ کا قانون تھا کہ کتاب خواہ ایک ہی گھنٹے کے لئے نکالی جائے، اس کا اندراج رجسٹر میں ہونا ضروری ہے، مگر میری لاابالی طبیعت، پابندی کی اس زنجیر گراں سے

بھی نفور تھی، خوشامد برآمد کر کے، ناظم کتب خانہ سے میں نے خود کو اس قانون سے مستثنیٰ کرالیا تھا، مجھے دن میں بعض اوقات کئی کئی بار کتابیں لینے کی نوبت آتی، ناظم کتب خانہ کو میرے اوپر اعتماد ہو گیا تھا، ان کی طرف سے علی الاطلاق اجازت تھی، یہی بے ڈھنگی رفتار دیوبند میں قائم رہی، چند دنوں تک تو ناظم شعبۂ مطالعہ مولوی محمد حنیف صاحب (مرحوم) سے آنکھ مچولی ہوتی رہی، وہ اپنے اصول کے بہت پابند تھے، بات بات پر گرفت کرنے کے عادی، طلبہ ان کی بے دماغی سے نالاں رہتے، مگر وہ اپنے اصول وقواعد کے مقررہ راستوں سے ایک انچ ادھر ادھر نہ ہوتے، اس لئے ابتداء میں مجھے بھی ان کے اصول وضوابط کی دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا، اور اس طرح گزرنا پڑا کہ روزانہ ہم دونوں ایک مرتبہ باہم دست وگریباں ہوتے، مگر آخر وہ بوڑھا سپاہی تھک گیا، اس کے اصول میرے لااُبالی پن اور بے ترتیبی کے سامنے شکست کھا گئے، پھر میں ہوتا اور میری تپائی پر غیر مندرج کتابوں کا ڈھیر! اور جب تک کتب خانہ کا وقت ساتھ دیتا، اس سے کچھ آگے ہی جا کر اس کا دامن چھوڑتا، مولوی صاحب ڈانٹتے کہ بارہ کا گھنٹہ ہو گیا ہے، جاؤ کھانا کھاؤ، ارے مر جائے گا، وغیرہ، اور میں وقت کی تنگ دامانی کی شکایت اور مزید مطالعہ کی حسرت لئے اٹھ کھڑا ہوتا، اللہ رکھے طبیعت کا وہی رنگ اب بھی باقی ہے، مدرسہ ریاض العلوم گورینی کے کتب خانہ کی نہ جانے کتنی کتابیں رجسٹر کی نگاہوں سے بچا کر الماریوں سے نکالی جاتی ہیں، اور واپس ہو جاتی ہیں، یہاں بھی ناظم کتب خانہ کرم فرما ہیں۔ (۱)

بہر حال یہ علمی سفر ہوتا رہا، اس وقت بچپن، جوانی سے ہم آغوش تھا، طبیعت، افسردگی اور پژمردگی کے مفہوم سے ناآشنا تھی، نہ کبھی تکان کا احساس ہوتا، نہ اکتاہٹ ہوتی، بس ایک دھن تھی کہ پڑھتے چلے جاؤ، ہر قسم کی کتابیں پڑھتا، اردو تو اپنی مادری زبان تھی، فارسی کی شدبد برائے نام تھی، عربی کی تحصیل کا زمانہ تھا، تینوں زبانوں کا مطالعہ جاری رہتا، اردو زیادہ، عربی دوسرے نمبر پر، اور کسی قدر فارسی!

---

(۱) جن دنوں یہ تحریر لکھی گئی، میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور میں مدرس تھا۔

لیکن اس ساری تفصیل سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مطالعہ کے علاوہ کسی اور چیز سے مجھے دلچسپی تھی ہی نہیں، یہ سچ ہے کہ قلبی لگاؤ اور فطری دلچسپی تو کتابوں ہی سے تھی، مگر اس کے ساتھ اپنی معلومات کو بیان کرنے کا بھی شوق تھا، چنانچہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میرے احباب مجھے چھیڑتے، اور ولولۂ تقریر جاگتا بس پھر کیا کہئے، رات آنکھوں میں کٹ جاتی، مجھے اکثر گفتگو میں ربودگی اور بے خودی کی کیفیت طاری ہوتی، اور اس وقت گل افشانئ گفتار کا منظر قابل دید ہوتا، باتوں کی محویت نے مجھے بہت جگایا ہے، باتیں ہر طرح کی ہوتیں۔ علمی، دینی، تاریخی، تفریحی، فضول بک بک، لغو مباحثے، یہ سب تکلم کی لمبی دیوار کے اینٹ گارے تھے، آخر گفتگو میں درازی کیونکر آتی، لطائف وظرائف اور اقوامِ پارینہ کے قصص واساطیر کا بھی خاصا حصہ ان مجالس میں ہوتا۔ کبھی کبھی آپس میں لڑائیاں بھی ہو جاتیں۔

اس گفتگو کو یہیں نا تمام چھوڑیئے، اپنی دلچسپیوں کی تفصیل کے لئے یہ جملۂ معترضہ کافی نہ ہوگا، ابھی میں اپنے آئینۂ ماضی کے اس حصہ سے نسیان وفراموشی کی گرد صاف کر رہا ہوں، جس میں میرے دیوبند جانے کی تیاریوں کی تصویر منعکس ہو رہی ہے، میں آج بھی جب ماضی کے اس دھندلے آئینہ کو ذرا شفاف کر کے دیکھتا ہوں، تو صاف نظر آتا ہے کہ پہلی رمضان سے ۲۵؍ رمضان تک کی مدت میں روز وشب کی سفید وسیاہ چادریں اس طرح پھیلتی اور سمٹتی رہیں، جیسے طویل کوہستانی سلسلے میں پھیلی ہوئی سرنگوں میں ٹرین چلتی ہے، کہ اچانک سرنگ میں گھسی اور چند لمحوں کے لئے اندھیرا چھایا، پھر دوسرے ہی لمحے سورج کی روشنی میں آنکلی، ریل گاڑی ان سرنگوں میں گھستی اور نکلتی رہتی ہے، اور مسافر اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے، چند ثانیے کے لئے جب گپ اندھیرا ہوتا ہے، تو مسافر آنکھیں بند کر لیتا ہے، پھر جونہی روشنی کی کرن آتی ہے، اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے، ہم دونوں کا حال اسی مسافر کی طرح تھا، ہماری زندگی کی تیز رفتار گاڑی اسی طرح کبھی رات کی سرنگ میں جا داخل ہوتی، لیکن یہ لمحہ تھوڑا ہوتا، پھر ایک دم میں روشنی پھیل جاتی، اور جو کتاب اجالے میں کھلی تھی، اسے اندھیرے میں بند کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

بس یونہی اچانک ایک دن وہ آیا کہ میاں الطاف نے اذنِ رحیل سنا دیا، آج ۲۵ر رمضان ہے، اب گھر چلیں گے، گھر والوں کے ساتھ مل کر عید کی تیاری کریں گے، میں بھی اس کے لئے تیار تھا، غالباً جمعرات کا دن تھا، ہم دونوں ایک دوسرے سے ۷ر شوال کو ملنے کا معاہدہ کرکے اپنے اپنے گھر کو روانہ ہوگئے۔

(۴)

میں ۲۵ر رمضان کو مدرسہ سے چند کتابیں لئے ہوئے گھر پہونچا، آخر گھر پر کیا کرتا، میرا نکما پن مجھے گھر میں بھی بدنام کئے ہوئے تھا، گھر رہ کر انھیں کتابوں میں لگے رہنے کا منصوبہ تھا، یہ میری عمر کا اٹھارہواں سال تھا، مزاج وطبیعت کا دامن اگرچہ ابھی طفولیت کی شوخیوں سے بندھا ہوا تھا، تاہم دیندار گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں، دینی مدرسہ میں تعلیم حاصل کررہا تھا، علماء کی صحبت سے فطری مناسبت تھی، دینی کتابوں کا ذوق تھا، سیرت کے مطالعہ کا شائق تھا، طبیعت بھی فطری طور پر دینداری کی طرف مائل تھی، گوکہ اعمال فاسقہ میں مبتلا تھا، تاہم دینداری کا جوش تھا، گھر آیا تو معلوم ہوا کہ سات مسجدوں (اس وقت سات مسجدیں تھیں، اب دس بارہ مسجدیں ہیں) کا یہ بڑا گاؤں، خدا کے حضور اعتکاف کرنے والوں سے یکسر خالی ہے، گاؤں کے کسی فرد کو فرصت نہ ہوئی کہ خداوند تعالیٰ کے آستانہ پر دس دن کے لئے دھونی رما کر بیٹھتا۔ رسول اکرم ﷺ کی اس سنت گرامی کو میرے وطن کے باشندوں نے مردہ کردیا، اس سے طبیعت بہت متاثر ہوئی، اور انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی تاثر بے چینی اور تڑپ پیدا کرتا ہے، تو اس کے اظہار کا اسے راستہ ملنا چاہئے، میری طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہوا، اور دوسرے دن نمازِ جمعہ کے بعد میں نے خود اپنی تقریر کا اعلان کردیا، اور تقریر کرنے کھڑا ہوگیا، اس سے پہلے میں نے متعدد تقریریں کی تھیں، کافیہ پڑھنے کے دور سے، مجھے تقریر وخطابت کا ایک گونہ ملکہ ہوگیا تھا، لیکن اب تک جو تقریریں ہوئی تھیں، اس تاثر کے ساتھ تھیں کہ ایک نوآموز لوگوں کے سامنے اپنی مشق وتمرین کا نمونہ پیش کررہا ہے، اور لوگوں کے تیور، ان کی زیرلب مسکراہٹ، ان کی پیشانی کی سلوٹوں میں اس کا نتیجہ

دیکھنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن آج خطابت کا انداز بدلا ہوا تھا، اب ملتجیانہ لب ولہجہ کی جگہ داعیانہ آہنگ تھا، میں لوگوں کے چہروں پر اپنی تقریر کی کامیابی وناکامی کی لکیریں پڑھنے کے بجائے ان کے دلوں میں اتر جانے کا عزم رکھتا تھا، میں نے بڑھ کر اپنی قوم کو للکارا تھا کہ رسول کے اتباع کے بغیر دنیا کا یہ جھوٹا غازہ، جو آج فریب نظر بنا ہوا ہے، اتر جائے گا۔ اعتکاف کی ایسی تاکیدی سنت اور اس سے اس درجہ سرد مہری! اس تقریر کا اثر لوگوں نے کیا لیا، اس کو معلوم کرنے کی کوشش میں نے آج تک نہیں کی، کیونکہ داعی جب اپنی بات پوری قوت سے کہہ دیتا ہے تو اسے کوئی چیز اس یقین سے روک نہیں سکتی کہ تیر نشانہ پر بیٹھ گیا ہے، میں نے چہروں سے تاثر معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی، میں نے تبصروں پر کوئی توجہ نہ دی، میں نہیں جانتا کہ خلوتوں اور جلوتوں میں، میرے اس بظاہر رِندانہ خطاب پر کیا کیا رائیں قائم کی گئیں، تاہم اتنا دیکھ رہا ہوں کہ اس سال کے بعد اب تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رمضان کا عشرۂ اخیرہ، اس متبرک سنت کی تعمیل سے خالی رہ گیا ہو۔ **فالحمد لله و ما أنا بشئ**

وقت کی لمبی زنجیر ماضی کی وادیوں میں سمٹی چلی جارہی ہے، مستقبل سرپٹ دوڑتا چلا آرہا ہے، ۲۵/رمضان کے بعد ۷/شوال کے آنے میں دیر نہیں لگی، اس قلیل وقفے میں آرزوؤں، امنگوں کے قافلے درقافلے یکے بعد دیگرے دل ودماغ کی وسعتوں میں اترتے اور کوچ کرتے، نہ جانے کتنے ولولے، طبیعت میں حوصلہ مندیوں کے طوفان اٹھاتے، اور آرزوؤں کا جادو جگاتے، میرا پورا وجود ان سحر طرازیوں کے سیلاب میں غرق تھا، تخیل کی جولانی، سفر کی، منازل سفر کی، دیوبند کی، دارالعلوم دیوبند کی، وہاں کے اساتذہ وطلبہ کی، عجیب وغریب تصویریں بناتی اور مٹاتی رہتی، میں سوچا کرتا کہ اللہ اللہ! دارالعلوم دیوبند کیسا ہوگا؟ وہاں کے اساتذہ اور علماء کس شان کے ہوں گے؟ بعض حضرات سے تو پہلے سے واقفیت تھی، مگر اکثر لوگ اَن جانے تھے، دل تھراتا تھا کہ امتحان میں کیا ہوگا؟ مدرسہ احیاء العلوم تو چھوٹا مدرسہ ہے، اس کا ماحول محدود ہے، تھوڑے طلبہ ہیں، یہاں تو سکہ جم جاتا تھا، مگر دارالعلوم! اللہ اکبر! پورے ہندوستان کی تمام تر چھوٹی بڑی علمی ندیاں اور نہریں، اسی

سمندر کی آغوش میں گرتی ہیں، ہر جگہ کا صاف ستھرا شفاف پانی، اسی بحر مواج میں شامل ہوتا ہے، وہاں اپنی انفرادیت کس طرح قائم ہو سکے گی، دار العلوم کا رعب، وہاں کے اساتذہ کی عظمت، وہاں کے ماحول کی دہشت، دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، تاہم وہاں پہونچنے کی خوشی اس سارے رعب و دہشت پر غالب تھی، کبھی کبھی دل میں آرزو اٹھتی کہ جانے سے پہلے ایک بار خواب میں وہاں کی زیارت ہو جاتی، لیکن میری طبیعت کا عجب انداز ہے، جس چیز کا خیال جتنا زیادہ دل پر مستولی ہوتا ہے، اسی قدر وہ خواب سے دور ہوتی ہے، میرے یہاں خواب و خیال کا اجتماع شاذ و نادر ہوتا ہے، خواب میں اکثر وہی باتیں دیکھتا ہوں، جن کا مدتوں تصور بھی نہ ہوا ہو، اس لئے اس باب میں بھی خواب کا دروازہ بند تھا، بس تخیل نے تصورات کے جو خوبصورت، باعظمت اور پُر شوکت پیکر ڈھالے تھے، وہی میری شادمانی و مسرت کا سرمایہ تھے، میں دن رات انھیں تصورات میں غرق رہتا تھا، والد صاحب میری ضروریات کے سامان فراہم کرنے میں مصروف تھے، دیوبند میں سردی زیادہ پڑتی ہے، اس لئے لحاف اچھا اور موٹا ہونا چاہئے، وہ بنوایا جا رہا ہے، کپڑے نئے خریدے اور سلوائے جا رہے ہیں، بہنیں بھی خوش تھیں، اور اتنے طویل سفر کا پہلا اتفاق ہے، اس لئے ہراساں بھی تھیں، ان دنوں رہ رہ کر مجھے ماں یاد آ رہی تھی، ماں! جس کے دید سے، میرے شعور کی آنکھیں محروم تھیں، جس کی ممتا مجھے ملی ضرور، مگر عمر کا کارواں، ابھی دوسرا ہی مرحلہ عبور کر کے کچھ آگے بڑھا تھا کہ میں اس سے بچھڑ گیا تھا، اور وہ مجھے زندگی کی دشوار گزار راہوں پر والد کی انگلی پکڑا کر خود آغوشِ رحمت میں جا سوئی، میرا حافظہ باوجودیکہ بچپن میں بہت اچھا تھا، مگر ذہن میں اس کی دھندلی سی بھی تصویر نہیں پاتا، البتہ اتنا یاد ہے کہ گھر کا اندرونی دروازہ ہے، جس کے بعد آنگن شروع ہو جاتا ہے، اس کے اندر نانی محترمہ تصویر یاس بنی کھڑی تھیں، اور بیرونی جانب والد صاحب سراپا درد بنے خاموش تھے، اور میں دونوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا، جیسے یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ بس اتنی ہی تصویر حافظہ نے محفوظ رکھی ہے، اور اس کو متاع زندگی سمجھ کر آج تک نہاں خانۂ دل میں محفوظ رکھے ہوئے ہوں، اور اکثر تخیل کی مدد

سے اسے دیکھا کرتا ہوں، مبادا یادوں کی رواروی میں، یہ ہلکا سا نقش مٹ نہ جائے، میں اس وقت اکثر سنا کرتا تھا، اور اب بھی کبھی کبھی تذکرہ ہوتا ہے کہ میری ماں بہت سلیقہ مند، عاقل اور نیک خاتون تھی، میرا خیال ہے کہ یہ بات صحیح ہے، کیونکہ میری خالہ جس کا ابھی چار پانچ برس ہوئے انتقال ہوا ہے، اس کی سلیقہ شعاری اور نیک بختی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

آہ! میری خالہ! اس کا تذکرہ کہیں تفصیل سے کروں گا، کہ میرے اوپر اس کے حقوق بہت ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ میری ماں اس سے بڑھ کر تھیں، ان دنوں جبکہ میں دیوبند جانے کی تیاری میں ہوں، ہر طرف خوشی کی برسات ہو رہی ہے، اس روح پرور ساون کی پھوار میں درد کی کوئی کسک اگر محسوس ہوتی ہے، تو وہ اماں کی یاد ہے، میں کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا کہ اماں ہوتی تو میرے لئے کیا کرتی، بس ایک میٹھی میٹھی مجمل سی یاد اٹھتی تھی، اور میرا دل بیٹھا جاتی تھی، میں اس کا تذکرہ بھی کسی سے نہیں کر پاتا تھا، بس یونہی کبھی گم سم ہو جاتا، پھر بیدار ہو جاتا، یہی کیفیت اب بھی محسوس ہوتی ہے، ایک مجمل اور مبہم سی یاد! البتہ اب اس میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ یاد آتے ہی دل کا ساغر بھر آتا ہے اور آنکھیں چھلک پڑتی ہیں، اس وقت اتنا شعور کہاں تھا؟

(۵)

آج ۶؍شوال ہے، کل صبح سب سے مل کر، بڑے بوڑھوں کی دعائیں لے کر مبارک پور جاؤں گا، وہاں سب رفقاء اکٹھے ہوں گے، مدرسہ کے در و دیوار سے رخصت ہو کر پرسوں ٹرین پر سوار ہونا ہے، الطاف شاہ گنج میں ملیں گے، یہی خیالات تھے کہ غروب ہوتے ہوئے آفتاب نے ابھرتے ہوئے اندھیرے کے کان میں نہ جانے کیا پھونک دیا کہ وہ رات کی سیاہ چادر میں چھپا کر لرزہ بخار لیتا آیا، اور میرے وجود کو کپکپا کر رکھ دیا، ۷؍شوال کی صبح طلوع ہوئی تو میرے بدن کی توانائی غروب ہو رہی تھی، میں بستر پر پڑا تڑپ رہا تھا، دل و دماغ میں ہیجان برپا تھا، شوق و اشتیاق کی تندی میری ناتوانی کو جھنجھوڑ رہی تھی، لیکن لرزہ نے سارا کس بل نکال دیا تھا، بخار اس شدت کا تھا کہ ہوش و حواس شکست کھا رہے تھے، والد

صاحب بہت مضطرب ہوئے، ڈاکٹر کو بلالائے، زوداثر دوائیں دی گئیں، شام تک بخار کا طوفان جس تیزی کے ساتھ چڑھا تھا اسی تیزی کے ساتھ اتر گیا۔

۸؍شوال کو بخار جاچکا تھا، مگر اس کی تیز گامی نے ضعف وناتوانی کی جو گرد اڑائی تھی، اس نے ناک میں دم کر دیا تھا، شام تک شکست خوردہ قوت قدرے واپس لوٹی، اور ضعف کا خیمہ اکھڑنے لگا، ۹؍کی صبح میں اس لائق تھا کہ کسی طرح مبارک پور پہونچ جاؤں، خیال یہ ہوا کہ شام ہی کو سب سے ملاقاتیں کرلی جائیں، تاکہ صبح سویرے مبارک پور پہونچ کر اسی دن ٹرین سے روانگی ہوجائے، سرشام ہی سے گاؤں میں دوڑتا پھرا، اساتذہ کی دعائیں لیں، احباب سے ملاقاتیں کیں، سب سے آخر میں نانیہال پہونچا، جو اپنے گھر کے بعد میرا سب سے بڑا مرکز محبت تھا، بہت دیر تک وہاں رہا، نانی اور خالہ پیار کرتی رہیں، دل بہلاتی رہیں، خالہ نے زادِ سفر کے طور پر عمدہ حلوا تیار کیا تھا، جب میں رخصت ہونے لگا تو اس نے حلوا میری طرف بڑھایا، میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے، میں ایسا نادان کہ اس تھرتھراہٹ کی علت نہ سمجھ سکا، جلدی سے میں نے ہاتھ بڑھا کر حلوا تھام لیا، اس کا ہاتھ آنچل کو لئے ہوئے آنکھوں تک جا پہونچا، اس نے ضبط کی بہت کوشش کی، مگر دل نے انکار کر دیا، آنکھیں ابل پڑیں، وہ اپنے آنچل میں اسے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی، اب میں سمجھا، معاً میرے دل میں بھی درد کا ایک طوفان اٹھا، مگر میں تیزی سے بھاگ نکلا، بڑی مشکلوں سے میں نے خود کو تھاما، آنسوؤں کے چند قطرے ادھر بھی ڈھلکے، لیکن میں انھیں چھپانے میں کامیاب رہا۔

رات کو میں یہ سوچتا رہا کہ کل اکیلے سفر کرنا ہوگا، ساتھی سب جاچکے ہیں، کیا ہوگا؟ اتنا لمبا سفر اکیلے کیسے طے ہوگا؟ اب تک جو بڑے سے بڑا سفر کیا تھا، وہ بنارس اور الٰہ آباد تک کیا تھا، اچانک اتنا طویل سفر کیونکر ہوگا؟ اب شوق کے دامن میں خوف وہراس بھی چمٹ چکا تھا۔

۹؍کی صبح طلوع ہوئی، تو طبیعت کا مطلع صاف تھا، فجر کی نماز پڑھ کر فوراً مبارک پور

چلا آیا، وہاں پہونچنے میں اتنی دیر ہوئی کہ ٹرین کا وقت نکل گیا، اساتذہ کرام بڑی محبت سے ملے، خیریت دریافت کی، سب نے تسلی دی، سامان سفر ٹھیک کر کے دوسرے روز ۱۰؍شوال کو سٹھیاؤں اسٹیشن پہونچا، چھوٹی لائن کی ٹرین جو شاہ گنج تک جاتی ہے، ساڑھے نو بجے صبح کو ملی، اگلے اسٹیشن اعظم گڈھ کے پلیٹ فارم پر جونہی گاڑی کی رفتار کم ہوئی، کیا دیکھتا ہوں کہ میرا پرانا رفیق ابوالعاص (اب وہ مرحوم ہوگیا ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں، آمین۔ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔) انجان شہید کا رہنے والا، جو مجھ سے ایک جماعت آگے ہونے کی وجہ سے پچھلے سال ہی دیوبند جاچکا تھا، پلیٹ فارم پر کھڑا ہے، اچانک ایسا محسوس ہوا کہ دل کا سارا بوجھ اتر گیا، ساری کلفت کافور ہوگئی، حالانکہ ابھی یقین کے ساتھ نہیں جان سکا تھا کہ یہ بھی آمادۂ سفر ہے، لیکن اس کا زرق برق لباس اور ڈبوں میں گھستی ہوئی متجسسانہ نگاہ غمازی کر رہی تھی کہ تیاری سفر کی ہے، مجھ پر جونہی اس کی نگاہ پڑی، لپک کر دوڑا، اور میرے ڈبہ میں گھس گیا۔

ارے! تم اب جارہے ہو؟ ہاں جی! میں بیمار ہوگیا تھا، کسی قدر اس سے نجات ہوئی ہے، تو چل پڑا ہوں، تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میں بھی تو چل ہی رہا ہوں، سبحان اللہ! اب خوشی کی تکمیل ہوگئی، اب کوئی پریشانی نہیں، پھر تو سفر خوب کٹا، شاہ گنج میں ڈیڑھ بجے دہرہ دون ایکسپریس ملی، صبح فجر سے پہلے لکسر میں اسے چھوڑ دیا، اور دوسری ٹرین میں سوار ہوکر سہارن پور پہونچے، پھر اسے چھوڑا، اور تیسری ٹرین سے ساڑھے بارہ بجے دیوبند جا پہونچے۔

دارالعلوم دیوبند میں

یہ کون سی سرزمین ہے؟ یہ سامنے بلند وبالا کون سی عمارت کھڑی ہے؟ جس کی عظمت اور جلال کے سامنے بے اختیار دل کی پیشانی جھکی جارہی ہے، ایسی عمارت جو ظاہری آرائش وزیبائش سے خالی ہے، جس کا حسن نگاہوں کو محسوس نہیں ہورہا ہے، مگر دل ہے کہ پروانہ وار فدا ہورہا ہے، خدا جانے اس میں کس غضب کی کشش بھری ہوئی ہے کہ دیکھنے سے

آسودگی نہیں ہوتی، سرخ سرخ عمارت جس کی دیواروں کو ظاہری ملمع سے چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، ایسا لگتا ہے جیسے شاہانِ مغلیہ کے دور کا کوئی قلعہ ہو، یہ عمارت اپنے اندر ایسی دل آویزی رکھتی ہے کہ ہر ہر اینٹ کو نقد جان کا نذرانہ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ایک نو وارد مسافر، ایک بڑے دروازے کے سامنے مبہوت کھڑا ہے، اس کا رفیق اسے بتا رہا ہے کہ یہی دارالعلوم دیوبند ہے، یہ معراج گیٹ ہے، نو وارد مسافر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے، یہ بیداری کی حقیقت ہے، یا خواب کا افسانہ ہے؟ لیکن یہ واقعہ تھا، اس پر یقین کرنا ہی تھا، دل عظمت کے بوجھ سے دبا جارہا تھا، قدم اٹھانے کا حوصلہ ہمت ہار رہا تھا، لیکن محبت کی کشش دوڑ کر لپٹ جانے پر اکساتی تھی، جذبۂ محبت نے فتح پائی، شوق نے پاؤں کو حوصلہ دیا، سامان اٹھا کر زبان و دل سے بسم اللہ پڑھتا ہوا گیٹ کے اندر داخل ہوا، جونہی اندر داخل ہوا، نگاہیں بے اختیار اوپر اٹھ گئیں، سامنے دار التفسیر کا عظیم گنبد آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا، نہ جانے کتنی مدت سے کھڑا، وہ طالبان علوم نبوت کا استقبال کر رہا ہے، وہ روشنی کا ایک مینار ہے جس کے گرد پروانوں کا ہر دم ایک ہجوم رہتا ہے، ہر سال ایک قافلہ آتا ہے تاکہ اس سے کسب نور کرے، اور ایک قافلہ رخصت ہوتا ہے، تاکہ جہل و بدعت کے اندھیروں کو دور کرے، میرے جذبۂ شوق نے اسکی عظمت کو جھک کر سلام کیا۔

پرانا رفیق ہمراہ تھا، اس لئے نہ کسی سے کچھ پوچھنا پڑا، نہ کسی کی جستجو میں پریشانی اٹھانی پڑی، مولوی ابوالعاص سیدھے مجھے دار جدید کمرہ نمبر ۷۰ میں لیکر پہونچے، وہاں میرے سب رفقاء موجود تھے، وہ مجھے دیکھتے ہی کھل گئے، وجہ تاخیر پوچھنے لگے، میں نے سب کو تفصیل سے بتایا، ساتھیوں سے معلوم ہوا کہ ان کے امتحانات داخلہ ہو چکے ہیں، اور سب کو ۳۵ نمبر ملے ہیں، اور یہ آخری نمبر ہے جس پر مطلوبہ کتابیں ملتی ہیں، اور مدرسہ سے امداد جاری ہوتی ہے، میرے ساتھیوں میں کچھ اچھے ذہین و فطین بھی تھے، اور کچھ کودن و غبی بھی، امتحان میں سب کو یکساں نمبر ملے، اس سے مجھے حیرت ہوئی، یہ بات میرے لئے معمہ تھی،

جس کو میں اس وقت حل نہ کر سکا، میں سوچتا ہی رہ گیا، ابھی دریافت کرنا مناسب نہ سمجھا، کچھ دیر کے بعد ظہر کی اذان ہوئی۔

مسجد کا منظر:

یہ پہلی نماز ہے، جو اس مقدس سرزمین پر ادا کی جائے گی، یہ وہ خاک پاک ہے جہاں کبھی اکابر اولیاء اللہ کی پیشانیاں جھکا کرتی تھیں، ان کے تقدس کو اس زمین نے اس طرح جذب کیا ہے کہ وہ خود ہی تقدس کا نشان بن گئی ہے، مسجد میں حاضری ہوئی، مدرسہ کی وسعت و عظمت کے لحاظ سے مسجد بہت چھوٹی اور مختصر معلوم ہوئی، لیکن یہ احساس ایک لمحے کے لئے دل میں پیدا ہوا، اور اسی وقت فنا ہو گیا جب طالب علموں کے ہجوم پر نگاہ پڑی، جو پروانوں کی طرح ٹوٹے پڑ رہے تھے، اور ان کے درمیان کوئی استاذ دکھائی دے جاتا، تو ایسا محسوس ہوتا ستاروں کے ہالہ میں چاند چمک رہا ہے۔

یہ کون آرہا ہے؟ جسے دیکھتے ہی طلبہ سمٹنے لگے، خود بخود نگاہیں جھک گئیں، آنے والا اکیلا آرہا ہے، مگر اس کے جلو میں رعب و ہیبت کا لشکر فراواں بھی چلا آرہا ہے، نکلتا ہوا قد، گورا چٹا چہرہ، سرخ و سفید رنگت، صحت مند جسم، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شیشہ کا بدن ہے، اور اس کے اندر سرخی اچھل رہی ہے، نہایت صاف ستھرا اجلا لباس، لمبا کرتا، مخصوص شرعی پاجامہ، سر پر اونچی دو پلی ٹوپی، اس کے نیچے سفید پٹھے، جن میں بالوں کی کمی نمایاں تھی، داڑھی بھی سفید برق، ساٹھ پینسٹھ کی عمر، ہاتھ میں ایک کالا بیگ! میں نے ساتھیوں سے سرگوشی کی، یہ کون صاحب ہیں؟ مولانا معراج الحق صاحب ہیں، دار العلوم دیوبند کے نائب مہتمم، اصول وضوابط پر بے لچک عمل کرنے والے، طلبہ و ملازمین پر یکساں ہیبت قائم!

ابھی نگاہیں ان کے خدوخال کا جائزہ لے رہی تھیں کہ دوسری جانب سے ایک اور صاحب نمودار ہوئے، جو تنہا نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ طلبہ کا ہجوم تھا، پستہ قد، سیاہ فام، شکل وصورت، حسن و جمال سے عاری، اور اس پر طرہ یہ کہ سر سے پاؤں تک کالا لبادہ، موسم سردیوں کا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سیاہی مجسم ہو گئی ہے، اس کے باوجود انھیں دیکھتے رہنے کا

جی چاہتا ہے، آنے والے کے متعلق کسی سے نہیں پوچھا، کیونکہ میرے دوستوں نے بتا رکھا تھا کہ اس ہیئت کے جو بزرگ نظر آئیں، سمجھ لینا کہ وہ دارالعلوم کے مشہور استاذ مولانا محمد حسین صاحب بہاری ہیں، جو طلبہ کے عرف میں ’’مولانا بہاری‘‘ کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ منظر ختم ہوا، اور میں سنتوں میں مشغول ہو گیا، سلام پھیرا تو دیکھتا ہوں کہ تھوڑے فاصلے پر ایک اور بزرگ نماز پڑھ رہے ہیں، پھر میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو میرے لئے سخت باعث حیرت تھا، دیکھا کہ چند طلبہ مسجد میں داخل ہونے کے لئے جوتے اتار رہے ہیں، اور یہ نمازی بزرگ جو ہاتھ باندھے ہوئے تھے، سر گھما کر ان طلبہ کو دیکھنے لگے، میں حیرت میں ڈوب گیا، مجھے احیاء العلوم مبارک پور کا وہ نومسلم یاد آ گیا، جو حضرت الاستاذ مولانا شمس الدین صاحب کے ہاتھوں پر ایمان لایا تھا، مولانا اسے مدرسہ میں لائے تھے، وہ ہم لوگوں سے قرآن پڑھتا تھا اور نماز سیکھتا تھا، وہ معمر تھا، چند ماہ میں اس کے چہرے پر خوبصورت داڑھی آ چکی تھی، لیکن نماز میں وہ اکثر دھوکہ کھا جاتا تھا، نماز میں مشغول ہوتا اور کوئی آ جاتا تو سر گھما کر دیکھنے لگتا، اور لڑکے ہنس پڑتے، میں سوچنے لگا کہ شاید یہ بھی کوئی نومسلم ہو، لیکن حلیہ بتا رہا تھا کہ کوئی بڑے عالم ہیں، سر پر اونی رومال کا ہرا صافہ جو اگرچہ بے ترتیبی کے ساتھ لپیٹا گیا تھا، مگر بھلا معلوم ہوتا تھا، خاصا لمبا کرتا، خوبصورت پاجامہ، بڑی داڑھی، قدرے لمبا چہرہ، گندم گوں رنگ، میں نے پہلو والے رفیق سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ بتایا کہ یہ مولانا فخر الحسن صاحب شیخ التفسیر ہیں، میں ان کی عظمت کے تصور میں ڈوب گیا، میں نے مولانا کے چرچے بہت سن رکھے تھے، لیکن اس عظمت کے ساتھ مولانا کے مذکورہ بالا عمل کی اس وقت میں کوئی تطبیق نہ دے سکا، شاید کوئی استغراقی کیفیت تھی، میں اپنے خیالات میں غرق تھا کہ اقامت شروع ہوئی، ایک ملیشیاوی طالب علم اپنے مخصوص لہجہ میں بلند آہنگی کے ساتھ تکبیر کہہ رہا تھا، ادھر کانوں میں تکبیر کا آوازہ گونج رہا تھا، اُدھر میں تخیلات میں کھویا ہوا تھا، مجھے عہد اسلامی کے مدارس یاد آ رہے تھے، مسلمانوں کی شان وشوکت کا زمانہ ذہن کے پردے پر نمایاں ہو رہا تھا، نماز شروع ہوئی، ختم ہوئی، تھوڑی دیر کے بعد گھنٹہ

بجا، دار العلوم کے گھنٹہ میں بھی خاص طرح کی عظمت ٹپکتی ہے، جلال محسوس ہوتا ہے، ایک زمانہ تھا کہ گھنٹہ بجانے والا دربان بھی صاحب نسبت تھا، گھنٹہ کی ہر ضرب پر وہ اللہ' کی ضرب لگاتا تھا، اللہ کے نام نے اس میں جلال و جمال کی جو کیفیت پیدا کر دی تھی، آج بھی اس کا اثر محسوس ہو رہا ہے۔

داخلے کے مراحل

مولوی ابو العاص مجھے دفتر تعلیمات میں لے گئے، کئی منشی اپنے اپنے ڈسک سنبھالے ہوئے لکھنے میں، کاغذات الٹ پلٹ کرنے میں، فائلیں بنانے، تلاش کرنے، محفوظ کرنے میں مشغول تھے، طلبہ کا ہجوم کچھ دروازے پر اور کچھ اندر تھا، اکثر جدید طلبہ تھے، چونکہ مجھے اپنی دھن تھی، اس لئے میں کچھ خیال نہ کر سکا کہ کون کیا چاہتا ہے؟ میں کیا، اس وقت سب اپنی اپنی کھال میں مست تھے، سب کا عجیب حال ہو رہا تھا۔

دفتر میں داخل ہوا تو وسط میں ایک بزرگ ۷۰/۷۵ سال کی عمر موٹا چشمہ لگائے ہوئے، نگاہیں جھکائے، نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ بیٹھے تھے، بھری بھری داڑھی، گندمی رنگ، متوسط قد، اوسط درجہ کا بدن، نہ بہت دبلے، نہ بہت موٹے، چہرے پر خاص طرح کی ہیبت، پاس میں ایک موٹا سا عصا رکھے ہوئے! دیکھتے ہی دل پر رعب طاری ہو گیا، لیکن ساتھ ہی محبت کی کشش بھی معلوم ہوئی، معلوم ہوا کہ یہ حضرت میاں صاحب ہیں ناظم تعلیمات، میاں صاحب کا نام حضرت مولانا اختر حسین صاحب ہے، حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب علیہ الرحمہ کے صاحبزادے، پہلے وہ ''میاں صاحب'' کہلاتے تھے، اب صاحبزادے ''میاں صاحب'' ہیں، نہایت بزرگ، دل کے صاف، زبان کے کھرے اور سچے، عمل کے مخلص، بے ریا، طلبہ و اساتذہ میں ان کی بزرگی و پاکبازی مسلم ہے، سب پر ان کا رعب یکساں ہے، میاں صاحب کے بارے میں طلبہ کی دو رائیں نہیں تھیں۔

دفتر تعلیمات سے فارم داخلہ لیا گیا، اس کی خانہ پُری کر کے دفتر میں جمع کر دیا گیا،

بتایا گیا کہ کل صبح امتحان داخلہ ہوگا، اوراسی وقت یہ معلوم ہوگا کہ کن بزرگ کے پاس امتحان دینا ہے، اس مرحلہ سے فارغ ہوکر پھر دوستوں کے جھرمٹ میں جاپہونچا، اب شام تک چونکہ اورکوئی کام نہ تھا، اس لئے ساتھیوں کے درمیان بیٹھ کران کے احوال دریافت کرنے لگا، میرا پہلا سوال یہ تھا کہ آخرسب کے نمبر یکساں کیوں ہیں؟ اس کا جو جواب مجھے ملا، اسے سن کر میں تصویرِ حیرت بن کررہ گیا، میں دیرتک سوچتارہ گیا کہ ایسی پاکیزہ اورمقدس جگہ میں بھی لوگ ایسی حرکات کرگزرتے ہیں! جواب ایسانہیں ہے، جوقیدِ تحریر میں لایا جاسکے، لیکن میں بے کم وکاست جو کچھ مجھ پر گزری ہے، اسے لکھنے بیٹھاہوں، اس لئے اجمالاً لکھ رہاہوں۔

جواب یہ تھا کہ جب ہم لوگ یہاں آئے تو فلاں صاحب سے ملاقات ہوئی، موصوف یہیں کے فاضل ہیں، ان کی تعلیم کی میعاد ختم ہوچکی ہے، لیکن جدید طلبہ کو داخلہ میں مدد دینے کے لئے شوال تک یہیں مقیم ہیں، جدید طلبہ چونکہ یہاں کے ماحول، قواعدوضوابط سے ناواقف ہوتے ہیں، پھر ماحول کا رعب مزید براں، ایسے میں جدید طلبہ کی رہبری کے لئے وہ اپنی خدمات پیش کرتے ہیں، ایسے لوگ خودکونوواردوں کے لئے نعمتِ عظمیٰ ثابت کرتے ہیں، اور پھراس راستے سے ان طلبہ سے کچھ آمدنی کرلیتے ہیں، وہ صاحب بھی اس مد میں تشریف فرما تھے، مبارک پور کے طلبہ بھی ان کے حلقے میں پہونچ گئے، انھوں نے اطلاع بخشی کہ امتحان بہت سخت ہورہا ہے، فلاں فلاں حضرات سب کوفیل کررہے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ان کے پاس امتحان نہ جائے، اوراس کی تدبیر یہ ہے کہ فلاں منشی جوان معاملات میں سب سے زیادہ دخیل ہیں، انھیں ہموار کیا جائے، وہ اگر چاہیں تو ایسے ممتحنوں کے پاس امتحان جاسکتا ہے، جوحسب دل خواہ نمبردیں گے، اس کے لئے سب لوگ مل کر اتنی رقم جمع کردیں، تاکہ معاملہ آسان ہو، پھرسب نے وہ رقم جمع کردی، دوسرے دن اس رقم کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ ہمارے ساتھیوں کے امتحانات دونرم مزاج اورسہولت والے حضرات کی خدمت میں پہونچ گیا، لیکن سفارش کا فطری اثر یہی ہونا تھا کہ ان حضرات نے سمجھ لیا کہ یہ

طلبہ صاحب استعداد نہیں ہیں، ورنہ سفارش کی ضرورت کیا تھی، ان حضرات نے غالباً سرسری امتحان لے کر سب کو ۳۵/۳۵ نمبر بخش دئے، یہ ان حضرات نے رعایت فرمائی تھی، مجھے سن کر شدید دھکا لگا، میں نے جی میں کہا یہ تو رشوت ہے، کیا یہاں بھی رشوت کا گزر ہے، میں بڑبڑا رہا تھا کہ ایک ساتھی نے میرا ہاتھ دبایا کہ میاں کام چلانے کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے، میں نے سوچا کہ میں ایسا ہرگز نہیں کرسکتا، بات یہیں ختم ہوگئی۔

رات دعا کرتے کٹ گئی، صبح ہوتے ہی میں ابوالعاص کے ساتھ دفتر تعلیمات میں پہونچ گیا، معلوم ہوا کہ مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانوی کی خدمت میں حاضری دینی ہے میرا ساتھی سہم گیا، اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا، کہنے لگا مولانا وحیدالزماں صاحب کسی کو پاس نہیں کرتے، میاں ٹھہرو! تمہارا امتحان ان کے پاس نہیں ہونا ہے، تم دارالحدیث چلو، وہاں امتحانات ہورہے ہیں، اس کا منظر دیکھو، لیکن یاد رکھو، تمہارا نام پکارا جائے تو ہرگز لبیک نہ کہنا، میں یہاں کوشش کرتا ہوں کہ تمہارا امتحان وہاں سے ہٹ جائے، میں نیا طالب علم، یہ پرانا آدمی، میں اس سے حیل وحجت کیا کرتا، خاموش رہ گیا، لیکن دل میں ٹھان لیا تھا کہ اگر میری جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی گئی، تو میں ہرگز ایسا کرنے نہ دوں گا، میں یہ فیصلہ کرکے دارالحدیث فوقانی کی طرف چلا گیا، یہاں جو نقشہ دیکھا، وہ خاصا مرعوب کن تھا۔

امتحان داخلہ کا منظر

دارالحدیث کے وسیع وعریض ہال میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈسک رکھے ہوئے ہیں، اوران کے پاس ایک ایک تپائی، ان تپائیوں پر کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے! اور ہر ڈسک کے پاس ایک ایک استاذ تشریف فرما ہیں، سب سے پہلے جن پر نگاہ ٹھہری، یہ پینتالیس اور پچاس کے پیٹے میں تھے، چھریرا بدن، ہلکا گندمی رنگ، چہرہ پر گوشت کم، آنکھیں ذرا چھوٹی، چہرے پر چیچک کے بہت ہلکے نشان، ناک باریک قدرے خمدار، داڑھی کے بال چھدرے، رخساروں پر کم، ٹھوڑی پر کسی قدر زیادہ، شیروانی زیب تن، نگاہیں جھکی ہوئی، چہرے پر ذہانت اور حوصلہ مندی کے آثار نمایاں، نشاط اور چستی پورے وجود پر چھائی

ہوئی، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہی مولانا وحید الزماں صاحب ہیں، اس وقت کے دار العلوم کے سب سے مقبول اور معروف استاذ!

ان سے تھوڑے فاصلے پر مولانا فخر الحسن صاحب تشریف فرما ہیں، ان سے قدرے ہٹ کر مولانا بہاری صاحب رونق افروز ہیں۔ یہ سب حضرات دار الحدیث کی مغربی دیوار کی جانب متمکن تھے، جنوبی دیوار جو عرض میں ہے، ادھر ایک گورے چٹے وجیہ بزرگ بیٹھے تھے، داڑھی خوب بھری ہوئی بالکل سفید، دہن مبارک پان سے بھرا ہوا، بدن کسی قدر بھاری، آنکھوں پر چشمہ، ہاتھوں میں پان کا بٹوا، مسلسل ہل رہے ہیں، اور نگاہیں بار بار ادھر ادھر کا جائزہ لے رہی ہیں، دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ یہ دار العلوم کے استاذ حدیث مولانا شریف الحسن صاحب ہیں، مولانا کا نام پہلے سے سن چکا تھا، شمالی دیوار کی جانب نگاہ اٹھائی تو ایک صاحب بیٹھے نظر آئے، پستہ قد، خوبصورت سے، ادھیڑ عمر کے چاق و چوبند، معلوم ہوا کہ یہ صاحب دار العلوم کے انگریزی کے استاذ مولوی عزیز بی۔ اے ہیں، امتحان داخلہ میں پاس ہونے والے طلبہ کا حلیہ اور وضع قطع لکھتے ہیں، دار العلوم میں اس وقت یہ دستور تھا کہ ہر طالب علم کا حلیہ لکھا جاتا تھا، اس وقت مدرسہ میں فوٹو کی لعنت نہیں داخل ہوئی تھی، پرانے علماء کے اثر سے فوٹو کی قباحت ذہنوں میں اس طرح راسخ تھی کہ اس کا تصور تک نہ ہوسکتا تھا، نیز اس وقت طالب علموں میں آج کے پیمانے پر دھاندلی کا رواج نہیں ہوا تھا کہ فوٹو کی ضرورت ہوتی، حلیہ میں عام شکل وصورت کے علاوہ کوئی خاص علامت بھی درج کی جاتی تھی، جس میں تبدیلی کا امکان کم سے کم ہو، نیز شرعی وضع قطع کی جانچ بھی ہوتی، سر پر انگریزی بال یا داڑھی منڈی ہوئی یا ترشی ہوئی ہونا خلاف شرع وضع تھی، اس کی اصلاح کے بغیر داخلہ نا مکمل ہوتا۔ (۲۵ر سال پرانی تحریر یہیں پر نا تمام رک گئی تھی، اس کے آگے تازہ تحریر ہے۔ اعجاز احمد اعظمی، ۲۳ر محرم الحرام ۱۴۲۹ھ مطابق ۲ر فروری ۲۰۰۸ء)

امتحان کے لئے جدید طالب علموں کا نام فارم داخلہ کے نمبر سے پکارا جاتا، ایک چپراسی بلند آواز سے پکارتا، اور طالب علم ممتحن کی خدمت میں حاضر ہوتا، یہ ایک پُر ہیبت

ماحول تھا، امتحان یونہی ایک مشکل مرحلہ ہے، پھر ماحول کا رُعب اسے اور مشکل بنا دیتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد میرا نام بھی پکارا گیا، میرا دل ہل گیا، مگر ابوالعاص کی ہدایت کے مطابق میں اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ پھر دوسرے کا نام پکارا گیا اور میری چڑھی ہوئی سانس پُرسکون ہوگئی، ابوالعاص آیا، تو مجھے واپس لے گیا، ظہر کے بعد میں پھر حاضر ہوا، اس وقت بھی میرا نام پکارا گیا، مگر ابوالعاص نے جانے نہ دیا، دوسرے دن صبح کو امتحان ہال میں مجھے جانے ہی نہ دیا کہ آج کوشش کرتے ہیں، مولانا وحید الزماں صاحب کے پاس سے امتحان ہٹ جائے تو اچھا ہے، ورنہ اگر انھوں نے فیل کر دیا تو احیاء العلوم کی ناک کٹ جائے گی، کہ وہاں کے ذہین ترین طالب علم تمہیں ہو، اب میں اکتا چکا تھا، دوپہر تک کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ میں ظہر بعد امتحان ہال میں حاضر ہوا، اور میرا نام پکارا گیا، ابوالعاص روکتا ہی رہا، مگر جھٹک کر میں چل دیا اور مولانا وحید الزماں صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا، مولانا نے ابتداءً تعارف کے لئے کچھ پوچھا، پھر انھوں نے ہدایہ ثانی کا کوئی صفحہ کھولا، عربی بولنے کے انداز میں انھوں نے عبارت پڑھوائی، اور فرمایا کہ کتاب بند کر کے حاصل مطلب سمجھائیے، کتابوں کے مذاکرہ وتکرار کی وجہ سے مجھے مضامین حفظ بھی تھے، اور بیان کرنے کی قدرت بھی تھی، میں نے مختصر لفظوں میں جیسے استاذ کے سامنے کوئی بات عرض کی جاسکتی ہے، مطلب عرض کر دیا، مولانا نے بہت غور سے سنا اور کتاب ہٹا دی۔ پھر دیوان متنبّی کا ایک صفحہ کھولا، اور چند اشعار پڑھوائے، ترجمہ اور مطلب پوچھا، میں نے عرض کیا۔ ایک لفظ پر انھوں نے ٹوکا، میں نے اپنے ترجمہ پر اصرار کیا۔ انھوں نے وضاحت چاہی، میں نے عرض کیا کہ جو ترجمہ میں کر رہا ہوں، وہ فلاں مصدر کے فعل کا ہے، اور حضرت جو کچھ فرما رہے ہیں، اس کا مصدر دوسرا ہے، یہ ترجمہ اس محل پر خوب منطبق نہیں ہوتا۔ مولانا کے چہرے پر مسرت کے آثار ظاہر ہوئے، مجھے اطمینان ہوا۔ پھر وہ صفحہ کھولا، جو میرا پڑھا ہوا نہیں تھا، جی میں آیا کہ کہہ دوں کہ حضرت! یہ پڑھا ہوا نہیں ہے، لیکن اس سے پہلے ہی مولانا نے فرمایا کہ عبارت اس طرح پڑھو کہ معلوم ہو کہ سمجھ کر پڑھ رہے ہو، عبارت پڑھنے کا ملکہ تو تھا ہی، اللہ جانے میں کچھ سمجھایا

نہیں! مگر عبارت بہت سلیقے سے پڑھ دی، مولانا نے فرمایا جاؤ۔ شاید کل پانچ سات منٹ لگے تھے، مولانا عموماً دیر تک امتحان لیتے تھے، بیس منٹ آدھ گھنٹہ تو ایک طالب علم کے ساتھ لگ ہی جاتا، اب جو اتنی جلدی امتحان ختم ہوا، تو ابوالعاص کو شبہ ہوا شاید مولانا نے کسی بات پر ناراض ہوکر جلدی اٹھا دیا ہو، وہ بہت تشویش میں پڑا، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ فارم حلیہ لکھنے والے کے پاس پہونچ گیا، اور میرا حلیہ لکھا گیا تو قدرے اطمینان ہوا۔ اس کے بعد وہ فارم دفتر تعلیمات میں پہونچ گیا، ابوالعاص نے وہاں جاکر معلومات کی، لوٹ کر وہ بہت خوش خوش آیا، میں نے پوچھا کیا ہوا؟ کہنے لگا اس سال تو کسی کو اتنا نمبر نہیں ملا ہے، جتنا تم کو ملا ہے، سب جدید طلبہ چالیس اور چالیس کے اندر ہیں، اور تم کو ۴۴ر نمبر ملے ہیں۔ مولانا وحیدالزماں صاحب سے اس کی امید نہ تھی۔

اب اطمینان ہوا کہ داخلہ تو یقینی ہوگیا، چنانچہ دوسرے دن اعلان میں نام آگیا، مگر ایک مرحلہ ابھی باقی ہے، وہ یہ کہ مدرسہ سے امداد کیونکر جاری ہو، میرے گھر کی وہ حیثیت نہ تھی کہ مطبخ اور دوسری ضروریات کے تکفل کے ساتھ میرا داخلہ ہوتا، میں چونکہ دیر میں پہونچا تھا، امدادی داخلہ کا کوٹا پُر ہو چکا تھا، میرا داخلہ اس سے خارج تھا، اس لئے بظاہر کوئی امید نہ تھی کہ امدادی کوٹے میں میری شمولیت ہوتی، طلبہ یہ کہتے تھے کہ بعد میں کچھ اور طلبہ اس کوٹے میں شامل کئے جاتے ہیں، مجھ سے بعض لوگوں نے اس میں شمولیت کی کچھ تدبیریں بتائیں، مگر وہ پسندیدہ نہ تھیں، میں نے قبول نہ کیں، اللہ تعالیٰ مالک ہیں، وہ کارساز ہیں، انھیں کے اعتماد پر میں نے تدبیر کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔

داخلے کے مراحل کی تکمیل اور تعلیم کے آغاز کے چند ہی دنوں کے بعد اہتمام کی طرف سے اعلان آویزاں ہوا کہ چند طلبہ کی امداد مدرسہ کی طرف سے منظور کی گئی ہے، اس میں پہلا نام میرا ہی تھا، اللہ کی مہربانی کا شکر ادا کیا، اب یکسوئی کے ساتھ تعلیم شروع ہوگئی۔

اسباق کی تفصیل:

جو کتابیں اس وقت مدرسہ کی طرف سے میرے لئے متعین کی گئی تھیں، ان کی

تفصیل درج ذیل ہے۔

جلالین شریف	حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہٗ	پہلا گھنٹہ
// //	// // //	دوسرا گھنٹہ
میبذی	حضرت مولانا قمرالدین صاحب مدظلہٗ	تیسرا گھنٹہ
کتابت	حضرت منشی امتیاز احمد صاحب علیہ الرحمہ	چوتھا گھنٹہ
ہدایہ اخیرین	حضرت مولانا اختر حسین میاں صاحب علیہ الرحمہ	پانچواں گھنٹہ
// //	// // //	چھٹا گھنٹہ

حضرت مولانا محمد سالم صاحب کے اسفار کبھی کبھی ہوا کرتے تھے، مگر جب وہ موجود ہوتے، تو درس کے وقت کی نہایت پابندی کرتے، پہلا گھنٹہ ہوتے ہی پانچ منٹ کے اندر درسگاہ میں پہونچ جاتے۔ جلالین شریف وہ دار العلوم کی سب سے بالائی عمارت دارالتفسیر میں پڑھاتے تھے، دارالعلوم میں فجر کی نماز کے تھوڑی ہی دیر کے بعد تعلیم شروع ہوجاتی تھی، فجر کی نماز سے فارغ ہوکر تھوڑی دیر تلاوت کرتے، اور چائے بناتے، ہلکا سا ناشتہ کرتے، اتنے میں تعلیم کا گھنٹہ بج جاتا، اوراس کے ساتھ ہی مولانا دارالتفسیر کی سیڑھیوں پر چڑھتے دکھائی دیتے، ہم لوگ کوشش کرتے کہ ان سے پہلے دارالتفسیر میں پہونچ جائیں، یا کم از کم ان کے پیچھے پیچھے ہولیں، کبھی ہم چائے پیتے ہوتے، اور مولانا اوپر جاتے نظر آتے، تو ہم لوگ چائے کو پیالی سے پلیٹ میں انڈیل لیتے، وہ ٹھنڈی ہوجاتی اور ہم ایک سانس میں اسے حلق میں ڈال لیتے اور کتاب لے کر بھاگتے، مولانا کے یہاں جلالین شریف کے دو گھنٹے تھے، مگر عموماً وہ سوا یا ڈیڑھ گھنٹہ پڑھاتے، سبق کی مقدار کم ہوتی، کثرت معلومات اور حسن تقریر کے لحاظ سے بے نظیر درس ہوتا، حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہٗ خانوادۂ قاسمی کے چشم و چراغ اور حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم کے صاحبزادۂ عالی قدر، اور انھیں کے انداز کے بہترین خطیب ہیں۔

تیسرے گھنٹے میں حضرت مولانا قمرالدین صاحب مدظلہٗ میبذی پڑھاتے تھے،

حضرت مولانا بڑہل گنج ضلع گورکھپور کے رہنے والے ہیں، حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی علیہ الرحمہ سے خصوصی مناسبت تھی، اوران کے خاص شاگرد ہیں۔

چوتھے گھنٹے میں حضرت منشی امتیاز احمد صاحب کی خدمت میں خطاطی سیکھنے کیلئے حاضر ہوتا تھا، مگر مجھے اس فن سے مناسبت نہ ہوسکی، چند دن ان کی خدمت میں حاضر ہوا، پھر میں نے ان کی خدمت میں عرض کی، اگر اجازت ہو، تو مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے، میں اس گھنٹے میں کتب خانہ چلا جایا کروں، انھوں نے بخوشی اجازت دے دی، اور میں اس گھنٹے میں پابندی سے کتب خانے جانے لگا، کتب خانہ اس وقت بارہ بجے دن تک کھلا رہتا، میں بارہ بجے تک کتابوں میں لپٹا رہتا، جب کتب خانہ بند ہونے لگتا، تو وہاں سے نکلتا، اس موضوع کو بعد میں قدرے تفصیل سے لکھوں گا۔ ان شاءاللہ

ظہر کی نماز کے بعد پانچواں اور چھٹا گھنٹہ ہدایہ اخیرین کے لئے تھا، میاں صاحب حضرت مولانا اختر حسین صاحب نور اللہ مرقدہٗ بہت عرصہ سے یہ کتاب پڑھاتے تھے، دارالعلوم میں ہماری جماعت کی ہر کتاب دو دو اساتذہ کے پاس تھی، سوائے میبذی کے کہ وہ صرف حضرت مولانا قمر الدین صاحب ہی اس سال پڑھا رہے تھے، ہدایہ اخیرین کچھ طلبہ حضرت مولانا معراج الحق صاحب علیہ الرحمہ نائب مہتمم کی خدمت میں پڑھتے تھے، مولانا موصوف یہ کتاب صبح کے وقت پہلے اور دوسرے گھنٹہ میں پڑھاتے، ان کے یہاں وقت کی پابندی کا بڑا اہتمام تھا۔ مشہور تھا کہ گھنٹے کی ٹن سے گھنٹے کی ٹن تک ان کا سبق ہوتا ہے، وقت سے پہلے ہی وہ درسگاہ میں تشریف لے آتے، طلبہ بھی اس کا اہتمام کرتے، اور جونہی تعلیم کا گھنٹہ بجتا، عبارت خوانی شروع ہوجاتی، مولانا بہت مفصل اور لمبی تقریر کرتے، جب تیسرا گھنٹہ بجتا، تب ان کا سلسلۂ تقریر موقوف ہوتا، مگر سبق کم ہوتا۔

حضرت میاں صاحب کے یہاں بھی یہ سبق ہوتا، میاں صاحب کا انداز یہ تھا، کہ گھنٹہ ہونے کے آدھ گھنٹے کے بعد تشریف لاتے، تھوڑی دیر میں حاضری ہوتی، پھر سبق شروع ہوتا، جو مکمل ایک گھنٹہ ہوتا تھا، اس ایک گھنٹہ میں وہ چار صفحے پڑھاتے، ان کی تقریر

مختصر بہت مختصر مگر واضح ہوتی، کتاب پوری طرح حل ہوجاتی، یہ شاید ان کی بزرگی اور تقویٰ کی برکت تھی، ورنہ اتنی مختصر تقریر سے نہ عبارت حل ہوتی، نہ طلبہ کو اطمینان ہوتا، ہماری جماعت جو ۸۰/ سے اوپر طلبہ پر مشتمل تھی، میں نے کسی کو شکایت کرتے نہیں سنا، ہم طلبہ کا اس وقت بھی یہی خیال تھا، کہ حضرت میاں صاحب کی یہ برکت ہے، ان کی بزرگی مسلّم تھی، اور ان کے ورع وتقویٰ میں کوئی دو رائے نہ تھی۔

یہ اسباق تو مدرسے کی طرف سے متعین کئے گئے تھے، اس وقت دارالعلوم میں درجہ بندی نہ تھی، کتابوں کے لحاظ سے درجات متعین ہوتے تھے، بعض کتابیں بعض کتابوں کے ساتھ لازم تھیں، اور بعض کے ساتھ بعض کتابیں نہیں دی جاتی تھیں، مثلاً جلالین شریفین کے ساتھ ہدایہ اخیرین کا سبق ہوتا تھا، لیکن مشکوٰۃ شریف کا نہیں، ہدایہ اخیرین اور میبذی کے اسباق جلالین کے ساتھ بھی اور مشکوٰۃ کے ساتھ بھی ہوسکتے تھے، چنانچہ مشکوٰۃ شریف پڑھنے والے بہت سے طلبہ ہدایہ اخیرین اور میبذی میں میرے ساتھی تھے۔

عربی تکلم وانشاء کے استاذ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی علیہ الرحمہ تھے، ان سے دورِ احیاء العلوم ہی سے بہت عقیدت تھی، میں ان کے درس میں خصوصیت سے شرکت کرنا چاہتا تھا۔ مولانا نے عربی تکلم وانشاء کے لئے تین درجے قائم کررکھے تھے، پہلے درجے کو ’’صف اول‘‘ دوسرے کو ’’صف ثانوی‘‘ اور تیسرے کو ’’صف نہائی‘‘ کے نام سے موسوم کررکھا تھا، جدید طلبہ کا داخلہ ’’صف اول‘‘ میں ہوتا تھا۔ یہ جماعت دو حصوں میں منقسم تھی، اور دونوں کو صف نہائی کے ممتاز طلبہ جن کو مولانا متعین فرماتے تھے، انھیں پڑھایا کرتے تھے، اور مولانا خود صف ثانوی اور صف نہائی کو پڑھاتے تھے، ان تینوں جماعتوں میں شامل ہونے کے لئے تعلیمات میں درخواست دینی ہوتی تھی، میں نے صف ثانوی میں شامل ہونے کی درخواست دی، دفتر تعلیمات سے مجھے ہدایت ملی کہ آپ جدید طالب ہیں مولانا وحید الزماں صاحب کی منظوری کے بعد آپ کو اس میں شامل کیا جائے گا، میں مولانا کی خدمت میں گیا، مولانا سے گزارش کی، مولانا نے مجھے پہچان لیا، اور فرمایا اچھی بات ہے،

آپ سبق میں آیا کیجئے، میں کہہ دوں گا۔ میں صف ثانوی کے سبق میں حاضری دینے لگا، مگر درسگاہ میں تعلیمات کی جانب سے رجسٹر طلبہ آیا تو اس میں میرا نام نہ تھا، میں تعلیمات میں گیا، میں نے اس کی تحقیق کی، تو معلوم ہوا کہ مولانا کی طرف سے تصدیق نہیں آئی ہے، میں حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، تو مولانا نے ایک تحریر لکھ کر دی، وہ تحریر میرے پاس محفوظ نہیں ہے، میں نے اسی وقت اس کی نقل والد صاحب کی خدمت میں بھیج دی تھی، ان کی اصل تحریر تو دفتر تعلیمات میں جمع ہوگئی تھی، اس کے الفاظ تو اب یاد ہونے کا سوال ہی نہیں، مضمون یہ تھا:

> ”میں نے اس طالب علم کا امتحان لیا تھا، ماشاءاللہ استعداد اچھی ہے، آئندہ ان سے بہتر توقعات ہیں، یہ صف ثانوی میں داخلہ کے مستحق ہیں، ان کا نام شامل کرلیا جائے۔

یہ تحریر میں نے دفتر تعلیمات میں جمع کر دی، پھر میرا نام رجسٹر میں درج ہوگیا۔ صف ثانوی کا درس بعد نماز مغرب ہوتا تھا، اس درس میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی، منتخب طلبہ ہی تھے۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب (بمبئی) مولانا نور عالم صاحب (دیوبند) مولانا بدرالحسن صاحب (کویت) مولانا مجیب اللہ صاحب (دیوبند) اس میں تھے، مولانا اس درس کا بہت اہتمام کرتے تھے، صف ثانوی میں زیادہ تر وہی طلبہ شامل تھے، جو پچھلے سال صف اول میں تعلیم حاصل کر چکے تھے، میں نو وارد تھا، اس لئے صف اول کی تعلیم سے بے بہرہ تھا، تعلیم کا ابھی آغاز تھا، مولانا سب طلبہ کو ایک دوسرے سے متعارف کرانا چاہ رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ ہر طالب علم کی ذہنی و دماغی استعداد بھی معلوم کرنا چاہتے تھے، تاکہ ہر طالب علم کے ساتھ تعلیم و تشجیع کا معاملہ اس کی استعداد کے مطابق کرسکیں۔

ایک قابل ذکر واقعہ:

آغاز تعلیم میں جمعہ کا وقفہ ہوا، میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ سہارن پور، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب علیہ الرحمہ کی زیارت و ملاقات کی غرض سے گیا، شیخ سے مصافحہ ہوا، مجلس میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، دسترخوان پر شیخ کی مہربانیاں دیکھیں

، جمعہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھی، وہاں ایک عجیب قصہ دیکھا، دیکھا کہ ایک نہایت نحیف ولاغر بزرگ کو چندلوگ مل کرتقریباً اٹھا کر یا شاید گھسیٹ کر مگر ادب کے ساتھ لا رہے ہیں، چہرہ نہایت روشن، سارا جسم جیسے سفید کاغذ کا ہو، میں نے دیکھا، مجھے بہت ترس آیا کہ اتنے زار ونزار بوڑھے کولوگ کیوں لا رہے ہیں، ان پر جمعہ کی نماز فرض ہی کہاں ہے؟ لیکن میں حیرت میں ڈوب گیا، جب دیکھا کہ انھیں لوگوں نے منبر کے دائیں جانب کھڑا کر دیا، اور وہ ہاتھ باندھ کر نماز میں مشغول ہوگئے، بہت طویل قیام اور رکوع وسجود کے ساتھ انھوں نے چار رکعتیں تقریباً آدھ گھنٹے میں ادا کیں، وہ آرام سے نماز پڑھ رہے تھے، نہ کسی سہارے کی ضرورت، نہ کسی مددگار کی حاجت! میں سوچ رہا تھا کہ صلوٰۃ التسبیح پڑھ رہے ہیں، جب اس سے فارغ ہوئے، تو دیکھا کہ دو آدمی انھیں سہارا دے کر کھڑا کر رہے ہیں، پھر انھوں نے پورے اطمینان سے چار رکعتیں پڑھیں، پھر خطبہ کی اذان ہوئی، نماز کے لئے پھر انھیں کھڑا کرنا پڑا، نماز جمعہ سے فراغت کے بعد پھر اسی شان سے بعد کی سنتیں پڑھیں، نماز سے فراغت کے بعد لوگ انھیں اٹھا پٹھا کر لے گئے، میں حیرت میں رہا۔ حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ نے مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح عمری میں، اسی طرح کا ان کا حال لکھا ہے، جس کو میں نے پڑھا تھا، کہ بیماری اور ضعف کی وجہ سے وہ ازخود کھڑے نہ ہوسکتے تھے، لیکن جب لوگ انھیں کھڑا کر دیتے، تو وہ پورے اطمینان سے بغیر کسی سہارے کے نماز ادا کرتے، وہی منظر میں یہاں دیکھ رہا تھا، اور مولانا محمد الیاس صاحب کو یاد کر رہا تھا، بعد میں کسی سے پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے؟ بتانے والے بتایا کہ یہ مدرسہ مظاہر علوم کے ناظم حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب ہیں، میرے دل کی پیشانی عقیدت سے جھک گئی، حضرت حکیم الامت کے خلیفہ! مشہور عالم اور زبردست ترجمان حق وصداقت!

شام کو دیوبند واپسی ہوئی، دوسرے روز بعد نماز مغرب مولانا وحید الزماں صاحب کی درس گاہ میں حاضری ہوئی۔ مولانا جونہی مسند درس پر جلوہ فگن ہوئے، زیر لب مسکراتے ہوئے انھوں نے فرمان صادر کیا کہ آج کل میں آپ لوگوں میں، جن صاحب کا کوئی سفر ہوا

ہو، اسے کھڑے ہوکر عربی میں بیان کریں، اس وقت تقریباً سبھی طلبہ چند روز آگے پیچھے اپنے اپنے گھروں سے تازہ وارد ہوئے تھے، جدید ذرا پہلے اور قدیم تو بالکل تازہ! مگر درس گاہ سناٹے میں آگئی، ہر زبان خاموش! نگاہیں، البتہ ایک دوسرے کو چوری چوری دیکھ رہی تھیں، مولانا ترغیبی اور تشجیعی کلمات صادر فرمارہے تھے، مگر دل سب کے ڈگمگا رہے تھے، کئی منٹ تک مجلس سنسان رہی، صرف مولانا کی آواز کان میں آرہی تھی، اور وہ بھی اس طرح جیسے کوئی بہت دور سے صدا لگا رہا ہو، جس سے ایک چونک سی پیدا ہوتی ہے، لیکن جواب کے لئے لب نہیں ملتے۔

میں نے دیکھا کہ دیر ہورہی ہے، اور کوئی جواب نہیں مل رہا ہے، مجھے اندیشہ ہوا کہ مولانا کی مسکراہٹ کہیں رنگ جلال میں نہ ڈھل جائے، میں یک بیک کھڑا ہوگیا، مولانا نے فرمایا ہاں فرمائیے۔ میں ساتھیوں میں اجنبی تھا، سب حیرت سے دیکھنے لگے کہ یہ کون دیوانہ ہے، دبلا پتلا، گلے سے بوسیدہ سا رومال لپیٹے ہوئے، مئو کی کشتی نما ٹوپی سر پر رکھے ہوئے، چہرے بشرے پر ذہانت وفطانت کا ذرا بھی اثر نہیں، سب تک رہے تھے اور میں

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

کا وظیفہ پڑھتا ہوا خطبہ پڑھنے لگا، پھر سہارن پور کے سفر کی روداد عربی میں سنائی۔ اس وقت کیا بیان کیا، اور کس انداز میں بیان کیا، اب کیا یاد، بس اتنا یاد ہے، کہ مولانا کے فطری رعب اور طلبہ کے تیر نگاہ نے ہوش وحواس میں ہنگامہ بپا کر رکھا تھا، کیا سوچتا رہا، کیا بولتا رہا، فرشتوں کے اعمالنامے میں محفوظ ہوگا، میرا حافظہ تو اس وقت بھی مفلوج ہورہا تھا، اب مدتوں کے بعد اسے کوئی لفظ کاہے کو یاد رہے گا، لیکن ایک جملہ یاد رہ گیا ہے، جس پر طلبہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا، اور مولانا نے اس سے زیادہ زوردار لہجہ میں انھیں ڈانٹا تھا۔ داستانِ سفر ختم کرتے ہوئے میرے منہ سے نکلا ”رجعت منها وقت الشام“ میں شام کے وقت وہاں سے واپس آیا۔ اس وقت الشام پر ایک زوردار قہقہہ لگا، میں بوکھلا گیا، مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ستم ظریف کیوں ہنس رہے ہیں، لیکن اسی لمحے مولانا کی رُعب دار آواز گونجی

"آپ لوگ ایک معمولی سی غلطی پر ہنس رہے ہیں، یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ اس تازہ وارد طالب علم نے کس جرأت کے ساتھ اپنی بات ادا کی، آپ لوگوں سے تو کچھ نہ ہو سکا۔ " مولانا کی آواز سے درسگاہ میں ایک سناٹا طاری ہو گیا۔

مولانا کا اندازِ تدریس:

مولانا وحید الزماں صاحب علیہ الرحمہ کا دماغ مجتہدانہ تھا، وہ ہر میدان میں اپنے اجتہاد سے ایسا راستہ اختیار فرماتے جو آسان بھی ہوتا اور مختصر بھی! مولانا نے عربی زبان میں انشاء وتکلم کی مشق اور عربی زبان وادب میں بے تکلف مہارت پیدا کرنے کے لئے اپنے آپ کو مامور بلکہ وقف کر رکھا تھا، ان کا رہائشی کمرہ اور ان کی درسگاہ بظاہر خطۂ عرب کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی، وہاں داخل ہوتے ہی مولانا کے خلوص اور ان کی محنت اور لگن کے باعث طلبہ نہ صرف عربی میں لکھنے اور بولنے لگتے بلکہ عربی ہی میں سوچنے بھی لگتے۔ مولانا کا اندازِ تدریس بھی مجتہدانہ تھا، طلبہ سے عربی زبان میں ان کی استعداد کے اعتبار سے کبھی مختصر اور کبھی طویل جملوں میں سوال کرتے، اور جواب میں طلبہ **نعم** اور **لا** کے ساتھ ان جملوں کو دہراتے، اس طرح فصیح عربی زبان خالص عربی لہجے میں بولنے کی مشق ہوتی تھی، اور ہر طالب علم کو دماغ حاضر رکھنا پڑتا تھا کہ مولانا کی زبان سے نکلا ہوا کوئی کلمہ جواب میں رہ نہ جائے، روزانہ اس طرح مشق ہوتی رہتی۔ مولانا کے درس میں طلبہ نہایت ذوق وشوق سے حاضر رہتے، ان کا درس اس درجہ دلچسپ ہوتا کہ پورا گھنٹہ گذر جاتا اور وقت کا احساس نہ ہوتا جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ عربی انشاء وتکلم کے لئے مولانا نے تین درجے قائم کر رکھے تھے۔ صف اول۔ صف ثانوی، صف نہائی۔ صف اول میں اردو تکلم کی گنجائش زیادہ تھی۔ صف ثانوی میں عربیت چھائی ہوئی ہوتی، اردو زبان کبھی ضرورت پر استعمال ہوتی، اور صف نہائی میں اردو کا سرے سے گذر ہی نہ ہوتا۔ ہم لوگ "صف ثانوی" میں تھے، مولانا عموماً عربی زبان میں درس دیتے، وہ زبان فصاحت وبلاغت کے ساتھ اتنی سہل ہوتی کہ لفظ لفظ طلبہ کے ذہن نشیں ہوتا رہتا اور طلبہ انھیں اپنی عام گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتے۔

النادی الادبی:

مولانا نے درس کی پابندیوں کے علاوہ طلبہ میں انشاء وتکلم کی بے تکلف مشق وتمرین کے لئے ان کی ایک نیم خودمختار انجمن قائم کی تھی، اس کا نام ’’النادی الادبی‘‘ تھا، النادی کے تحت عربی زبان کے دیواری پرچے تینوں درجات کے الگ الگ نکالے جاتے، عموماً ہر درجے کے پندرہ روزہ دو دو پرچے ہوتے، ہم لوگوں کے درجے میں ’’النهضة‘‘ نام کے دو پندرہ روزہ پرچے نکلتے تھے، دونوں پرچوں کے الگ الگ مدیر تھے، جب اس پرچے کا منصوبہ تیار ہوا تو مولانا نے فرمایا کہ جو لوگ اس کی ادارت کی ذمہ داری کا بار اٹھا سکتے ہوں وہ اپنا نام پیش کریں، ہمارے ساتھیوں میں سے چار نے اپنا اپنا نام پیش کیا، مولانا نے حکم دیا کہ چاروں طلبہ فل اسکیپ صفحہ کا ایک ایک مضمون عربی زبان میں لکھیں اور خوشخط لکھ کر دکھائیں، چاروں نے ایک ایک مضمون لکھا اور اپنی بساط بھر خوشخط لکھنے کی کوشش کی۔ مولانا کے سامنے یہ مضامین پیش ہوئے تو ان میں سب سے عمدہ خط نور عالم مظفر پوری کا تھا، جواَب دارالعلوم دیوبند میں عربی ادب کے استاذ مولانا نور عالم خلیل امینی ہیں۔ اور معلومات، اسلوب تحریر اور حسن انشاء کے اعتبار سے مولانا کی نظر میں اس خاکسار کا مضمون بہتر تھا، مولانا نے دونوں کی تحسین فرمائی، اور ایک ایک پرچے کا دونوں کو مدیر بنادیا، اور دوسرے دونوں طلبہ کو ان کا نائب بنایا۔

ابھی ’’النهضة‘‘ کے دو یا تین شمارے نکلے تھے کہ ہندوستان کے پہلے مسلمان صدر جمہوریہ اور مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین کا ۳؍مئی ۱۹۶۹ء کو انتقال ہوا۔ ان کی وفات سے ہم لوگ بہت متاثر تھے، اسی تاثر میں ڈوب کر میں نے عربی زبان میں ایک مضمون لکھا، مولانا کو دکھایا تو اسے پڑھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اس سال جیسے مضامین لکھے جارہے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اخیر سال میں ایک میگزین شائع کیا جائے، جس میں یہ مضامین محفوظ کردئے جائیں، ہم لوگ بڑے حوصلے اور شوق وولولے کے ساتھ عربی زبان میں انشاء وتکلم کی مہارت بہم پہونچاتے رہے۔

النادی الادبی کا دوسرا شعبہ تقریر وخطابت کا تھا، اس کے تحت ہر جمعرات کو عشاء کی نماز کے بعد جلسے منعقد کئے جاتے، ہر جماعت کے متعدد گروپ ہوتے، ان جلسوں کی نگرانی کے لئے مولانا صف نہائی کے ایک طالب علم کو متعین فرماتے، وہ ناظر اجتماعات کہلاتا، اور صف ثانوی کے ایک ایک طالب علم کو اس کا نائب بناتے، یہ پروگرام بھی بہت کامیابی کے ساتھ چلا کرتے تھے۔

مولانا کا اندازِ تربیت:

مولانا وحید الزماں صاحب علیہ الرحمہ نگاہِ مردم شناس رکھتے تھے، وہ طلبہ کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بہت جلد بھانپ لیتے تھے، اور پھر ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا بہت اہتمام فرماتے، اس کے لئے وہ مختلف طریقے اختیار کرتے۔ ان کا ایک نادر طریقہ یہ تھا کہ اپنے باصلاحیت طالب علموں کو اپنے دسترخوان پر ہفتہ میں کسی ایک روز جمع کرتے، ہر طالب علم اپنا کھانا جو اسے مدرسہ کے مطبخ سے ملتا لے کر ان کے کمرے میں حاضر ہوتا، مولانا کے گھر سے بھی کھانا آتا، سب لوگ بے تکلفی کی ایک خوشگوار فضا میں کھانا کھاتے، اس وقت مولانا بھی خوب باغ وبہار ہوتے، مگر اس کے ساتھ غیر محسوس طریقہ پر شرکائے دسترخوان کی نگرانی بھی فرماتے اور کسی سے کوئی بے جا حرکت صادر ہوتی یا کوئی غیر سنجیدہ کام اس سے سرزد ہوتا تو ایسے انداز میں اس کی اصلاح فرماتے جو بظاہر گرفت اور تنبیہ نہ محسوس ہوتی۔ کھانے کا سلیقہ سکھاتے، بات کرنے کے آداب بتاتے، ایک دوسرے کو دیکھنے کے انداز سمجھاتے، لیکن یہ سب کچھ اس طرح ہوتا جیسے یہ اصلاح وتنبیہ نہیں بلکہ مجلس کے بے تکلف اجزا ہوں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مولانا خود چائے بناتے، ان کی ہر چیز جیسے معیاری ہوتی، چائے بھی ویسے ہی معیاری ہوتی، پھر اپنے ہاتھ سے چائے سب کو پیش کرتے۔ بعض پینے والے زور سے چسکیاں لیتے اور مجلس میں ایک بے ہنگم سا شور ہونے لگتا، مولانا بڑے خوبصورت انداز میں فرماتے کہ چائے پینے کی شرطِ اول یہ ہے کہ آواز نہ نکلے، پھر اس طرح خاموشی سے چائے پی جاتی کہ مجلس میں کوئی ناگوار آواز نہ آتی۔ اس مجلس میں

مولانا کا انبساط دیدنی ہوتا، خوب باتیں کرتے، پڑھنے لکھنے کی محنت کرنے کی، حوصلہ افزائی کی باتیں، اس گفتگو میں لطائف وظرائف بھی ہوتے، سنجیدہ حکایات بھی ہوتیں، برمحل اصلاحات بھی ہوتیں، اور جب طلبہ وہاں سے رخصت ہوتے تو اپنے اپنے دلوں میں کچھ کرگزرنے کا حوصلہ اور تعلیم میں ترقی کی امنگ لے کر جاتے۔ میں جدید طالب علم تھا، اس محفل میں صرف وہی طلبہ بار پاتے تھے جو پہلے سے مولانا کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوتے، مگر چونکہ میرا امتحانِ داخلہ مولانا نے لیا تھا اور اس کے بعد چند مواقع ایسے آئے کہ میں بھی مولانا کی نگاہوں میں آگیا، اور انھوں نے اس محفل میں شرکت کی سعادت بخشی۔ مولانا کی ان مجالس سے طلبہ کو تعلیمی اور تربیتی دونوں فوائد حاصل ہوتے۔ ان مجالس میں محنت ومجاہدہ کا حوصلہ بھی بیدار ہوتا، پڑھنے کا سلیقہ بھی آتا، انسانیت اور اس کے آداب برتنے کا شعور بھی حاصل ہوتا، مولانا ہم لوگوں کے لئے نمونہ تھے، جو طلبہ مولانا کے درس میں شریک ہوتے، وہ دوسرے طلبہ کے مقابلے میں نمایاں ہوتے۔

ایک تاسف کا ازالہ:

میں دار العلوم بڑی امنگوں اور حوصلوں سے معمور ہوکر گیا تھا، دار العلوم کے اساتذہ اور وہاں کے طلبہ کی عظمت دل ودماغ پر چھائی ہوئی تھی، جب تعلیم شروع ہوئی اور ایک دو ماہ گزر گئے، سہ ماہی امتحان قریب آچلا تھا، تو مجھے یہ دیکھ کر ایک طرح کی مایوسی بھی ہورہی تھی اور تاسف بھی! کہ طلبہ میں تعلیم، مطالعہ، مذاکرہ اور پڑھنے کے لئے شب خیزی کا فقدان ہے۔ میں روزانہ صدر دروازہ پر فٹ بال، والی وال، کرکٹ وغیرہ کے مقابلے کے اعلانات دیکھتا، مختلف ناموں سے کلب تھے، اور ہر روز کسی کلب کا دوسری کلب سے مقابلہ ہوتا، اور اس کے لئے خوبصورت، دیدہ زیب اور رنگین اعلان نکالے جاتے، مجھے یہ دیکھ کر بڑی وحشت ہوتی، کتابوں میں لگے لپٹے رہنے والے برائے نام دکھائی دیتے، کھیل کے میدان میں خوب جمگھٹا رہتا، مجھے کھیل کا بالکل ذوق نہ تھا، طلبہ کے ان کھیلوں اور مقابلوں کو دیکھ دیکھ کر میں سخت مایوسی کا شکار ہوتا۔ ایک روز میں نے اپنے کمرے میں جس میں دس طلبہ

کا قیام تھا، زیادہ تر میرے ساتھی ہی تھے اور میرے علاقے کے! میں نے کہا کہ جب کسی قوم پر زوال وادبار طاری ہوتا ہے تو کام کے وقت اسے کھیل سوجھتا ہے، یہ سن کر کئی طلبہ میرے اوپر خفا ہوگئے، اتنے خفا ہوئے کہ الامان والحفیظ۔ میں نے حتی الامکان قائل کرنے کی کوشش کی، مگر میری آواز ہلکی پڑگئی، میں بہت مایوس ہوا۔ مجھے اس سے شدید جھٹکا لگا، میں سوچتا رہا کہ دار العلوم ایک مقدس تعلیمی ادارہ ہے، جہاں حضرت تھانویؒ، حضرت کشمیریؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت مفتی اعظم دہلویؒ جیسے اکابر نے علم حاصل کیا اور آفتاب وماہتاب بنے، اب اسی دارالعلوم میں بجائے علم وفضل کے کھیل تماشوں کے مظاہرے ہورہے ہیں، اور حالات کی سنگینی اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ اسے اچھا بلکہ ضروری قرار دیا جارہا ہے، ان حالات میں مَیں شکستہ دل بھی ہورہا تھا اور کام کے منصوبے بھی بنا رہا تھا۔

ایک روز اپنے ایک دربھنگوی دوست مولوی ابرار صاحب (اب یہ مولانا ابرار احمد صاحب مدظلہ جامع مسجد باقر گنج لہیر یا سرائے ضلع دربھنگہ کے امام وخطیب ہیں) سے میں نے اس افسوسناک صورت حال کا تذکرہ کیا، مولوی صاحب موصوف مولانا وحید الزماں صاحب کے یہاں صف ثانوی میں میرے ہم درس تھے، وہ کئی سال سے دار العلوم میں تھے، اور یہاں کے حالات سے خوب واقف تھے، انھوں نے میری تائید کی، لیکن یہ بھی بتایا کہ اس سمندر میں موتی اور جواہر بھی ہیں، کسی دن ۱۲؍ بجے رات میں آپ تیار ہوں تو میں تنہائیوں میں یکسو ہوکر پڑھنے والوں سے آپ کی ملاقات کراؤں۔ میں نے کہا ضرور! چنانچہ ایک دن طے ہوگیا، وہ مجھے بارہ بجے ساتھ لے کر چلے، اولاً دار العلوم کے مختلف چھوٹے چھوٹے حجروں میں لے گئے، ہر حجرے میں مَیں نے دیکھا کہ ایک یا دو طالب علم دنیا ومافیہا سے بے خبر کتابوں میں منہمک ہیں، کسی نے توجہ کی تو اس کے پاس کچھ دیر بیٹھ گئے، اور اپنی کتاب سے اگر کسی نے سر نہیں اٹھایا، تو ہم خاموشی سے وہاں سے چلے آئے، صبح صادق ہونے کو تھی، مولوی ابرار اس وقت مجھے ایک مسجد میں لے گئے، اس کے حجرے میں بجلی کا چراغ روشن تھا، دروازہ بھڑا ہوا تھا، مولوی ابرار نے زوردار آواز میں **السلام علیکم** کی صدا لگائی۔ دوسری

طرف سے آواز آئی **وعلیکم السلام**، کون؟ اتنا سننا تھا کہ مولوی صاحب موصوف نے دروازہ کھول دیا، دیکھا کہ ایک بہت دبلا، لاغر ونحیف نوجوان طالب علم، جس کا بچپن نوجوانی سے ہم آغوش ہو رہا ہے، اکڑوں بیٹھا ہوا، اور خود کو ایک رومال سے باندھے ہوئے کتاب سامنے کھولے ہوئے منہمک ہے، ہم اس میں خلل انداز ہو گئے تھے، وہ بالکل تنہا تھا، البتہ متعدد کتابیں اس کے دائیں بائیں اور سامنے بکھری ہوئی تھیں، میں ایک نظر دیکھ کر ٹھٹکا، یہ تو میرے ساتھی، صف ثانوی کے طالب علم بدر الحسن دربھنگوی ہیں، ان کے مطالعہ کی حالت قابل رشک تھی، رات کتابوں میں گزارنے والے، سب سے الگ تھلگ، میں نے جی میں کہا پڑھنے والے ایسے ہوتے ہیں۔ میرے جگر میں ٹھنڈک پڑی کہ اب بھی علم کی راہ میں کھپنے والے، جان کھپانے والے موجود ہیں، میں دل میں ایک نیا حوصلہ اور پُر جوش ولولہ لے کر لوٹا۔

یہ وہی بدر الحسن ہیں، جو بعد میں دار العلوم دیوبند میں عربی ادب کے استاذ ہوئے، ’’الداعی‘‘ عربی رسالہ کے مدیر ہوئے، دار العلوم میں انقلاب کے بعد کویت چلے گئے اور وہاں اپنی علمی قابلیت ولیاقت کا لوہا منوا رہے ہیں۔

یہ اس رات کی آخری منزل تھی، بدر الحسن سے اس وقت بے تکلفی نہ تھی، مگر کچھ دیر وہاں بیٹھے، پھر فجر کی اذان سے کچھ پہلے لوٹ کر مدرسہ کی چہار دیواری میں آ گئے۔

ایک طالب علم کی تقریر اور اس سے تاثر:

اسی دوران ایک دن صدر دروازے پر اعلان آویزاں ہوا کہ دار الحدیث فوقانی میں کسی خاص موضوع پر طلبہ کا پروگرام ہے، غالباً جمعہ کے دن یہ پروگرام تھا، کیا تھا؟ اب بالکل یاد نہیں، میں بھی شوق سے حاضر ہوا، مجھے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور ہی سے تقریر وخطابت کا ایک گونہ ملکہ ہو گیا تھا۔ میرا شمار اوسط درجہ کے مقررین میں تھا۔ دل میں البتہ حوصلہ کی فراوانی تھی، ایک چھوٹے ماحول سے بڑے، بہت بڑے ماحول میں پہونچا تھا، میں سوچا کرتا تھا کہ دار العلوم کے طلبہ کی کیا شان ہوگی؟ میں جس طالب علم کو دیکھتا، یہی سوچتا تھا کہ

یہ مجھ سے بدرجہا بلند ہے، مجھے بھی اس بلندی تک پہونچنا چاہئے، میں دارالحدیث میں پہونچا، جلسہ شروع ہو چکا تھا، اناؤنسر نے اعلان کیا کہ جناب مولوی دبیر عالم صاحب دربھنگوی اسٹیج پر تشریف لا رہے ہیں، اور گل افشانی گفتار سے مجمع کو لالہ زار بنائیں گے۔

یہ اعلان ہونا تھا کہ ایک طرف سے ایک دبلا پتلا طالب علم چھوٹا کرتا اور خالطہ پاجامہ پہنے ہوئے نمودار ہوا۔ پکا رنگ، آنکھوں میں جرأت و بے باکی کی چمک، داہنے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پلندہ دبا ہوا۔ بے تکلفی اور بے خوفی سے مائک کے سامنے آیا، اور خطبہ پڑھ کر تقریر شروع کر دی، انداز ایسا تھا جیسے کوئی بڑا کہنہ مشق خطیب ہو، ایک خاص آہنگ میں، پُرجوش خطابت تھی، موقع بموقع خوبصورت اشعار بھی پڑھ رہا تھا، ادب و انشاء کا آبشار بہہ رہا تھا، تمام طلبہ سراپا سکوت تھے، اس کی تقریر تھی! کہ دلوں میں اترتی چلی جارہی تھی، طالب علم معمر نہ تھا، چہرہ ابھی ناآشنائے ریش و بروت تھا، لیکن آواز میں ایک عجیب جھنکار تھی، میں اس کی تقریر سن رہا تھا اور میرا دل سینے میں اچھل رہا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ مقرر یہ ہے! میں تو ننگِ خطابت ہوں، میرے جی میں آرہا تھا کہ تقریر کا انداز مجھے بھی یہی اختیار کرنا چاہئے۔

آدھ گھنٹے تک خطابت کا یہ آبشار بہتا رہا، اور سب کو اپنی رَو میں بہاتا رہا، جب وہ تقریر ختم کر کے مڑا ہے تو لوگ چونکے کہ اتنی جلد کیوں یہ آواز بند ہوگئی، میں اس تقریر سے بہت متاثر ہوا۔

جماعت اسلامی سے سابقہ:

میں ایک روز دارالعلوم کے عظیم الشان کتب خانہ میں بیٹھا محو مطالعہ تھا۔ کیا پڑھ رہا تھا، اس سے پہلے یہ عرض کردوں کہ میں جب جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں زیر تعلیم تھا، اس وقت وہاں چند افراد کے بارے میں سنا تھا کہ ان کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے، ان میں مدرسہ کے طبیب خاص جناب حکیم محمد صابر صاحب بھی تھے۔ میرا شوقِ مطالعہ مجھے سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے دروازے تک بھی لے گیا، ان کی متعدد کتابیں میں احیاء العلوم میں آنے سے پہلے گھر پر پڑھ چکا تھا، مدرسہ میں آیا تو یہاں اور کتابیں ملیں، ان کا اندازِ تحریر

مجھے بہت پسند تھا، وہ پڑھنے والے کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھتے ہیں، وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، پڑھنے والا ان کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے کھوسا جاتا ہے۔ میں نے ان کی کتابیں بارہا ایک ہی نشست میں پڑھی ہیں۔ حکیم صاحب کو میرے جنون مطالعہ کا علم ہوگیا تھا، انھوں نے مودودی صاحب کی کتابیں اور مضامین مجھے دینے شروع کئے، اور میں انھیں بڑے شوق سے پڑھتا رہا، اس وقت تک تفہیم القرآن کی جتنی جلدیں شائع ہوچکی تھیں، انھوں نے سب مجھے دیں، میں پڑھ کر واپس کرتا تو وہ مجھ سے تاثر پوچھتے، میں صرف پڑھنے کے لئے پڑھتا تھا، اس لئے ان کے جی کے موافق تاثر نہیں بتا پاتا تھا۔ علاوہ اس کے مجھے نظریاتی اعتبار سے جماعت اسلامی اور مودودی صاحب سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہ کا بہت معتقد تھا، ان کے متعلق مضامین بہت پڑھ چکا تھا، نقش حیات خود حضرت مدنی کی کتاب میرے مطالعہ سے گذر چکی تھی، ان کے بارے میں دیکھنے والوں سے اتنے واقعات وحالات سن چکا تھا کہ بزرگی وتقویٰ، علم وفضل اور خلوص وللٰہیت کے وہ میرے لئے معیار بن چکے تھے، ان کے علاوہ دوسرے اکابر دیوبند بالخصوص حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی محبت وعقیدت میرے دل میں پیوست تھی۔ میں نے جب فارسی شروع کی تھی اسی وقت سوانح قاسمی حصہ دوم کا مطالعہ اتنی مرتبہ کرچکا تھا کہ وہ مجھے ازبر ہوگئی تھی، میرے دل ودماغ کے رگ وریشہ میں ان کی محبت جذب ہوگئی تھی۔ اس کے برخلاف مودودی صاحب کا تعارف یا تو ان کی کتابوں سے ہوا تھا یا عامر عثمانی ایڈیٹر تجلی کے مضامین ومقالات سے، اسلوب نگارش دونوں کا معیاری تھا، مگر تعلّی اور ہمہ دانی اور دوسروں کی تحقیر وتحمیق کا جذبہ ان پر مسلط تھا، ہر وہ شخص جو ان کے نظریات کے موافق نہ ہو، ان کی تحریروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عقل وخرد سے بالکل تہی دامن ہے، اس چیز نے مجھے ان سے بجائے قریب ہونے کے دور کردیا۔ میں جماعت اسلامی کی موافقت کبھی اپنے دل میں نہ پاسکا۔

اس دور میں بلریا گنج میں جماعت اسلامی کا ادارہ جامعۃ الفلاح کے نام سے قائم

ہو چکا تھا، اور اس حلقے میں جماعت اسلامی پر پُرزے نکال رہی تھی۔ جامعۃ الفلاح کے اساتذہ آس پاس کے گاؤں میں دورہ کرتے رہتے تھے، بلریا گنج کے حلقے کے تمام گاؤں، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے زیر اثر تھے، چنانچہ اس اطراف کے گاؤں کے طلبہ بکثرت احیاء العلوم میں پڑھتے تھے، اب آہستہ آہستہ جامعۃ الفلاح اسی میں سے اپنا حصہ نکال رہا تھا۔ چونکہ اس نواح کے طلبہ بکثرت میرے ساتھی تھے، اور وہ بہت خلیق اور مہمان نواز تھے، ان کی دعوت پر اکثر میرا جانا آنا رہتا تھا، جمعرات کو جاتا، جمعہ کے بعد یا پہلے کچھ تقریر کرتا، شام کو مبارک پور لوٹ آتا۔ ان مہمانیوں میں کبھی کبھی جامعۃ الفلاح کے جماعت اسلامیوں سے سے مڈبھیڑ ہو جاتی، ان کی تقریروں اور باتوں سے مجھے ان کی موافقت کا کوئی تاثر نہ ہوتا، مودودی صاحب اور مولانا امین احسن اصلاحی کی اکثر کتابیں پڑھ چکا تھا، مجھے ہمیشہ ایسا لگا کہ یہ الفاظ ہی الفاظ ہیں، حقیقت اور معانی سے خالی! ڈھانچہ ہی ڈھانچہ ہے روح اور زندگی سے عاری!

ایک بار میں اسی حلقے کے ایک گاؤں اشرف پور میں پہونچا، دیکھا کہ وہاں جماعت اسلامی کا اجتماع ہو رہا ہے، مسجد میں بعد نماز مغرب اجتماع کی کارروائی شروع ہوئی، میں بھی اس میں بیٹھ گیا، دو ایک تقریروں کے بعد ایک صاحب نے مجھے بھی تقریر کی دعوت دی، میں اس وقت غالباً عربی کی پانچویں جماعت، جس میں ہدایہ اولین وغیرہ پڑھائی جاتی ہے، کا طالب علم تھا، لیکن تقریر کا یک گونہ عادی تھا، اور جماعت اسلامی کا اس وقت تک شائع شدہ لٹریچر زیادہ تر پڑھ چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے آخرت کے موضوع پر تقریر کی تھی، اور اس میں میں نے اشارات میں کہا تھا کہ کچھ لوگ آخرت آخرت کا نام بہت دہراتے ہیں مگر ان کا لفظ لفظ بتاتا ہے کہ وہ فکر آخرت سے تہی مایہ ہیں، میرا اشارہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی طرف تھا، کیونکہ وہ اپنے اوپر ہونے والے اعتراضات کے متعلق جواب دیتے ہوئے آخرت کی دہائی بہت دیتے ہیں، مگر انداز اتنا جارحانہ ہوتا ہے کہ فکر آخرت سے خود خالی معلوم ہوتے ہیں۔

غرض یہ کہ جماعت اسلامی کے لٹریچر سے بھی اور اس کے افراد سے بھی خاصی حد تک واقفیت ہو چکی تھی ، اور یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ متعدد اصحاب علم مودودی صاحب کی تحریروں سے متاثر ہو کر ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے ، مگر جب ان سے براہ راست سابقہ پڑا ، تو آہستہ آہستہ لوگ ان سے ٹوٹتے گئے ۔

انھیں ٹوٹنے والوں میں ایک صاحب قلم وحید الدین خاں بھی تھے ، جس وقت میں احیاء العلوم میں تھا ، انھیں حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی علیہ الرحمہ جمعیۃ علماء ہند میں لے آئے اور اخبار الجمعیۃ کا ہفتہ وار جمعہ ایڈیشن ان کے سپرد کیا ، اس میں ان کی البیلی اور فکر انگیز تحریریں چھپنے لگیں ، تو وہ حلقۂ دیوبند میں یکا یک معروف ہو گئے ، میں جمعہ ایڈیشن بہت پابندی سے پڑھتا تھا ۔

وہ جب جماعت اسلامی کے حلقہ سے باہر نکلے تو انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے ’’تعبیر کی غلطی‘‘ میرا مطالعہ جب جماعت اسلامی کے لٹریچر سے آگے بڑھا ، تو مجھے تعبیر کی غلطی کی تلاش ہوئی ، مگر وہ کتاب مجھے مبارک پور میں ہاتھ نہ آسکی ۔ میں دار العلوم میں پہونچا تو کتب خانے میں اسے تلاش کیا ، وہ مل گئی ، اور میں بڑے انہماک اور غور سے اس کا مطالعہ کرنے لگا ۔ جماعت اسلامی کے نظریات کے رد میں بہت کچھ پڑھ چکا تھا ، لیکن وحید الدین خاں نے جو کچھ لکھا تھا ، اس کا اسلوب و آہنگ جداگانہ تھا ۔ میں یہی کتاب پڑھ رہا تھا کہ ایک طالب علم بہت جامہ زیب ، خوبصورت ، گورا چٹا ، پستہ قد ، چہرے پر چھوٹی سی داڑھی سلام کر کے بے تکلفی سے میرے پاس بیٹھ گیا ، اور پوچھنے لگا کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے کہا ’’تعبیر کی غلطی‘‘

میں اس کی ہر ہر سطر چھ چھ مرتبہ پڑھ چکا ہوں ، وہ بولا
بہت خوب میں نے کہا
اتنا ہی نہیں ، میں نے اس کا جواب بھی لکھا ہے
بہت اچھا ، پھر تو آپ وہ جواب فراہم کیجئے

وہ یہاں نہیں ہے، میرے گھر پر ہے
آپ کا گھر کہاں ہے؟
میں سنبھل کا ہوں، مجھے اسعد اسرائیلی کہتے ہیں

پھر جماعت اسلامی کے موضوع پر دیر تک اس طالب علم سے گفتگو ہوتی رہی، وہ کہہ رہا تھا کہ میں دین وشریعت کو مولانا مودودی کی تحریروں سے سمجھ سکا ہوں، میں نے دریافت کیا کہ آپ کس درجہ کے طالب علم ہیں؟ کہا کہ دورۂ حدیث میں ہوں، میں نے کہا تعجب ہے، آپ نے قرآن پڑھا، اس سے دین نہیں سمجھا، تفسیر پڑھی اس سے دین نہیں سمجھا، حدیثیں پڑھیں اور پڑھ رہے ہیں، ان سے دین کو نہیں سمجھا، سمجھا تو کس سے سمجھا، جو امت میں مختلف فیہ ہے، جس کی شخصیت نزاعی ہے، اللہ جانے آپ نے کیا سمجھا ہوگا۔

پھر وہ صاحب مجھ سے بدک گئے، وہ کہیں ہوتے اور میں پہونچ جاتا تو کسی حیلے سے اٹھ کر چل دیتے۔ ان دنوں جماعت اسلامی کے افراد خفیہ طور پر اپنے پر پُرزے نکال رہے تھے، دیواری پرچوں میں اس نظریہ اور جماعت کے رنگ میں کبھی کبھی مضامین نظر آتے تھے۔

ایک دو طالب علم اور بھی اس خیال کے ملے، ان سے خاصہ مباحثہ ہوا۔ ان طلبہ کے پیش نظر دارالعلوم کے طلبہ کی اصلاح تھی، اور اس کے لئے وہ ادبی، بلکہ ناول کے طرز پر مضامین لکھتے اور دیواری پرچوں میں ان کی اشاعت کرتے، غالباً ان کے نزدیک اصلاح کا مطلب یہ تھا دارالعلوم کے ماحول میں علمی نظریات اور عملی روایات میں اسلاف کے فکر وعمل کی جو پابندی ہے، یہ تنگ نظری ہے، تقلید جامد ہے، روشن خیالی کے منافی ہے، پس اسے دور کرنا چاہئے، قدیم بنیادوں کو ڈھادینا چاہئے، اور ان کی جگہ پر نئی بنیاد اور اس پر نئی تعمیر جدید افکار ونظریات کی قائم کرنی چاہئے۔

مجھے یاد ہے، سردی رخصت ہو رہی تھی، مگر رات ابھی بدستور لمبی ہی تھی، دار جدید کی بالائی منزل کے ایک کشادہ کمرے میں رات کا ایک بڑا حصہ اسی موضوع پر بحث ومباحثہ

کی نذر رہوا تھا۔ دو طالب علم جو ذہین بھی تھے، غیر درسی کتابوں سے شغف بھی رکھتے تھے، ادبی ذوق کے بھی دلدادہ اور مالک تھے، وہ دارالعلوم کے طلبہ میں ایک انقلاب چاہتے تھے، وہ انقلاب جو روس کے کمیونزم اور فرانس کے ہنگاموں کے نقش قدم پر ہو، اس کیلئے شاعری، ادبی مضامین، افسانے اور ناول کو بطور اسلحہ اختیار کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔

میں عرض کررہا تھا کہ انقلاب کا یہ مفہوم بھی غلط ہے اور اس کا یہ طریقہ بھی غلط ہے، اس انقلاب کی نہ منزل درست ہے اور نہ راستہ! ہمیں یہ انقلاب درکار نہیں ہے، اس علم وعمل اور فکر ونظر میں پختگی درکار ہے، جو ہمارے اکابر واسلاف کا طرۂ امتیاز رہا ہے، اور جو نبی اکرم ﷺ سے ہمیں بطور وراثت نسلاً بعد نسلٍ حاصل ہوا ہے، اگر فکر وعمل کے جمود وتعطل میں اس طرح کا انقلاب چاہئے تو درست ہے، اور اگر یہ نہیں ہے تو ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں، یہ انقلاب شاعری سے نہیں آئے گا، قرآن وحدیث میں رسوخ سے آئے گا۔ یہ انقلاب ادبی مضامین اور افسانوی اسلوب وآہنگ سے نہیں، روحانی تربیت وریاضت سے ہوگا، اس موضوع پر دیر تک کشمکش رہی، میں تو آج ۴۰؍سال کے بعد بھی اپنی اسی رائے پر قائم ہوں، بلکہ تجربات نے اس میں مزید پختگی پیدا کردی ہے، لیکن بحث کرنے والوں میں سے ایک صاحب نے تو اپنے اس وقت کے خیالات سے برگشتہ ہوکر وہی روپ دھارا ہے، جو میں نے اس وقت کہا تھا۔

کتب خانے سے استفادہ:

میں شوال ۱۳۸۸ھ میں دارالعلوم دیوبند پہونچا تھا، امتحان داخلہ اور داخلہ کے ابتدائی مرحلوں کی مشغولیات سے فراغت ہوئی، تو مطالعہ کا شوق اور کتابوں کا ذوقِ تجسس مجھے دارالعلوم کے وسیع وعریض کتب خانے میں لے گیا، یہ کتب خانہ کیا ہے؟ ہر علم وفن کی مختصر اور مفصل کتابوں کا عظیم الشان خزانہ اور علوم اسلامی کا ایک نادر اور عدیم المثال گنجینہ ہے، علماء ربانی اور مشائخ حقانی کی ایک صدی کی کاوشوں اور جانکاہیوں سے جمع کیا ہوا کتابوں کا ایک سدابہار گلشن!

اس کتب خانہ کے ناظم مولانا سلطان الحق صاحب بجنوری علیہ الرحمہ تھے، جو اپنی فراست ودانائی اور اپنے تن وتوش دونوں اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتے تھے، ان سے سابقہ نہیں پڑا، میں اس کتب خانہ کے ایک خاص شعبہ ''شعبۂ دارالمطالعہ'' میں حاضر ہوا تھا، اس وقت اس شعبہ کے نگراں ایک بزرگ مولوی محمد حنیف صاحب مرحوم تھے، مرحوم اس وقت بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو چکے تھے، مولوی صاحب ایک مشت استخواں تھے، لاغر بدن، پستہ قد، آنکھوں پر باریک کمانی کی عینک، آواز مہین مگر کراری، بڑھاپا بال پر نمایاں تھا، مگر متحرک، جہاں کسی نے کوئی کتاب مانگی، اگر وہ اس سے پہلے سے واقف ہیں، تو بجلی کی سی تیزی سے اٹھتے اور مطلوبہ کتاب بلا تامل نکال کر دیدیتے، اور اگر اس سے واقف نہیں ہیں تو الجھتے، اس کا مبلغ علم معلوم کرتے، جدید ہو یا قدیم، پوچھتے۔ انھیں اس کے معیار سے اونچی کتاب معلوم ہوتی تو اسے مطالعہ کی ترتیب بتاتے کہ پہلے فلاں فلاں کتاب پڑھو، پھر اسے پڑھنا۔

یہ دارالمطالعہ ان دنوں صبح کے اوقات تعلیم میں بارہ بجے تک اور بعد نماز ظہر اذان عصر تک کھلا رہتا تھا، طلبہ ان اوقات میں عموماً درس میں مشغول ہوتے تھے، وہی طلبہ دار المطالعہ میں آتے تھے، جن کا گھنٹہ کسی اتفاقی وجہ سے خالی ہو گیا ہو، اس وقت کچھ شوقین طلبہ مطالعہ کے لئے اس شعبہ میں جمع ہو جاتے تھے۔

میں دار المطالعہ میں پہونچا تو کتابوں کا ہجوم دیکھ کر خوشی سے میری طبیعت جھوم اٹھی، کہ یہاں جنونِ مطالعہ کی تسکین کا سامان موجود ہے، میں اس میں لگی ہوئی فہرست (کیٹلاگ) دیکھنے لگا۔ اور گھنٹوں کھڑا دیکھتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک نظر کتابوں کے نام پر پڑ جائے، پھر مطالعہ کیلئے کسی کتاب کا انتخاب کروں۔

دارالعلوم دیوبند جانے سے پہلے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں پڑھتا تھا، وہاں تعلیمی مضامین میں مجھے گو کہ کچھ زیادہ صلاحیت نہ تھی۔ لیکن ادب عربی کے بعد منطق سے خصوصی دلچسپی تھی، میرے ذہن ودماغ میں منطق کے مباحث عموماً گردش کیا کرتے تھے

،اس موضوع پر درسی کتابوں کے علاوہ دوسری کتب کا بھی مطالعہ کیا کرتا تھا۔ بالخصوص منطق کی حمایت ومخالفت میں جو مضامین اور کتابیں ملتیں انھیں ضرور پڑھتا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ کے مقالات کا وہ حصہ جو منطقی مباحث پر مشتمل ہے اسے بار بار پڑھا، انھوں نے اپنے مقالات میں علامہ قطب الدین رازی کی کتاب شرح مطالع کا ذکر بہت اہتمام سے کیا ہے، نیز انھیں کے مقالات میں علامہ ابن تیمیہؒ کی کتاب" **الرد علی المنطقیین** " کا ذکر بھی پڑھا تھا۔ مجھے ان دونوں کتابوں کے مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ مبارکپور کے کتب خانہ میں یہ دونوں کتابیں موجود نہ تھیں، دارالعلوم کے کتب خانہ میں رسائی ہوئی تو فہرست میں یہ دونوں مل گئیں، میں نے غایت شوق میں نگران کتب خانہ مولوی محمد حنیف صاحب سے کہا کہ ذرا شرح مطالع نکال دیجئے، نام سنتے ہی ان کی پیشانی پر بل آ گیا، سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا، ایک مسکین اور شرمیلا طالب علم، گردن میں پرانے طرز کا رومال لپیٹے، بہت معمولی سوتی کرتا اور مِل کی بنی ہوئی چارخانے کی لنگی پہنے، سر پر مئو والی مخصوص کشتی نما ٹوپی رکھے کھڑا ان سے شرح مطالع کی فرمائش کر رہا تھا۔ چہرے بشرے پر ذہانت کی پرچھائیاں بھی نہ تھیں، عمر بھی اٹھارہ سال کے قریب پہونچی تھی، انھوں نے کڑک کر پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ جلالین کی جماعت میں داخلہ ہوا ہے، اچھا جدید ہو؟ جی ہاں۔ منطق کی کون سی کتاب پڑھی ہے؟ سلم اور ملاحسن پڑھی ہے، قاضی مبارک اور حمد اللہ بھی پڑھ چکے ہو؟ جی نہیں، پھر شرح مطالع کیا سمجھو گے؟ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے، میں گھبرا گیا، میں نے سوچا یہ موقع ہاتھ سے جانا چاہتا ہے، میں نے ہمت کی، اور لپک کر ان سے کہا کہ صاحب کتاب دیدیجئے، انھوں نے پھر ڈانٹا کہ سمجھو گے؟ اب میں نے بھی تیور بدلے، آپ کو اس سے کیا مطلب؟ آپ کتاب دیجئے، پہلے وہ گرم ہوئے، لیکن پھر نرم پڑ گئے، اور مجھے سمجھانے لگے، دیر تک سمجھاتے رہے، مگر میری آتش شوق تیز تر ہوتی رہی، بالآخر انھوں نے سپر ڈال دی، کہنے لگے میں عرصۂ دراز سے یہاں کام کر رہا ہوں، مگر کسی نے یہ کتاب نہیں مانگی، اچھا لاتا ہوں، یہ کہہ کر وہ سیڑھی سے اوپر ریلنگ پر چڑھ گئے اور کتاب نکال کر لے آئے، اسے خوب جھاڑا پونچھا، رجسٹر پر درج

کیا، مجھ سے دستخط لیا اور کتاب میرے حوالے کر کے نگرانی کرنے لگے کہ میں پڑھتا بھی ہوں، یا صرف ورق گردانی کرتا ہوں۔

یہ تھا مولوی صاحب مرحوم سے میرا پہلا سابقہ جو لڑائی سے شروع ہوا، اور ان کی شفقت و محبت تک پہونچا۔

کسی طالب علم کو کوئی کتاب خود سے نکالنے نہیں دیتے، طلبہ الماریوں کے قریب کھڑے ہو کر کتاب کے نام دیکھتے رہتے، اور مولوی صاحب انھیں دیکھتے رہتے، جہاں کسی کا ہاتھ کسی کتاب کی طرف بڑھتا، وہ تڑپ کر اٹھتے اور ان کے پہونچنے سے پہلے ان کی آواز اس کے کانوں تک پہونچ جاتی، ہاں ہاں کتاب کو ہاتھ نہ لگاؤ، تمہیں کون سی کتاب چاہئے، طلبہ ان کی اس ادا سے خوب واقف تھے، اس لئے ہر طالب علم اپنے ہاتھ کو محتاط ہی رکھتا، کیونکہ مولوی صاحب پھر دیر تک تنبیہ کرتے رہتے اور طالب علم خفیف ہوتا رہتا، اگر ایسا وہ نہ کرتے، تو کتب خانے کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

ابتداءً میرے ساتھ بھی یہی معاملہ رہا، لیکن چونکہ میں روزانہ پابندی کے ساتھ حاضر ہوتا رہا، اور بکثرت کتابیں ان سے طلب کرتا رہتا، پہلے تو انھوں نے بیک وقت کئی کئی کتابیں مانگنے پر ٹوکا، مگر جب دیکھا کہ اس لڑکے کی بے دماغی ان کے اصول وضوابط کی آہنی رکاوٹوں سے ہارنے والی نہیں ہے، تو خود انھوں نے سپر ڈال دی، انھوں نے اس کے بعد مجھے خصوصی اجازت مرحمت فرما دی تھی، کہ تم جو چاہو کتاب نکال سکتے ہو، کچھ دنوں کے بعد رجسٹر میں درج کرانے کی پابندی بھی ہٹا دی تھی، مجھے دیکھ کر بعض اور طلبہ نے بھی جرأت کرنی چاہی، لیکن انھوں نے تنبیہ کر کے اور سمجھا کر انھیں ایسا کرنے سے باز رکھا، انھوں نے مہربانی فرما کر میرے لئے کتب خانے کا ایک گوشہ متعین کر دیا تھا کہ میں وہیں بیٹھا کروں، اس جگہ کسی کو بیٹھنے نہیں دیتے تھے، وہ جگہ ایسی تھی کہ نوادرات کی الماریوں کی وجہ سے وہاں کچھ آڑ سی ہو گئی تھی، کتب خانہ میں آنے جانے والوں کی نگاہ وہاں نہیں پڑتی تھی، ایسے طالب علموں کو جو پڑھنے سے زیادہ گفتگو کے عادی تھے۔ انھیں میرے پاس جانے سے

روک دیتے اور اگر اتفاق سے میں خود کبھی کسی سے گفتگو شروع کر دیتا، تو دو چار منٹ برداشت کرتے، لیکن اس کے بعد ان کی ناصحانہ تنبیہ شروع ہو جاتی۔

میں جس درجہ میں پڑھتا تھا اس میں صرف تین کتابیں زیرِ درس تھیں، صبح کے ابتدائی دو گھنٹوں میں جلالین شریف ہوتی، تیسرے گھنٹے میں میبذی ہوتی، چوتھا گھنٹہ خالی تھا، اس میں خوشخطی کی تمرین کیا کرتا، شام کے دونوں گھنٹے ہدایہ اخیرین کے لئے تھے۔

جلالین شریف حضرت مولانا محمد سالم صاحب پڑھاتے تھے، ان کا دستور تھا کہ وقت ہوتے ہی پانچ منٹ کے اندر دار التفسیر میں تشریف لے آتے تھے، اگر پانچ منٹ گزر گئے اور مولانا نہیں پہونچے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب تشریف نہیں لائیں گے۔ کہیں سفر میں گئے ہوں گے یا اور کوئی ضروری مشغولیت ہوگی، اس کے بعد طلبہ کچھ تو وہیں درسگاہ میں مذاکرہ و مطالعہ میں لگ جاتے، کچھ لوٹ آتے، میں سیدھا بھاگ کر کتب خانہ میں پہونچ جاتا، میبذی حضرت مولانا قمر الدین صاحب گورکھپوری کی خدمت میں پڑھتا تھا۔ وہاں ناغہ کا کوئی سوال نہ تھا، خوشخطی کی تمرین بعض دوستوں کی ترغیب سے اختیار کر لی تھی، مگر مجھے اس سے کوئی مناسبت نہ تھی، کچھ دنوں تک اس کو نباہتا رہا، لیکن چند دنوں کے بعد اپنے استاذ محترم حضرت منشی امتیاز احمد صاحب علیہ الرحمہ سے اجازت لے کر اس شعبہ سے اپنا نام میں نے خارج کرا لیا، اب یہ گھنٹہ کتب خانہ کیلئے مستقل ہو گیا۔

شام کے دونوں گھنٹوں میں ہدایہ اخیرین کا درس تھا۔ حضرت مولانا اختر حسین صاحب علیہ الرحمہ جو مدرسہ میں ''میاں صاحب'' کے نام سے معروف تھے، پڑھاتے تھے، میاں صاحب نہایت متقی اور باخدا انسان تھے، اس وقت وہ نائب ناظم تعلیمات تھے، ان کے درس میں بڑی برکت تھی، جتنا سبق کوئی دو گھنٹے میں پڑھاتا، اس سے زیادہ وہ ایک گھنٹے میں پڑھاتے تھے، چھٹی سے آدھ گھنٹہ پہلے ان کا سبق مکمل ہو جاتا، میں اس وقت بھی بھاگ کر کتب خانہ پہونچ جاتا۔ مولوی صاحب بھی منتظر ہی ہوتے، میری کثرتِ حاضری کی وجہ سے وہ بہت مانوس ہو گئے تھے، اور بڑی رعایت کرتے تھے، کبھی کبھی باتیں بھی کرتے، خوش

رہتے تو اپنے پچھلے تجربات بھی بتاتے، ان کی باتوں سے مطالعہ کا شوق بڑھتا، اور بڑی ہمت ملتی، حوصلہ بیدار ہوتا۔

ایک روز بارہ بجنے کے بعد بھی میں کتب خانہ میں بیٹھا رہ گیا، وہ بھی کسی کام میں مشغول تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب فارغ ہوئے تو دروازہ بند کرنے لگے، پھر انھیں کچھ خیال آیا تو پلٹ کر دیکھا کہ میں ابھی تک کتاب دیکھے جا رہا ہوں۔ ڈانٹنے لگے کہ تمہاری وجہ سے کیا میں یہیں پڑا رہوں، چلو باہر چلو، میں تو دروازہ بند کر دئے ہوتا، مگر تم یاد آ گئے پھر مسکرانے لگے، اور فرمایا کہ میں کتب خانے میں اس کام پر ۳۰/ سال سے ہوں، اس تیس سال کے عرصہ میں کتب خانے کو سب سے زیادہ استعمال کرنے والے تین طالب علم ملے، اور اتفاق ہے کہ تینوں اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں، بلکہ دو تو بھائی تھے، ایک امانت اللہ، دوسرے نعمت اللہ! اور تیسرے تم ہو، اس وقت ہم تینوں کا ضلع اعظم گڈھ تھا، اب مئو ضلع میں آ گئے ہیں۔

مجھے ان کی بات سے بے حد مسرت ہوئی، اور بڑا حوصلہ ملا۔ اور مطالعہ کے شوق میں مزید مہمیز ہوئی۔ اس طرح وہ پڑھنے والے طالب علم کا دل بڑھایا کرتے تھے، اس کے بعد اکثر وہ میری رعایت میں وقت ختم ہونے کے بعد بھی بیٹھے رہتے۔ جب زیادہ دیر ہونے لگتی، تو حکماً اٹھا دیتے،

مولوی محمد حنیف صاحب مرحوم کو دارالعلوم کے کتب خانے سے عشق تھا، وہ ہر وقت کتابوں کی دیکھ بھال کیا کرتے، انھیں جھاڑتے پونچھتے رہتے، اسی عشق کا نتیجہ تھا کہ ان کے لوحِ دماغ پر ہر ہر کتاب کا نام ثبت تھا، اور یہ کہ وہ کس جگہ رکھی ہے، اس کی جلد کا رنگ کیا ہے، کتنی ضخیم ہے، جہاں کسی نے کوئی کتاب طلب کی، وہ نہ فن پوچھتے، نہ کتاب کا نمبر پوچھتے، سیدھے متعلقہ الماری کے پاس پہونچتے، اور ان کی انگلیاں ٹھیک اسی کتاب پر پڑتیں جو مطلوب ہوتی، اس میں کبھی تخلف نہیں دیکھا، جب میں نے ان سے شرح مطالع طلب کی، اور حجت وتکرار کے بعد وہ دینے پر آمادہ ہوئے، تو حالانکہ انھیں اس کتاب کے نکالنے کی کبھی

ضرورت پیش نہیں آئی تھی، مگر وہ سیڑھی پر چڑھ کر ٹھیک اسی کتاب کو نکال کر لے آئے۔

دارالعلوم دیوبند سے واپسی کے بعد پھر ان سے ملاقات کی نوبت بہت کم آئی، (۱۹۹۴ء میں) دارالعلوم حاضری ہوئی، اور کتب خانہ میں جانا ہوا، تو کتب خانہ کا وہ بوڑھا عاشق ملا۔ دارالمطالعہ کی جگہ اب تبدیل ہوگئی ہے۔ مولوی محمد حنیف صاحب بھی تھک ہار چکے تھے، کمزوری کا ان پر غلبہ تھا۔ حافظہ کی گرفت بھی ڈھیلی ہوگئی تھی۔ ان کے ساتھ ایک معاون لگا دیا گیا تھا۔ تعارف کے بعد پہچان گئے۔ اور پھر وہ دیر تک پچھلے دور کو یاد کرتے رہے، اور کتب خانہ اور اس کے متعلقات پر باتیں کرتے رہے، لیکن اب باتوں میں کرارا پن نہ تھا۔ اضمحلال جھلکتا تھا، بہت سی باتیں حافظہ سے محو بھی ہوچکی تھیں۔ غالباً اسّی سے زائد عمر بھی ہوچکی تھی۔

بالآخر کتابوں کی خدمت کرتے کرتے اس جاں نثار اور باوفا بوڑھے نے ۱۹؍ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ کو زندگی کے سفر سے کمر کھول دی، اور رب کریم کے حضور بامید مغفرت حاضری دیدی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کی تُربت کو ٹھنڈا رکھے اور ان کے احسانات کا اجر عطا فرمائے۔ (۱)

☆☆☆☆☆

(۱) مولوی محمد حنیف صاحب دیوبندیؒ پر تفصیلی مضمون دیکھئے مولف کی کتاب ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' میں، ص: ۲۸۶ (ضیاء الحق خیرآبادی)

دسواں باب

دارالعلوم دیوبند کی اسٹرائیک

(۱۳۸۹ھ مطابق ۱۹۶۹ء)

یہ ایک تکلیف دہ موضوع ہے جس کا ذکر اللہ جانے بہتر ہوگا، یا نہیں؟ تاہم جب سب حالات لکھ رہا ہوں تو اس کے حالات بھی لکھ دوں کہ اس کے صحیح حالات کا جاننے والا میرے اور مولانا طاہر حسین صاحب گیاوی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے ایک صاحب اور ہیں، مگر وہ پوشیدہ تھے، اور اب بھی پوشیدہ ہی رہنا چاہتے ہیں، اس تحریر میں بھی ان کا نام کہیں نہیں آئے گا۔

میرا داخلہ شوال ۱۳۸۸ھ میں دارالعلوم دیوبند میں ہوا، میں اپنے تصورات میں دارالعلوم کو، اور دارالعلوم کے اساتذہ کو جیسا سمجھ رہا تھا ویسا نہیں پایا، کوئی بھی ادارہ جب پرانا ہوجاتا ہے اور اس پر بڑھاپا آجاتا ہے تو بڑھاپے کی کمزوریاں اس کے عوارض وامراض اسے لاحق ہوجاتے ہیں، دارالعلوم دیوبند کو بھی میں نے بڑھاپے کی کمزوریوں کا شکار پایا، ہم لوگ سنتے تھے کہ ایک دور ایسا تھا کہ دارالعلوم کے شیخ الحدیث سے لے کر دربان تک صاحب نسبت ہوا کرتے تھے، اب حال ایسا تھا کہ ابتدائی دینداری بھی نچلی سطح کے ملازمین میں مشکل سے ملتی تھی، حضرات اساتذہ کے احوال بھی بکثرت قابل اعتراض تھے، داخلہ کے وقت ہی ایسے حالات پیش آئے کہ طبیعت ٹوٹ ٹوٹ کر رہی، خیر ہم تو پڑھنے آئے تھے جی میں ٹھان لیا تھا کہ جو بھی ہو ہم جس مقصد کیلئے آئے ہیں اس کو حاصل کریں اور خیر وعافیت کے ساتھ فارغ ہوکر جائیں۔ طبیعت اس پر جمی ہوئی تھی کہ خرابیوں کو دیکھو، اور ان سے اجتناب کرنے کی کوشش کرتے رہو، اور آئندہ زندگی میں ان سے اجتناب کو اپنا شعار بناؤ۔

تعلیم کی گاڑی چلتی رہی، اس وقت دارالعلوم میں تین امتحان ہوا کرتے تھے، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ، سہ ماہی امتحان بخیریت گزر گیا، ششماہی امتحان قریب آگیا تھا طلبہ کی حاضری اسباق میں حاضری پکارنے تک ہوتی، پڑھنے کا ذوق وشوق بڑی حد تک مردہ تھا امتحان ششماہی جوں جوں قریب آرہا تھا، طلبہ میں ٹورنامنٹ اور میچ کا ذوق بڑھ رہا تھا، صدر گیٹ پر ہر روز متعدد اعلانات رنگ برنگ کے والی وال، فٹ بال وغیرہ کے مقابلے کے نکلتے رہتے، مجھے اس سے بڑا رنج ہوتا، ایک دن طلبہ کے ایک مجمع میں میں نے کہا کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو کام کے وقت میں اسے لہو ولعب کا شوق چرّاتا ہے، اس پر بعض طلبہ مجھ پر بہت ناراض ہوئے اور بڑی دیر تک بحث ومباحثہ کرتے رہے۔

جب امتحان بالکل سر پر آگیا تو شور ہوا کہ فلاں مدراسی تکرار کیلئے کشمیر سے آگئے ہیں ان کا تکرار بہت مشہور تھا، وہ آئے اور طلبہ میں ہل چل مچ گئی، طلبہ ان سے وقت لینے لگے کسی کو عشاء کے بعد کسی جماعت کو بارہ بجے رات میں، کسی کو بھور میں، وہ وقت دیتے اور طلبہ دیوانہ وار ان کے پیچھے دوڑتے، مجھے حیرت ہوتی کہ یہ طلبہ اگر اساتذہ کے سبق میں اسی ذوق وشوق کے ساتھ حاضری دیتے تو آج اس کی نوبت نہ آتی، ایک دن میں میبذی کے تکرار میں ان کی مجلس میں شریک ہوا، تو محسوس ہوا کہ یہ صاحب تکرار میں بہت پھکڑ پن کرتے ہیں، کسی پر جملہ کس دیا، کسی کی ٹوپی اچھال دی، اساتذہ دارالعلوم کو خاص طور سے نشانہ بناتے، ان خرافات کی وجہ سے طلبہ خوب ہنستے اور ان کی مقبولیت ہوتی، اسی میں مسائل بھی سمجھاتے جاتے، میں جب پہونچا تو اساتذہ کا خاکہ اڑا رہے تھے، اور کسی عبارت کا مطلب سمجھا رہے تھے، اور طلبہ جھوم رہے تھے مگر میرے خیال میں تو وہ عبارت اور مطلب کی تقریر بالکل غلط کر رہے تھے، میں تھوڑی دیر میں اٹھ کر چلا آیا اور اپنے تکرار میں میں نے اس کی تردید کی۔

وہ اپنے ان تکراروں سے اور اپنے پھکڑ پن سے طلبہ کا مزاج خراب کر دیتے تھے اسی لئے دارالعلوم کے اساتذہ اور اہل انتظام ان کے آنے کو اور ان کے تکرار کو پسند نہ کرتے تھے، معلوم ہوا کہ دیوبند میں ایک مکان انھوں نے مستقل کرایہ پر لے رکھا ہے اور ہر سہ ماہی

، شش ماہی اور سالانہ امتحان میں جہاں وہ پڑھاتے ہوتے ہیں، طلبہ ان کو بلا لیتے ہیں اور اگر نہ بلائیں تو وہ ازخود آجاتے ہیں، انھیں دار العلوم سے فارغ ہوئے عرصہ گزر چکا ہے، مگر یہاں طلبہ کی وجہ سے بھی معقول آمدنی ہوجاتی ہے، اس لئے مستقل ایک مکان کرایہ پر لے رکھا ہے، ایک روز میں غالباً مغرب کے یا عشاء کے بعد ایک بزرگ طالب علم کے پاس بیٹھا ہوا تھا یہ صاحب طلبہ میں اپنے تقویٰ طہارت اور تدین میں معروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ بہت ذہین اور محنتی تھے پچھلے سال دورۂ حدیث میں دوسری پوزیشن کے ساتھ کامیاب ہوئے تھے، اسی کے ساتھ یہ بات بھی طلبہ میں گرم تھی کہ انھیں پہلی پوزیشن حاصل ہوئی تھی، مگر سازشی کارروائیوں نے کسی اور کو پہلی پوزیشن پر پہونچا دیا، اور میں دیکھتا تھا کہ ان کو اس امر کی گہری چوٹ لگی تھی مگر بہر حال دیندار اور محتاط تھے، ان کی طرف سے اظہارِ تکلیف کا اندازہ تو ضرور ہوتا تھا، مگر ان کی زبان کسی نامناسب بات میں مبتلا نہ تھی میں ان کا بہت عقیدت مند تھا اور اسی عقیدت مندی کے اثر سے ان کے پاس بیٹھا کرتا تھا، ان کی خدمت میں یکسوئی اور پڑھنے میں محنت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

میں بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا کہ باہر کچھ شور سنائی دیا وہ تو اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں، مجھ سے کہا دیکھو کیا بات ہے؟ میں کمرے سے باہر نکلا تو شور تھا کہ فلاں مدراسی کے خلاف نائب مہتمم صاحب نے مالک مکان کو ورغلایا ہے، اور وہ زبردستی مکان خالی کرا رہا ہے، یہ شور ہونا تھا کہ طلبہ کا جم غفیر ان کے مکان کی طرف ٹوٹ پڑا تھا، جو طلبہ ادھر گئے تھے وہی اب واپس آرہے تھے، اور ایک بے ہنگم سا شور ہو رہا تھا، میں نے جا کر یہ بات انھیں بتائی تو وہ کہنے لگے کہ مدراسی کا کوئی مسئلہ نہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کے ارباب انتظام نے جمعیۃ الطلبہ کو توڑ دیا ہے، جب تک جمعیۃ تھی، طلبہ کی ایک طاقت تھی، اتنے طلبہ کو دوڑنا نہ پڑتا، ایک صدر یا ایک ناظم جا کر تنہا معاملے کو دیکھ لیتا، اب جمعیۃ نہیں تو جس کا جو جی چاہے کرے، طلبہ کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے یہ کہہ کر انھیں جوش آگیا، کسی نے آکر بتایا کہ طلبہ دار جدید کے صحن میں جمع ہو رہے ہیں، وہ جوش میں کہنے لگے کہ آج اگر کوئی ہوتا تو کام بن جاتا، اسے وہ مکررسہ

کررا پنی ران پر ہاتھ مار مار کر برابر کہتے رہے، میں ٹھہرا نادان! اور پُر جوش عقیدت مند! میں نے کہا میں جاتا ہوں میں گیا، تو طلبہ بڑی تعداد میں موجود تھے ایک صاحب اسٹیج پر تقریر کر رہے تھے......دار جدید کے صحن میں ایک اسٹیج مستقل بنا ہوا تھا، غلہ اسکیم کا جلسہ ہوتا، تو علماء کی اسی پر تقریریں ہوتیں..........میں پہونچا تو میں نے تقریر شروع کر دی، میں نے جمعیۃ الطلبہ کے قیام پر زور دیا، اس وقت طلبہ کی انجمن کے نقصانات گوکہ میں دیکھ چکا تھا مگر بچپن کی نادانی میں اسے نقصان نہ سمجھتا تھا، یہ تقریر اتنی پر جوش تھی کہ تمام موجود طلبہ نے اتفاق رائے سے جمعیۃ کے قیام کو منظور کر لیا، اسی وقت سب طلبہ کی طرف سے اصرار ہوا کہ تم ہی جمعیۃ کی صدارت کو قبول کرو، میں نے معذرت کی کہ جمعیۃ کے دستور میں ہے کہ صدر کم از کم ایک سال قدیم ہونا چاہئے، اور میرا تو یہ پہلا سال ہے مگر اس وقت سب نے اس سے مجھ کو مستثنیٰ قرار دے کر باتفاق رائے مجھے صدر بنا دیا تھا، میری تقریر کے بعد مولوی طاہر حسین گیاوی اسٹیج پر آئے، ان کی برجستہ اور پر جوش تقریر نے اس مجمع کو ایک تحریک کی شکل دیدی، اور پھر اس تحریک نے ایک خطرناک شکل اختیار کر لی، وہ یہ کہ اب جمعیۃ کے قیام کا مسئلہ پیچھے چلا گیا، اور نائب مہتمم مولانا معراج الحق صاحب کے خلاف یہ ایک بغاوت کی تحریک بن گئی، ابتداءً میں اسے بھانپ نہ سکا، مگر ان کی تقریر کے بعد بعض اور تقریریں ہوئیں، جن میں سارا زور نائب مہتمم کے خلاف تھا، میں نے چاہا کہ پہلے جمعیۃ کا باقاعدہ قیام عمل میں آجائے، اس کے ممبران وغیرہ متعین ہو جائیں، پھر کوئی دوسرا کام چھیڑا جائے، چنانچہ اخیر میں میں نے عرض کیا کہ فی الحال اس کے ممبران کے انتخاب کے ضرورت ہے اس کے لئے تمام اضلاع اور صوبوں سے منتخب طلبہ کی مجلس شوریٰ بن جائے، چنانچہ اسی وقت غالباً اٹھائیس ممبران کے نام منظور ہو گئے، اعلان ہوا کہ سب طلبہ آرام کریں، یہ ممبران سب طلبہ کے نمائندے ہیں آج رات میٹنگ کر کے کوئی لائحہ عمل طے کر لیا جائے گا، یہ رات جمعہ کی تھی۔

یہ ممبران دار العلوم کے باہر ایک مسجد میں اکٹھا ہوئے، مشورے ہونے لگے، درمیان میں یہ بات کسی نے زور وشور سے اٹھائی کہ یہاں کی کوئی بات دار الاہتمام میں علیحدہ سے نہ

پہونچ جائے، ہر بات اب نظام کے ماتحت ہونی چاہئے اس کے لئے حلف رازداری دلایا جائے، میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی، مگر دوسرے پرجوش طلبہ نے اسے بہت ضروری قرار دیا، اس کیلئے کچھ الفاظ تجویز ہونے لگے جو انسانی زندگی کیلئے بہت سخت تھے، میں نے انھیں تسلیم نہیں کیا، بس یونہی زبانی رازداری کا اقرار لے لیا گیا۔

تجویز میں یہ بات پاس ہوئی کہ

(۱) طلبہ نے مدراسی کی حمایت میں جو یلغار کی وہ غلطی ہوئی، مہتمم صاحب سے اس کی معافی مانگ لی جائے۔

(۲) جمعیۃ الطلبہ جو طلبہ نے قائم کرلی ہے، اسے منظوری دی جائے۔

(۳) جو طلبہ اس تحریک میں سامنے آگئے ہیں انھیں معاف کیا جائے اور ان کا اخراج نہ کیا جائے۔

طے ہوا کہ نمبر ۲ کو تو ابھی ذکر نہ کیا جائے، (۱) اور (۳) کیلئے ایک تحریری معذرت نامہ لکھ کر دارالاہتمام میں پیش کردیا جائے، امتحان ششماہی کے بعد انجمن کے مسئلہ کو چھیڑا جائے۔

اسی پر میٹنگ برخواست ہوگئی۔

جمعہ کے روز علی الصباح بازار سے لاؤڈ اسپیکر لایا گیا، طلبہ کو رات کی میٹنگ کے نتائج کا انتظار تھا، صبح کو اتفاق سے بارش ہوگئی، میدان میں طلبہ کے جمع ہونے کا موقع نہ رہا، دارجدید کے برآمدے میں لاؤڈ اسپیکر فٹ کیا گیا، زیادہ تر طلبہ آگئے میں نے اعلان کیا کہ امتحان ششماہی کا وقت قریب ہے، طلبہ اس کی تیاریوں میں لگیں، سکون واطمینان سے امتحان دیں اور باقی ضروری کام ان شاء اللہ امتحان کے بعد طے کئے جائیں گے، اس اعلان پر طلبہ مطمئن ہوگئے، ہم لوگوں نے جو معذرت نامہ تیار کیا تھا، اسے چند طلبہ مل کر حضرت مہتمم صاحب کو دینا چاہتے تھے، مگر وہ سفر میں تھے، مجبوراً نائب مہتمم کو درخواست دی، انھوں نے بڑی بے اعتنائی سے لے کر ڈسک میں یہ کہتے ہوئے ڈال دی کہ حضرت مہتمم صاحب

تشریف لائیں گے تو کوئی بات ہوگی، ہم لوگ قدرے مایوس ہوکر وہاں سے لوٹے، میں رات بھر جاگا تھا، یہاں سے فارغ ہوتے ہی جا کر سوگیا۔

دس بجے کے بعد اچانک ایک طالب علم نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھادیا، میں کبیدہ خاطر ہوکر بیدار ہوا، معلوم ہوا کہ مولوی طاہر بلا رہے ہیں، میں ہاتھ منھ دھوکر نکلا، تو وہ مل گئے، مجھ سے کہنے لگے چلو، میں نے کہا کہاں؟ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا بس چلنے لگے میں بھی ایک ہم سفر کی طرح چلنے لگا، پھر راہ میں ایک بزرگ طالب علم مل گئے، ہم تینوں مل کر دارالعلوم سے دور ایک مسجد میں بیٹھے، ان بزرگ طالب علم نے کہا کہ تم نے تحریک واپس لے کر بڑی غلطی کی، یہی تو تحریک کا وقت ہے، اس وقت یہ تحریک سرد پڑگئی، تو سارا کام خراب ہوجائے گا، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کون سا کام خراب ہوجائے گا وہ برابر اصرار کرتے رہے، اور میں ہکا بکا رہا، مولوی طاہر بھی کچھ بول نہیں پا رہے تھے، آخر میں انھوں نے دیکھا کہ یہ دونوں آمادہ نہیں ہورہے ہیں تو انھوں نے ایک استاد کا حوالہ دیا کہ ان کا حکم ہے، میں تو ان کا نمائندہ ہوں، میری سمجھ میں تب بھی نہیں آیا، مگر مولوی طاہر صاحب نے آمادگی ظاہر کی، ہم دونوں وہاں سے اٹھے، تو مولوی طاہر صاحب مجھے لے کر بازار چلے لاؤڈ اسپیکر والے سے کہا کہ جمعہ کے بعد لاؤڈ اسپیکر دارجدید میں لاکر لگادو، یہ کہہ کر ہم دونوں مدرسہ واپس آگئے، میں نہا دھوکر نمازِ جمعہ پڑھنے جامع مسجد چلا گیا، اور ارادہ کیا کہ عصر تک واپس نہ آؤں گا، میں جمعہ پڑھ کر وہیں ٹھہر گیا، اچانک کچھ طلبہ مجھے تلاش کرتے ہوئے آگئے، اور مجھے سمجھا بجھا کر مدرسے میں لے آئے، یہاں دھواں دھار تقریر ہورہی تھی، اسٹرائیک کا اعلان ہورہا تھا کہ کل سے بالکل تعلیمی مقاطعہ ہے، جب تک ہمارے مطالبات پورے نہ ہوں گے، میں دم بخود تھا، مگر حالات ایسے تھے کہ مجھے بھی تائید کرنی ہی تھی اور میں تو صدر تھا، مجھے آگے آنا ہی تھا، عصر کے بعد طلبہ نے دفتر تعلیمات سے تمام درسگاہوں کی چابیاں لے لیں، تاکہ صبح کو کوئی درسگاہ نہ کھلے، اب باقاعدہ اسٹرائیک کا آغاز ہوگیا، اس کے سربراہ ....
تھے، ان کی تقریروں نے بڑی مقبولیت پائی اور طلبہ ان کے اشاروں پر چلنے لگے میں بھی مجبور

تھا، یہ صدارت کا عہدہ میرے لئے مصیبت بن گیا، تعلیمی مقاطعہ چلتا رہا، سنیچر کا دن گزرا، اتوار کو اچانک اس تحریک نے ایک خطرناک موڑ لیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اتوار کے روز شام کو مغرب کی نماز کے بعد دارالعلوم کے چند بڑے اساتذہ نے دارالعلوم کی مسجد میں طلبہ کو روکا اور انھیں اس ہڑبونگ کے متعلق کچھ سمجھانا چاہا کچھ طلبہ بیٹھ بھی گئے، مگر اسٹرائیک کے شعلہ بار مقررین کو یہ بات ناگوار ہوئی، انھوں نے مسجد میں جاکر اساتذہ کے بالمقابل تقریر شروع کردی، اس میں طلبہ کو فوراً یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا، طلبہ نے یکا یک مسجد خالی کردی اور اساتذہ خفیف ہوکر وہاں سے نکل گئے اس واقعہ کے بعد طلبہ میں ایک نیا اشتعال پید ہوگیا، ایک جوشیلے طالب علم نے مائک پر اعلان کردیا کہ جو اساتذہ دارالعلوم میں مقیم ہیں وہ دارالعلوم خالی کردیں، اس سے بڑا ہیجان پیدا ہوگیا، خود طلبہ اس ہنگامہ کے مخالف ہونے لگے، معاملہ قابو سے باہر ہوگیا پھر کسی نے افواہ اڑادی کہ فلاں فلاں طالب علم اسٹرائیک کی مخالفت کررہے ہیں اور وہ اپنے کمرے میں لاٹھی ڈنڈے جمع کررہے ہیں، یہ افواہ پھیلی ہی تھی کہ مقررین نے طلبہ کا رخ ان مخالفین کی طرف پھیر دیا، سارے طلبہ دوڑ پڑے افواہ محض افواہ تھی حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، وہ مخالفین ہاتھ آگئے تو انھیں بعض کمروں محصور میں کردیا، پھر افواہ گرم ہوئی کہ باہر سے لوگ بلائے گئے ہیں وہ دارالعلوم میں داخل ہوکر اس تحریک کو فیل کریں گے، بس یہ سننا تھا کہ دارالعلوم کے تمام گیٹ بند کرادیئے گئے، اور دربانوں کی چھٹی کردی گئی، ان کی جگہ پر طلبہ کی ڈیوٹی لگادی گئی، دوشنبہ کے دن مطبخ کے ملازمین نہیں آئے، اتنی بڑی تعداد کو کھانا کھلانا ایک مسئلہ تھا ہم لوگوں نے طلبہ سے چندہ کیا، اور چاول دال بازار سے منگوا کر کھچڑی پکوائی، اور دوپہر کا کھانا شام کو تین چار بجے بقدر ضرورت طلبہ کو ملا، یہ غلط ہے کہ طلبہ نے مدرسہ کی املاک کو نقصان پہونچایا، اگر یہی کرنا ہوتا تو تالا توڑ کر غلہ نکالا جاسکتا تھا، مگر اس کی طرف طلبہ نے رخ بھی نہیں کیا۔ طلبہ سے چندہ کیا گیا، اور بازار سے غلہ منگوایا گیا، اور البتہ مدرسہ کی لکڑی اور برتن باہر موجود تھے انھیں استعمال کیا گیا، چولھا استعمال کیا گیا۔

اس وقت حضرت مہتمم صاحب حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ دیوبند تشریف لا چکے تھے، دوسرے دن انھوں نے مطبخ کے ملازمین کو حسب معمول کھانا پکانے کے لئے بھیجا، یہ مہتمم صاحب کی شرافت تھی ورنہ دو وقت مطبخ کو اور بند کر دیتے تو طلبہ منتشر ہو جاتے، ان سب کارروائیوں کے لئے خفیہ ہدایات انھیں بزرگ طالب علم کے ذریعے سے پرچوں پر الٹے ہاتھ سے لکھی ہوئی مل رہی تھیں، سوفی صد یقین تھا کہ فلاں استاذ کی جانب سے یہ ہدایات آ رہی ہیں۔

فوری طور پر مجلس شوریٰ کی ہنگامی میٹنگ طلب کی گئی، حضرات ارکان بہت عجلت میں تشریف لائے، بچوں کی نادانی تھی کہ وہ اسے اپنا اور دارالعلوم کا مسئلہ سمجھ رہے تھے، حالانکہ اب یہ پوری ملت اسلامیہ ہند کا مسئلہ بن چکا تھا، مجلس شوریٰ بیٹھی تو طلبہ نے اپنے مطالبات کی لمبی چوڑی فہرست پیش کردی، لیکن صورت حال ایسی ہو چکی تھی کہ مطالبات کا مسئلہ تو بعد میں آتا پہلے اسٹرائیک ختم ہونی ضروری تھی اور طلبہ بضد تھے، کہ مطالبات پورے ہونے کا اعلان ہو تب تحریک واپس ہوگی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مہتمم صاحب اور ارکان شوریٰ نے بہت تحمل سے کام لیا طلبہ کو اپنا بچہ سمجھ کر انھیں سمجھانے کی کوشش کرتے رہے، مگر اس وقت وہ حال تھا کہ ؎

میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہیں

جب حلم وتحمل کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو بالآخر انتظامیہ نے پولیس کو بلایا اور مدرسہ کو طلبہ سے بزور وجبر خالی کرادیا اس وقت پولیس نے طلبہ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی اور نہ طلبہ ہی پولیس سے الجھے، پولیس کے آجانے کے بعد ہم لوگوں کو اندیشہ ہوا کہ اب معاملہ اور نہ بگڑ جائے اس لئے طلبہ کو عام ہدایت کی گئی کہ اپنا جو سامان لے سکتے ہوں لے کر خاموشی سے نکل جائیں، لیکن نکل کر جائیں کہاں؟ یہ سوال طلبہ کی قیادت کے لئے ایک بڑا امتحان تھا مشورے کے بعد اعلان کیا گیا کہ سب طلبہ عیدگاہ میں جمع ہو جائیں ظہر کے بعد کا وقت تھا عصر کی نماز عیدگاہ میں پڑھی گئی، عیدگاہ گھاسوں سے بھری ہوئی تھی طلبہ نے اسے صاف کیا

مغرب بھی وہیں پڑھی گئی، اب مسئلہ رات کے کھانے کا تھا ایک ہزار سے دو تین سو زائد طلبہ اس وقت رہے ہوں گے، اہل قصبہ نے تعاون کیا چاول اور دال منگوا کر کھچڑی ابالی گئی، اس میں رات کے بارہ بج گئے، عیدگاہ سے منتقل ہو کر طلبہ ایک محلّہ میں چلے گئے، کھانا وہیں پکا تھا کھانے میں رات کے تین بج گئے۔

یہی انتظام دوسرے دن دوپہر کو بھی ہوا، اب طلبہ منتشر ہونے لگے دارالعلوم کی جانب سے اعلان ہوا کہ جو طلبہ گھر جانا چاہیں انھیں سہولت دی جائے گی، اب یہ فوج ٹوٹ چکی تھی، قیادت نے شکست مان لی تھی، بہت تیزی سے طلبہ جانے لگے پھر ہم گنے چنے لوگ پٹھان پورے کی جامع مسجد میں چلے گئے۔ اس وقت بھی سو سے زائد طلبہ تھے بالآخر کوئی صورت نہ بن پڑی تو ہم لوگ بھی اپنے اپنے وطن کو روانہ ہوگئے، اب میرے سامنے اور مولوی طاہر کے سامنے مسئلہ تھا کہ ہم کہاں جائیں؟ جانے کیا سوچا گیا کہ ہم دونوں مئو مدرسہ مفتاح العلوم چلے گئے، شام کو پہونچے رات وہاں گزاری، طلبہ سے تعارف ہوا انھوں نے بڑی عزت کی لیکن صبح کو حضرت مولانا عبداللطیف صاحب علیہ الرحمہ نے ہم دونوں کو طلب کر کے سرزنش کی، اور مدرسے سے چلے جانے کا حکم دیا اللہ جانے توقع کی کون سی کرن تھی جو وہاں لے گئی تھی وہاں سے جب مایوسی ہوئی تو مولوی طاہر اپنے گھر کیلئے روانہ ہوگئے اور میں اپنے گھر چلا گیا۔

گاؤں پہونچا تو یہاں کا رنگ بدلا ہوا پایا، ہر طرف سے ملامت کے تیر، تحقیر کے بادل، نگاہیں گرم، لوگ بات کرنے کے روادار نہیں، ایک ہفتہ سے زائد حکومت کی تھی، اب غلاموں سے بدتر حالت تھی، سب کی نظر میں مجرم! گو بزعم خود ہم نے کوئی کارنامہ انجام دیا تھا میں ایک دو دن رہ کر اپنے محبوب مدرسہ احیاء العلوم چلا گیا، وہاں ناظم صاحب کو پتہ چلا تو مدرسہ میں آنے کی ممانعت کردی، میرا کچھ سامان ایک ٹرنک میں تھا، وہ ٹرنک مدرسہ کے باہر میری عدم موجودگی میں ڈلوا دیا میرے ایک رشتہ دار تھے وہ اسے اپنے گھر لے گئے اور مجھے اس کی اطلاع کی، میرا آنا جانا مدرسہ میں تو بند ہوگیا مگر قصبہ میں اور جامع مسجد میں

آمد و رفت رہی، بعض طلبہ مجھ سے ہمدردی رکھتے تھے انھیں کچھ دوسرے طلبہ نے بہت مارا پیٹا اس سے مدرسہ میں ایک بدمزگی پیدا ہوگئی مارنے والوں کا اخراج عمل میں آیا۔

میں نے قصبہ میں جانا ترک کردیا ایک روز میں کہیں گیا ہوا تھا، شام کو واپس آیا تو معلوم ہوا کہ مولوی طاہر حسین صاحب آئے ہوئے ہیں ان سے ملاقات ہوئی، وہ ایک ہفتہ تک میرے گھر رہے، روز مشورے ہوتے رہے کہ کیا کرنا چاہئے۔ دارالعلوم دیوبند سے ہندوستان کے تمام طول و عرض میں یہ بات مشتہر کردی گئی تھی کہ اس ہنگامے میں ۳۵ رطلبہ کا اخراج ہوا ہے، ان کی فہرست ہر مدرسے کو بھیج دی گئی، اس طرح پورے ملک میں ہم لوگوں کی شہرت بدنامی کے ساتھ ہوگئی، سرفہرست ہمیں دونوں کے نام تھے، اب تو کسی مدرسے میں داخلہ ممکن نہیں، میں کہتا اب خاموش بیٹھو، مولوی طاہر کہتے کہ نہیں کہیں نہ کہیں داخل ہوکر پڑھ لینا چاہئے ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے، ہفتہ بھر اسی موضوع پر بحث ہوتی رہی مولوی طاہر ہمت کے مضبوط اور بات کے دھنی ہیں، انھوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان کا ساتھ دوں، ہم نے بہت سوچا کہ وہ کون سا مدرسہ ہوسکتا ہے جو ہمیں اس جرم کے بعد بھی قبول کرلے، ندوہ تو ہو نہیں سکتا کیونکہ حضرت مولانا علی میاں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں، سرائمیر کے مدرسۃ الاصلاح پر نظر آکر جمی۔

☆☆☆☆☆

مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے چند دن

ہم دونوں ایک روز اٹھے اور سرائمیر مدرسۃ الاصلاح میں جاپہونچے مولانا بدرالدین صاحب علیہ الرحمہ اس وقت ناظم تھے، ان سے ملاقات ہوئی ان سے عرض کی گئی وہ ایک لمحے کیلئے سکتے میں آگئے، پھر فرمایا کہ آپ لوگ ٹھہریئے میں مشورہ کرلوں، انھوں نے چند گھنٹوں کے بعد ہمیں بلایا اور فرمایا کہ آپ لوگوں کا داخلہ منظور ہے بہت خوشی ہوئی، ہر جگہ کے راندے ہوئے جب ایک جگہ پناہ محسوس کریں تو اس وقت تشکر و امتنان اور خوشی و راحت کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی کوئی کیا بیان کرے۔

ہم لوگ گھر واپس آ کر ضروری سامان لے کر دوسرے دن مدرسہ میں حاضر ہو گئے اور تعلیم اور درس میں شریک ہو گئے، یہاں کا نصاب مختلف تھا، اندازِ درس الگ تھا، تہذیب و رہائش الگ تھی مگر ہمیں تو وقت گزارنا تھا، ہم لوگ سعادت مندی کے ساتھ درس میں حاضر ہوتے، طلبہ کو تکرار بھی کرانے لگے، ہم اپنے طریقہ پر تکرار کراتے تھے، چند دنوں میں ہم لوگوں کی ذہانت اور قابلیت کا سکہ جم گیا، مولوی طاہر حسین صاحب تو اردو کے ساتھ عربی بولنے کا بھی ملکہ رکھتے تھے، میں ان کی طرح عربی بول تو نہ سکتا تھا مگر عربی انشاء پردازی کا ملکہ تھا، مدرسہ میں ہم دونوں کا شہرہ ہو گیا، تقریر دونوں کر لیتے تھے، چنانچہ اس وقت کے ایک ابتدائی درجہ کے طالب علم مولوی محمد اشفاق صاحب بکھرا کے رہنے والے، اپنے گاؤں میں ہم دونوں کو لے گئے اور تقریر کروائی۔

سرائمیر میں ہم لوگوں نے دو ہفتے گزارے ان دو ہفتوں میں ہم لوگوں نے وہاں کے انگریزی ماسٹر سے جن کا نام محمد مسلم صاحب تھا اچھی خاصی انگریزی بھی سیکھ لی، میری انگریزی تو اس حد تک ہو گئی تھی لغت کی مدد سے میں انگریزی کی ہلکی پھلکی کتابیں حل کر لیتا تھا، ہم لوگ وہاں کے ماحول میں اجنبی تھے مگر آہستہ آہستہ اس میں ڈھل رہے تھے دو ہفتے ہونے ہی والے تھے کہ مجھے ایک بڑا پھوڑا ٹھیک بیٹھنے کی جگہ پر نکل آیا، تکلیف بہت شدید تھی، مولوی طاہر حسین صاحب مجھے لے کر گھر آ گئے، پھر وہ واپس چلے گئے میں پانچ دن تک بستر پڑا رہا اور پڑے پڑے مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا، اور مستقبل کے بارے میں سوچتا بھی رہا، علامہ اقبال اور اقبال سہیل کی کلیات زیادہ تر مطالعہ میں رہتیں، یہ دونوں عزم و ہمت، اور حوصلہ و ولولہ کے شاعر! میری طبیعت بھی عزم و حوصلہ سے معمور ہوتی رہی، گو کہ ہم لوگ آسمان سے گرے تھے، مگر بازوئے پرواز میں کمزوری کا احساس نہیں تھا، چھ دن میں زخم ٹھیک ہو گیا، جاڑے کی شروعات تھی میں نے ایک کمبل لیا، اور والد صاحب سے رخصت ہو کر سرائمیر چلا۔

بچے کی زبان سے نصیحت

میں گھر سے نکل کر پاس ہی گاؤں کے مدرسے کے عقب سے گزر رہا تھا وہاں چند

چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے، مجھے دیکھ کر ایک نے دوسرے بچے سے اپنی زبان میں پوچھا، انھیں پہچانتے ہو؟ دوسرے نے کہا ہاں یہ دیوبند پڑھتے تھے وہاں جھگڑا کیا، تو نکال دیئے گئے، پہلے نے کہا اگر جھگڑا نہ کئے ہوتے تو نہ نکالے گئے ہوتے، یہ بات سنی تھی کہ میری آنکھوں سے آنسو ابل پڑے، دل تو زخمی تھا ہی، خون نکلنا چاہئے تھا لیکن وہ خون ہی تو ہوتا ہے جو پانی بن کر آنکھوں کی راہ سے بہتا ہے، توبہ کرتا رہا اور عزم کرتا رہا کہ اب کبھی جھگڑا نہ کروں گا، اور قدم آگے بڑھتے رہے نہ آنسو رکے اور نہ قدم ٹھہرے، محمد آباد پہونچا تو میرے بزرگ حاجی محمد طاہر صاحب مرحوم جو دور کے رشتے سے میرے خالو ہوتے تھے ہنگامے کے بعد گھر رہنے کے دوران دو ہی تین بزرگ تھے، جو حقیقت میں میرے ساتھ محبت اور ہمدردی کا برتاؤ کرتے تھے، ان میں حاجی محمد طاہر صاحب بھی تھے بلکہ یہ میرے اوپر غیر معمولی شفقت رکھتے تھے وہ ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے میں نے انھیں سلام کیا انھوں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ میں نے بتایا کہ سرائمیر مدرسۃ الاصلاح میں پڑھ رہا ہوں، انھوں نے انتہائی شفقت کے لہجے میں کہا ہاں بیٹا جاؤ پڑھو! اس جملے پر پھر آنکھیں ابل پڑیں، دل کا زخم چمک اٹھا، دل کا زخم لئے ہوئے میں مدرسہ میں حاضر ہو گیا شام ہو گئی تھی، پہونچتے ہی میں نے مولوی طاہر حسین صاحب کے متعلق پوچھا معلوم ہوا کہ وہ آپ کو گھر پہونچا کر آئے اور دوسرے دن دیوبند چلے گئے، یہ سنتے ہی میری طبیعت کے قدم بھی اکھڑ گئے میں نے بھی دل میں طے کر لیا کہ کل دہرہ ایکسپریس سے چلا جاؤں، اس وقت دارالاقامہ کے نگراں جو صاحب تھے انھیں میں نے درخواست دی، ناظم صاحب موجود نہ تھے اور جیب کو دیکھا تو دیوبند تک کرایہ میں پانچ روپئے کی کمی تھی، ایک طالب علم نے مجھے وہ بطور قرض دیئے، میں دوسرے دن صبح شاہ گنج پہونچ گیا اور دیوبند کا ٹکٹ لینے کے بعد میرے پاس پچاس پیسے بچ رہے، ڈیڑھ بجے گاڑی آئی اور میں اس پر بیٹھ گیا، اور جانے راستے میں کہاں رکا یا کیا بات ہوئی میں دوسرے دن رات کو بارہ بجے دیوبند اسٹیشن پر اترا، ابھی پچاس پیسے میری جیب میں تھے، ہلکی ٹھنڈک شروع ہو گئی تھی ایک رکشے پر بیٹھا اور سیدھے

پٹھان پورے کی جامع مسجد میں آ گیا رکشے والے کو وہ پچاس پیسے میں نے دیئے اس نے بغیر چوں وچرا کئے لے کر رکھ لئے اور چلا گیا۔

دیوبند میں

میرا قیام مستقل جامع مسجد میں ہوگیا، مولوی طاہر صاحب بھی وہیں تھے، بعد میں انھیں ایک نابینا کتب فروش حافظ محمد علی صاحب اپنے گھر لے گئے، میں جامع مسجد میں رہ پڑا، اس وقت جامع مسجد کے امام مولوی مظہر عالم مظفر پوری (اس وقت کے مولوی مظہر عالم صاحب اب مدرسہ عزیزیہ میرا روڈ بمبئی کے مہتمم مولانا مظہر عالم صاحب ہیں) تھے وہ دارالعلوم سے دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے کسی اور شعبے میں زیر تعلیم تھے اور اس کے موذن مولوی سمیر الدین تھے مولوی مظہر عالم صاحب مسجد کے کمرے میں رہتے نہیں تھے، مولوی سمیر الدین رہتے تھے کمرہ خاصا بڑا تھا، بڑی خوشی سے مجھے بھی وہیں رہنے کی اجازت دیدی، دوایک وقت مہمانی کی اور مجھے کھلایا اس کے بعد میں کھانے کے وقت وہاں سے نکل جاتا کئی وقت فاقے میں گزر گئے بعض طلبہ کبھی کبھی ہوٹل میں چائے پلا دیتے جب زیادہ تنگ ہوا تو اپنے محبوب اور بے تکلف ساتھی مولوی عامر مبارک پوری (مولوی محمد عامر مرحوم مبارک پور کے زمانے سے میرے بہت مخلص اور محبوب ساتھی تھے، فراغت کے بعد کچھ دنوں جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے نائب ناظم بھی رہے، غالباً ۱۹۸۳ء میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون) سے میں نے قرض مانگا، ان کا بھی اس وقت ہاتھ خالی تھا، صرف چھ روپئے تھے انھوں نے وہ مجھے دیدیئے تب میں نے شکم سیر ہوکر کئی دن کے بعد کھانا کھایا، دارالعلوم کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ تھی، نماز پڑھنے دارالعلوم کی مسجد میں جاسکتے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد مولوی عزیز الرحمٰن (ان کا بھی اخراج ہوا تھا اب یہ بمبئی کے مفتی ہیں) فتح پوری بھی آ گئے پھر آہستہ آہستہ کئی ایک جمع ہو گئے مولوی عزیز الرحمٰن صاحب تو میرے ساتھ جامع مسجد پٹھان پورے میں رہے اب ہم لوگوں کی مجلس جمنے لگی، امتحان سالانہ کا وقت آیا تو میں نے ہدایہ اخیرین کا تکرار بھی کرایا یہ تکرار مدنی مسجد میں ہوتا تھا۔

گھڑی بیچی

عامر سے لیا ہوا روپیہ کتنے دن کام دیتا پھر فاقہ مستی شروع ہوگئی، میرے پاس ایک پرانی گھڑی ''ٹیٹونی'' کی تھی ایک طالب علم سے میں نے کہا اسے خرید لو اس نے ساٹھ روپئے میں خرید لی، تیس روپئے میں نے اپنی جیب میں ڈالے اور تیس روپئے ایک طالب علم کو معتمد سمجھ کر دیدئے کہ جب ضرورت ہوگی لے لوں گا، اطمینان تھا کہ پندرہ بیس دن کا خرچ چل جائے گا، اس سے فاقہ ٹوٹا لیکن وہ طالب علم تیس روپئے لے کر کہیں چلا گیا، اور واپس نہیں آیا، معلوم ہوا کہ وہ حفظ سے فارغ ہو چکا تھا آگے اسے پڑھنا نہیں تھا، کہیں جگہ کی تلاش میں چلا گیا، میں نے یہ تصور کر لیا کہ میری گھڑی تیس روپئے میں فروخت ہوئی۔

حافظ (قاری) شبیر احمد صاحب نابینا

دار العلوم دیوبند کی اسٹرائیک کے طوفانی ہنگامے نے گو بہت کچھ برباد کیا، بہت سی امیدوں اور آرزوؤں پر پانی پھیرا، کتنے حوصلوں کو سرد کیا اور ولولوں کو بجھایا، مگر جس طرح سیلاب کی تیزی کھیتوں کو تباہ اور آبادیوں کو ویران کرتی ہے، لیکن بسا اوقات بنجر زمینوں کو زرخیز مٹی سے مالا مال بھی کر دیتی ہے، پانی کی طغیانی بہت کچھ چھینتی ہے تو بعض اوقات کچھ بیش قیمت چیزیں بھی دامن ارضی میں ڈال جاتی ہے، اسی طرح اسٹرائیک کی ہنگامہ خیزی اور شرر باری نے جہاں دل کی دنیا زیر وزبر کی اور حوصلوں اور عزائم کے سرمایہ کو نذر آتش کیا، وہیں وہ کچھ متاع بیش قیمت بھی دیتی گئی۔

یہی وہ دور تھا، جب میری ملاقات، میری خوش قسمتی نے ایک ایسے گوہر آبدار سے کرائی جس سے رشتۂ اخوت ومحبت جو اس وقت استوار ہوا تو اب تک اس میں کوئی ضعف وشکستگی نے راہ نہیں پائی، بلکہ مزید سے مزید تر پختگی اور مضبوطی ہوتی گئی۔

یہ ہیں میرے دوست، میرے محسن، میرے ہمدرد وغمخوار، میرے رفیق وہم نشین جناب مولانا حافظ قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی مدظلہ! ناظم مدرسہ اسلامیہ شکرپور، بھروارہ

ضلع دربھنگہ، بہار، اللہ تعالیٰ انھیں سلامت باکرامت رکھے۔

ہوا یہ کہ دارالعلوم دیوبند پہونچنے کے بعد دربھنگوی طلبہ میں پہلے مولانا ابراراحمد (امام وخطیب جامع مسجد باقر گنج لہیریاسرائے، دربھنگہ) سے میری شناسائی ہوئی، انھوں نے مولانا بدرالحسن صاحب دربھنگوی سے ملاقات کرائی، ان دونوں سے کبھی کبھی حافظ شبیر احمد صاحب کا تذکرہ سنتا تھا، مگر وہ حفظ وتجوید کے طالب علم تھے اس لئے کوئی خاص توجہ نہیں ہوئی، اسٹرائیک کا ہنگامہ جب شروع ہوا، تو یاد نہیں کس تقریب سے مولانا ابراراحمد صاحب نے یا مولانا بدرالحسن صاحب نے قاری صاحب سے ملاقات کرائی، میں ایک ایسے شخص کی زبان سے جو نابینا تھا، اور درجۂ حفظ وتجوید کا طالب علم تھا، بہترین، شستہ شگفتہ اور فصیح وبلیغ نیز معلومات سے لبریز گفتگو سن کر چونک گیا، میں بہت متاثر ہوا لیکن اس طوفان بلا کے اضطراب اور اس کی وحشت میں زیادہ دیر تک ملنے اور بار بار ملاقات کا موقع نہ پاسکا۔

پھر جو کچھ ہوا لکھ چکا ہوں، اخراج ہوا، کچھ دنوں گھر پر رہا، پھر مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں داخلہ لیا، پھر طبیعت گھبرائی اور وہاں سے اکھڑا، تو چاروناچار دوبارہ دیوبند کی سرزمین پر گرا۔ دیوبند میں پٹھان پورے کی جامع مسجد مستقر قرار پائی، مگر ذہن ودماغ جو کتاب اور علم کا جویا تھا اسے تلاش تھی، اس آبِ زُلال کی، جس سے علم کی پیاس کی تسکین ہو، دارالعلوم میں داخل ہونا اور اس کی درسگاہوں سے فیضیاب ہونا ممکن نہ تھا، اساتذۂ دارالعلوم کو ہم گنہگاروں سے جو وحشت ہوگئی تھی وہ سد سکندری بن کر استفادہ سے مانع بنی ہوئی تھی، دارالعلوم کے طلبہ بھی خوفزدہ تھے کہ ہم لوگوں سے ملاقات کا جرم ثابت ہوگیا تو ان کے لئے تازہ خطرہ پیدا ہوسکتا ہے، پرانے شناسا نگاہ بچالینے میں عافیت سمجھتے، چندروز بےکاری میں اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتا رہا، مگر اس کا بھی ذوق نہ تھا، آوارہ گردی بھی فاقہ مستی بھی، اپنوں کا اعراض بھی غیروں کی شماتت بھی، ایک عجیب کش مکش میں جان مبتلا تھی، اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ از خود یا کسی کے توجہ دلانے سے مجھے حافظ شبیر احمد صاحب یاد آئے، میں

نے انھیں تلاش کیا، میری خوش بختی تھی کہ حافظ صاحب اس وقت دارالعلوم کے دارالاقامہ میں مقیم نہ تھے، دیوبند کے محلّہ گدی واڑہ کی ایک عمارت ''ظہیر منزل'' میں فروکش تھے، یہ ایک دومنزلہ عمارت کئی کمروں پر مشتمل تھی، ان کمروں میں دارالعلوم کے طلبہ معمولی کرایہ دے کر رہتے تھے، اسی کے ایک کمرے میں حافظ صاحب سے ملاقات ہوئی۔

قاری صاحب سے مل کر خوشی ہوئی اور اطمینان بھی ہوا، قاری صاحب کو بھی مجھ سے وحشت نہیں ہوئی، اس کی مزید خوشی ہوئی، یہاں سے ہم دونوں کی رفاقت کا آغاز ہوا۔

قاری صاحب ذہانت وذکاوت کے پیکر اور قوتِ حافظہ کے شاہکار تھے، آنکھوں سے معذور ہونے کی وجہ سے انھیں مطالعہ کے لئے ایک مددگار کی ضرورت تھی، اوقات درس میں درسگاہ کی حاضری، اسباق یاد کرنے کے لئے کافی تھی۔ قرآن حفظ کرنے کی یہ کیفیت تھی کہ ایک بار استاذ نے آیت آیت پڑھادی، دوبارہ کسی ساتھی سے سن لیا، پھر سہ بارہ پوچھنے کی ضرورت نہ دہرانے کی حاجت! حافظہ کے خزانے میں لفظ لفظ محفوظ ہوتا، جب چاہتے پڑھ لیتے، سنادیتے، مجھ سے جب ملاقات ہوئی، تو غالباً حفظ کی تکمیل ہوچکی تھی، تجوید پڑھ رہے تھے، اوقات درس کے بعد وہ دوسری کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہتے، مجھ سے پہلے اس سلسلے میں کون معاون تھا، اس کا علم مجھے نہیں، مگر جب میں ان کی خدمت میں پہونچ گیا تو چونکہ بالکل فارغ تھا، نہ تو سبق پڑھنا تھا نہ کسی کام کی کوئی پابندی تھی، قاری صاحب درسگاہ سے فارغ ہوکر آتے تو میں ہمہ وقت ان کے ہمراہ ہوتا، پڑھنے کا شوق مجھے بھی تھا اور قاری صاحب بھی مطالعہ کے شیدائی تھے، میں پڑھتا اور قاری صاحب سنتے، حافظہ میرا بھی اچھا تھا، مگر اتنا نہیں جتنا ان کا تھا، ذہین میں بھی کہلاتا تھا، مگر قاری صاحب کی ذہانت کے پاسنگ بھی نہ تھا۔

دیوبند میں کتب خانوں کی بہتات ہے، ہم دونوں کسی کتب خانے پر جاتے، کتابوں کا انتخاب کرتے، خریدتے اور میں پڑھتا، وہ سنتے، درمیان میں قاری صاحب نکتہ آفرینیاں

کرتے، کبھی کتاب پر، صاحب کتاب پر، اس کے مضامین پر تبصرے کرتے، قاری صاحب کو بعض شاعروں کے دواوین وکلیات حفظ تھے، خاص طور سے دیوان غالب اور کلیات اقبال پر بہت عبور تھا، میں نے اقبال کو بہت پڑھا تھا، اور ان کا کلام سمجھتا بھی تھا۔ مگر غالب کے باب میں مَیں عاجز ہوجاتا تھا، قاری صاحب کو ان دونوں کے اشعار یاد بھی بہت تھے اور سمجھتے بھی خوب تھے، میرا حافظہ اشعار کے باب میں بہت کوتاہ ہے، اور قاری صاحب کا حال یہ تھا کہ طویل طویل نظمیں ایک بار سن لیتے اور دوبارہ من وعن دہرا دیتے۔ غالب کے علاوہ اکبرالہ آبادی، جوشؔ ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ، فراقؔ گورکھپوری کے اتنے اشعار انھیں یاد تھے کہ حیرت ہوتی، اس وقت رات دن کا مشغلہ یہی مشترکہ مطالعۂ کتب تھا!

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' کا ترجمہ ''ہماری آزادی'' انھیں صحبتوں میں متعدد بار پڑھی گئی، اور اس کے علاوہ کیا کیا کتابیں پڑھیں گئیں، چالیس بیالیس سال کے بعد کیا یاد رہیں گی؟

قاری صاحب کو مطالعۂ کتب کے بعد دو چیزوں کا اور ذوق تھا، ایک عمدہ چائے پینے کا! دوسرے صبح یا شام کو چہل قدمی کا، چائے کی پتی عمدہ سے عمدہ رکھتے، چائے کو دم دینے کے لئے ٹی۔ کوزی رکھتے، اسٹوپ اور برتن صاف ستھرا رکھتے۔ میں کتابیں پڑھنے کے ساتھ چائے کی خدمت انجام دیتا، مجھے خود چائے کا ذوق نہ تھا، مگر قاری صاحب کی خدمت میں رہ کر کچھ ذوق آشنا ہوگیا تھا، مجھے اسٹوپ چلانے، اس پر برتن رکھنے اور پکانے سے قطعاً مناسبت نہ تھی، دارالعلوم میں میں زمانۂ تعلیم میں چار شرکائے دسترخوان کے ہمراہ مجھے کبھی کبھی طباخی کا عمل کرنا پڑتا تھا، مگر اس طرح کہ ایک ساتھی مسلسل میرے ساتھ رہنمائی کے لئے ہوتا، اس طرح اسٹوپ جلاؤ، اس طرح اور اتنا پانی رکھو، اور اس طرح دیکھتے رہو، غرض مسلسل ہدایات کی روشنی میں مَیں کچھ پکا پاتا مگر بجز اسٹوپ جلانے کے اور کوئی سلیقہ نہیں آیا۔ قاری صاحب کے پاس رہ کر میں نے چائے بنانی سیکھی۔

چہل قدمی کا حال یہ تھا کہ نہایت صاف ستھرا لباس زیب تن کرتے، سر پر مولانا آزاد والی ٹوپی پہنتے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دور تک ٹہل آتے، راستے میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرتے رہتے، گفتگو کی زبان اتنی شستہ اور فصیح ہوتی، جیسے مولانا آزاد کا قلم چل رہا ہو، مولانا آزاد کی تحریر اور قاری صاحب کی تقریر، ہو بہو باہم دگر مشابہ ہوتی۔

قاری صاحب سال ڈیڑھ سال کے تھے کہ کسی بیماری کی وجہ سے بینائی زائل ہوگئی تھی، ان کے والد بمبئی میں رہتے تھے، ان کا بچپن بمبئی میں گزرا ہے، علاج بہت ہوا مگر کامیاب نہیں ہوا۔ آنکھوں کی معذوری نے غور وفکر کی راہ کھولی، پھر یہ راہ بھٹک کر فلسفہ کی طرف مڑ گئی، پھر شک وارتیاب کی دلدل نے ان کے پاؤں پکڑے، جب میری ملاقات ان سے ہوئی تو یہ وساوس وشبہات کی وادی میں تہ وبالا ہو رہے تھے، اس وقت اندیشہ ہو رہا تھا کہ دین حق کے صراطِ مستقیم سے بھٹک کر کہیں وادیٔ ظلمات میں جا نہ نکلیں، لیکن روشنی کی ایک شعاع نے انھیں ادھر ادھر ہونے نہ دیا، وہ یہ کہ انھیں قرآن کریم سے بہت محبت تھی، قرآن یاد بھی بہت اچھا تھا، اسی محبت نے انھیں راہِ حق پر مضبوط رکھا، ورنہ ذہانت کی جو تیزی انھیں حاصل تھی قدم کا بہک جانا کچھ بعید نہ تھا، لیکن اللہ نے فضل فرمایا، اس کی جستہ جستہ تفصیلات آگے بھی آئیں گی۔

ان دنوں قاری صاحب اپنے بعض احباب کو بہت اہتمام کے ساتھ خطوط لکھواتے تھے، بازار سے عمدہ سے عمدہ کاغذ خطوط لکھنے کے لئے لاتے، پھر فرماتے لکھو، کاتب قلم کاغذ لے کر بیٹھ جاتا، کاتب میں ہی ہوتا، ان کی زبان پر فصاحت وبلاغت کا فرشتہ بولتا رہتا اور میں قلم بند کرتا چلا جاتا، الفاظ، معلومات، برجستہ اشعار، برمحل فقروں کا ایک سیل رواں ہوتا اور میں انھیں کاغذ پر سمیٹتا رہتا۔ قاری صاحب کے مکاتیب کو جمع کیا جاتا تو ''غبارِ خاطر'' کا ایک دوسرا جلوہ نگاہوں کے سامنے آجاتا، مگر اس وقت وہ طالب علم تھے اور مخاطب بھی طلبہ ہی تھے، میں نے ان خطوط کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا، مگر اللہ ہی جانتا ہے کہ کون مجھ سے مانگ کر لے گیا، اور اب تک واپس نہیں کیا، میں نے بہت تلاش کیا، مگر کہیں پتہ نشان نہ ملا۔

قاری صاحب نے بھی قلم رکھ دیا ہے، اور زبانی مخاطبہ پر اکتفا کرتے ہیں، حالانکہ اگر وہ لکھیں تو ادب عالیہ کا شہ پارہ وجود میں آئے۔

میں کہہ سکتا ہوں کی ان کی ذہانت وذکاوت کے بعد کسی کی ذہانت کا میرے اوپر اثر نہیں پڑا، ان کا ذکر میری کہانی میں بار بار آئے گا کیونکہ وہ جب سے میری زندگی میں داخل ہوئے کبھی ان سے تعلق میں کمزوری نہیں آئی، میں کہیں رہا ہوں وہ کہیں رہے ہوں ہم دونوں ہمیشہ قریب رہے، اب بھی ان سے تعلق ومحبت کا وہی رنگ ہے جو پہلے تھا بلکہ اور گہرا اور مزید پختہ!

دارالعلوم کے سالانہ امتحانات ہوگئے، چھٹی ہوگئی، طلبہ اپنے اپنے وطن چلے گئے، مگر جو چند نفوس مدرسے سے باہر کردیئے گئے تھے وہ کہاں جاتے؟ وہ خاک دیوبند سے چمٹے رہے، حافظ صاحب بھی کہیں نہیں گئے حالانکہ وہ رمضان شریف میں تراویح پڑھانے کہیں جاتے تھے، مگر میرا خیال ہے کہ اس رمضان میں میری وجہ سے وہ کہیں نہیں گئے، رمضان میں حافظ صاحب نے کسی نئے حافظ کے پیچھے تراویح کی سماعت کی، میں مدنی مسجد میں تراویح پڑھتا رہا، جہاں مولانا ارشد میاں اور مولانا قاری محمد عثمان صاحب تراویح پڑھاتے تھے، دس رکعت میں ایک پارہ ایک صاحب، پھر وہی پارہ دوسری دس رکعت میں دوسرے صاحب!

عید کی نماز دیوبند کی وسیع وعریض عیدگاہ میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب اقتداء میں ادا کی گئی، بہت بڑا مجمع تھا ایک تو عیدگاہ خود بہت بڑی لیکن عیدگاہ کے باہر خالی زمینوں اور کھیتوں میں اس سے زیادہ لوگ تھے، جتنے عیدگاہ میں تھے۔

عید کی نماز میں ایک لطیفہ

ہم چند طلبہ عیدگاہ میں ذرا سویرے پہونچے، ٹھیک امام کے مصلے کے قریب صف اول میں جگہ مل گئی، پھر لوگ آتے گئے اور عیدگاہ بھرتی گئی نماز کا وقت ہوتے ہوتے عیدگاہ بھی بھر گئی اس کے آس پاس کی خالی زمینیں بھی بھر گئیں، متعدد اکابر علماء موجود تھے، دیوبند میں اس وقت امامت کیلئے شخصیت کا انتخاب موذن کیا کرتے تھے، وہ جن بزرگ سے درخواست کرتے وہ امامت کیلئے آگے بڑھتے، جمعہ میں بھی یہی دیکھا، عید کی نماز میں بھی یہی دیکھا۔ موذن نے

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سے درخواست کی قاری صاحب مصلیٰ پر تشریف لائے، عیدگاہ کا ممبر بہت اونچا اور بہت وسیع وعریض تھا، اس کے اوپر چھ مکبروں کی صف لگی مجمع چونکہ بہت بڑا تھا اس لئے یہ سب مکبر بیک وقت تکبیر پکار رہے تھے اس وقت نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا عام رواج نہ تھا نماز شروع ہوئی پہلی رکعت خیریت سے گزر گئی دوسری رکعت میں قرأت کے بعد ۳؍ تکبیرات زائدہ کہی گئیں، اس کے بعد رکوع کی تکبیر کہہ کر رکوع میں جانا تھا حضرت مہتمم صاحب کو سہو ہوا، وہ سجدے میں چلے گئے ہم لوگ قریب تھے، ہڑبڑا کر ہم لوگ بھی سجدے میں چلے گئے لوگوں نے لقمہ دینے کوشش کی لیکن ممبر کے اوپر جو مکبر تھے، ان کی بلند آواز میں کسی کو کچھ احساس نہ ہوا، مکبر تکبیر کہہ رکوع میں چلے گئے، حضرت نے جب سجدے سے سر اٹھایا تو **اللہ اکبر** کہا، مکبروں کو ایک لمحہ جھٹکا لگا کہ بجائے **سمع اللہ لمن حمدہ**‘ کے یہ تکبیر کیسی؟ لیکن انھوں نے بلا توقف **ربنا لک الحمد** پکار دیا، اب مہتمم صاحب دوسرے سجدے میں گئے لیکن مکبرین اور ان کی آواز پر اقتدا کرنے والے پہلے سجدے میں پہونچے، حضرت دوسرے سجدے سے اٹھ کر تشہد پڑھنے لگے اور کچھ دیر کے بعد سلام پھیرا۔ سلام کا پھرنا تھا کہ ایک شور اٹھا کہ ایک ہی سجدہ ہوا، ہم لوگ کہہ رہے تھے کہ رکوع نہیں ہوا، خیر نماز پھر پڑھی گئی، لیکن اس واقعہ سے رسول اللہ ﷺ کی نماز کسوف کی مختلف روایات کے درمیان بعض علماء نے جو توجیہ کی ہے اس کا سراغ ملتا ہے، نماز کسوف آپؐ نے بہت طویل قرأت کے ساتھ ادا کی تھی اس کا رکوع بھی بہت طویل کیا تھا، اس رکوع کے بارے میں متعدد روایتیں ہیں کسی روایت میں ہے کہ آپ نے دو رکوع کیا کسی میں ہے کہ تین رکوع کئے اس سلسلے میں یہ توجیہ بھی کی گئی ہے کہ چونکہ رکوع بہت طویل تھا، اتنا طویل رکوع عموماً ہوتا نہیں تھا، اور مجمع بڑا تھا تو پیچھے سے کسی کو شبہ ہوا ہوگا، اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی ہوگی، اس کے پیچھے اور اغل بغل والوں نے اسے اٹھتے دیکھ کر سمجھا ہوگا کہ اب رکوع پورا ہوا، پھر وہ لوگ بھی کھڑے ہو گئے اس طرح پیچھے تک کھڑے ہونے کا سلسلہ قائم ہو گیا مگر پہلے شخص نے جب دیکھا ہوگا کہ اگلی صفیں رکوع ہی میں ہیں، تو وہ بھی جھک گیا ہوگا، اسے جھکتے دیکھ کر سب لوگ جھک گئے ہوں گے، اس طرح

ان کے دو رکوع ہو گئے اور آگے والوں کا ایک رکوع ہوا، یہ توجیہ بہت قابل قبول نہیں ہے، لیکن عیدگاہ کے اس واقعہ سے اس کا امکان تو ظاہر ہوتا ہے، ابھی حال تک اس کے بارے میں مَیں نے بعض شرکاء سے سنا کہ ایک سجدہ ہوا تھا، میں نے کہا کہ نہیں رکوع نہیں ہوا تھا، روایتوں میں اس طرح اختلاف ہو جانا کچھ بعید نہیں۔

دیو بند میں میرے کھانے کا انتظام

میری فاقہ مستی کا سلسلہ گھڑی بیچنے کے بعد موقوف ہو گیا، مسجد کے موذن حافظ سمیر الدین نے محلّہ کے ایک بااثر اور مخیّر بزرگ عبدالوہاب خان سے شاید میرے متعلق ذکر کیا انھوں نے کہا کہ میرے چھوٹے بیٹے عبدالرؤف کو قرآن پڑھا دیا کریں اور کھانا میرے گھر کھا لیا کریں، سمیر الدین نے اس بات کی اطلاع مجھے کی میں نے کہا میں ضرورت مند تو ہوں مگر کسی کے گھر جا کر ٹیوشن پڑھانا علم کی غیرت کے خلاف ہے، اور گھر جا کر اس کے معاوضے میں کھانا کھانا میری غیرت کے خلاف ہے اس لئے مجھے یہ معاملہ منظور نہیں ہے، سمیر الدین نے اصرار کیا کہ کوئی قابل قبول صورت بتاؤ میں معذرت کرتا رہا مگر سمیر الدین نے کسی طرح میری معذرت قبول نہیں کی، میں نے کہا بچہ یہیں مسجد میں آئے میں پڑھا دیا کروں گا اور کھانے سے معذرت ہی قبول کیجئے، انھوں نے کہا کھانا اس کا معاوضہ نہیں ہے، اگر ان کے گھر سے کوئی لا دیا کرے تو آپ قبول کر لیں گے یہ بطور ضیافت کے ہوگا، ان کے اصرار پر میں نے اسے قبول کر لیا، بچہ پڑھنے آنے لگا اور کھانا کبھی وہی لاتا کبھی کسی اور سے بھجوا دیتے اس کی تعلیم تو دو ہفتے کے بعد بند ہو گئی لیکن کھانا آنے کا سلسلہ قائم رہا، اس کی طرف سے انھوں نے مجھے بے فکر کر دیا، عبدالوہاب خان صاحب کا یہ احسان میری گردن پر ہے، فراغت کے بعد جب میرا دیو بند جانا ہوا تو میں ان کے گھر گیا ان کا انتقال ہو گیا تھا، عبدالرووف جوان ہو کر کام کاج میں لگ گیا تھا، میں نے بہت کچھ ہدئے تحائف اس کو پیش کئے، وہ بھی بڑی محبت سے پیش آیا مگر اس کے بعد نوبت نہ آئی، اللہ تعالیٰ عبدالوہاب صاحب کی مغفرت فرمائیں اور عبدالرووف کو اپنی رحمتوں سے نوازیں۔ آمین

دیوبند کی کچھ یادیں

(۱)

دیوبند کی طالب علمی مختصر رہی، لیکن یہ طلب علم کی سرمستی کا دور تھا۔ پڑھنے کا جنون تو مجھے بچپن سے تھا، لیکن اس وقت ایک چھوٹا اور محدود ماحول، تھوڑی سی محنت بھی بہت معلوم ہوتی۔ دیوبند آیا تو یہاں بڑا ماحول ملا، یہاں اگر کھلاڑی طلبہ تھے تو بہت سے محنتی اور جان کھپانے والے بھی تھے، ایک سے بڑھ کر ایک ذہین اور صاحب فہم وذکا، راتوں کو جاگنے والے، کتابوں میں سر کھپانے والے، ابتداء میں تو مجھے قدرے مایوسی ہوئی تھی، جیسا کہ لکھ چکا ہوں، لیکن مولوی ابرار احمد دربھنگوی کی رہنمائی میں اس مایوسی کا ازالہ ہوگیا، پڑھنے والے طالب علموں کو دیکھ کر میری ہمت کو مہمیز لگی، میں نے از سرنو عہد کیا کہ اپنی پوری طاقت اس راہ میں صرف کروں گا۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ درس کے بعد اوقاتِ درس میں جو وقت بچتا تھا، میں اس کا ایک ایک لمحہ کتب خانہ میں اور مطالعۂ کتب میں بسر کرتا تھا۔ ان دنوں میں نے تیز پڑھنے کی مشق کی تھی، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آدمی مطالعہ کرتا ہے، تو اس کی نگاہ پڑھتے وقت بار بار پیچھے پلٹتی ہے، اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب مطالعہ کرتے وقت قلب، نگاہ کے ہمراہ نہیں ہوتا، نگاہ آگے بڑھ جاتی ہے، اور دل غفلت میں پڑا پیچھے رہ جاتا ہے، تو جو کچھ نگاہ نے دیکھا وہ ذہن ودماغ کی گرفت میں نہیں آتا، اس لئے دل کو جہاں خلا کا احساس ہوتا ہے، وہ نگاہ کو پیچھے کی جانب پلٹا دیتا ہے، یہ حرکت معکوسی دل کی غفلت کی وجہ سے مسلسل ہوتی رہتی ہے، جس کا احساس آدمی کو نہیں ہو پاتا، اور مسلسل اس کی نگاہ آگے پیچھے ہوتی رہتی ہے، اس لئے مطالعہ کی رفتار سست ہو جاتی ہے، جیسے کوئی آدمی راستہ چل رہا ہو اور دو قدم چل کر ایک قدم پیچھے ہٹتا ہو، تو یقیناً اس کا سفر کھوٹا ہوگا، یونہی طالب علم کی نگاہ اور ذہن ودماغ ساتھ ساتھ نہیں

ہوں گے تو نگاہ کو بار بار پیچھے کی طرف پلٹنا ہوگا لیکن از بسکہ نگاہ بہت لطیف شے ہے، اس لئے اس کے پلٹنے کا احساس نہیں ہوتا۔

اس نکتے کی دریافت کے بعد میں نے نگاہ اور ذہن و دماغ دونوں کو ہمراہ رکھنے کی مشق کی، اس طرح ذہن کا استحضار بڑھا اور غفلت کم ہوئی، اس پر ابتداء میں بہت محنت اور توجہ کرنی پڑی، مگر آہستہ آہستہ قابو ملتا گیا اور نگاہ کا بار بار پلٹنا کم ہوتا گیا، پھر جب کبھی نگاہ پلٹتی تو مجھے اس کا ادراک ہو جاتا اور میں از سر نو تازہ دم ہو جاتا، اس طرح میرے مطالعے کی رفتار بہت بڑھ گئی، یہ ایک مشق ہوئی۔

دوسری مشق یہ کی، کہ ایک نگاہ میں کئی سطریں پڑھنی سیکھنے کا اہتمام کیا، عام طور سے مطالعہ دو طریقوں پر ہوتا ہے، بعض لوگ زبان سے پڑھتے ہیں، یہ طریقۂ عمل بہت طویل اور دیر طلب ہے، مطالعہ کرنے والے عموماً نگاہ سے مطالعہ کرتے ہیں، وہ اس طرح کہ ہر سطر پر علیحدہ نگاہ ڈالتے ہیں، اس طرح بائیس سطر کا صفحہ ہو تو بائیس نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے، میں نے ایک نگاہ میں دو سطریں پڑھنے کی مشق کی، یہ مشق مکمل ہوگئی، تو ایک نظر میں تین سطروں کو سمیٹا، اس طرح مشق بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ ایک نگاہ میں آدھا صفحہ پڑھنے کی مہارت حاصل کر لی، اس کے آگے نہیں گیا، البتہ ایک نگاہ میں آدھا صفحہ پڑھنے کی مشق خوب ہوگئی، پہلی مشق تو گھر اور مبارک پور میں کر لی تھی، یہ آخری مشق دارالعلوم کے کتب خانہ میں بیٹھ کر کی۔

مبارک پور کی طالب علمی میں ''حیاتِ شبلی'' پڑھی تھی، اس میں سیّد صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی کے

> ''مطالعہ کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی کتاب اول سے آخر تک نہ پڑھتے تھے، فرماتے تھے کہ اگر یہ طریقہ اختیار کروں، تو ایک ہی کتاب میں الجھ کر رہ جاؤں، بے ترتیبی کے ساتھ ادھر ادھر اوراق الٹتے پلٹتے رہتے تھے، اور نہایت سرعت کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے، لیکن بایں ہمہ کتاب میں جو بہترین معلومات ہوتیں، ان پر نگاہ پڑ جاتی، اور ان معلومات پر اس قدر حاوی ہو جاتے کہ کتاب پر

ریویو کرنے کے لئے بالکل تیار ہوجاتے۔ (حیاتِ شبلی، ص: ۵۹۹)

علامہ شبلی کے اس طریقۂ مطالعہ نے میرے لئے سرعتِ مطالعہ کی راہ ہموار کی۔

ہمدرد دواخانہ دہلی سے میرے بچپن میں ایک ماہانہ رسالہ بنام ''ہمدرد صحت'' شائع ہوتا تھا، اس کے ایک شمارے میں مطالعہ کی رہنمائی کیلئے ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا تھا، میں نے اسے پڑھا تھا، اس کے مضامین منتشر طور سے میرے ذہن میں تھے، اسی کی روشنی میں مَیں نے سرعت مطالعہ کی بنیاد ڈالی تھی، اس وقت ہر مضمون، ہر کتاب اور ہر رسالہ حرفاً حرفاً مکمل پڑھتا تھا، پھر ایک وقت آیا کہ جس مضمون پر نگاہ پڑتی، اس کا بڑا حصہ یا اس کا کوئی جزو ذہن وحافظہ میں محفوظ پاتا، پس حرفاً حرفاً پڑھنے کی حاجت باقی نہ رہی، ایک نظر ڈالتا اور ساری بات ذہن میں جگمگا جاتی، جیسا کہ علامہ شبلی نے فرمایا، واقعہ یہ ہے علامہ شبلی کا مطالعہ کے باب میں میرے اوپر بڑا احسان ہے، ان کی زندگی سے، ان کی کتابوں سے اور ان کے مقالات سے میں نے مطالعہ کرنا سیکھا، بات کو سمجھنا سیکھا، عمدہ طرز میں بیان کرنا اور لکھنا سیکھا، اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے۔

(۲)

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کے بعد عزم وہمت کا ایک نیا ولولہ پیدا ہوا تھا۔ مولانا وحیدالزماں صاحب کے قرب اور ان کی توجہ نے اس ولولہ کو دوآتشہ کردیا، میں اپنے چند ایک ساتھیوں کے ہمراہ تعلیم کے ایک نئے حوصلے کی تعمیر کررہا تھا، ایسے دو ساتھیوں کے نام اس وقت یاد آرہے ہیں۔ ایک مولانا مفتی عزیزالرحمٰن فتح پوری، اور دوسرے مولانا عبادالرحمٰن بلندشہری!

یہ دونوں الگ الگ ذوق ومزاج کے مالک تھے اور میری دونوں سے الگ الگ دوستی تھی، مولوی عزیزالرحمٰن فتح پور ہنسوہ کے رہنے والے، حضرت مولانا قاری سیّد صدیق احمد صاحب علیہ الرحمہ کے مدرسہ سے تعلیم حاصل کرکے اسی سال دیوبند میں داخل ہوئے تھے، یہ ترتیب کے اعتبار سے مجھ سے ایک سال آگے تھے۔ میں جلالین شریف کی جماعت

میں تھا اور یہ مشکوٰۃ شریف کی جماعت میں! ہم دونوں کا نقطۂ اتحاد حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کا صف ثانوی کا درس تھا، مولوی عزیز الرحمٰن کو بھی میری ہی طرح پڑھنے کا جنون تھا، بلکہ ان کا جنونِ مطالعہ مجھ سے بڑھا ہوا تھا، کیونکہ وہ بہت لاابالی مزاج کے تھے، جس کتاب اور موضوع میں لگتے انھیں گرد وپیش کا ہوش نہ رہتا، ان میں ایک ربودگی اور استغراق کی کیفیت تھی، ان کی بھی رفتار مطالعہ تیز تھی، وہ جسم اور دماغ کے لحاظ سے مجھ سے بہت مضبوط تھے، تھکنا جانتے ہی نہ تھے، جبکہ میں ان اوصاف سے محروم تھا، مجھے باوجود شوق مطالعہ کے استغراق بایدوشاید ہوتا تھا، میں بچپن سے کمزور اور مریض تھا، اس لئے تھک بھی جاتا تھا، اور ان میں مزید ایک خوبی یہ تھی کہ طبیعت بہت موزوں پائی تھی، طبیعت کی اس موزونی کے علاوہ ان کی ہر چیز غیر موزوں اور غیر مرتب تھی، نہ وقت کی کوئی پابندی تھی، نہ لباس میں کوئی ترتیب تھی، نہ اٹھنے بیٹھنے میں کوئی نظم تھا، بس طبیعت موزوں تھی اور ایسی موزوں تھی کہ بے ساختہ اشعار ڈھل ڈھل کر نکلتے تھے، نماز پڑھ رہے ہیں، سلام پھیرتے ہی جیب سے کاغذ قلم نکالتے ہیں، کیا ہوا؟ دوشعر ہوگئے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے بغیر کسی قید کے اشعار ڈھلتے تھے اور ایسے ویسے نہیں، بہت معیاری! اس درجہ زودگو شاعر میری نظر سے ابھی تک نہیں گزرا۔

ہم دونوں نے آپس میں طے کیا تھا، کہ رات کا بیشتر حصہ جاگ کر مطالعۂ کتب میں گزاریں گے، ساتھ رہیں گے مگر بات چیت نہ کریں گے، بس مطالعہ میں منہمک رہیں گے، چنانچہ ہم دونوں پوری پوری رات، بغیر گفتگو کے اور بغیر پیٹھ لگائے گزار دیتے تھے، ایک بار تو مسلسل دو ہفتہ مَیں رات میں نہیں سویا، اور وہ بھی رفیق بیداری رہے، صرف دو گھنٹہ دن میں کھانا کھانے کے بعد میں سوتا تھا، لیکن اللہ کا فضل تھا کہ نیند کا دباؤ کبھی نہیں ہوتا تھا، اس جاگنے کے لئے کچھ تدبیریں بھی کام میں لاتا تھا، کہیں پڑھا تھا کہ زیادہ پانی پینے سے زیادہ نیند آتی ہے، کیونکہ اس سے مزاج بلغمی ہوجاتا ہے، اور بلغمی مزاج والے کو نیند بہت آتی ہے، اور یہ بھی کہ زیادہ کھانے سے زیادہ پانی پینے کی ضرورت ہوتی ہے، میں نے اپنی طبیعت پر

پابندی لگائی اور کھانا کم کرنے کو سوچا تو روزہ کی راہ نظر آئی، رات کو جاگنے کا پروگرام تو تھا ہی، اخیر شب میں سحری کا انتظام کیا، اس انتظام میں مولوی عزیز الرحمٰن نے شرکت نہیں کی، مجھے اس کے لئے ایک رفیق کی ضرورت تھی کہ اخیر شب میں سحری کے لئے کچھ گرم کرنے کی ضرورت پیش آئی، تو میں کیا کروں گا؟ اسٹوپ چلانے اور کچھ پکانے سے میں بالکل کورا تھا، حق تعالیٰ کی مدد ہوئی، ایک دوست بے وہم وگمان مل گئے، یہ تھے مولوی عباد الرحمٰن بلند شہری بہت نیک اور متقی! نماز تلاوت کے بہت پابند، غالباً حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادی علیہ الرحمہ سے بیعت واصلاح کا تعلق رکھتے تھے، مولوی عزیز الرحمٰن کے واسطے سے ان سے ملاقات ہوئی، یہ دونوں ہم سبق تھے، میرا ان کا کسی سبق میں ساتھ نہ تھا، بہر حال ان سے عہد رفاقت باندھا گیا، ان کے پاس خاموش برنل کا اسٹوپ تھا۔ ہم دونوں سحری کے وقت اکٹھا ہوتے، وہ سالن گرم کرتے اور ہم دونوں سحری کھالیتے، میری مقدار سحری میں دار العلوم کی ایک تندوری روٹی تھی، طلبہ کو ایک وقت میں دو روٹیاں ملا کرتی تھیں، یہ ایک آدمی کیلئے کم نہ تھیں، اور پانی کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اس کی چھٹی کردی، ایک ہفتہ پانی پیتا ہی نہ تھا، صرف جمعہ کو احاطۂ مولسری کے کنویں کا پانی جو بہت ٹھنڈا اور عمدہ پانی ہے، ایک ڈیڑھ جگ پی لیتا تھا۔ اس طرزِ عمل سے جاگنے میں بہت مدد ملی، کتنا ہی جاگتا نیند کا غلبہ نہ ہوتا۔

ایک بار حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کی خدمت میں حاضر تھا، وہاں میرے بزرگ کرم فرما طالب علم مولانا عبد الوحید حیدر آبادی بھی موجود تھے، وہ دار العلوم کے ممتاز طلبہ میں تھے، جن کو مولانا نے صف اول کی تدریس کی ذمہ داری سونپ رکھی تھی، انھوں نے کسی تقریب سے مولانا سے عرض کیا کہ حضرت! آپ کے پاس یہ دو جن بیٹھے ہوئے ہیں، اور مولوی عزیز الرحمٰن اور میری طرف اشارہ کیا۔ مولانا نے تعجب کا اظہار کیا، انھوں نے مولانا کو بتایا کہ یہ دونوں کئی رات سے سوئے نہیں ہیں، مگر چہرے کی تازگی دیکھئے، ذرا بھی نیند کا اثر نہیں ہے۔

یہاں مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کی ایک یاد دل میں کھٹک رہی ہے، اور قلم سے ٹپکنے کیلئے بے قرار ہے۔ مولوی عزیز الرحمٰن نودرہ میں بیٹھے مشغول تھے اور میں کہیں اور تھا، رات کے دو بجے میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چلا، راستے میں نودرہ پڑتا تھا، انھیں دیکھا اکیلے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں، میں ان کے پاس چلا گیا۔ پوچھا کہ کیا کر رہے ہیں؟ بولے اشعار کہہ رہا ہوں، پھر کہنے لگے کہ آج فلاں رسالہ میں پڑھا ہے کہ فراؔق گورکھپوری ایک نشست میں دو دو سو شعر کہہ لیتا ہے، میں اپنی طبیعت کو آزما رہا ہوں، پھر کتنے شعر ہوئے؟ کہنے لگے دس بجے سے بیٹھا ہوں اور ڈھائی سو شعر کہہ چکا ہوں، میں نے کہا ماشاء اللہ! اور وہاں سے چلا گیا۔

ان کی برجستگی کا یہ حال اب بھی قائم ہے، گوکہ شعر کہنا اب بہت کم کر دیا ہے۔ اب وہ بمبئی میں رہتے ہیں اور وہاں کے معتبر صاحب فتویٰ ہیں، ایک روز ہم چند لوگ بھیونڈی میں فجر کی نماز پڑھ رہے تھے، میرے بوڑھے دوست حاجی عبدالاحد صاحب جو پان بہت کھاتے ہیں اور عطر بہت لگاتے ہیں، انھوں نے باریک کپڑے کا اپنا رومال بچھا رکھا تھا، اس پر پان کے دھبے بکثرت پڑے ہوئے تھے، اور خوشبو سے معطر بھی تھا۔ مولوی عزیز الرحمٰن نے اس پر سجدہ کیا اور سلام پھیرتے ہی ارشاد فرمایا کہ ؎

پان کے دھبوں سے بھی آتی ہے خوشبو عطر کی
مولوی عبد الاحد کی یہ کرامت دیکھئے

تعلیمی یکسوئی کی یہ داستان بہت لذیذ ہے، مگر اس کی مدت کم رہی، دارالعلوم دیوبند میں اس وقت تین امتحانات ہوتے تھے، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ! میری داستان ششماہی تک چل کر ختم ہوگئی، اس وقت مطالعہ کا وہ جوش تھا کہ آج میں اپنے طالب علموں کو دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہدایہ اخیرین حضرت مولانا اختر حسین صاحب علیہ الرحمہ المعروف بہ ”میاں صاحب“ پڑھاتے تھے، ان کا سبق ایجاز و اختصار اور برکت و کرامت کا

شاہکار تھا، مطلب بتانے میں وہ اتنے ہی کلمات بولتے تھے جتنے صاحب ہدایہ نے لکھے ہیں، مگر اتنے واضح اور آسان ہوتے تھے کہ بات ذہن نشین ہوجاتی تھی، ایک گھنٹہ پڑھاتے تھے مگر سبق خواہ کتنا ہی دشوار ہو چار صفحے پڑھا دیتے تھے، کبھی کبھی فرماتے کہ آج سبق عربی میں ہوگا اور پھر وہ ہدایہ کی عبارت کو طالب علم کی قرأت کے بعد خود پڑھ دیتے، مگر اس طرح پڑھتے کہ فہیم طلبہ کے لئے مطلب کھلتا چلا جاتا، مجھے ان کے سبق میں کبھی یہ شکایت نہیں ہوئی کہ فلاں بات یا فلاں دلیل سمجھ میں نہیں آئی، اسی لئے امتحان سہ ماہی میں مَیں نے اس کا باطمینان تکرار کرایا، حالانکہ ہدایہ اخیرین ایک مشکل ترین کتاب ہے، امتحان شش ماہی کا وقت آیا تو میں نے پروگرام بنایا کہ جس قدر کتاب ہوچکی ہے سب کا ایک مرتبہ اپنے طور پر مطالعہ کرلوں، پھر تکرار کے لئے بیٹھوں، اسباق ہنوز جاری تھے، جمعہ کے روز چھٹی ہوتی تھی، میں ایک جمعہ کو علی الصباح کتاب لے کر روپوش ہوگیا، اور متواتر پانچ گھنٹے تک ہدایہ اخیرین کا مطالعہ کرتا رہا، جب جمعہ کا وقت قریب ہوا تو میں اس کی تیاری کے لئے کمرے میں پہونچا، ساتھیوں نے غُل مچایا کہ کہاں غائب تھے، میں نے بتایا کہ ہدایہ پڑھ رہا تھا، کسی نے جل کر کہا کون سا تیر مار لیا؟ میں نے بھی اسی لہجے میں کہا کہ پانچ گھنٹے میں ۷۰؍ صفحے حل کرکے آرہا ہوں، سب نے تردید کی، کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا، مانا کہ تم کتاب سمجھتے ہو، مگر ہدایہ جیسی مشکل کتاب پانچ گھنٹے میں ۷۰؍ صفحے حل کرلو، ممکن نہیں؟ میں نے کہا ۷۰؍ صفحے میں جہاں سے چاہو پوچھ لو، اگر کہیں اٹک جاؤں تو تم سچے! مگر کسی نے ہمت نہ کی۔

مگر آہ! کہ تقدیر نہ تھی، نہ تکرار کرا پایا اور نہ امتحان دے سکا، بساط الٹ گئی، معاملہ درہم برہم ہوگیا، طبیعت پر وہ چوٹ پڑی کہ شیشۂ دل چور چور ہوگیا، پھر ان ریزوں کو اکٹھا کرنے اور جوڑنے میں مدت لگ گئی۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

(۳)

مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کے چھوٹے سے ماحول سے نکل کر جب دیوبند کے بڑے ماحول میں پہونچا تو اس سے متاثر ہوکر زندگی میں بعض خوشگوار تبدیلیوں کا خیال آیا، دینی ذوق گوکہ آغاز ہی سے تھا، مگر بچپن اور عنفوان شباب کی لااُبالیوں اور مختلف صحبتوں اور مشاغل نے اس میں سستی اور غفلت کا زنگ چڑھا دیا تھا، اس کا احساس کبھی کبھی ہوتا تھا، مگر پانی کے بلبلے کی طرح جلد ہی بیٹھ جاتا تھا، دارالعلوم دیوبند میں بعض نیک اور متقی طلبہ کو دیکھ کر اور ان کی صحبت میں رہ کر دینی ولولہ جاگا۔

ضلع بلندشہر کے ایک طالب علم مولوی عبادالرحمٰن سے میں خاص طور سے متاثر ہوا، ان سے تقریب ملاقات یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ صف ثانوی کے دو ساتھیوں مولوی عزیزالرحمٰن اور مولوی محمد اسلام دملوی (استاذ دارالعلوم وقف) کے واسطے سے ملاقات ہوئی۔ مولوی محمد اسلام انھیں کے کمرے میں رہتے تھے، اور مولوی عزیزالرحمٰن کئی کتابوں میں ان کے ہم سبق تھے، وہ بہت دیندار اور پرہیزگار تھے، طالب علمی کی شوخیوں سے دور، نوجوانی کی غفلت سے نفور، سنجیدہ اور متین طالب علم تھے، اوقات کے پابند، غلط صحبتوں سے گریزاں، مگر خوش مزاج، سبک روح، ان سے مل کر میرے اندر کی دینداری نے کروٹ لی، کسی سبق میں میرا ان کا ساتھ نہ تھا، مگر ان کی تدین وتقویٰ کی وجہ سے میں نے اپنے دل میں ان کی طرف بڑی کشش پائی۔ ان سے تعلقات اور دوستی کی بنیاد پڑ گئی، ان کی باتوں سے اور ان کی صحبت سے میرے اندر ایک خواشگوار تبدیلی آئی، شوخی کی جگہ سنجیدگی ومتانت، لاپرواہی کی جگہ نظم واہتمام، اور شرارت کی جگہ شرافت کا خیال دل میں جمنے لگا۔ چند دنوں کی رفاقت کے بعد ہم دونوں نے باہم یہ معاملہ طے کیا کہ جو کوئی دوسرے میں کوئی غلطی دیکھے، تو اسے ٹوک کر متنبہ کردے، شریعت کی اصطلاح میں **امر بالمعروف** اور **نہی عن المنکر** کا عہد باندھا گیا۔

ایک صاحب نے ہمارا یہ باہمی عہد سنا تو کہنے لگے، کہ دو دوستوں نے باہم اسی

طرح کا عہد کیا تھا، کسی نے ان میں سے ایک سے پوچھا کہ اس عہد کے بعد آپ لوگوں کا کیا حال رہا؟ وہ کہنے لگا کہ دو سال سے بات چیت بند اور تعلقات منقطع ہیں، انھوں نے اشارہ کیا کہ کہیں ایسا ہی حال آپ لوگوں کا نہ ہو، اور واقعہ یہ ہے کہ امر بالمعروف کو نباہ لینا تو نسبۃً آسان ہے، مگر نہی عن المنکر کو برداشت کر لینا ذرا مشکل ہوتا ہے، ٹوکنے والے کا لہجہ کیا ہوتا ہے؟ اس نے صورت حال پر صحیح گرفت کی یا کسی غلط فہمی میں وہ مبتلا ہوا؟ واقعی اسے اس غلطی کی تحقیق ہے، یا کسی کے کان بھرنے سے متاثر ہوا؟ وغیرہ بڑی نزاکتیں ہیں، ان نزاکتوں کی روشنی میں ہم نے برداشت وتحمل کا بھی عہد کیا، اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم دونوں اس پر برقرار رہے، تا آنکہ اس عہد کے ایک یا دو ماہ کے بعد وہ ہنگامہ ہوگیا، جس نے ہم دونوں کو الگ الگ راہوں پر ڈال دیا، انھوں نے فتنہ کی سنگینی اور حالات کا جوش وخروش دیکھا، اور مجھے پُرشور اجتماعیت کے طوفانِ بلاخیز میں گھرا ہوا پایا، نیز اس دوران وہ مجھ سے مل بھی نہ سکے کہ کچھ کہہ پاتے، تو انھوں نے خاموشی سے کنارہ کشی اختیار کر لی، پھر مجھے خبر نہ ہوئی میرا یہ مخلص ومہربان دوست اپنے کو چھپانے میں کہاں کامیاب ہوگیا، وہ مجھ سے بدرجہا بہتر ثابت ہوا، وہ حدیث کی ہدایت کے مطابق فتنہ مواج سے بالکل الگ تھلگ رہا، پھر ہنگاموں کی بلاخیزی میں وہ مجھ سے کہیں نہیں ٹکرایا۔ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مدرسہ خادم الاسلام ہاپوڑ میں مدرس ہے، میرے نزدیک وہ ایک عظیم انسان ہے، میری عقیدت ومحبت اس کے ساتھ ہے، گو کہ پھر کبھی ملاقات نہیں ہوسکی۔

دارالعلوم دیوبند میں روزہ رکھنے میں یہ میرے رفیق تھے، سحری یہ تیار کرتے، اور ہم دونوں اسے کھا لیتے، اس وقت کی صحبت بہت اچھی ہوتی، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

(۴)

اوپر میں مولوی عزیز الرحمٰن فتح پوری کا ذکر کر چکا ہوں، یہاں میں ان کا واقعہ لکھنا چاہتا ہوں، گو کہ وہ میری آپ بیتی نہیں ہے، لیکن ان کے اس واقعہ کا تاثر میرے اوپر بہت

گہرا ہے، اور جوں جوں مدت گزرتی جارہی ہے تجربہ بڑھتا جارہا ہے، اس کا تاثر بھی گہرا ہوتا جارہا ہے، میں اسے لکھتا ہوں اور طالب علموں سے سے نیز طالبان کمال سے امید کرتا ہوں وہ اسے یاد رکھیں گے۔

ہوا یہ کہ حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب علیہ الرحمہ جمعہ کے روز علی الصباح فرائض کی مشہور کتاب ''سراجی'' پڑھایا کرتے تھے، سراجی کا سبق ہفتہ میں ایک ہی دن ہوتا تھا، اس سبق کی جماعت بھی بہت بڑی تھی، میں اس سبق میں شریک نہ تھا، میں نے اگلے سال کے لئے اسے موخر کر رکھا تھا۔ ایک دن سبق کے بعد مولوی عزیز الرحمٰن سیدھے میرے پاس آئے، ان کا چہرہ قہر آلود ہو رہا تھا، میں دیکھ کر سمجھ گیا کہ کچھ معاملہ کر کے آرہے ہیں، میں نے بات پوچھی، کہنے لگے آج سراجی کے سبق میں ہنگامہ ہو گیا، اور ایک طالب علم سے تلخی پیدا ہوگئی، جس طالب علم کا انھوں نے نام لیا وہ شوخی وشرارت اور بے خوفی وانتقامی جذبے میں بدنام تھا، سب طلبہ اس کی شرارت سے ڈرتے تھے، میں ڈرا کہ کوئی فتنہ نہ ہو جائے، مگر مولوی صاحب مطمئن تھے، انھوں نے بتایا کہ آج سبق میں حضرت مفتی صاحب نے ایک مشکل مسئلہ سمجھایا، مسئلہ ذرا گنجلک تھا اور حضرت مفتی صاحب کو بہت واضح بیان پر قدرت نہیں ہے، لیکن انھوں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی، پھر طلبہ سے پوچھا تم لوگ سمجھ گئے، مذکورہ طالب علم نے جھٹک کر جواب دیا کہ کچھ نہیں سمجھے، حضرت نے پھر محنت کی، اور دوبارہ پوچھا کہ سمجھ گئے، اس نے پھر کڑک کر کہا خاک نہیں سمجھے، مفتی صاحب آزردہ ہو گئے، انھیں ایک دھکا سا لگا، چہرہ ان کا سرخ ہو گیا، پھر وہ سہ بارہ سمجھانا چاہ رہے تھے، مگر آواز متاثر تھی، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا حضرت! بالکل سمجھ میں آگیا، خوب اچھی طرح سمجھ میں آگیا، یہ جھوٹا ہے، شریر ہے وغیرہ، حضرت مفتی صاحب کا رنگ بدل گیا، خوش ہو گئے، پھر سہ بارہ نہیں سمجھایا، سب طلبہ کہہ رہے ہیں کہ یہ تمہاری جرأت کا انتقام لے گا، مگر مجھے پروا نہیں۔

میں نے ان کی ہمت پر آفریں کہی اور بہت شاباشی دی، ان کا حوصلہ بڑھایا، اس وقت ہم میں سے کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ عزیز الرحمٰن جیسے لاابالی اور بے ہنگم طالب علم سے علم اور دین کی کوئی خدمت بن پڑے گی، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ بڑے شاعر ہوجائیں گے، لیکن اس کے برعکس یہ بہترین مدرس اور معتبر مفتی ہوئے، بمبئی میں یہ فتویٰ کے مدار ہیں، اور خصوصیت کے ساتھ سراجی کے موضوع پر تو انھیں وہ کمال حاصل ہوا کہ وراثت کے بڑے سے بڑے حساب کو یہ منٹوں میں زبانی طور پر حل کرلیتے ہیں، سراجی تو انھیں نوکِ زبان ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی قلبی خوشی اور دعاؤں کا اثر ہے۔

(۵)

غالباً سہ ماہی امتحان گزر چکا تھا، دارالعلوم کے احاطہ میں آوازہ گونجا کہ اخبار الجمعیۃ کے جمعہ ایڈیشن کے ایڈیٹر وحید الدین خاں فلاں دن دارالعلوم دیوبند تشریف لارہے ہیں، میں مبارک پور کی طالب علمی کے عہد میں جمعہ ایڈیشن کا ذکر کرچکا ہوں، اور اس سے مجھے کتنی دلچسپی اور کتنا شغف تھا، لکھ چکا ہوں۔

وحید الدین خاں، ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے، جماعت اسلامی کے بہترین اہل قلم میں تھے، ان کی تحریر کا ایک اُسلوب اور آہنگ ہے، پڑھنے والا ڈوب جاتا ہے، اور نکلتا ہے تو تاثر میں ڈوبا رہتا ہے، کسی بھی مضمون کا آغاز وہ چونکا دینے کے انداز میں کرتے ہیں۔ زندگی کے روزمرہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج نکالنے کا انھیں ملکہ ہے، خاں صاحب ابتداءً جماعت اسلامی کے اہم ارکان میں تھے، مگر بعد میں جب اس کے بہت اہم اہم ستون جماعت اسلامی سے نکل کر بکھرنے لگے تو وحید الدین خاں کو بھی مولانا مودودی سے اختلاف ہوا، اور وہ بھی اس حلقہ سے باہر آگئے۔

غالباً ۱۹۶۶ء میں جمعیۃ علماء ہند کے اس وقت کے ناظم عمومی حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی علیہ الرحمہ انھیں اخبار الجمعیۃ کے ادارہ میں لے آئے، انھوں نے الجمعیۃ کا جمعہ ایڈیشن بڑی آب وتاب سے نکالا۔ اس وقت جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے یہ بالکل نئے انداز کی

آواز تھی، ہر جمعہ کو یہ رسالہ نو بنو اور فکر انگیز مضامین کے ساتھ طلوع ہوتا، اور لوگ بڑے ذوق وشوق سے اسے پڑھتے۔ میں ان دنوں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں طالب علم تھا، مجھے بڑی بے تابی سے اس کا انتظار رہتا، جمعہ ایڈیشن سنیچر کو مبارک پور میں پہونچتا اور میں اسے بتمام وکمال پڑھ لیتا، پھر ہفتہ بھر اس کے منتخب مضامین پڑھتا رہتا، دوسروں کو سناتا اور اسی انداز پر لکھنے کی مشق کرتا، میں وحید الدین خاں سے اسی جمعہ ایڈیشن کے واسطے سے واقف ہوا، اسی وقت معلوم ہوا کہ یہ صاحب پہلے جماعت اسلامی میں تھے اور اس سے نکل چکے ہیں، انھوں نے جماعت اسلامی سے نکلنے کے بعد ایک کتاب بھی ''تعبیر کی غلطی'' کے نام سے لکھی ہے، مبارک پور میں یہ کتاب مجھے نہ مل سکی تھی، دیوبند آکر میں نے آغاز تعلیم ہی میں اس کا مطالعہ کیا، بہر حال اس وقت وحید الدین خاں کے ساتھ بڑی جذباتی وابستگی ہو چکی تھی، ان کی ہر تحریر نوشتۂ تقدیر کی طرح پڑھتا تھا، ان کی ہر بات فکر ونظر کی شاہکار معلوم ہوتی تھی۔

معلوم ہوا کہ ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی نے انھیں دار العلوم آنے کی دعوت دی ہے، اور دار الحدیث (فوقانی) میں ان کا خطاب ہوگا، طلبہ بڑی عقیدت سے ان کے خطاب میں شریک ہوئے، اس وقت انھوں نے کیا کہا، اب یاد کہاں؟ ہاں اتنا یاد ہے کہ اخیر میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور عمل وکردار کی ضرورت کے متعلق کچھ کہتے ہوئے اچانک ان کی آواز بھرا گئی، اور آگے بولنے کے بجائے نا تمام جملوں پر بات ختم کرکے بیٹھ گئے، ان کے اس ڈرامائی انداز پر خطاب ختم کرنے کا وہ اثر ہوا کہ بیشتر طلبہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے، ان کے خطاب کا اتنا شدید اور گہرا تاثر ہوا کہ بہت دیر تک ہم لوگوں کی حالت بدلی سی رہی، لیکن

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

یہ چراغ جس تیزی سے روشن ہوا تھا، اسی تیزی سے بعد میں کالا دھواں پھینکنے لگا، اور فکر ونظر کی فضا اس دھویں کی آلودگی سے تاریک ہونے لگی، اور اب ''وحید الدین خاں''

کجروی اور گمرہی کی علامت بن کر رہ گئے ہیں۔

حضرت مولانا فخر الدین صاحب شیخ الحدیث کی خدمت میں

عید گزر گئی اب مدرسے کھلنے والے ہیں دار العلوم دیوبند میں داخلے کی گنجائش نہیں۔ ایک دن میں اور مولوی طاہر حسین جلال آباد حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت نے بہت محبت وشفقت کا برتاؤ کیا، مگر ظاہر ہے کہ داخلے سے وہ بھی معذور تھے۔ عید کے چند روز کے بعد ہم تین آدمی مولوی طاہر اور مولوی عزیز الرحمٰن اور میں، مراد آباد شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے درخواست کی گئی وہ کہیں ہم لوگوں کا داخلہ کرا دیں، شیخ نے فرمایا کہ امروہہ میں جامع مسجد کے مدرسے میں داخلہ کرا سکتا ہوں، سب خوش ہو گئے تھوڑی دیر کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ تمھارے بارے میں مبارک پور سے کچھ ایسی بات آئی ہے کہ تمھارا داخلہ نہیں کرا سکوں گا، میں نے دریافت نہیں کیا کہ وہاں سے کیا بات آئی ہے، اللہ کی مشیت سمجھ کر میں چپ ہو رہا۔ مدرسہ جب کھلا تو ہمارے کئی ساتھی جامع مسجد امروہہ میں داخل ہو گئے، مولوی طاہر حسین صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم بھی چلو بات چیت کی جائے گی مگر میری ہمت نہ ہوئی، میں نے دیوبند میں رہنا طے کر لیا، درسیات کو مطالعہ سے حل کرنے کا ارادہ تھا، بعض علماء نظر میں تھے ان سے مدد لینے کو سوچ رکھا تھا، حافظ شبیر احمد صاحب کی محبت اور رفاقت بہت قیمتی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد مولوی طاہر صاحب امروہہ سے دیوبند آئے انھوں نے کہا کہ میں مدرسہ کے مہتمم قاری فضل الرحمٰن صاحب سے بات کر چکا ہوں، تمھارا ابھی وہاں داخلہ ہو جائے گا، میں نے انکار کر دیا، انھوں نے اصرار کیا، اچھی خاصی بحث ہوئی مگر وہ اپنی بات منوانا چاہتے تھے، میں مانتا نہیں تھا، حافظ صاحب کو میں نے فیصل بنایا انھوں نے کافی دیر گفتگو کے بعد فیصلہ سنایا کہ آپ چلے جائیں چنانچہ میں تیار ہو گیا صبح فجر کے پہلے ٹرین سے ہم لوگ امروہہ کے لئے چل دیئے، ظہر کے بعد امروہہ پہونچ گئے، میں نے وہاں کی سب باتیں دریافت کرنے کے بعد پوچھا کہ وہاں دورۂ حدیث کا یہی ایک مدرسہ ہے

، یا کوئی اور بھی ہے، کہنے لگے کہ ایک اور مدرسہ ہے، مگر بہت چھوٹا ہے، یہ مدرسہ دار العلوم حسینیہ محلّہ چلّہ امروہہ ہے، اس میں دورۂ حدیث کے صرف دو طالب علم ہیں، اس کے شیخ الحدیث حضرت مولانا افضال الحق صاحب جوہر ہیں، مولانا کو میں پہلے سے جانتا تھا، میرے استاذ حضرت مولانا عبدالمنان صاحب کے استاذ ہیں، اسٹرائیک کے ہنگامے میں ان کی طرف سے بہت سے کلمات خیر ہم لوگوں کے حق میں صادر ہوئے تھے، ورنہ عموماً ہم لوگ کسی حسن ظن اور کسی کلمہ خیر کے مستحق نہیں تھے، اور ملامت کی گھٹائیں مسلسل گرج اور برس رہی تھیں۔

امروہہ میں

میں نے کہا کہ میں جامع مسجد میں جہاں آپ لوگ ہیں نہیں جاؤں گا، مجھے چلہ میں پہونچا دیجئے، چنانچہ امروہہ اسٹیشن سے رکشہ سے چلے تو پہلے محلّہ چلّہ آیا میں مدرسہ کے پاس اتر گیا، حضرت مولانا افضال الحق صاحب سے ملاقات ہوئی، انھوں نے بخوشی بغیر کسی سفارش کے داخلہ کرلیا، میرا جب داخلہ یہاں ہوگیا تو میں نے اپنے ایک قدیم ساتھی حافظ الطاف حسین صاحب کو بھی یہیں بلالیا، حافظ صاحب کا دیوبند سے اخراج نہیں ہوا تھا مگر ان کا شمار مشتبہ افراد میں تھا، ایسے لوگوں کیلئے ارباب انتظام نے قاعدہ بنایا تھا کہ اپنے ضلع کے دو منتخب علماء میں سے کسی ایک سے اپنی تصدیق لکھوا کر لائیں، تب داخلہ برقرار رہے گا، حافظ صاحب کسی کے پاس نہیں گئے، میرے بلانے پر امروہہ میں آگئے، ان کا بھی داخلہ ہوگیا اس طرح ہم چار ساتھی ہوگئے، دو تو پہلے سے موجود تھے دو اب ہوگئے اس وقت تک مدرسے میں مطبخ نہ تھا، تھوڑے سے طلبہ تھے وہ ٹفن لے کر محلّہ میں کسی ایک یا دو گھر جاتے، اور انھیں بقدر ضرورت کھانا مل جاتا مجھے یہ عمل کسی صورت گوارا نہ تھا، ہم چار آدمیوں پر مطبخ قائم ہوا پھر اس میں اور شرکاء بڑھ گئے تعلیم ہم لوگوں کی شروع ہوگئی، اسباق کی ترتیب یوں تھی۔

(۱)......حضرت مولانا عبدالحی صاحب امروہوی علیہ الرحمہ	ابوداؤد شریف
(۲)......حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب دیوریاوی مدظلہ	مسلم شریف
(۳)......حضرت مولانا افضال الحق صاحب قاسمی مدظلہ	بخاری شریف

(۴)......حضرت مولانا افضال الحق صاحب قاسمی مدظلہ بخاری شریف
(۵)......حضرت مولانا افضال الحق صاحب قاسمی مدظلہ ترمذی شریف
(٦)......حضرت مولانا عبدالمنان صاحب مظفرپوری مدظلہ شمائل ترمذی شریف

گھنٹوں کی ترتیب یہی تھی ابن ماجہ شریف اورنسائی شریف کے اسباق بھی انھیں گھنٹوں میں وقفے وقفے سے ہوجایا کرتے تھے، یہ سال ذوق وشوق سے پڑھنے کا نہ تھا، دارالعلوم کے حادثے نے دل ودماغ کو بجھا کر رکھ دیا تھا، بس کسی طرح تعلیم کی تکمیل کرلینی تھی اسی لئے تعلیم میں نقص بھی رہ گیا، میں نے دیوبند میں شش ماہی امتحان تک جلالین شریف کے تین پارے، ہدایہ اخیرین کے تقریباً سواڈیڑھ سو صفحے اورمیبذی کی تھوڑی سی مقدار پڑھی تھی، سالانہ تک جتنا حصہ پڑھنا تھا وہ رہ گیا، پھر دوسرے سال مشکٰوۃ شریف، بیضاوی شریف، شرح عقائد، سراجی پڑھنی تھی وہ سب رہ گئی، میں نے دورۂ حدیث میں داخلہ لے لیا اس طرح درسی کتابوں میں نقص رہ گیا، بس یہ خیال تھا کہ تعلیم سے فراغت ہوجائے یہ الزام نہ رہ جائے کہ تعلیم مکمل نہ ہوسکی۔

نہ مطالعہ، نہ مذاکرہ، بس درس میں جا کر حدیث خوانی! البتہ حضرت مولانا افضال الحق صاحب مدظلہ کے سبق میں بہت دلچسپی ہوئی، مولانا کی تقریر کی زبان صاف نہ تھی آواز بھی باریک تھی اور عجلت میں جملے بھی پورے ادا نہ ہوتے تھے، انداز تقریر پہلے تو عجیب سا لگا، لیکن جلد ہی طبیعت مانوس ہوگئی، میں مولانا کی تقریر تو تقریر اشارات بھی سمجھنے لگا، مولانا غضب کے ذہین تھے، باتوں سے باتیں نکالنا ان میں ترتیب پیدا کرنا، دلائل کو سجا کر پیش کرنا مولانا کا خاص فن تھا یہ فن ترمذی شریف کے درس میں زیادہ ظاہر ہوتا تھا، میں ان کی باتیں بہت انہماک سے سنتا اور بہت فائدہ ہوتا، سوال کرنے کی نوبت کم آتی اس قدر مرتب اور مدلل تقریر ہوتی کہ سوالات خود بخود حل ہوتے رہتے، ان کے سبق میں بیٹھ کر احساس ہوا کہ علمی اور دماغی فوائد کے لحاظ سے صرف وقت گزاری نہیں ہے، بلکہ علم وہنر کے بیش قیمت جواہر ہاتھ آرہے ہیں مولانا کا ذوق شعری بھی بہت بلند ہے، خود بھی عمدہ شاعر ہیں باتوں

باتوں میں شعروادب کے رموز ونکات بھی بیان کرجاتے تھے، اس سے فہم سخن کی دنیا وسیع تر ہوتی جارہی تھی اس دلچسپی کے باوجود بے دلی کی کیفیت باقی رہی۔

ادیب ماہر کا امتحان

اس بے دلی نے طبیعت کو ادھرادھر بھٹکایا، امروہہ میں شعروادب کا ذوق بہت عام تھا مدرسہ کے ایک ممبر حکیم محمد احمد صاحب بڑے پائے کے شاعر تھے، اساتذہ میں ان کا شمار تھا ہمارے مولانا ان کے یہاں پہونچتے تو شعروشاعری کی بہار آجاتی وہ جہاں شعر بہت اچھے کہتے تھے وہیں خوب سمجھتے بھی تھے، شعر کے عیب وہنر کی پرکھ خوب رکھتے تھے میں نے ان کے یہاں فنا نظامی کو ادب سے بیٹھے اور ادب سے گفتگو کرتے دیکھا ہے مدرسہ میں ایک نابینا استاذ جناب شہباز امروہوی، بے حد قادرالکلام اور پرگو شاعر تھے، ان کا کلام پرکیف ظرافت سے معمور ہوتا، مگر ظرافت کے پیرائے میں عمدہ اخلاق کی تلقین کرتے تھے امروہہ میں جمعہ کے روز نعتیہ مشاعرے خاص خاص ارباب ذوق کے یہاں ہوتے، مختصر سی مجلس ہوتی اچھے شاعر اور سخن فہم سامعین ہوتے دوزانو نشست ہوتی، کوئی ننگے سر نہ ہوتا، ادب واحترام کے تمام لوازم کے ساتھ تازہ نعتیں سنائی جاتیں، نعت کی مجلسوں میں مجھے بارہا شریک ہونے کا اتفاق ہوا، اس ماحول نے ایک مرتبہ علی گڑھ کے اردو ادب کے امتحان کی طرف مائل کردیا ادیب کا امتحان میں دے چکا تھا، ادیب ماہر کا فارم بھردیا، میرے ساتھ مولانا کے صاحبزادے حافظ محمد ارشد نے بھی فارم بھرا، حافظ محمد ارشد مولانا کے بڑے صاحبزادے تھے، یہ بھی ذہانت اور حاضر جوابی کے پتلے تھے، مگر حالات نے ان کی ذہانت کو منفی ذہانت بنادیا تھا، درس میں اور تعلیم میں اس ذہانت کا ظہور نہ ہوتا، تنقید وتبصرہ، باتوں کی کمزوریوں پر گرفت، الزامی جوابات کی تیزی میں طاق تھے۔ حافظ کیسے تھے یہ تو نہیں معلوم، مگر قرأت بہت عمدہ تھی قرآن پڑھتے تو سماں باندھ دیتے، ادیب ماہر کا فارم انھوں نے بھی بھرا، اس کے لئے مطالعہ کا سلسلہ شروع ہوا، اس کی تیاری کیلئے ایک لائبریری تھی وہاں سے کتابیں لا لا کر ہم لوگ پڑھا کرتے، میں تو پڑھتا اور مولوی ارشد اس کی کمزوریوں کا بخیہ ادھیڑتے۔

امتحان کی تیاری کما حقہ نہیں ہوسکی، البتہ ایک کتاب مسعود حسن رضوی ادیب کی ''ہماری شاعری'' مجھے مل گئی، یہ کتاب مجھے بہت پسند آئی اسے میں نے بار بار پڑھا، اور امتحان کی تیاری کا مدار اسے ہی بنالیا، اردو شاعری کے تعارف وتنقید پر بہترین کتاب ہے اس کے مضامین پر میں بخوبی حاوی ہوگیا، جب امتحان کا وقت آیا تو تمام پرچے میں نے اسی کتاب کی مدد سے حل کئے تھے۔

امروہہ میں امتحان کا سنٹر کیا تھا؟ نقالی، ہڑبونگ اور بددیانتی کا سنٹر تھا، نگراں حضرات جوابات الٹے سیدھے بلیک بورڈ پر لکھ دیتے طلبہ اسے نقل کرلیتے، یا کتابیں لے کر آتے اور وہیں بیٹھ کر نقل کرتے مجھے نقل کرنے کی کبھی عادت نہ تھی بڑی وحشت ہوتی میں اپنی کاپی پر سر جھکالیتا تو نگاہ بھی نہ اٹھاتا، میں نے ہر پرچہ تفصیل سے لکھ کر حل کیا، مضمون نگاری کا ملکہ تھا ہی، امتحان کی کاپی نہیں ادیبانہ مضامین لکھے، نہ میں نے کوئی نقل کی اور نہ کسی کو نقل کرائی صرف تنقید کے پرچے میں ایسا ہوا کہ میں نے تفصیل سے جب لکھ لیا تو ایک طالب علم میرے پاس آیا کہ مجھے بھی لکھوادو، میں نے اختصار کے ساتھ لکھوادیا، اب ستم ظریفی ملاحظہ ہو، اس پرچے میں اسے امتیازی نمبر ملے اور مجھے نہیں۔

جب نتیجہ آیا تو میری پوزیشن پہلی تھی اور ارشد کی تیسری!

مدرسہ کا سالانہ امتحان

آہستہ آہستہ وقت کا کاروان آگے بڑھتا رہا، یہاں تک سالانہ امتحان کا وقت آ گیا امتحان سے کوئی خاص دلچسپی باقی نہ رہ گئی مگر رسم تو پوری کرنی ہی تھی، امروہہ کے مولانا انصارالحق صاحب جو اس وقت مدرسہ شاہی مرادآباد کے مہتمم تھے، امتحان کیلئے تشریف لائے تھے، امتحان کی کوئی خاص بات حافظے میں نہیں ہے، مولانا نے امتحان کے معاً بعد جلسہ دستار بندی وتقسیم اسناد رکھا تھا، دستار بندی کیلئے امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب علیہ الرحمہ کے صاحبزادۂ محترم مولانا عبدالسلام صاحب لکھنوی علیہ الرحمۃ کو دعوت دی، اور تقریر کیلئے دہلی کے مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کو، اس جلسے میں مولانا نے مجھے

تقریر کا حکم دیا تھا، میں نے علم کے سفر کے موضوع پر تقریر کی، کہ علم آسمان سے نازل ہوا، اس کے نزول کا آغاز غار حرا سے ہوا، اور اس کی تکمیل مدینہ طیبہ میں ہوئی، پھر اس علم نے کہاں کہاں کا سفر کیا کوفہ، بصرہ، بغداد، قرطبہ، غرناطہ، شام، دمشق فلسطین، مصر وقاہرہ، دہلی، سرہند، لکھنو، دیوبند وغیرہ کن کن منزلوں سے ہوتا ہوا کہاں کہاں پہونچا، یہ تقریر برجستہ تھی آدھ پون گھنٹہ تک ہوئی، اس کے بعد مولانا عبدالسلام صاحب کے ہاتھوں دستار باندھی اور سند دی گئی۔

خواب میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زیارت

جلسہ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک چلا، صبح کو فجر کی نماز کے بعد ٹرین تھی، اس سے وطن کی روانگی تھی، جلسہ کی ہماہمی کے بعد نیند آگئی، خواب میں دیکھتا ہوں کہ میری بڑی بہن جو میرے لئے بمنزلہ ماں کے ہے، گھر سے اطلاع آئی ہے کہ اس کا انتقال ہوگیا ہے، میں سخت حیران و پریشان ہوا کہ نہ میں نے اس کی کوئی خدمت کی اور نہ میں اسے دیکھ سکا، اسی پریشانی میں مدرسہ کے باہر نکلا باہر ایک لمبا چوڑا سا چبوترہ ہے دیکھتا ہوں کہ اس پر ایک قبر ہے اور وہ کھلی ہوئی ہے، مجھے خواب میں یہ محسوس ہوا کہ یہ صاحبزادیٔ رسول حضرت فاطمہ بتول رضی اللہ عنہا کی قبر ہے میں قبر کے کنارے بیٹھ کر رونے لگا، اور اماں اماں پکارنے لگا، پھر دیکھتا ہوں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا قبر سے باہر لیٹی ہوئی ہیں، اور سر اقدس میرے زانو پر ہے، آنکھیں بند ہیں میں اور بے قراری کی حالت میں اماں اماں رٹنے لگا، اماں نے آنکھیں کھول دیں، فرمایا کیا بات ہے؟ میں نے کہا دیدی (بہن) کہاں ہے؟ انھوں نے فرمایا جنت میں ہے، مت روؤ، مجھے قبر میں اتار دو، میں نے بہت احترام سے اماں کو قبر میں اتار دیا، اور مٹی برابر کردی، اتنے میں آنکھ کھل گئی، اللہ جانے اس کی کیا تعبیر ہے؟

پھر خیمہ اکھڑ گیا، طناب ٹوٹ گئی، اور ہم لوگ صبح کو گھر کے لئے روانہ ہوگئے۔

امروہہ کی چند ناقابل فراموش یادیں

امروہہ میں پورے بارہ مہینے رہنے کا اتفاق نہیں ہوا، شوال کے نصف کے بعد آیا تھا،

۱۳۸۹ھ کا سال تھا، اور شعبان کے نصف کے پہلے وہاں سے روانہ ہو گئے، لیکن چونکہ یہ سرزمین میری محسن سرزمین ہے، اس لئے اس سے بہت زیادہ محبت ہو گئی آج بھی جب امروہہ کا تصور آتا ہے یا کوئی امروہہ کا نام لیتا ہے تو میرے دل پر محبت کی پروائی چلنے لگتی ہے، ایک میٹھا میٹھا درد دل میں ہونے لگتا ہے، سفر میں اگر کبھی ٹرین امروہہ سے گزرنے والی ہوتی ہے تو میرے اوپر ایک بے خودی سی طاری ہونے لگتی ہے، اکثر ایسا ہوا کہ ٹرین امروہہ میں رکی نہیں اور میں دیر تک دل بیتاب کو سنبھالتا رہ گیا۔

ایک بار ٹرین اتفاق سے وہاں رک گئی، حالانکہ رکنے والی نہ تھی میں بیقرار ہو گیا، اپنے رفیق سفر سے کہا یہاں اتر جاؤ ؎ **قفانبک من ذکری حبیب ومنزل**

اور پھر ہم دونوں اتر گئے چوبیس گھنٹے وہاں رہے پھر جہاں جانا تھا گئے۔

امروہہ کی سرزمین سے کئی یادیں وابستہ ہیں جنھیں میں فراموش نہیں کر سکا ہوں، انھیں بغیر کسی ترتیب کے لکھتا ہوں۔

(۱) نمازوں کی پابندی کا اہتمام

نمازیں پڑھنے کا مزاج تو شروع طالب علمی سے ہے مگر جیسا چاہئے اس کا اہتمام نہ تھا، نماز پڑھتا ضرور تھا، مگر قرآن میں اقامة الصلوٰة کا جو حکم ہے اس پر عمل نہ تھا نماز قضا ہو گئی کوئی فکر نہیں سوتے رہ گئے کوئی قلق نہیں، بالخصوص سفر میں نمازیں قضا ہو گئیں، اور دل نے انقباض نہیں محسوس کیا، امروہہ میں داخلہ کے بعد جب بقرعید کی تعطیل ہوئی تو گھر جانے کا پروگرام بنا، میں اور حافظ الطاف حسین صاحب ساتھ ہی وطن واپس ہوئے وہ اعظم گڑھ اسٹیشن پر اترے اور میں محمد آباد، اس سفر میں پانچ نمازیں قضا ہوئیں مگر دل ذرا بھی میلا نہ ہوا، گھر پر جتنے دن مقدر تھا رہے واپسی کی تاریخ متعین تھی، حافظ الطاف حسین صاحب مجھے اعظم گڑھ میں ملتے، میں روانگی سے ایک دن قبل گاؤں کی کھپریل مسجد میں بعد نماز ظہر اکیلا بیٹھا تصورات کی دنیا میں غرق تھا کہ اچانک دل پر ایک روشنی پھیلی، اور میں دیکھنے لگا کہ حدیث کی تمام کتابوں میں نماز کی اہمیت، اس کے وجوب، اس کی تاکید کے متعلق مسلسل حدیثیں پڑھی

گئیں، قرأت کرنے والا میں ہی تھا ان احادیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ ورسول کے نزدیک نماز کا درجہ کیا ہے، اور میں ہوں کہ لاپرواہی سے نماز قضا کردیتا ہوں، یہ روشنی پھیلنی تھی کہ میں نے نہایت تضرع وزاری سے اللہ کے حضور توبہ کی اور عہد کیا کہ اب نماز نہ ترک کروں گا، حضر میں تو کم ترک ہوتی تھی، بس باید وشاید! لیکن سفر میں بہت! میں توبہ کر کے سوچنے لگا کہ کل ہی سفر ہے ٹرین میں بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے، اس وقت ریزرویشن کا عام چلن ہم طالب علموں میں نہیں تھا، ایک ڈبہ ٹو ٹائر کہلاتا تھا اس میں پچاس پیسے مزید دے کر بیٹھنے کی سیٹ مل جاتی تھی، سونے کیلئے غالباً دو روپئے لگتے تھے، ہم لوگ عموماً ٹو ٹائر میں بیٹھنے کی سیٹ تلاش کر لیتے تھے، میں نے دل میں کہا کہ بھیڑ بہت ہوتی ہے اگر اس سے سابقہ پڑ گیا، تو نماز کا معاملہ مشکل ہوگا، میں نے اسی سانس میں اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعا کی کہ پہلے مرتبہ عہد کر رہا ہوں، اے اللہ آپ اسے پورا کرادیجئے۔

دوسرے دن چھوٹی لائن کی ٹرین پر محمد آباد میں بیٹھا، اعظم گڑھ میں حافظ الطاف سوار ہوں گے، ان سے بھی اپنی یہ بات بتادوں گا، ڈیڑھ بجے شاہ گنج میں دہرہ دون ایکسپریس ملتی ہے، اس پر سوار ہونے سے پہلے ظہر کی نماز اسٹیشن پر ادا کرلیں گے، باقی نمازیں ٹرین میں ان شاء اللہ، اعظم گڑھ میں حافظ صاحب آگئے میں نے ان سے اپنی آپ بیتی بتائی، وہ بہت خوش ہوئے اور عزیمت کے ساتھ موافقت کی، چنانچہ شاہ گنج میں ظہر کی نماز ادا کی گئی، وہاں بھی سہولت کی دعا کی عام طور پر دہرہ ایکسپریس بھری بھرائی آتی تھی لیکن آج اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ گاڑی آئی تو ہر ڈبہ خالی! ٹو ٹائر کے ٹی ٹی نے خود پکارا کہ مولوی صاحب آجاؤ، ہم لوگوں کیلئے اس نے دو سیٹ ریزرو کردی، ماشاء اللہ ہم نے چار وقت کی نماز ٹرین میں نہایت سہولت کے ساتھ ادا کی۔

(۲) بیداری میں زیارت نبوی

ایک روز حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں، میں ابوداؤد شریف کی عبارت پڑھ رہا تھا، مولانا نہایت پاک باطن اور صاف دل بزرگ ولی تھے، سادات میں

تھے میں حدیث نبوی کی مسلسل قرأت کررہا تھا، اسی دوران مجھ پر ایک ربودگی کی سی کیفیت طاری ہوئی، اسی حالت میں پڑھتے پڑھتے میری نگاہ باہر کی طرف اٹھ گئی، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ چند اصحاب کے ساتھ ایک طرف جارہے ہیں، احرام جیسا لباس زیب تن فرمائے ہوئے، چہرۂ اقدس دوسری طرف تھا، میں نے پیچھے سے دیکھا خوبصورت زلفیں تھیں چندے زیارت ہوئی پھر وہ منظر نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

(۳) ٹرین میں ایک شاعر سے ملاقات

امروہہ کی طالب علمی کے دوران ایک بار مولوی طاہر صاحب، مولوی عزیز الرحمٰن صاحب اور میں دیوبند جارہے تھے، مولوی عزیز الرحمٰن ایک زود گو شاعر تھے، مولوی طاہر صاحب بھی شعر کہہ لیتے تھے، میں کورا تھا، لیکن شعر سمجھتا تھا، ٹرین میں بیٹھے بٹھائے مشغلہ سوجھا، مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کا تخلص شہیدؔ تھا، انھوں نے اپنی تازہ غزل جو بہت مرصع تھی، سنانی شروع کی، مولوی طاہر صاحب نے عروض کے لحاظ سے اس میں کوئی غلطی بیان کی، پھر دونوں میں بحث شروع ہوگئی درمیان میں میں بھی بول پڑتا تھا، ہم لوگوں کی بحث سن کر دہلی کے ایک شاعر جو ڈبے میں بیٹھے تھے اٹھ کر آئے اور شریک بحث ہوگئے، پھر انھوں نے عروض کی ضرورت پر مبالغہ کے ساتھ زور دیا، کہنے لگے کہ اب شاعر عروضی نہیں ہوتے اور مولوی فروضی نہیں ہوتے، یعنی میراث کی تقسیم نہیں جانتے، انھوں نے کچھ زیادہ مبالغہ سے کام لیا۔

میں نے مولوی طاہر صاحب کو اشارہ کیا کہ آپ نہ بولیں کیونکہ وہ خود عروضی تھے اور ان کی بحث کا جواب میرے بس کی بات نہ تھی وہ سمجھ گئے، پھر میں نے عروض کے خلاف ایک مفصل تقریر کر ڈالی، اس سے وہ بہت متأثر ہوئے اور میرے ہم نوا ہوگئے، پھر بحث کا پیرایہ بند کردیا گیا، ان شاعر صاحب نے کہا آپ حضرات اپنا اپنا کوئی ایسا شعر سنائیے، جو آپ کو خود پسند ہو، مولوی عزیز الرحمن صاحب نے متعدد شعر سنائے مولوی طاہر صاحب نے بھی سنائے، مجھ سے انھوں نے کہا میں نے معذرت کی کہ میں شاعر نہیں ہوں، انھوں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے شاعری اور اشعار کے بارے میں آپ کی معلومات بہت ہیں، اور آپ

کا ذوق بھی بلند ہے، آپ شعر نہ کہتے ہوں یہ نہیں ہوسکتا میں نے کہا کہ میرا مطالعہ ہے مگر میں شعر سرے سے نہیں کہتا، البتہ منظور کریں تو کوئی ایسا شعر سنا سکتا ہوں جو میرے دل کی گہرائیوں میں اترا ہوا ہے، اس وقت مہینوں سے ایک شعر کی گرفت میں ہوں ہر وقت میرے دماغ میں وہ گونجا کرتا ہے، وہ فارسی میں ہے اجازت ہو تو سنا دوں کہنے لگے، ضرور ضرور میں نے کہا تو سنئے۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

انھوں نے کہا اس کا مطلب بتایئے، میں نے عرض کیا کہ زندگی کی دوڑ میں کبھی کبھی ایک لحظہ کی غفلت انسان کو بہت پیچھے ڈال دیتی ہے، اسی مضمون کو اس شعر میں ادا کیا گیا ہے، کہ میرے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ گیا، میں سوچا کہ ٹھہر کر پاؤں سے کانٹا نکال لوں، کانٹا نکالنے کا وقفہ ہوا تھا کہ کارواں نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، ایک لحظہ میں غافل ہوا تھا، لیکن اس کے نتیجے میں سو سال کے لئے میری راہ دور ہوگئی، اس پر انھوں نے بہت داد دی۔

(۴) بدنامی بھی عجیب ہوتی ہے

دیوبند کے ہنگامے نے ہم لوگوں کو پورے ملک میں مشہور کردیا تھا، اللہ جانے لوگوں نے ہم لوگوں کے بارے میں کیا کیا تصور قائم کرلئے تھے اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ ہم لوگوں کے ساتھ پیش آیا میں اور مولوی طاہر کسی ضرورت سے امروہہ سے مرادآباد گئے تھے غالبًا مولوی عزیز الرحمٰن بھی ساتھ تھے، شام کو وہاں سے واپسی ہوئی، مغرب کا وقت تھا ایک بڑے میاں جو دیکھنے میں مولوی معلوم ہوتے تھے وہ بھی ساتھ میں ٹرین میں تشریف فرما تھے راستے میں مدارس، اساتذہ اور طلبہ کے موضوع پر گفتگو شروع ہوئی اس وقت دارالعلوم کا ہنگامہ ہر مولوی کے یہاں زیر بحث رہتا تھا، چنانچہ انھوں نے بھی یہی موضوع اٹھایا اور طلبہ کی شکایتیں کرنے لگے میں نے عرض کیا کہ ساری غلطی طلبہ کے سر لگا دینا بے انصافی ہے، پانی کہیں اور بھی مرتا ہے پھر میں نے اس پر بہت تفصیل سے کلام کیا بڑے میاں بہت متاثر

ہوئے کہنے لگے آپ لوگ کہاں پڑھاتے ہیں، میں نے کہا پڑھاتے نہیں پڑھتے ہیں، بولے کہاں؟ ہم نے امروہہ کا نام لیا انھوں نے تعجب سے کہا کہ امروہہ جیسی جگہ اتنے باصلاحیت طلبہ جو اساتذہ پر بھی فوقیت رکھتے ہیں آپ لوگوں کو تو دارالعلوم دیوبند میں ہونا چاہئے تھا، یہ سننا تھا کہ دل پر زخم سا لگا، یا یہ کہئے کہ زخم کے ٹانکے کھل گئے، لیکن ہم لوگ سنبھل گئے، میں نے کہا ہاں زمانہ کی نیرنگیاں ہیں، انھوں نے کہا کہ بجنور میں میرا ایک مدرسہ ہے میں ابھی سے دعوت دیتا ہوں، فارغ ہوکر وہیں آجایئے، پھر اور باتیں ہوتی رہیں، امروہہ قریب آگیا تو بڑے میاں نے فرمایا کہ آپ حضرات اپنا نام بتادیں، میں نے کہا جانے دیجئے، مسافر ہیں ادھر سے آئے ادھر چلے گئے، کیا کیجئے گا نام پوچھ کر مگر وہ بضد ہوگئے، میں نے کہا جب نہیں مانتے تو بتانا ہی پڑے گا یہ طاہر حسین گیاوی اور میں اعجاز احمد اعظمی!

یہ دونوں نام سننے تھے کہ بڑے میاں ایک دم گھبرا کر کھڑے ہوگئے، میں نے کہا آپ گھبرایئے مت آرام سے تشریف رکھئے، وہ چپ چاپ بیٹھ گئے پھر ایک لفظ نہیں بولے، امروہہ گاڑی ٹھہری اور ہم لوگ سلام کرکے اتر گئے اور وہ بے حس وحرکت پڑے رہے۔

(۵) تجارت اور ناکامی

دارالعلوم کے حادثے کے بعد دل ایسا ٹوٹا کہ باقی زندگی مدرسوں میں بسر کرنے سے طبیعت سرد ہوگئی ہمارے دورے کے ایک ساتھی مولوی محمد شفیق تھے انھیں تجارت کا ذوق تھا آپس میں گفتگو ہوتی ہی رہتی تھی انھوں نے تجارت کرنے کا مشورہ دیا، اس کے فوائد بتائے مجھے اس سے مناسبت نہیں تھی لیکن ان کے بتانے اور سمجھانے سے میں تیار ہوگیا، ہمارے یہاں ہینڈلوم پر جو ساڑیاں تیار کی جاتی ہیں، شفیق نے کہا انھیں منگواو یہاں ان کی مانگ ہے میں نے والد صاحب کو لکھا انھوں نے ساڑیاں بھیج دیں بازار میں انھیں لے گئے، وہ فوراً بک گئیں اور نقد قیمت وصول ہوگئی پہلا معاملہ حوصلہ افزا تھا، اب نیت میں کچھ پختگی آچکی تھی امتحان سالانہ قریب تھا طے کیا گیا کہ بروقت تو معاملہ ملتوی رکھا جائے، چھٹی کے بعد میں گھر جاؤں، اسی وقت رقم بھی والد صاحب کے حوالے کردوں اور مزید ساڑیاں لے کر

خود آؤں، یہ پروگرام بنا کر رقم میں نے اپنے نزدیک بکس میں حفاظت سے رکھ دیا۔

ایک ہفتہ کے بعد مجھے کسی ضرورت سے اس رقم کو نکالنے کی نوبت آئی، دیکھا تو وہ غائب تھی میں بہت پریشان ہوا، رقم میری حیثیت سے اچھی خاصی تھی، اور دوسرے کی امانت تھی، اب کیا ہوگا؟ کسی پر شبہ کی بھی گنجائش نہ تھی، اور اسے نظر انداز کردینے کی بھی وسعت نہ تھی، پوچھ گچھ کی گئی مگر کچھ پتہ نہ چلا، شفیق نے کہا کہ فلاں جگہ ایک عامل رہتے ہیں، چلو ان سے کہا جائے، میرا جی تو نہ چاہتا تھا مگر گھبراہٹ مجھے لے گئی، ان سے صورت حال بتائی، انھوں نے کہا جن لوگوں پر شبہ ہو یا جو لوگ کمرے میں رہتے ہوں ان کے نام کا پہلا حرف لکھ کر دے دو، مجھے کسی پر شبہ نہ تھا، کمرے میں ۷؍لڑکے تھے میں نے ہر ایک کے نام کا پہلا حرف لکھ کر دے دیا، اس نے کہا کل صبح آنا میں بتادوں گا۔

صبح ہم لوگ گئے تو وہ اس کاغذ کو لے کر آیا، جس پر ہم نے ہر ایک کے نام کا پہلا حرف لکھ رکھا تھا، اس نے ’’ش‘‘ پر نشان بنایا تھا، کہا جس کے نام کے شروع میں شین ہے وہی چور ہے، آپ اپنے طور پر معلوم کرلیجئے، یہ رام پور کا ایک لڑکا تھا اس کا نام شفیق احمد تھا۔

یہ وہ شفیق نہیں تھا جو تجارت کا شریک تھا وہ دوسرے کمرے میں رہتا تھا، وہ مرادآباد کا رہنے والا تھا۔ شفیق رام پوری کی ایک داستان ہے، کچھ مضائقہ نہیں اگر اسے قدرے اختصار کے ساتھ بیان کردوں۔

ضلع رام پور میں ایک قصبہ ہے ٹانڈہ بادلی، شفیق وہاں کا رہنے والا تھا اور بہت خوبصورت، طرحدار اور سجیلا نوجوان تھا، لمبا قد، خوب بھرا ہوا بدن، دارالعلوم دیوبند کا طالب علم تھا، نائب مہتمم صاحب کا خادم خاص تھا ان کا بہت مقرب! مزاج اور عادت کے لحاظ سے بگڑا ہوا، اسٹرائیک کے ہنگامے کے بعد جب مدرسہ کھلا تو وہ بھاگ کر بمبئی چلا گیا، وہاں کسی فلمی ادارے میں پہونچ گیا اور اداکاروں کے زمرے میں شامل ہوگیا، نائب صاحب بہت پریشان ہوئے، کسی طرح پتہ چلا کہ وہ بمبئی میں ہے، تو اس کے والد بمبئی جا کر اس گندگی سے نکال لائے لیکن اس کی اس موضوع پر شہرت ہوچکی تھی، دارالعلوم میں داخلہ اب مشکل تھا تو

نائب صاحب نے ایک خط دے کر امروہہ مدرسہ چلہ میں اسے بھیج دیا، مولانا عطاء اللہ صاحب ان کے خاص شاگرد تھے، انھیں کے نام خط لکھا، انھوں نے حضرت مولانا افضال الحق صاحب سے سفارش کی، مولانا بہت وسیع القلب تھے، داخلہ کرلیا، حالانکہ میں نے دبی زبان میں مخالفت کی تھی، مولانا نے اسے میرے ہی کمرے میں رکھ دیا، ہم لوگ اس سے ربط ضبط نہ رکھتے تھے، اب اس کا نام آیا تو میں نے اسے سمجھایا، اور پوچھا، اس نے اقرار کرلیا، میں نے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو اس نے بتایا کہ وہ سنیما دیکھنے کا عادی ہے، اس کے بغیر اسے چین نہیں آتا، پیسے اس کے پاس نہ تھے تب اس نے میرے بکس سے رقم نکال لی۔

میں نے مولانا سے تذکرہ کیا مولانا نے بہت تاسف کا اظہار کیا اور فرمایا کہ بڑوں کا بگاڑا جلدی نہیں بنتا، مولانا نے اس کے والد کے نام مجھے ایک خط دے کر بھیجا، وہ آئے اور انھوں نے وعدہ کیا کہ گھر جانے سے پہلے میں انھیں رقم دیدوں گا، انھوں نے وعدہ پورا کیا اور جلسہ والے دن انھوں نے پوری رقم مجھے دیدی، وہ بہت نیک آدمی تھے۔

(۶) تدریس

میں نے پہلے کہیں ذکر کیا ہے کہ مجھے پڑھنے کے ساتھ پڑھانے کا بھی ذوق تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس ذوق کی تکمیل کا سامان بھی عطا فرما رکھا تھا۔ امروہہ میں دو طالب علم دیوریا کے تھے جو عربی سوم میں پڑھتے تھے، وہ عربی سوم کی کتابوں کے ساتھ عربی چہارم کی کتابیں بھی پڑھنا چاہتے تھے، چنانچہ میں نے خارج اوقات میں انھیں چہارم کی کتابیں شرح جامی وغیرہ پڑھادیں، وہ اگلے سال مدرسہ شاہی میں چہارم کا امتحان دے کر کامیاب ہوگئے۔

ہم لوگوں کی چونکہ مدارس میں عام شہرت تھی اس لئے اکثر مدرسوں کے ذی استعداد طلبہ ملنے کی آرزو رکھتے تھے چنانچہ مدرسہ شاہی کے متعدد طلبہ وہاں سے امروہہ ملنے کیلئے آیا کرتے تھے، اور سوالات بھی کرتے تھے، ایک طالب علم ذی استعداد اور نیک کئی طلبہ کے ساتھ ملنے آیا، وہ مختصر المعانی پڑھتا تھا، میں نے دوران گفتگو مختصر المعانی کس طرح پڑھانی چاہئے اس پر تفصیل سے گفتگو کی، مختصر المعانی ایک پیچیدہ کتاب ہے، مصنف نے اس

کے مسائل کو الجھایا بہت ہے کہیں متن کی عبارت آنے سے پہلے ہی اس پر گفتگو شروع کردیتے کہیں بے محل لفظی بحث چھیڑ دیتے ہیں کہیں کسی ربط کے بغیر کسی شارح کی تردید شروع کردیتے ہیں، اس میں طلبہ تو طلبہ ہیں، اساتذہ بھی غچا کھا جاتے ہیں، مجھے بہت تجربہ ہوا ہے کہ اس کے سمجھنے میں طلبہ اور سمجھانے میں اساتذہ اکثر چکراتے رہتے ہیں اس طالب علم کو میری یہ بات بڑی معلوم ہورہی تھی اس وقت تو کچھ نہیں بولا تھوڑی دیر کے بعد وہ مختصر المعانی میرے پاس لے کر آیا کہ مجھے آپ سمجھایئے، میں نے کہا کہ کل جو تم نے سبق پڑھا ہے اسے نکالو، میں اسے سمجھاتا ہوں پھر اندازہ کرنا اس نے اپنا سبق پیش کیا، میں نے اپنے انداز میں اسے پڑھایا، وہ حیرت زدہ ہوگیا اس نے اقرار کیا کہ میں نے اس طرح نہیں سمجھا تھا، پھر اس نے متعدد اسباق مجھ سے پڑھے، اس کے شوق کا عالم یہ تھا کہ میں کبھی مدرسہ شاہی جاتا تو وہ کتاب کھول کر میرے سامنے بیٹھ جاتا، میں جب ٹانڈہ بادلی جارہا تھا تو بس اڈے پر وہ کتاب لے کر آگیا اور میں نے وہاں اسے سبق پڑھایا تھا۔

(۷) مولوی محمد اجمل صاحب

امروہہ کی مدت تعلیم میں جن چیزوں نے مجھے متاثر کیا اور جن سے میں نے تعمیر سیرت کا سبق حاصل کیا ان میں ایک نوجوان عالم مولوی اجمل صاحب بھی ہیں، میں جس وقت امروہہ پہونچا تھا سردیوں کا زمانہ تھا فجر کے وقت کبھی سویرے آنکھ کھل جاتی تو لاؤڈ اسپیکر سے تقریر کی آواز آتی، غور سے سننے پر باتیں بھی سمجھ میں آتیں، یہ تقریر جماعت کے وقت سے دس منٹ پہلے بند ہوجاتی، کبھی کبھی یہ آواز سننے کو مل جاتی ورنہ عموماً آنکھ اس وقت کھلتی جب آواز بند ہوچکی ہوتی، بقرعید کے بعد جب کہ نماز کا اہتمام بہت بڑھ گیا تھا روزانہ یہ آواز کانوں میں آنے لگی میں نے اپنے بعض ساتھیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ محلّہ نل میں ایک امام صاحب ہیں وہ فجر کی اذان خود ہی کہتے ہیں، اور اذان کے بعد تقریر کرتے ہیں، پورا محلّہ گوش برآواز ہوتا ہے ان کی یہ تقریر اصلاحی ہوتی ہے، اور ہر روز ہوتی ہے اس سے محلّہ والوں کی کافی اصلاح ہوتی ہے کچھ دنوں تک تو ان سے کچھ ربط ضبط نہ

ہوا، لیکن یاد نہیں کہ کیا تقریب ہوئی کہ ایک روز ان کی مسجد میں جانا ہوا، وہاں ایک مکتب بھی چلتا تھا، جس میں وہ پڑھاتے تھے، امروہہ میں تعویذ اور جھاڑ پھونک کا بہت زور تھا، مولوی صاحب اس میں بھی دخل رکھتے تھے، ہم لوگ پہونچے تو وہ بہت خوش ہوئے کہنے لگے تم لوگ پورب کے ہو، میں بھی وہیں غازیپور کا ہوں تم لوگ ٹھہرو میں پورب کا کھانا پکواتا ہوں، پھر کسی لڑکے کو بھیجا اور اس سے کہلوادیا کہ فلاں فلاں کھانا پکاؤ، میرے مہمان ہیں، دو گھنٹے کے بعد دیکھا تو واقعی ہم لوگوں کے مزاج کے مطابق گوشت، دال، چاول پک کر آ گیا۔

معلوم ہوا کہ مولوی اجمل صاحب غازیپور کے کسی گاؤں کے رہنے والے ہیں سادات میں سے ہیں، مگر اپنا سید ہونا کبھی ظاہر نہیں کرتے، مدرسہ حیات العلوم مرادآباد کے فارغ ہیں، فراغت کے بعد یہاں امامت کے لئے آ گئے ہیں، ابھی شادی نہیں ہوئی ہے، بادشاہوں کی سی شان سے اس محلّہ میں رہتے ہیں، گفتگو ہی سے طبیعت کی پختگی، دینداری اور جاہ وجلال کا پتہ چلتا تھا، آہستہ آہستہ ان کے بارے میں معلومات ہوتی رہیں، اس شان کا آدمی اس وقت تک تو میں نے نہیں دیکھا تھا اس کے بعد بھی کم نظر آئے، ان سے میری طبیعت متأثر ہوئی اس لئے قدرے تذکرہ ان کا لکھتا ہوں۔

سب سے اہم شان جو ان کی نظر آئی وہ شان استغناء تھی، استغناء کو کبر تک پہونچنے میں دیر نہیں لگتی، اور مجھے کبھی کبھی ان کے رویے سے اس کی بو معلوم ہوتی تھی مگر استغناء میں کبر کی بو گوارہ ہے، حرص کی ذلت گوارہ نہیں ان کا انداز یہ تھا کہ اپنی مسجد والوں سے امامت کا معاوضہ وہ اس وقت سو روپئے پاتے تھے، اور اخراجات شاہانہ رکھتے تھے ایک مرتبہ وہ گھر گئے ہوئے تھے، مسجد کی کمیٹی نے ان کے کام اور ان کے اخراجات کو دیکھ کر تنخواہ بڑھادی، جب وہ واپس آئے اور بڑھی ہوئی تنخواہ انھیں دی گئی، تو انھوں نے انکار کر دیا اور کمیٹی طلب کر کے انھوں نے کہا کہ میں نے تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کیا تھا؟ نہیں! تو پھر کیا ضرورت تھی، بلکہ کیا حق تھا تنخواہ بڑھانے کا، جو پہلے تھی وہی رہے گی۔

اگر مسجد کو کسی ضرورت سے رقم کی ضرورت ہوتی تو وہ مسجد کے لاؤڈاسپیکر سے محلّہ

میں صبح کے وقت اعلان کر دیتے کہ مسجد کی فلاں ضرورت کیلئے اتنی رقم کی ضرورت ہے، پانچ بجے شام تک آپ لوگ اتنی رقم پوری کر دیں، اس اعلان کے بعد رقم ان کے پاس پہونچنے لگتی، اگر وقت متعینہ سے پہلے مطلوبہ رقم آجاتی تو پھر چندہ لینا موقوف کر دیتے اور فرماتے کہ رقم پوری ہوگئی، بعد میں جب ضرورت ہوگی تو لائیے گا، اور اگر کبھی وقت پورا ہوگیا اور بقدر اعلان رقم نہیں آئی تو وقت کے بعد کوئی رقم نہ لیتے، اور ضرورت مختصر کر دیتے اس کا اثر یہ تھا کہ اعلان ہوتے ہی فوراً فوراً رقم مہیا کر دی جاتی۔

امروہہ کے تاجر دہلی میں بہت رہتے ہیں، وہاں کے تجار سال میں ایک مرتبہ مولوی صاحب کو دعوت دے کر بلاتے کہ یہاں سے چندہ ہو، مولوی صاحب چندہ کیلئے نہ کسی کے گھر جاتے اور نہ کسی کی دکان پر، بس ایک جگہ قیام ہوتا اور اطلاع کرادیتے کہ میں اتنے دنوں تک یہاں رہوں گا لوگ اپنی سہولت کے لحاظ سے مسجد اور مکتب کا چندہ پہونچا دیں، لوگ اس وقت کے اندر رقمیں پہونچا دیتے۔

محلے پر ان کا بہت اثر تھا، لوگوں کے جھگڑے قضیے خود جا کر چکا دیا کرتے کسی بھی معاملہ میں کچہری جانے کو منع کر دیا تھا، اگر کسی جگہ کچھ نزاع معلوم ہوتی تو وہ خود پہنچ جاتے یا فریقین کو بلا لیتے، اور معاملہ رفع دفع کر دیتے۔

محلے میں ایک اور مسجد تھی اس سے ملحق ایک صاحب ثروت کا مکان تھا وہ اپنا مکان بنوا رہے تھے، اپنے مکان کو درست کرانے کیلئے انھوں نے مسجد کی زمین کے کچھ حصہ میں بنیاد رکھ دی تھی، مسجد والوں نے ان پر اعتراض کیا، مگر وہ اپنی مالداری کے زعم میں بات ٹال گئے، مولوی اجمل صاحب کو معلوم ہوا، یہ رکشہ پر وہاں گئے، دیکھا تو وہ سیٹھ صاحب وہاں موجود تھے، انھوں نے رکشہ پر بیٹھے ہی بیٹھے اپنے پختہ جلالی لہجہ میں ان سے کہا کہ مسجد کی زمین سے اپنی بنیاد ہٹا لیجئے، انھوں نے کچھ جواب دینا چاہا مگر مولوی صاحب نے کہا کہ کچھ کہنے کی اجازت نہیں، وہ غصے میں آگئے وہ ان کے مکتب کو شاید اچھی رقم دیتے تھے، کسی عنوان سے اس کا تذکرہ کر دیا، انھوں نے رکشہ گھمایا مدرسہ پر آئے، رجسٹر دیکھا ان کے چندے کی رقم دیکھی،

چند ہزار بنتی تھی، پھر وہ بازار میں آئے، محلّہ کے کسی کپڑے کے دکاندار سے کہا، اتنی رقم ہے؟ مجھے ابھی ضرورت ہے، بعد میں دیدوں گا، اس نے فوراً اتنی رقم دیدی یہ اسی رکشہ پر واپس گئے اور نوٹوں کی گڈی انھیں تھمادی کہ یہ آپ کے چندے کی رقم واپس، آئندہ چندہ نہ دیجئے گا اور بنیاد وہاں سے ہٹا لیجئے، یہ کہہ کر فوراً وہاں سے واپس ہوگئے، اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ بنیاد وہاں سے ہٹ گئی اور سینکڑوں معذرت کے ساتھ رقم واپس کی۔

وہ تعویذ بھی لکھتے تھے، اس بیماری میں عورتیں زیادہ مبتلا ہوتی ہیں، انھوں نے مسجد کے طویل وعریض احاطے کے ایک حصے میں ایک کمرہ تعمیر کرایا تھا، ضرورت مند عورتیں اسی کمرہ میں آکر بیٹھتیں اور یہ تعویذ لکھ کر کسی بچے کے ہاتھ بھجوادیتے۔

جب تک میں امروہہ میں رہا اسی رنگ پر دیکھا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہمارے مدرسہ دارالعلوم حسینیہ چلّہ کے مہتمم بنادئے گئے تھے بہت عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ انھوں نے امروہہ چھوڑ دیا ہے۔

غالباً ۱۹۸۳ء کا کوئی مہینہ تھا، میں شوکت منزل مدرسہ دینیہ غازیپور میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا، یہ کمرہ عمارت کی چھت پر واحد کمرہ تھا اچانک مولوی اجمل صاحب اس میں وارد ہوئے، انھوں نے مجھ سے کہا میں یہاں ایک ہفتہ رہوں گا، یہیں رہوں گا، نماز بھی اسی میں پڑھوں گا، کسی کو میرے بارے میں بتانا مت! میں نے کہا نیچے باجماعت نماز ہوتی ہے اس میں آپ شامل ہوں، آپ کو کوئی نہیں جانتا، اور میں کسی سے تذکرہ بھی نہ کروں گا، چنانچہ وہ خاموش اور گوشہ نشین رہے، میزبانی کا شرف مجھے حاصل ہوا، میں نے کچھ پوچھا نہیں، انھوں نے کچھ بتایا نہیں، ایک ہفتہ کے بعد اچانک انھوں نے کہا میں جارہا ہوں، میں ان کا مزاج جانتا تھا، میں نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ کہاں؟ وہ چل دیئے۔

دوتین روز کے بعد مدرسہ مخزن العلوم دلدارنگر کے استاذ مولانا غلام رسول صاحب تشریف لائے، وہ کہنے لگے دلدارنگر کی کوئی خاص خبر آپ کو نہیں معلوم؟ میں کچھ نہیں جانتا تھا انھوں نے بتایا کہ موضع کرہ کے ایک مولوی اجمل صاحب ہیں انھوں نے کپڑے کی ایک

دکان دلدار نگر بازار میں کھولی، وہ اس پر بیٹھتے اور قریب ہی ایک ڈاکٹر صاحب کا دواخانہ ہے ان کے یہاں سے اخبار منگا کر پڑھتے، کئی روز تک یہ سلسلہ رہا، تو ڈاکٹر صاحب نے ایک دن اکتا کر کہلوایا کہ مولوی صاحب کو اخبار پڑھنا ہے تو خرید کر پڑھیں، مولوی صاحب نے یہ بات سنی تو انھیں جلال آ گیا، جو آدمی یہ پیغام لایا تھا اسی سے جواب کہلوایا کہ ڈاکٹر صاحب! اب اخبار ہی پڑھو گے، بازار میں ایک سایہ دار درخت تھا، انھوں نے دوسرے دن اس کے سایے میں ایک چوکی بچھائی اس پر گدا اور سفید برق چاندنی ڈالی، گاؤ تکیہ رکھا اور دو زانو آنکھیں بند کر کے درویشوں کی طرح بیٹھ گئے، تعویذ گنڈوں کی مہارت تو تھی ہی، لوگ اپنی ضروریات کیلئے رجوع ہونے لگے، آٹھ دس دن گزرتے گزرتے وہاں زبردست ہجوم ہونے لگا مریضوں نے ڈاکٹروں کا راستہ چھوڑ دیا، ہر قسم کے مریض ان کے پاس آنے لگے یہ کسی پر دم کرتے کسی کیلئے پانی پر تیل پر دم کرتے، طبیعت تو پختہ تھی ہی، بات میں بھی بڑی پختگی تھی جس کے بارے میں جو کہ دیا، ویسا ہی بحکم خدا اس پر اثر پڑا، اس کا ایک ہنگامہ ہو گیا، ڈاکٹر صاحب واقعی اب مریضوں سے خالی ہو کر اخبار پڑھنے ہی کے کام کے رہ گئے، اسپتال سے بھی مریض نکل آئے، ڈاکٹر صاحب کو جوش آیا، وہ آ کر مولوی صاحب سے الجھنے لگے، داروغہ آ گیا، اس کی بہن کو یہاں سے شفا ہوئی تھی، وہ بھی بہت معتقد تھا اس نے ڈاکٹر کو ڈانٹ کر بھگایا، ایک ماہ میں یہ رنگ ہو گیا کہ ہزارہا لوگ ان کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے، رات کو گھر جاتے تو دروازے پر سینکڑوں کی بھیڑ ہوتی، نہ دن کو آرام نہ رات کو نیند! بس اچانک ایک دن غائب ہو گئے تمام لوگ متحیر ہیں کہ کہاں غائب ہو گئے۔

میں نے بتایا کہ ایک ہفتہ تو ابھی میرے پاس رہے، دو تین روز پہلے یہاں سے گئے، مولانا غلام رسول کو حیرت ہوئی، پوچھنے لگے کہ کہاں گئے میں نے کہا میں نے پوچھا نہیں۔

پھر عرصہ کے بعد جب میں شیخو پور میں آ گیا، دلدار نگر ان کی دکان پر ان سے ملاقات ہوئی، فقیرانہ ہیئت میں رہتے ہیں، جھاڑ پھونک عروج پر ہے، مگر شان استغناء اب بھی قائم ہے، شاید بیعت کا بھی سلسلہ ہے مگر مجھے اس کی تحقیق نہیں۔

۲۰۰۳ء میں حج کا سفر ہوا۔ منیٰ میں بیت الخلاء پر لمبی لائن تھی ایک لائن میں میں تھا، دوسری لائن میں ایک سفید ریش بزرگ تھے، ان کی لائن میں ایک آدمی کو عجلت تھی یہ بزرگ اسے آہستہ آہستہ سمجھا رہے تھے، ان کے تکلم کے انداز سے مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ مولوی اجمل صاحب ہیں، لیکن سر کے بال اور داڑھی اتنی سفید تھی کہ میں پہچان نہ سکا، احرام کی حالت میں یوں بھی شناخت مشکل ہو جاتی ہے، بات ختم ہوگئی، وہ دن احرام اتارنے کا تھا میں نے نہا دھو کر احرام اتارا، خیمہ کے باہر نکلا تو وہی صاحب احرام اتار کر لنگی کرتے میں ٹوپی سر پر پہنے ہوئے ٹہل رہے تھے، مجھ سے نہیں رہا گیا، میں نے سلام مصافحہ کر کے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں، بولے غازیپور سے، میں نے کہاں کہ آپ مولوی اجمل صاحب ہیں؟ بولے ہاں، میں نے اپنا نام بتایا تو لپٹ گئے، یہ ملاقات غالباً دس سال بعد ہوئی تھی۔

اس کے بعد ۲۰۰۶ء کے دونوں حجوں میں ان سے ملاقات ہوئی وہی شان قلندرانہ ہے، اللہ تعالیٰ اچھا رکھیں۔

(۸) حافظ الطاف حسین صاحب کا مالی احسان

طالب علمی کے دور کا یہ آخری واقعہ لکھ رہا ہوں اس پر اصطلاحی دور طالب علمی کا خاتمہ ہو رہا ہے، اس پر زندگی کا ورق پلٹ رہا ہے۔

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخلہ کے بعد جن رفقاء سے خواجہ تاشی کا تعلق ہوا، ان میں دو ساتھیوں سے بہت گہرا تعلق ہوا، ایسا تعلق جسے دوستی کہئے۔ ان میں ایک مولوی محمد عامر مرحوم تھے، یہ مبارک پور کے رہنے والے تھے، ان کا تذکرہ آئندہ آئے گا ان شاء اللہ، دوسرے حافظ الطاف حسین صاحب، یہ اعظم گڑھ ضلع کے ایک گاؤں محی الدین پور کے رہنے والے ہیں، اب جہاں میں مدرس ہوں، شیخوپور، اس سے ایک کلومیٹر مشرق میں یہ چھوٹا سا گاؤں ہے یہ احیاء العلوم کے ممتاز طلبہ میں شمار ہوتے تھے، قرآن بھی یہیں حفظ کیا، اور یہیں عربی فارسی تعلیم کا آغاز ہوا۔ میں جب عربی دوم میں یہاں داخل ہوا تو انھیں یہاں چھ سال گزر چکے تھے، عمر میں مجھ سے کئی سال زائد تھے، دوستی کی بنیاد اسی وقت پڑ گئی تھی،

عربی چہارم تک ساتھ رہے، عربی دوم میں یہ تکرار کرایا کرتے تھے عربی سوم و عربی چہارم میں میرے ساتھ رہے، اپنے بعض خاص حالات کے باعث عربی چہارم کی تکمیل کے بعد یہ دارالعلوم دیوبند چلے گئے وہاں انھوں نے اپنے ساتھیوں سے میرا تذکرہ کر رکھا تھا، ایک سال کے بعد جب میں دارالعلوم پہونچا تو بعض واقعات کی بناء پر ابتداء ہی میں میرا شہرہ ہوگیا تھا، تو کئی طلبہ حافظ صاحب کے حوالے سے ملنے آئے، دیوبند میں حافظ صاحب اور میرے تعلقات میں مزید پختگی آئی، ان کے والد بمبئی میں رہا کرتے تھے وہاں سے وہ پابندی سے ان کیلئے پچاس روپئے ماہانہ بھیجا کرتے تھے، اور میرے پاس تیس روپئے ماہانہ آتے، تیس روپئے میں اس وقت بہت فراغت سے کام چلتا تھا، حافظ صاحب کا شمار اصحاب ثروت میں تھا، دیوبند میں میرا اور ان کا معاملہ یہ تھا کہ ایک لفافہ میں دونوں کے روپئے مشترک طور پر رکھ دیئے جاتے تھے ان کا خرچ کم تھا، کم تو میرا بھی تھا، دیوبند میں کبھی کبھی کتابیں خریدا کرتا تھا، ظاہر ہے کہ ان کے پیسے بھی میرے خرچ میں آتے تھے مگر انھوں نے نہ کبھی حساب رکھا، اور نہ کبھی میرے اوپر اپنا کوئی احسان سمجھا، مگر میں ذہنی طور پر حساب کرتا تھا، دیوبند میں تو چھ ماہ تک ساتھ ہی رہا مگر معاملہ تتر بتر ہوگیا، انھوں نے بھی دیوبند کا پھر رخ نہیں کیا میں جب امروہہ آگیا، تو انھیں یہاں بلالیا، معاملہ پھر وہی دیوبند والا رہا، سال گزرنے کے بعد ذہنی اعتبار سے میں ان کا تقریباً ڈیڑھ دوسو کا مقروض تھا، میں نے والد صاحب سے اس کا ذکر کیا، وہ رقم انھوں نے دیدی، میں نے ڈرتے ڈرتے حافظ صاحب سے اس کا ذکر کیا، انھوں نے اس کے سننے سے بھی انکار کیا، لینے کی بات تو درکنار!

میں نے دارالمصنفین جاکر ان پیسوں سے کتابیں خرید لیں۔

ختم ہوا دور طالب علمی کا

فالحمدللہ الذی بنعمته تتم الصالحات

ابراج الخزندار   مکۃ المکرّمہ
یکم محرم الحرام ۱۴۲۹ھ مطابق ۹؍جنوری ۲۰۰۸ء

گیارہواں باب

طالب علمی سے فراغت کے بعد

دارالعلوم حسینیہ محلّہ چلہ امروہہ سے تعلیم کی تکمیل کے بعد یہ خاکسار اپنے آبائی وطن بھیرہ پوسٹ ولید پور ضلع اعظم گڑھ آگیا۔ تعلیم سے کسی طرح کچھ چھوڑتے کچھ پکڑتے فراغت ہوگئی، لیکن یہ بات سوہانِ روح تھی کہ علمی اور دینی خدمت تو مدارس سے وابستہ ہے مگر مدارس میں ہم جیسوں کا گزر کہاں؟ ہم سے پہلے ہماری رسوائی پہونچ چکی تھی جہاں کا نام لیں گے لوگ کان پر ہاتھ رکھیں گے، سوچ کی اسی کشمکش میں شعبان کے آخر میں اپنے استاذ محترم حضرت مولانا افضال الحق صاحب مدظلہ کی خدمت میں حاضری دی۔ بہت دیر تک اس موضوع پر گفتگو ہوئی، پھر مولانا نے ایک خط لکھا اور فرمایا کہ رمضان شریف میں مولانا سید اسعد مدنی کا قیام ٹانڈہ میں ہوگا، یہ خط انھیں رمضان میں ٹانڈہ پہونچ کر دے دینا۔ میں غالباً رمضان کے دوسرے عشرے میں ٹانڈہ حاضر ہوا، مولانا کے ساتھ مریدین ومتوسلین کا جم غفیر تھا، وہاں ایک روز رہا۔ مولانا کو خط دیا، مولانا نے فرمایا کہ رمضان کے بعد دہلی آؤ، میں شوال میں دفتر جمعیۃ علماء ہند میں پہونچا معلوم ہوا کہ رمضان میں مولوی طاہر حسین صاحب بھی مولانا کا خط لے کر آئے تھے، پھر چند دنوں رہ کر چلے گئے میں پہونچا تو مولانا اسعد صاحب موجود نہ تھے ان کے انتظار میں ٹھہر گیا، اور وہاں کے احوال کا جائزہ لیتا رہا، اس وقت طبیعت میں اضطراب بہت تھا، انتظار کا ایک ایک دن بھاری معلوم ہو رہا تھا، مجھے کتابوں کا ذوق تھا وہاں دفتر میں اس وقت ایک چھوٹا سا کتب خانہ تھا، اس میں سے حضرت مولانا علی میاں کی

تصنیف سیرت سید احمد شہیدؒ نکال لایا، یہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن تھا ایک جلد میں! بعد میں مولانا نے اس میں بہت اضافہ کیا اب وہ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، میں نے وہ کتاب پڑھی، تو دل پر شدید اثر ہوا کچھ تو حالات کا زخم خوردہ تھا کچھ اللہ والے کی یہ موثر داستان! اس قدر تاثر ہوا کہ میرا دل امنڈ پڑا اور آنکھوں کے راستے دریا بہہ گیا، اس وقت کی کیفیت یہ تھی کہ لحاف میں منھ ڈھک لیتا اور روتے روتے لحاف بھگو دیتا، سید احمد شہیدؒ کے حالات نے میری طبیعت کا دھارا کلیۃً دین اور آخرت کی طرف موڑ دیا، دینی اور اخروی ذوق مجھے ابتدائے شعور سے تھا، بچپن ہی میں حدیث کی بہت سی کتابیں جو اردو میں آگئی تھیں میں نے پڑھ لی تھیں، سیرت پاک جناب رسول اللہ ﷺ سے مجھے عشق تھا، غرض طبیعت کا رجحان بچپن سے ادھر ہی تھا، بعد میں ہنگامی حالات، صحبت بد کے برے اثرات اور بقول سعدی ”در ایام جوانی چنانکہ افتد وانی“ وغیرہ احوال نے دل کو زنگ آلود بنا دیا تھا، اسٹرائیک کے ہنگامے سے دل پر جو چوٹ لگی تھی اس نے اس زنگ کو ڈھیلا کر دیا، پھر سید صاحب کے پاکیزہ حالات نے زنگ کی تہوں کو اتار دیا، آنکھیں جو برسیں تو ساری کدورتیں بہہ گئیں، اب دل کا رنگ کچھ اور ہی تھا، کاروبار دنیا سے دل سرد ہو گیا، ایک دن مسجد عبد النبی (دفتر جمعیۃ علماء ہند) میں بیٹھا قرآن کریم کی تلاوت کر رہا، ایک محویت اور مستی کی کیفیت تھی، سورہ انفطار شروع ہوئی، جب اس آیت یَاأَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ. پر پہونچا تو میں ایک دم سے چونک پڑا، ایسا محسوس ہوا کہ جیسے حق تعالیٰ مجھے ہی ڈانٹ رہے ہوں کہ تم کس دھوکے میں پڑ کر خدا سے غافل ہو رہے ہو، آخر تمھارا سرمایہ کیا ہے؟ پیدا اُنھیں نے کیا، انھیں نے سب اعضاء و جوارح ہوش و گوش، عقل و ذہانت اور دل و دماغ کو درست کیا، اور انھیں نے جس صورت میں چاہا تمھیں ڈھال دیا، پھر جب سب انھیں کی طرف سے ہے تو کیوں انھیں بھول رہے ہو، یہاں پہونچ کر تلاوت رک گئی اور میں سوچ کے سمندر میں غرق ہو گیا، جب دیر کے بعد افاقہ ہوا تو سخت تھکن محسوس ہو رہی تھی، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بدن میں جان

نہیں، میں اٹھا اور بے جان قدموں سے چلتا ہوا سڑک پر آ گیا بس آئی اس پر سوار ہوا اور بستی نظام الدین تبلیغی مرکز میں آ گیا، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھ سمیت وہ ساری دنیا جس میں مَیں سانس لے رہا ہوں خدا سے غافل خودغرض پڑی ہوئی ہے، اور خودغرضی کی سزا میں اسے خود فراموشی کا عذاب بھگتنا پڑ رہا ہے، میں نے یہ سوچا تھا کہ تبلیغی مرکز میں چلوں یہ لوگ خدا کا نام بہت لیتے ہیں، دیکھوں ان میں خدا کی بندگی کس طور پر ہے، جو کچھ پڑھا تھا، قرآن میں، حدیث میں، بزرگوں کے حالات میں، نبی کی سیرت میں، صحابہ کی زندگی میں، وہ سب یاد تھا میں اسے تلاش کر رہا تھا، میرے اندر تو اس کا شائبہ نہ تھا، اپنے سے باہر اسے دیکھنا چاہ رہا تھا، جمعیۃ کے آفس میں مجھے وہ چیز نہیں ملی، جماعت اسلامی کے افراد سے کوئی امید نہ تھی، مدارس میں ایک آفت سے دوچار ہو چکا تھا، جماعت تبلیغ کی قدر دل میں تھی، مگر عملاً اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، آج اسی کی تلاش میں وہاں گیا، تقریریں سنیں، چہل پہل دیکھی مگر دل کو آسودگی نہ ملی، ایک پرانے مدرس مولانا محمد الیاس صاحب بارہ بنکوی سے ملاقات ہوئی، بہت سیدھے سادے، معصوم صفت! ان سے کچھ سوالات کئے، تو وہ ایک خاص وقت میں حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحب کی خدمت میں لے گئے وہ بہت خاموش بزرگ تھے، ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی، مگر دل متأثر بھی نہیں ہوا، ایک روز رہ کر وہاں سے واپس آ گیا، پھر آ کر روتا رہا، رو لیتا تو طبیعت ہلکی ہو جاتی، پھر سوچتے سوچتے طبیعت بوجھل ہو جاتی پھر روتا، دو روز کے بعد پھر مرکز گیا، کیونکہ مولانا الیاس صاحب نے فرمایا تھا کہ اس کام میں لگ کر دیکھو، اب کی لگنے کے ارادے سے گیا، مولانا سے ملاقات ہوئی، ہمارے اعظم گڑھ کے ایک نوجوان بزرگ مولانا عزیر صاحب سے ملاقات ہوئی، مولانا عزیر صاحب پھولوں سے بنے انسان تھے، پھول کی طرح خوشبودار، بولتے تو منھ سے پھول جھڑتے، اور دل کو چھو لیتے، انھوں نے بہت زور دیا کہ جماعت میں نکل جاؤ، میں نے کہا کہ مجھے ادھر ادھر جانے سے مناسبت نہیں ہے لیکن آپ کا حکم نہیں ٹال

سکتا، ایسے منھ سے نکلی ہوئی بات سے انحراف میرے بس کی بات نہیں، میں دو دن مرکز میں رہا، مجھے یہاں بھی کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا کہ بعض لوگ میرے بارے میں مشورے کر رہے ہیں، دو روز کے بعد مولانا عزیر صاحب نے فرمایا کہ ایک جماعت کا انتظار تھا وہ آ گئی ہے، تم اس میں شامل ہو جاؤ، اس کے امیر ایک بزرگ حافظ محمد یوسف صاحب ہیں، ان کے ساتھ دہلی ہی میں آٹھ دن لگاؤ۔ چنانچہ ان کے ساتھ آٹھ دن دہلی کی مختلف مساجد میں وقت گزارا، دین اور دینی اعمال سے مجھے دلچسپی تو پہلے ہی سے تھی لیکن تبلیغی طریقۂ کار سے مجھے دلچسپی نہ ہو سکی، البتہ امیر صاحب سے مناسبت ہوئی، امیر صاحب اچھے حافظ قرآن تھے، تہجد میں بڑے اہتمام سے قرآن کریم پڑھتے تھے اور یقین انھیں کمال درجے کا حاصل تھا، ان دونوں باتوں کی وجہ سے مجھے ان سے بہت مناسبت اور محبت ہو گئی، تقریر بھی بہت عمدہ کرتے تھے، ہمارے علاقے میں ایک بہت معروف صاحب علم خطیب مولانا ضمیر احمد صاحب علیہ الرحمہ تھے، حافظ صاحب کی تقریر جب ہوئی تو مولانا ضمیر احمد صاحب کی خطابت یاد آئی، مشکل سے مشکل بات کو آسان کر کے سمجھانے کا ایسا ملکہ تھا کہ باید وشاید! روتوں کو ہنسانا اور ہنستوں کو رلا دینا، ان کیلئے معمولی بات تھی، آٹھ دن میں ان سے خوب تعلق ہو گیا۔

تبلیغی جماعت میں ایک چلّہ

دہلی کے آٹھ روزہ دورے کے بعد پھر مرکز میں آ گئے، دو تین دن یہاں قیام رہا اس کے بعد یہ جماعت بنگال کے ضلع بردوان میں بھیج دی گئی یہ جماعت اصلاً کشمیر کے لئے آئی تھی، امیر صاحب سالہا سال سے کشمیر جماعت لے کر جایا کرتے تھے وہ مرکز کے ایک بزرگ منشی اللہ داتا صاحب خلیفہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کے مرید ومجاز تھے، اللہ تعالیٰ نے ایمان کی قوت اور یقین کی پختگی انھیں عطا فرمائی تھی، بردوان میں میں ان کے ساتھ چالیس روز رہا، ان سے محبت تو بہت ہوئی، مگر جماعت سے مناسبت

نہ ہوسکی اس سلسلے میں تفصیل آگے ان شاء اللہ آئے گی۔

حفظ قرآن کا آغاز

غالبًا بیس روز گزر چکے تھے بردوان کے دیہاتی علاقوں میں دورہ ہورہا تھا، کھانا عشاء کے بعد کھایا جاتا، کھانے کے بعد امیر صاحب مجھے ساتھ لے کر میدان کی طرف چہل قدمی کیلئے نکل جاتے انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں قرآن کی ایک سورہ پڑھتا ہوں اس کا ترجمہ آپ کریں، انھوں نے سورۂ رحمٰن شروع کی، میں ایک ایک آیت کا ترجمہ کرتا وہ یاد کرتے، چند دنوں میں انھیں سورۂ رحمٰن کا ترجمہ یاد ہوگیا، اور مجھے سورۂ رحمٰن یاد ہوگئی، انھوں نے مجھے ترجمہ سنایا، اور میں نے سورۂ رحمٰن سنادی وہ بہت خوش ہوئے، اس کی تکمیل کے بعد انھوں نے سورہ واقعہ شروع کی، میں اس کی ایک ایک آیت کا ترجمہ کرتا، چند دنوں میں انھیں ترجمہ اور مجھے سورۂ واقعہ یاد ہوگئی۔

حافظ صاحب میرے علم کی تازگی سے بہت متاثر ہوئے تھے، اب جو حافظہ کی قوت دیکھی تو کہنے لگے کہ آپ قرآن حفظ کرلیں، میں نے لبیک کہی اور اسی وقت سے آخری منزل سورۂ ق سے یاد کرنا شروع کردیا، جماعت کے مشاغل میں یاد کرنے کا موقع کم ملتا تھا، تاہم یاد کرتا رہا، اور چند دنوں میں آخری منزل پوری انھیں سنادی، ادھر وہ مجھے حفظ قرآن کیلئے زور دے رہے تھے، دوسری طرف وہ مجھے سات چلے کیلئے جماعت میں لے جانا چاہ رہے تھے، جماعت کے چالیس دن پورے ہوگئے، انھوں نے بردوان سے ایک بڑی جماعت دہلی مرکز کے لئے تیار کرلی تھی، مجھ پر زور تھا کہ میں چالیس روز کو سات چلے بنالوں، مگر میں اس کے لئے آمادہ نہ ہوسکا۔

مجھے جماعت کے طریقۂ کار، اس کے رجحانات اور اس کے مشاغل سے احساس ہورہا تھا کہ اب تک میں نے جو علم اساتذہ کی خدمت میں حاصل کیا ہے، وہ اس کے مطابق نہیں ہے۔ مجھے بکثرت انحراف محسوس ہوتا تھا، میں جب اس کا تذکرہ امیر صاحب سے

کرتا تو وہ میرے علم کو الزام دیتے اور کہتے کہ آپ کا علم آپ کیلئے حجاب ہے، میں نے صوفیہ کے کلام میں **العلم هو الحجاب الاکبر** پڑھا تھا، مگر میں سمجھتا تھا کہ اس سے دینی علم مراد نہیں ہے، یا یہ کہ دینی علم جب دنیاوی غرض کیلئے استعمال کیا جائے، تب وہ حجاب اکبر بنتا ہے، بعد میں صوفیہ کے کلام میں حجاب اکبر کی جو تشریح پڑھی تو معلوم ہوا کہ حجاب اکبر موقع ذم پر نہیں، بلکہ مدح پر ہے، اس کی قدرے تفصیل حاشیہ میں دیکھئے (۱)۔ مجھ کو یہ منطق کبھی سمجھ میں نہ آئی کہ کرو پہلے، اور سمجھو بعد میں، میں کہتا تھا کہ مجھے مطمئن کر دیجئے پھر کام لیجئے۔

---

(۱) **العلم هو الحجاب الاکبر** اس قول کا بظاہر مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ علم، حق تعالیٰ کی معرفت کے لئے ایک بڑا حجاب اور بڑی رکاوٹ ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ علماء اپنے علم کے ساتھ معرفت الٰہی کی دولت سے محروم رہتے ہیں، شاید اسی بڑی رکاوٹ کی وجہ سے تبلیغی جماعت کے اکابر نے علماء کے لئے سات یا نو چلوں کی شرط لگائی ہے، تاکہ یہ حجاب اکبر چاک ہو جائے، اور عالم کی رسائی اس حقیقت تک ہو جائے جہاں تک یہ پہونچانا چاہتے ہیں، اور غیر عالم چونکہ اس ”حجاب اکبر“ سے بری ہے، اس لئے وہ تین چلوں میں ہی حقیقت تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

لیکن یہ اس قول کی غلط تشریح ہے، اول تو یہ قول نہ قرآن سے ماخوذ ہے، نہ سنت سے، اس لئے اس کو محل استدلال میں پیش کرنا ہی غلط ہے، دوسرے یہ کہ اس کا وہ مطلب ہی نہیں ہے جو سمجھ لیا گیا ہے۔

”حجاب اکبر“ کسے کہتے ہیں؟ یہ سمجھ لینا چاہئے! قدیم زمانے میں دستور تھا کہ بادشاہ جب اپنے لاؤلشکر کے ساتھ سفر میں ہوتا، تو پڑاؤ کی جگہ شاہی خیمہ اس طرح لگایا جاتا کہ کافی دور سے اس کی حفاظت کے لئے متعدد حصار بنائے جاتے، اور ہر حصار پر پہرہ لگایا جاتا۔ یہ سب حصار حجاب کہلاتے تھے، اور بالکل آخر میں خیمہ کے قریب ایک بڑا حصار ہوتا، اس حصار میں داخل ہونے کے بعد آدمی شاہی خیمہ میں داخل ہو جاتا۔ اسی آخری حصار کو ”حجاب اکبر“ کہا جاتا ہے۔ تو علم کے حجاب اکبر ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ جب آدمی علم کے حصار کو پار کر لے گا، تو اب بارگاہ خداوندی تک پہونچنے میں اور کوئی حجاب نہیں ہے، یہ سب سے قریبی درجہ ہے جس تک پہونچنے کے بعد اب کوئی فاصلہ باقی نہیں رہا۔ پس جو کوئی اس حجاب اکبر تک پہونچ گیا، وہ گویا آخری منزل پر پہونچ گیا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ قول مقام مذمت پر نہیں ہے، بلکہ موقع مدح پر ہے۔

بہرحال چالیس دن پورے کرنے کے بعد جب جماعت کی واپسی ہونے لگی تو میں نے بنارس کا ٹکٹ بنوایا، اور وہیں اتر گیا اس طرح میں بقرعید سے پہلے گھر آ گیا، غالباً یہ جنوری ۱۹۷۱ء کی آخری دہائی تھی، تاریخیں میرے پاس محفوظ نہیں ہیں اندازہ یہی ہے۔

۱۶ر مہینے گھر پر

حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کی سیرت کے مطالعے سے دل پر جو اثر ہوا تھا، چالیس دن کے تبلیغی دورے کے بعد وہ اثر اور گہرا اور پختہ ہو گیا، ان چالیس دنوں میں بجز اللہ و رسول اور دین وعظمت دین کے اور کوئی ذکر وتذکرہ نہ تھا اس کا طبیعت پر خوشگوار اثر پڑا، گھر آ کر میں قطعی یکسو ہو گیا، تبتل کی سی کیفیت پیدا ہو گئی، عملی طور پر حفظ قرآن کا مشغلہ شروع ہو گیا تھا کوئی پوچھتا کہ کیا کر رہے ہو، تو جواب دینا آسان تھا کہ قرآن کریم حفظ کر رہا ہوں جب تک اس کی تکمیل نہ ہو گی کوئی دوسرا سوال نہ پیدا ہو گا۔

دیوبند کے حادثے کی وجہ سے محرومی، بدنامی اور لعن وطعن کے تیروں سے قلب تو چھلنی تھا ہی، بزرگوں کی سیرت اور چالیس دن کی یکسوئی نے دنیا سے دل سرد کر دیا، خلوت سے نہایت درجہ محبت اور رغبت ہو گئی تھی قرآن کریم کے حفظ کی مشغولیت نے اور یکسو بنا دیا، اس وقت جو نظام الاوقات بنایا تھا، بلکہ بن گیا تھا وہ کچھ اس طرح تھا۔

رات کو دو بجے کے بعد اٹھ جانا، جتنا حفظ ہو چکا تھا اس کا کچھ حصہ تہجد میں پڑھنا، پھر بقدر ربع پارہ (ایک پاؤ) یاد کرنا، فجر کی نماز پڑھ کر اسے پختہ کرنا اور سات بجے استاذ محترم حضرت حافظ احمد کریم صاحب علیہ الرحمہ کو ان کے گھر جا کر سنانا۔

قرآن سنا کر آتا تو گھر کے کام میں چار گھنٹہ مشغول رہتا، ظہر کی نماز کے بعد پھر قرآن کا دور کرتا اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرتا، عصر کی نماز کے بعد استاذ محترم حضرت مولانا عبدالستار صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حاضری دیتا، مغرب کی نماز کے بعد گاؤں کے نوجوان حفاظ جن کی تعداد دس بارہ تھی، کو ترجمہ قرآن کریم پڑھاتا اور یاد کراتا، عشاء کی

نماز کے بعد فوراً سو جاتا۔

یہ دستور العمل اور نظام الاوقات اس وقت تک یکساں اور متواتر رہا، جب تک حفظ قرآن کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔

اس کی تفصیل کچھ عرض کر دوں، تبلیغی جماعت کے سفر میں مجھے دو فائدے بہت اہم ہوئے، ایک تو تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز باجماعت کا اہتمام والتزام ہوا، دوسرے تہجد کی پابندی نصیب ہوئی۔ ہماری جماعت میں دو بزرگ تہجد کے بے حد پابند تھے، ایک تو امیر جماعت حافظ محمد یوسف صاحب یہ جید حافظ تھے، اور تہجد میں پابندی سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے، دوسرے مظفر نگر کے ایک بزرگ مولوی حافظ اللہ بندہ تھے یہ دیو بند کے فارغ تھے مگر علم کا مشغلہ نہیں تھا، اور بہت سادہ اور معمولی دیہاتی انداز میں رہتے تھے لیکن حفظ قرآن مجید مین امیر صاحب سے کچھ بڑھ کر تھے، وہ عموماً تہجد میں پانچ چھ پارے پڑھتے تھے، ان دونوں بزرگوں کو دیکھ کر میری آرزو بھی جاگ اٹھی، اور اسی وقت سے تہجد کا التزام کر لیا، گھر پر آ کر رات کو عموماً دو بجے یا اس کے کچھ بعد میں اٹھ جاتا، اور نوافل میں قرآن کریم کی تلاوت کرتا، اس کے بعد روزانہ ایک پاؤ قرآن مجید یاد کرتا، صبح سات بجے تک اس سے فارغ ہو جاتا، اس میں تخلُّف کم ہوتا، تخلُّف ہوتا تو کسی بیماری کی وجہ سے یا کسی ضرورت سے کہیں آنے جانے کی وجہ سے، آنا جانا تو برائے نام ہوتا، خلوت کا اہتمام بہت تھا۔

والد صاحب کے پاس دو مکان تھے ایک رہائشی مکان، اور ایک مکان میں کوئی رہتا نہ تھا، اس میں کپڑا بننے کے کرگھے لگے ہوئے تھے، جن پر مزدور کاریگر بنائی کرتے تھے، اس میں ایک بڑا صحن تھا جس میں نیم کا ایک بڑا سا سایہ دار درخت تھا، اور باقی گھاس وغیرہ سے بھرا رہتا تھا، اس میں دو لمبے لمبے کھپریل کمرے تھے، انھیں میں سے ایک میں ہتھ کرگھے تھے، ایک کمرے میں آدھے حصے میں لکڑی وغیرہ رہا کرتی تھی اور آدھا خالی تھا میں نے اسی آدھے حصے میں دیوار سے متصل تین طرف سے ٹاٹ کے پردے لگا کر چھوٹا سا حجرہ بنا لیا تھا

یہ حجرہ بس اتنا بڑا تھا کہ اس میں مَیں نماز پڑھ سکتا اور لیٹ سکتا تھا، دوایک کتاب اس میں رکھی جاسکتی تھیں، میں عام اوقات میں اسی حجرے میں رہتا گرمی محسوس ہوتی تو صحن میں نکل آتا، یہ مکان چونکہ خالی تھا اس لئے کسی کی آمد ورفت اس میں نہ تھی، صحن کے آدھے حصے کی گھاس میں نے صاف کرلی تھی اس میں وضو کرنے اور نماز پڑھنے کی جگہ متعین کرلی تھی مطالعہ کا جنون تو شروع سے تھا، اس کی گرفت سے طبیعت آزاد نہیں ہوسکتی تھی، اس دور میں عموماً دینی کتابیں، بزرگوں کے احوال اور اہل تصوف کی تصنیفات وملفوظات زیر مطالعہ رہتے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی کتاب فضائل صدقات کا مطالعہ مسلسل کرتا، خواجہ فریدالدین عطار کی تذکرۃ الاولیاء شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ کی شرح فتوح الغیب (فارسی) امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے مکتوبات کا مطالعہ کرتا رہتا، ان سب کتابوں سے اللہ کی محبت بڑھتی، شریعت کی عظمت دل میں جاگتی، دنیا سے دل سرد ہوتا، یہ سب مطالعے تھکن کے اوقات میں کرتا، ورنہ اصل کام حفظ کلام اللہ شریف کا تھا۔

حافظ احمد کریم صاحب علیہ الرحمۃ

ہمارے گاؤں کے بزرگ حافظ قرآن حضرت حافظ احمد کریم صاحب تھے، یہ گاؤں کے تمام حفاظ کے استاد تھے، حافظ صاحب کسی مدرسہ میں نہیں اپنے گھر پر طلبہ کو بلا کر پڑھایا کرتے تھے ان کے پاس دو وسیع وعریض مکان تھے ایک رہائشی اور ایک غیر رہائشی، جسے عرف میں ’’حاطہ‘‘ کہا جاتا ہے، (یہ احاطہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے) جن طلبہ کو حفظ کرنا ہوتا وہ اسی حاطے میں آکر بیٹھتے اور قرآن یاد کرتے، حافظ صاحب وقت فارغ کرکے سن لیا کرتے، حافظ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خصوصیات سے نوازا تھا، تھے تو مختصر جثہ وبدن کے، ہلکا پھلکا چہرہ اس پر ناتمام سی داڑھی، مگر رعب اس درجہ تھا کہ ان سے سب طلبہ تھراتے تھے کبھی میں نے انھیں مارتے نہیں دیکھا، ہاں ڈانٹتے تھے آواز بہت کراری تھی، زبان میں

ذرا بھی لکنت نہ تھی مسلسل بولتے تھے، دل اور طبیعت کے بہت قوی تھے کوئی کیسا ہی سنگین معاملہ ہو گھبرانا اور ڈرنا جانتے ہی نہ تھے، قرآن کریم بہت صاف اور تیز پڑھتے تھے یادداشت بہت اچھی تھی، دیندار بہت تھے اور دینی احکام میں بہت پختگی رکھتے تھے اور اس باب میں بہت جری تھے، خوش مزاج بھی بہت تھے، ان کے یہاں مغرب کی نماز کے بعد مسجد کے نمازی لوگ جمع ہوتے، وہ حقہ پیتے تھے، اہل مجلس بھی حقہ کا شغل کرتے، حقہ بھرنے کی خدمت میں نے بھی خوب انجام دی ہے، اس کا تذکرہ شاید پہلے کہیں آچکا ہے۔

میں نے جب حفظ کرنا شروع کیا تو حافظ صاحب کو سنانے لگا، اس وقت حافظ صاحب صاحب فراش تھے، کئی برس پہلے ان کے پاؤں میں ایک زبردست پھوڑا نکلا تھا، وہ پھوڑا بڑھ کر گھٹنے اور ران تک پہونچ گیا تھا، اس نے انھیں معذور کر دیا تھا مگر بہت صابر وشاکر بزرگ تھے، برسوں یہ تکلیف جھیلی مگر شکایت کا کوئی کلمہ ان کی زبان سے نہیں سنا گیا، اس حال میں بھی مغرب بعد کی ان کی مجلس قائم رہی، عشاء تک لوگ بیٹھتے اور عشاء کی اذان پر یہ مجلس برخواست ہوتی، اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت فرمائے۔

مدرسہ قرآنیہ جون پور میں حاضری

جن دنوں میں گھر پر قرآن کریم حفظ کر رہا تھا، اس وقت استاذ محترم مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ ایک مدرسہ میں نئی روح پھونک رہے تھے۔ میں امروہہ میں زیر تعلیم تھا، اس وقت جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں ایک انقلابی بھونچال آیا تھا، اس بھونچال میں مدرسہ کے بعض بڑے ستون وہاں سے اکھڑ کر دوسری جگہ نصب ہو گئے تھے۔ حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساحرؔ اور حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ یہاں سے اٹھے، تو جونپور مدرسہ قرآنیہ بڑی مسجد میں جا پہونچے، حضرت مولانا زین العابدین صاحب تبلیغی جماعت کے طویل مدتی دورے پر نکل گئے، یہ تینوں اساتذہ مدرسہ کی روح تھے، مدرسہ قرآنیہ ایک زوال پذیر پرانا مدرسہ تھا، مولانا تشریف لائے تو اس میں نئی روح آگئی، عربی کے پانچ

درجات تک تعلیم ہونے لگی، میں تبلیغی چلے سے واپس آیا اور گھر رہنے لگا، تو متعدد بار جون پور مولانا کی خدمت میں حاضری دی، مولانا کی وسعت ظرفی تھی کہ انھوں نے اپنے اس خطا کار شاگرد کو کبھی دھکا نہیں دیا، نہ کبھی برا بھلا کہا۔

اس دوران ایک مرتبہ مدرسہ قرآنیہ میں حاضر ہوا، تو ایک بڑے عالم وواعظ جن کی شانِ خطابت مشہور و مسلّم تھی، تشریف فرما تھے، ان کی مجلس میں از راہ سعادت ملاقات وزیارت کے لئے پہونچا، جب تعارف ہوا تو انھوں نے اتنے سخت کلمات نہایت ہی نازیبا اور کرخت لہجے میں کہے کہ میں سہم گیا، بلکہ میرے دل کے ٹکڑے اڑ گئے، وہ بہت بڑے تھے اور میں بہت چھوٹا تھا، ادب مانع رہا، اور گنہگاری کے احساس نے مشتعل ہونے نہیں دیا، ورنہ دل ودماغ میں جوابی کلمات موجیں مارنے لگے تھے، میں خاموشی سے وہاں سے اٹھ آیا، مگر طبیعت بے چین تھی، دل تھرا رہا تھا، نہیں رہا گیا تو میں نے بے اختیار قلم اور کاغذ کا سہارا لیا، اور ان کے نام ایک عریضہ لکھا، جو باریک خط میں فل سکیپ کے چار صفحے پر مشتمل تھا، میں نے اس میں تفصیل سے اسٹرائیک کے اسباب وعلل کو بیان کیا، اور یہ کہ طلبہ کتنے گنہگار اور کتنے بے گناہ تھے؟ اور یہ کہ اکابر نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا وہ عقل وشریعت کی میزان پر کتنا پورا اترتا ہے؟ اور صرف طلبہ کو ملامت کر کے اپنی تسلی کر لینا کافی ہے، یا خود اپنے طرز عمل پر بھی غور کرنا چاہئے؟ غرض ایک تفصیلی خط لکھ کر ان کے حوالے کر دیا، انھوں نے پڑھ کر کیا اثر لیا، اس کا فوری طور پر علم نہیں ہوا، کیونکہ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، اور جواب کیلئے میں نے لکھا بھی نہ تھا، ہاں یہ دیکھا کہ اس واقعہ کے دوسال کے بعد میری ان سے ملاقات ہوئی تو بہت مہربان اور قدر دان تھے، اس کا تذکرہ مدرسہ دینیہ غازی پور کی مدرسی کے ذکر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ

مولانا عبدالباطن صاحب

اس وقت طبیعت بے کیف ہوئی، تو اسی دن یا دوسرے دن جونپور کے علماء ومشائخ

کے محلے ملا ٹولہ میں حاضری کا قصد کیا۔ معلوم ہوا تھا کہ حضرت مولانا کرامت علی صاحب علیہ الرحمہ کے پوتے، حضرت مولانا عبدالاول صاحب کے صاحبزادۂ گرامی قدر حضرت مولانا عبدالباطن صاحب آج کل یہیں تشریف فرما ہیں، حضرت مولانا کرامت علی صاحبؒ کے حالات سے اور ان کی بعض کتابوں سے واقف تھا، مولانا عبدالاول صاحبؒ کے بھی بعض رسائل پڑھ چکا تھا، اس خاندان کی عظمت وعقیدت دل میں بسی ہوئی تھی، کچھ رفقاء مل گئے، ان کے ساتھ مولانا کے دولت خانے پر حاضری دی، حضرت مولانا کی زیارت ہوئی، سلام ومصافحہ کی سعادت حاصل ہوئی، تو ایسا محسوس ہوا جیسے گرم تپتی ہوئی زمین، آگ برساتی ہوئی دھوپ اور فضا کو جھلساتی ہوئی لو سے نکل کر کسی گھنے اور ہرے بھرے باغ کے ٹھنڈے سائے میں آ گیا ہوں، جہاں ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے، اور ہر طرف خوشبو پھوٹی پڑ رہی ہے، دل کو ایسا سکون اور روح کو ایسا اطمینان حاصل ہوا جیسے میں اپنی دنیا سے الگ کسی اور عالم میں پہونچ گیا ہوں۔ ایک روشن نورانی چہرہ جس سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں، سفید بال جیسے رحمت کی پھوار برس رہی ہو، نحیف وناتواں بوڑھا جسم جیسے روئی کے سفید گالے نے انسانی جسم کا روپ دھار لیا ہو، سلام ومصافحے کے بعد کانپتے پیروں سے اٹھے اور اندر تشریف لے گئے، اور تھوڑی دیر کے بعد بہ نفس نفیس اپنے ہاتھوں میں ایک خوبصورت ٹرے لے کر آئے جس میں میزبانی کے نفیس لوازم تھے، اور اس محبت وشفقت سے انھیں کھانے کا حکم دیا کہ ایک لمحے کو احساس ہوا کہ ہم کو بھی کسی عزت وتکریم کا استحقاق ہے، میں نے ان سے کچھ عرض کرنا چاہا، تو فرمایا کہ میں بہرہ ہوں، میرے کان میں اذان دیں گے تب بھی مشکل سے سنوں گا، اس لئے آپ زحمت میں نہ پڑیں، مجھی کو کچھ کہنے دیجئے، آپ صرف سنیں، پھر انھوں نے وہ عمدہ عمدہ نصیحتیں اس محبت سے کیں کہ طبیعت کی ساری بے کیفی ختم ہوگئی، بولتے کیا تھے منہ سے پھول جھڑتے تھے، طبیعت بے حد متاثر ہوئی، پھر گھر میں تشریف لے گئے اور چائے لے کر آئے، گرم گرم، خوشبو سے معمور! چائے پلاتے رہے اور سامعہ کو نوازتے رہے،

پھر اٹھے اور اندر جا کر اپنے تصنیف کردہ چند رسائل لے آئے، جن میں ”کشکول باطن“ خوب یاد ہے، اور بڑی محبت سے عنایت فرمایا۔

بنگلہ دیش کا اس وقت ہنگامہ چل رہا تھا، بنگلہ دیش بن جانے کے بعد وہ وہاں تشریف لے گئے، وہاں کے وہ مسلّم پیر و مرشد تھے، جانے کے کچھ ہی دنوں کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا جنازہ شرکاء کی تعداد کے اعتبار سے اب تک کا دنیا کا عظیم ترین جنازہ تھا، اخباروں نے خبر دی کہ ان کے جنازے میں چوبیس لاکھ کا مجمع تھا۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، آج بھی ان کا تصور آتا ہے تو دل پر محبت کی موج نسیم چلنے لگتی ہے۔

مولانا عبدالباطن صاحب کے یہاں سے اٹھے تو ایک مسجد میں مغرب کی نماز ادا کی، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہیں ایک جوان عالم سے ملاقات ہوئی، ان کا نام اب یاد نہیں ہے، ان سے گفتگو ہوئی، اس قدر شیریں اور فصیح وشستہ گفتگو کر رہے تھے کہ مجھے بار بار حافظ شبیر احمد صاحب یاد آ رہے تھے، میں انھیں چھیڑتا تھا کہ ان کی دلنواز گفتگو کا سلسلہ دراز ہو، ان کی گفتگو کا اتنا حصہ یاد ہے کہ وہ ہندوؤں میں تبلیغ اسلام کا ذکر کر رہے تھے، اور شاید یہ فرما رہے تھے کہ ہندوؤں میں تبلیغ اسلام کا کام نہیں ہوا، ورنہ یہاں آج ہندوؤں کی اکثریت نہ ہوتی، میں نے عرض کیا تھا کہ جن قوموں کے پاس کوئی قدیم مذہب، قدیم کتاب اور تہذیب وتمدن کا سرمایہ ہوتا ہے، ان کا اسلام کی طرف آنا عادۃً مشکل ہوتا ہے۔ اہل عرب کے پاس اور بعض دوسری قوموں کے پاس آسمانی مذہبی کتاب نہ تھی، انھوں نے تو بہت جلد اسلام قبول کر لیا، اور جن کے پاس کتاب اور مذہب رہا ہے وہ بمشکل اور کم تعداد میں داخل اسلام ہوئے۔ مدینہ میں یہود بکثرت موجود تھے، اور ان کے سامنے حضور اکرم ﷺ کی معجزانہ شخصیت موجود تھی، مگر گنتی کے چند لوگ اسلام لے آئے، اوس وخزرج کسی مذہب وکتاب کے خزانہ دار نہ تھے، تو سب ایمان لائے، معاملہ توفیق الٰہی پر منحصر ہے، مگر اسباب کی ناگزیری سے انکار بھی ممکن نہیں ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی قدس سرہ کی خدمت میں ان کے ایک

خلیفہ ایک ہندو بچہ کو لائے، اور عرض کیا کہ اس میں سعادت کے آثار ہیں، اس کے لئے قبول حق کی دعا فرمادیں، خواجہ صاحب آنکھوں میں آنسو بھرلائے، فرمایا کہ اس قوم کا ہدایت پر آنا بسا مشکل ہے، ہاں کسی بزرگ صاحب دل کی صحبت نصیب ہو تو توقع ہے، ان جوان عالم نے اس گفتگو کی تحسین فرمائی، اور میں وہاں سے بھی یہ احساس لے کر اٹھا کہ ہماری ناکارگی، گنہگاری کے باوجود کچھ بزرگوں کی بارگاہ میں قبولیت سے سرفراز ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

مدرسہ قرآنیہ میں تدریس

ان دنوں استاذ محترم مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ کو دھن تھی کہ مدرسہ قرآنیہ کو ترقی دی جائے، طلبہ کی بھی اچھی خاصی تعداد ہوگئی تھی، اساتذہ بھی منتخب اکٹھے ہوگئے تھے، مالی سرمایہ کی فراہمی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ مولانا پڑھاتے بھی تھے اور جیسے موقع ملتا صبح وشام اور جمعرات وجمعہ کو چندہ کے لئے نکل جاتے، اور اللہ جانے کہاں کہاں جاکر مدرسہ کے لئے مالیات کا انتظام کرتے، اسی دوران میں جب کبھی پہونچا اولاً انھوں نے دریافت کیا کہ کتنے وقت کے لئے آئے ہو، میں بتاتا، وہ اپنے اسباق میرے حوالے کرتے اور خود بیگ لے کر نکل جاتے، میں جب تک رہتا ان کے اسباق پڑھاتا اور مولانا اطمینان سے چندہ کرتے۔

مولانا کی یہ محبت اور ان کا یہ اعتماد، ان کی زندگی کے آخری لمحات تک اس غریب خاکسار کو حاصل رہا۔

کپڑے کی بنائی

میں نے ذکر کیا ہے کہ ہمارے گھر میں ہتھ کرگھہ تھے ایک کرگھہ رہائشی مکان میں تھی میں اب پڑھ کر فارغ ہوچکا تھا اب کسی نہ کسی معاش کے دھندے سے وابستہ ہونا، عرف عام کے لحاظ سے ضروری تھا، ورنہ والد صاحب کی کمائی کب تک کھاتا رہتا، گھر میں کرگھہ تھی جس پر والد صاحب اور مجھ سے پہلے میری بڑی بہنیں کپڑا بنتیں، بہنوں کی شادی ہوگئی

تو ایک چھوٹی بہن تھی اور میری سوتیلی والدہ، یہ دونوں اس پر کام کرتیں، میں جب گھر آ گیا اور حفظ قرآن کی تکمیل تک گھر پر رہنا طے ہو گیا تو میں نے دستور بنا لیا، کہ حافظ صاحب کو جب سبق سنا کر آتا، تو کرگھہ میں بیٹھ جاتا، اور چار گھنٹے متواتر کپڑا بنتا رہتا، اس چار گھنٹے میں تھوڑی دیر کے لئے بھی میں باہر نہ نکلتا چار گھنٹے میں ایک فینسی ساڑی تیار ہو جاتی، پھر میں اس سے نکل آتا اور کل تک کیلئے اس سے میری فرصت ہو جاتی۔

اس کرگھہ میں کپڑے کی بنائی میں ہاتھ، پاؤں اور نظر تینوں کا پورا استعمال ہوتا، مگر میرا شوق مطالعہ یہاں بھی راہ ڈھونڈتا رہا، میں یہ کرتا کہ کپڑا جو ایک لکڑی..... جسے ''طور'' کہتے ہیں..... میں لپٹتا رہتا، اس پر میں کتاب اپنے بائیں طرف کھول کر رکھ لیتا، ہاتھ اپنا کام کرتا یعنی سانچہ چلاتا، پیر اپنا کام کرتا، مگر نگاہ کتاب پر رہتی، اور میں پڑھتا رہتا، اللہ جانے کتنی کتابیں میں نے اس طرح پڑھ ڈالی ہیں۔

تدریس

پڑھنے اور پڑھانے کا ذوق وشوق فطری ہے میں نے سوچا کہ کچھ پڑھانے کا بھی مشغلہ چاہئے، میرے دینی ذوق اور پڑھنے کے شوق اور وعظ وتقریر کے ملکہ کی وجہ سے گاؤں کے دیندار نوجوان مجھ سے بہت قریب ہو گئے تھے، میں نے خصوصیت سے حفاظ سے کہا کہ آپ لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر اس کا معنی نہیں جانتے، تو ایسا کریں کہ ایک وقت متعین کر لیں اور عم پارہ کی سورتیں جو زیادہ تر نماز میں پڑھی جاتی ہیں، میں ان کا ترجمہ آپ لوگوں کو پڑھا دوں گا، حافظ محمد یوسف صاحب امیر جماعت کے عمل سے اس کا تجربہ بھی ہو چکا تھا، سب نے خوشی سے اسے قبول کیا اور مغرب بعد کا وقت مقرر ہو گیا اور میں نے الحمد شریف سے ترجمہ شروع کرا دیا کچھ ہلکے پھلکے قواعد بتاتا، الفاظ کے معنی بتاتا اور حروف ربط سمجھاتا، اور ترجمہ یاد کرا دیتا، میرا حفظ چلتا رہا، میرے حفظ میں چھ ماہ کی مجموعی مدت لگی، تیسواں پارے اور سورہ یوسف کا ترجمہ اتنی مدت میں پورا ہوا، اور حفاظ نے خوب یاد کر لیا۔

بعد نماز عصر کی مشغولیات

یوں تو سبھی اساتذہ محسن ہوتے ہیں لیکن بعض اساتذہ سے استفادہ زیادہ ہوتا ہے اور مناسبت زیادہ ہوتی ہے میرے اساتذہ میں حضرت مولانا عبدالستار صاحب علیہ الرحمہ امام جامع مسجد بھیرہ کا احسان میرے اوپر ابتدائی تعلیم میں سب سے زیادہ ہے، میں ان کے گھر ان کی اولاد کی طرح رہتا، مولانا کسی مدرسہ میں مدرس نہ تھے ہاں مدرسہ کے ناظم ضرور تھے مگر اعزازی، بغیر کسی تنخواہ کے، اور معاش کا کام وہی کپڑے کی بنائی تھا، مولانا کپڑا بنتے رہتے، اسی میں اپنے کام کا حرج کر کے مجھے پڑھاتے اس طرح ان سے قربت بہت ہوئی تکمیلِ تعلیم کے دوران بھی ان کے ساتھ یہ خصوصی تعلق باقی رہا، دیوبند کے ہنگامے کا انھیں افسوس تو بہت ہوا، مگر کبھی مجھ سے ناراض نہ ہوئے، نہ ڈانٹا، نہ اپنے یہاں آنے سے منع کیا، میری حاضری ان کے یہاں اور ان کی شفقت میرے اوپر پہلے ہی کی طرح باقی رہی، اب جو گھر رہنا ہوا تو روزانہ عصر کی نماز کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، اور یہ سلسلہ ان کے آخری لمحات حیات تک باقی رہا، (مولانا کی وفات: ۵/جمادی الاخریٰ ۱۴۲۵ھ ۲۳/جولائی ۲۰۰۴ء) میں ہوئی، ان کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے، مولانا کے فرزند اکبر مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کہ وہ بھی میرے استاذ ہیں ان کی وجہ سے یہ سلسلہ باقی ہے۔

خانہ آبادی

میں جب گھر آ کر رہنے لگا، اور حفظ قرآن کے ساتھ گھریلو مشاغل میں ضم ہوا، تو والد صاحب کو خیال ہوا کہ اب خانہ آبادی ہو جانی چاہئے۔ میرا نکاح اس وقت ہو گیا تھا، جب میں عمر کی دسویں منزل میں تھا، اس وقت ہمارے معاشرے میں نابالغی کے نکاح کا بکثرت رواج تھا، غالباً ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء رہا ہوگا، گاؤں ہی میں ایک جگہ رشتہ طے ہوا، اور مسجد میں مجھے بیٹھا کر کسی نماز کے بعد دادا مرحوم نے نکاح کا خطبہ پڑھا اور ایجاب وقبول کرا دیا۔ میں قدرے باشعور تھا، مگر نابالغ تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد رخصتی کی سلسلہ جنبانی ہونے

لگی، میری اہلیہ تین بہنیں ہیں، دو بڑی بہنوں کا نکاح ایک ساتھ ہوا تھا، تیسری بہن کی نسبت طے تھی، مگر ابھی عقد نکاح نہ ہوا تھا، سسرال کی جانب سے تحریک تھی کہ تینوں کی بارات ساتھ میں آئے، جس کا نکاح نہیں ہوا ہے، اس کا صرف نکاح ہوجائے، اور دو کی رخصتی ہوجائے۔ تیاریاں گفتگو کی حد تک شروع ہوگئی تھیں۔ میرے نانا مرحوم شادی بیاہ کے معاملات میں گاؤں کے چودھری تھے، اس مسئلہ میں ان سے مشورہ ضرور لیا جاتا تھا۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے مگر وجاہت اور رعب داب میں ممتاز تھے۔ گاؤں میں ان کا بڑا لحاظ تھا، وہ گھر پر تشریف لائے اور والد صاحب سے اس موضوع پر گفتگو کرنے لگے، کتنے باراتی جائیں گے؟ کون کون ہوں گے؟ بارات کے لوازم کو کس کس طرح برتا جائے گا وغیرہ؟ اس طرح کے معاملات میں لڑکوں کو دخل دینے اور بولنے کی گنجائش نہ تھی، میں ایک طرف بیٹھا سن رہا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ معاملہ میں اصل میں ہوں، اور علم دین کی تکمیل کرکے فارغ التحصیل ہوچکا ہوں، اور بارات میں بہت سی غیر شرعی رسمیں ہوتی ہیں، لیکن معاشرہ کی ریت یہ ہے کہ صاحب معاملہ کچھ نہ بولے، اسی لئے نانا کا خطاب میری طرف سرے سے ہے ہی نہیں، میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ پھر دل نے فیصلہ کیا جو کچھ بھی ہو، مجھے خاموش نہیں رہنا چاہئے، میں نے سر جھکا کر ڈرتے ڈرتے نانا سے پوچھا کس کی بارات کی بات ہورہی ہے؟ نانا جھٹک کر بولے تمہاری بارات کی! میں نے اپنے اسی ڈر کے لہجے میں سر جھکائے عرض کیا کہ آپ لوگوں نے مجھے علم دین پڑھایا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ دین پر عمل کیا جائے۔ میں فقہ اور حدیث دونوں طرح کی کتابیں پڑھ چکا ہوں، ان میں نکاح کا تذکرہ تو ہے مگر بارات کا ذکر کہیں نہیں ہے، اس کا کوئی تعلق شریعت وسنت سے نہیں ہے، اس لئے بارات میں مَیں نہیں جاؤں گا، اس کے بعد آپ کو اختیار ہے۔ میری معروضات سن کر ابتداءً تو نانا کو جلال آیا مگر دیندار تھے، ٹھنڈے ہوگئے، والد صاحب بھی خاموش رہ گئے، مشورہ بکھر گیا۔ دوسرے دن سسرال پیغام بھیج دیا گیا کہ محض رخصتی ہوگی، بارات نہیں جائے گی، میرے خسر بھی دیندار

تھے، انھوں نے اصرار نہیں کیا، بلکہ اور دونوں باراتیں بھی انھوں نے منسوخ کر دیں۔

تاریخ مقررہ پر میری اہلیہ میرے گھر آ گئی، اور اس وقت کی جو معاشرتی رسمیں تھیں، انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔

میری افتادِ طبع

(۱)

جن دنوں میری خانہ آبادی کا معاملہ طے ہو رہا تھا، میری طبیعت کا رنگ کچھ عجیب سا تھا، دیوبند کے حادثے نے جو چوٹ پہونچائی تھی، اور اس کے بعد حضرت سیّد احمد شہید علیہ الرحمہ کے حالاتِ زندگی نے جس طرح متاثر کیا تھا، اور پھر تبلیغی جماعت کے دورۂ یکسوئی نے جو اثر ڈالا تھا، اس کے نتیجے میں طبیعت دنیا اور لذاتِ دنیا سے نہ صرف یکسو ہو گئی تھی بلکہ ایک درجہ میں دنیا سے بیزاری کا رجحان پیدا ہو گیا تھا، رہبانیت کی طرف دل کا میلان ہو چلا تھا۔ رہبانیت کی ناپسندیدگی کے متعلق قرآن کریم کی آیت اور احادیث کا استحضار قلب و دماغ میں تھا، اس لئے اس کی طرف کوئی عملی قدم اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی، مگر دل کا رجحان اتنا شدید تھا کہ یہ نصوص دامن گیر نہ ہوتے، تو میں دنیا اور حطامِ دنیا کو جھٹک کر کہیں گم ہو جاتا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ رات کے سناٹے میں مَیں خود کو تنہا محسوس کرتا تھا، ایک خدا اور ایک بندے کے علاوہ اور کسی کا وجود محسوس نہ ہوتا۔ اس وقت اقبال مرحوم کے یہ اشعار اکثر ذہن و دماغ میں گونجا کرتے ؎

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا　　مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
تھی کسی درماندہ رہ رَو کی صدائے دردناک　　جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

اس وقت ترکِ دنیا کا اس درجہ غلبہ تھا کہ دنیا اور حیاۃ دنیا کی کسی متاع سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مجھے نہ مال کا تصور آتا نہ گھر مکان کی کوئی فکر ہوتی، نہ دنیا کے کسی مستقبل کی

طرف نگاہ اٹھتی، دلچسپی کا تمامتر محور نماز، عبادت، تلاوت اور آخرت کا تصور تھا۔ روزہ رکھتا، تو مسلسل رکھے جاتا، اس وقت کے غلبۂ رجحان نے مستقبل سے بے پرواہو کر کئی معاملات طے کر ڈالے۔ میں نے بارگاہِ الٰہی میں خاموش زبان سے یہ عہد کر لیا تھا کہ میں دنیا میں مکان کی تعمیر سے ہمیشہ کنارہ کش رہوں گا، اینٹ پر اینٹ رکھنے کا عمل نہ کروں گا، دل نے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ بھی عرض کر ڈالا کہ مال کی بہتات سے مجھے محفوظ رکھا جائے، میری قسمت کا جو بھی مال ہو اسے دوسروں کے حوالے فرمادیجئے، اور جب مجھے ضرورت ہو نکل نکل کر مال میرے پاس آجایا کرے، دوسرے میرے مال کے خزانچی اور محاسب ہوں، میں اس سے پاک رہوں، میرے اندر حساب رکھنے اور حساب دینے کی نہ ہمت ہے، نہ طاقت!

(۲)

ان دنوں جب کہ میں گھر پر مستقل مقیم تھا، کتابوں کا مطالعہ بھی جاری تھا، حفظ قرآن کا عمل بھی چل رہا تھا، محبت الٰہی اور محبت رسول کی فراوانی بھی تھی، غلبۂ محبت نے مدتوں میری زبان اور میرے قلب سے اس دعا کا ورد کرایا، جو امیر المومنین سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہے، یعنی

اللّٰھم ارزقنی شھادۃً فی سبیلک والموت فی بلد رسولک

اے اللہ! اپنی راہ میں مجھے شہادت نصیب فرمایئے، اور موت اپنے رسول کے شہر میں عنایت فرمایئے۔

میں کرگھہ پر کپڑا بنتا رہتا تھا، اس پر کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ بھی جاری رہتا، اور جب اس سے فارغ ہوتا، تو یہ دعا مسلسل جاری رہتی، اس وقت شوقِ شہادت کا عجیب عالم تھا، شوقِ شہادت میں حضرت سیّد احمد شہید قدس سرہٗ کی زبان مبارک سے یہ شعر اکثر ادا ہوتا تھا، اسے یاد کر کے میں بھی بکثرت اسے دہراتا۔

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست
اس نویدِ جاں فزا سے سر وبالِ دوش ہے

محبت نبوی

(۳)

رسول اللہ ﷺ کی محبت مَیں اپنے قلب وجگر میں ابتداءِ شعور سے پاتا تھا، جب سے حروف پڑھنے کی کچھ شُد بُد ہوئی ہے، میں نے سیرتِ پاک کا جو بھی چھوٹا بڑا رسالہ پایا، بڑے ذوق وشوق سے پڑھا۔ مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کی طالب علمی میں سیرۃ النبی (علامہ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی) بطور تلاوت کے پڑھا کرتا تھا، گھر پر عبادت کی یکسوئی حاصل ہوئی، تو جوشِ محبت میں بہت اضافہ ہوا۔ میں اپنے سفرنامۂ حج ''بطواف کعبہ رفتم'' میں لکھ چکا ہوں کہ بالکل بچپن میں جبکہ میری عمر ۹/۱۰ر سال رہی ہوگی، میں نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا تھا۔

> ''جاڑوں کی ایک رات تھی میں اپنی بہنوں کے قدموں کی جانب سویا ہوا تھا، خواب دیکھتا ہوں کہ دادا محترم گھر میں تیزی سے تشریف لائے، اور والد صاحب سے جو گھر کے کسی کام میں مصروف تھے، ڈانٹ کر کہا تم ابھی یہیں ہو اور حضور اکرم ﷺ تشریف لا رہے ہیں۔ والد صاحب فوراً کام چھوڑ کر لپکے، اور میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں ان سے زیادہ تیزی کے ساتھ باہر کی جانب دوڑا، دروازہ پر پہونچا تو حضور ﷺ تشریف لا چکے تھے، عجلت میں والد صاحب کو کوئی چارپائی نہ مل سکی تو ایک چھوٹا سا کھٹولا ہی بچھا دیا، سرکار اس پر تشریف فرما ہوئے۔ میں یہ سوچ کر کہ حضور ﷺ بچوں پر نہایت شفیق ومہربان ہیں، آپ کے پاؤں کے پاس کھٹولے پر بیٹھ گیا، آپ نے کاغذ اور قلم طلب کیا، والد صاحب نے لاکر حاضر کیا، میں سوچنے لگا کہ کتابوں میں پڑھا ہے کہ آپ لکھنا نہیں جانتے تھے، پھر دیکھا کہ آپ کچھ لکھ رہے ہیں، کاغذ کا وہ ٹکڑا اور آپ کا دست مبارک اب تک نگاہوں میں موجود ہے۔'' (ص: ۴۲)

آج پچاس باون سال گزرنے کے بعد آپ کے دست مبارک کی چمک دل میں اور آنکھوں میں تازہ ہے، دست مبارک کی پشت پر ایک رگ ابھری ہوئی اب بھی نگاہوں کے سامنے ہے، اب یہ خیال نہیں ہے کہ لکھ کر آپ نے کاغذ کیا کیا، پھر میری آنکھ کھل گئی، وہ دن میرے لئے عید سے بڑھ کر تھا، دن بھر بلکہ ایک مدت تک سرمستی سی رہی۔

جن دنوں میں شرح وقایہ پڑھ رہا تھا، ایک شب خواب میں دیکھا کہ میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوں، طبیعت خوشی سے بے تاب ہے، میں تلاش کر رہا ہوں کہ رسول اکرم ﷺ کہاں تشریف فرما ہیں، رات کا سماں ہے، اچانک مشہور صحابی حضرت سعد بن معاذ ؓ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا، اور فرمایا چلو تم کو میں حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پہونچادوں، میں شوق کے قدموں سے ان کے ساتھ چلا، کچھ دور چل کر فرمایا، ابھی ٹھہرو، تمہارا وقت ابھی نہیں آیا ہے، کچھ دنوں بعد تم کو پہونچایا جائے گا، اتنا فرمایا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی اور دل میں زیارت وحاضری کی خلش رہ گئی۔

یہ دونوں خواب مجھے ہمیشہ مستحضر رہے، گھر پر جب یکسوئی حاصل ہوئی، اور دل کا زخم ناسور بنتا رہا، تو یہ خلش بھی بڑھی اور بہت بڑھی، میں نے زیارت نبوی کے وظائف پڑھنے شروع کئے۔ دل اس جمالِ جہاں آرا کے تصور میں ہمہ وقت غرق رہتا، رات کو عشاء کے بعد بستر پر بیٹھ کر وظیفہ پڑھتا، اور محبت میں ڈوب کر یہ اشعار دہراتا، پھر آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ؎

اتنا پیغام درد کا کہہ دے　　جب صبا کوئے یار میں گزرے
کون سی شب وہ آئیں گے　　دن بہت انتظار میں گزرے

ایک عرصہ کے درد وکسک کے بعد زیارت وحاضری نصیب ہوئی، اور متعدد بار ہوئی۔ ایک بار دیکھا کہ آپ سے حدیث شریف کا سبق پڑھ رہا ہوں، ایک بار دیکھا کہ سحری کا وقت ہے اور میں گھی روٹی کا ملیدہ بنا کر خدمت اقدس میں پیش کر رہا ہوں، آپ نے

تناول فرمایا، اور مجھے بھی اس میں سے حصہ عطا فرمایا، حق تعالیٰ رسول اکرم ﷺ کی برکات سے نوازیں۔

ان دنوں خواب میں متعدد بار حرمین شریفین کی حاضری ہوئی، میں اپنے احوال کو دیکھ کر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سفر سعادت سے سرفراز کیا جاؤں گا، مگر قربان جاؤں رحمت پروردگار کے، اس وقت کے خواب، اب حقیقت میں ڈھل چکے ہیں۔ **فللّٰہ الحمد والمنۃ**

(۴)

میں پہلے کہیں لکھ چکا ہوں کہ میرا دل محبت کا گھائل ہے، طالب علمی کے زمانے میں جن لوگوں سے قلبی محبت کی بنیاد پڑی تھی، گھر آنے کے بعد خط وکتابت سے ان کے تعلقات برقرار تھے۔ میرے تعلق ومحبت والوں میں سے ایک صاحب مالی اعتبار سے پریشان رہا کرتے تھے، طالب علمی کے دور میں ان کی تنگدستی کے مظاہر دیکھا کرتا تھا، اس وقت مجھے بھی کچھ کشادگی نہ تھی، لیکن جب گھر رہنے لگا اور قدرے وسعت ملی، تو مجھے اپنے وہ دوست یاد آئے، خطوط کا سلسلہ جاری تھا، مجھے جو کچھ رقم گھر سے ملتی، جو اگرچہ بہت قلیل ہوتی، مگر اسے جمع کرکے اپنے دوست کے پاس بھیج دیتا، خود اپنے مصرف میں کم سے کم استعمال کرتا تھا، خاص خاص مواقع پر اپنے نانیہال سے کچھ آمدنی ہوجاتی، مثلاً عید بقرعید کے موقع پر عیدی مل جاتی، یا کسی اور عنوان سے ماموں یا خالہ کی طرف سے کچھ پیسے مل جاتے تو میں بذریعہ منی آرڈر بھیج دیتا۔

میں نے اپنے یہاں جاڑوں میں دیکھا کہ چند احباب مل کر گاجر کا حلوا بناتے ہیں، یہ حلوا کیا تھا، مقویات بدن کا اچھا خاصا مرکب ہوتا۔ اس کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا، بنانے کی ترکیب ہوتی، لیکن ساتھ ہی بہت لذیذ بھی ہوتا۔ گاؤں میں میرا بھی ایک حلقۂ احباب تھا، طے ہوا کہ گاجر کا حلوا بنایا جائے، تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کرکے دس بارہ آدمیوں نے گاجر کا

حلوا بنانا شروع کیا، یہ ایک طرح کی پکنک ہوتی، احباب سب اکٹھے ہوتے، جس مزاج کے لوگ ہوتے ویسی گفتگو ہوتی، میرا حلقہ دینداروں اور حفاظ قرآن کا تھا، اس لئے دینی باتیں، مسائل کا مذاکرہ، بزرگوں کے واقعات کا تذکرہ ہوتا، اس وقت طبیعت کو خوب انبساط ہوتا۔ میں اپنا حاصل مطالعہ بیان کرتا رہتا، لوگ سنتے بھی اور کام میں بھی لگے رہتے، اس طرح کے دو تین پروگرام میں میری شرکت ہوئی، یاد آتا ہے کہ دو دو کیلو حلوا حصہ میں آیا۔ حلوے کی مقدار زیادہ تھی، جس کا جی چاہا اس کا کچھ حصہ بیچ دیا اور جو رقم لگی تھی اسے خالی کرلیا، اور باقی حلوا نفع میں مفت پڑا۔ میں نے حلوا چکھا، بہت لذیذ تھا، مجھے اپنا وہ دوست یاد آیا، مجھے بڑی غیرت آئی کہ میں گاجر کا حلوا کھاؤں اور میرا دوست نانِ شبینہ کا محتاج ہو، میں نے سارا حلوا فروخت کردیا، اس کی قیمت میں مجھے پچیس روپئے حاصل ہوئے، میں نے وہ پوری رقم بھیج دی، اور طبیعت نے آسودگی اور راحت محسوس کی۔

(۵)

یہاں ایک ایسی بات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، جس کے تذکرے سے طبیعت رکتی ہے، کہ اللہ جانے پڑھنے والے اس سے کیا اثر لیں، آپ نے جہاں ’’افتادِ طبع‘‘ کا عنوان پڑھا ہے، وہ اسی خاص بات کے تذکرے کے لئے قائم کیا تھا، مگر طبیعت رک گئی، اور اس کے دوسرے متعلقات اس نے ڈھونڈ لئے۔ ایک راہ پر قلم چلنے سے ہچکچایا، تو اسی کے مناسب دوسری راہوں پر نکل چلا، لیکن اصل بات دل میں کھٹکتی رہی، لکھوں یا نہ لکھوں؟ پھر فیصلہ کیا کہ جب گفتنی اور ناگفتنی بات زبانِ قلم سے ٹپکتی جارہی ہے تو اسے ہی کیوں کیونکر زندانِ سکوت میں قید رکھوں؟ اگر قارئین کے انجانے تاثر کا تردد ہی مانع بن رہا ہے، تو اس ’’حکایت ہستی‘‘ کی جرأت ہی کیوں کی؟ اس لئے قلم کو اذنِ بیان دے رہا ہوں۔

میں ذکر کررہا تھا کہ ان دنوں میری طبیعت دنیا اور مشاغل دنیا سے بالکل یکسو تھی، دنیا کے مشغلوں میں مَیں ضرور تھا، مگر بیزار بیزار سا! طبیعت اکھڑی اکھڑی سی! امورِ آخرت

میں لگتا، تو جذب ہوکر رہ جاتا، امورِ دنیا کی طرف ضرورتاً توجہ کرتا، تو طبیعت کو وحشت ہوتی۔

اسی لئے عام رہائشی مکان سے الگ تھلگ والد صاحب کے ایک غیر مسکون مکان کے ایک گوشے میں مَیں نے ٹاٹ سے گھیر کر ایک چھوٹا سا حجرہ بقدر نماز پڑھنے اور پاؤں پھیلانے کے بنا رکھا تھا، دن رات اس میں بند رہتا، صرف فرض نمازوں کے لئے مسجد جاتا، یا سبق سنانے کے لئے حافظ صاحب کے پاس جاتا، اور مغرب بعد ترجمہ قرآن پڑھانے کے لئے گاؤں کے مکتب میں حاضر ہوتا اور بس! ہاں عصر کے بعد استاذ محترم مولانا عبد الستار صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں مختصر سی حاضری دیتا۔

اسی غلبۂ حال کے زمانے میں میری اہلیہ پہلی بار رخصت کرا کے گھر لائی گئی۔ میں نے پہلی ملاقات میں جو بات کی، وہ یہ تھی کہ مجھ کو تمہارے ساتھ باندھ تو دیا گیا ہے، مگر میں نہ دنیا کمانے کے کام کا ہوں، نہ دنیا کا کوئی کام کروں گا، اللہ کی عبادت، رسول کی اطاعت اور دین اسلام کی خدمت جس قدر مجھ سے بن پڑے گی کرتا رہوں گا، معلوم نہیں تمہارے اخراجات وضروریات کو میں نباہ سکوں یا نہ نباہ سکوں؟ دین کی خدمت میں کبھی سفر، کبھی گھر، کبھی تنگی کبھی فراخی، سب سے سابقہ پڑے گا، اگر اس تنگی ترشی کے ساتھ بخوشی گزارا کرنا منظور ہو، تو ٹھیک ہے، اور اگر نہیں، تو میں ابھی زندگی میں تبدیلی لانے سے پہلے آزاد کردوں؟

میری بیوی زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے، مگر ماشاء اللہ فہیم ہے، اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا کہ مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے، جو کچھ بھی گزرے گی، میں خوشی خوشی نباہوں گی، اور اللہ جزائے خیر دے، وہ آج تک اپنے اس قول وقرار پر قائم ہے، اس کے کچھ تذکرے اور اس کی جھلکیاں آئندہ سطروں میں آئیں گی۔ ان شاء اللہ

(۶)

اسی دور میں جبکہ دنیا سے وحشت غالب تھی، کسی ضرورت سے میرا مئوناتھ بھنجن جانا ہوا، وہاں ایک رفیق کے ساتھ مئو کے ایک مشہور عالم کی خدمت میں حاضری ہوئی، جو ایک

بزرگ عالم کے مجاز وخلیفہ تھے، انھوں نے ان دنوں ذریعۂ معاش کے طور پر ایک دکان کھولی تھی، انھوں نے باتوں باتوں میں کاروباری دشواریاں، تلاشِ معاش کی محنتیں، مال کی فروختگی کی دقتیں اور قیمتوں کی وصولیابی کی زحمتیں، اس انداز سے بیان کیں کہ میرا دل تھرا گیا، میں سوچنے لگا کہ معاش کا حصول کتنا دشوار ہے، اس میں دل، دماغ، وقت اور فرصت سب کھپ کر رہ جاتے ہیں، تب کہیں کچھ رقم حاصل ہوتی ہے، میرے دل سے بے ساختہ یہ دعا نکلی کہ:

"یا اللہ! اتنی مشکل روزی کا مجھے تحمل نہیں، آپ مجھے آسان روزی عطا فرمائیے۔"

میرا اندازہ ہے کہ یہ دعا قبول ہوگئی، حق تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ ساٹھ سال کی زندگی میں روزی کمانے کی مشقت سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔ حق تعالیٰ نے بڑی آسانیاں فرمائیں۔

(۷)

پہلے گزر چکا ہے کہ میں نے بخاری شریف استاذ محترم حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب قاسمی مدظلہ سے امروہہ میں پڑھی ہے، تنگی اور مصیبت کے جس دور میں انھوں نے اس حقیر کو اپنے دامن میں پناہ دی، اس کا گہرا اثر میرے دل پر تھا۔ مولانا کا مکان اس وقت کے ضلع اعظم گڈھ اور اب کے ضلع مئو کے مشہور قصبہ گھوسی سے چار کیلومیٹر کے فاصلے پر بجانب مشرق رگھولی گاؤں میں ہے، مولانا تعطیلات میں اپنے گاؤں تشریف لاتے، تو میں سائیکل سے خدمت میں حاضری دیتا۔ شعبان (۱۳۹۱ھ) کا مہینہ تھا، مولانا نصف شعبان کے بعد وطن میں فروکش تھے، میں ان کے یہاں حاضر ہوا، کتابوں کی الماری میں کتابیں دیکھنے لگا، اور دو کتابوں کا انتخاب کیا۔ ایک امام غزالی کی کتاب "کیمیائے سعادت" کا ترجمہ "اکسیر ہدایت" دوسرے سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی "فتوح الغیب" کی فارسی شرح جو حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے قلم سے ہے، اس کا قلمی نسخہ جو بہت عمدہ اور روشن خط میں لکھا ہوا تھا، یہ دونوں کتابیں میں مانگ کر لے آیا، اور ان کے مطالعہ میں

غرق ہوگیا۔ چند دنوں میں دونوں کتابیں پڑھ لیں، پھر دونوں نے مجھے اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا کہ قرآن کریم کی تلاوت کے بعد انھیں دونوں کتابوں میں محو رہتا۔ اسی میں رمضان کا مبارک مہینہ آگیا، اور ان دونوں کے اثر نے دنیا کے رہے سہے نقوش بھی دل سے مٹادئے، اخیر عشرہ میں اعتکاف کا منصوبہ بنایا، لیکن کس مسجد میں اعتکاف کروں؟ اس سوال پر کئی دن الجھا رہا، جس مسجد میں مَیں پنجوقتہ نمازیں پڑھا کرتا تھا، اس میں تنہائی نصیب نہ ہوتی، کیونکہ اس وقت وہ عبادت گزاروں سے ہمہ وقت معمور رہتی تھی، اور میرا دل تنہائی چاہتا تھا، گاؤں کے پچھّم محلّہ میں ٹونس ندی کے کنارے، آبادی سے قدرے ہٹ کر ایک چھوٹی سی مسجد تھی جسے گھریلو زبان میں ''اونچکی مسجد'' یعنی اونچی مسجد کہا جاتا تھا، اس وقت اس میں آبادی سے قدرے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے گنے چنے مصلی آتے تھے، اور صرف نماز کے اوقات میں آتے تھے، باقی ہمہ وقت وہ سنسان رہتی تھی، ندی کے کنارے سناٹے میں ہونے کی وجہ سے کچھ غیر مرئی روایتیں بھی اس کی طرف منسوب تھیں، اس میں کسی کو اعتکاف کی ہمت نہ ہوتی تھی، میں نے اپنے اعتکاف کے لئے اسی کو منتخب کیا، میرے خاص لوگوں نے منع بھی کیا، مگر میں مصر رہا، بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ میرے گھر سے خاصے فاصلے پر ہے، افطار کا مسئلہ تو آسان تھا، دن کا وقت ہوتا، کوئی نہ کوئی لے کر پہونچ جاتا۔ نانیہال قریب ہے، وہاں سے افطار کا انتظام ہوجاتا، لیکن سحری کا مسئلہ کیونکر حل ہوتا، مگر مجھے اصرار تھا کہ تنہائی اس مسجد کے علاوہ اور کہیں نہ ملے گی، اس لئے میں بہر حال وہیں اعتکاف کروں گا، لیکن یہ سوال ہنوز لاینحل تھا کہ سحری کون پہونچائے گا، میں والد صاحب کو تکلیف نہیں دے سکتا تھا، چھوٹا بھائی سات آٹھ سال کا تھا، اس کے بس کا کام نہ تھا، لیکن حق تعالیٰ نے پہلے ہی سے انتظام کر رکھا تھا، گاؤں کے چند بچے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں زیر تعلیم تھے۔ عبدالغفار، عطاء الحق، خیر البشر یہ شعبان و رمضان کی تعطیل میں گھر آئے تو از راہ شوق مجھ سے کچھ کتابیں پڑھنے لگے، یہ سلسلہ رمضان میں بھی چلتا رہا، حالانکہ یہ سب اس مسجد سے خاصے فاصلے پر رہنے

والے تھے، مگر انھوں نے بخوشی ذمہ لیا کہ ہم لوگ گھر سے سحری لے کر مسجد میں پہونچایا کریں گے، چنانچہ ان بچوں نے ازراہِ سعادت مندی ٹھیک وقت پر سحری پہونچانے کا سلسلہ جاری رکھا، ایسا یاد آتا ہے کہ اس وقت میں انھیں کوئی سبق بھی پڑھاتا تھا۔

اس اعتکاف کی تنہائی میں زیادہ وقت تو تلاوت میں گزرتا، باقی وقت اکسیر ہدایت اور شرح فتوح الغیب کے پڑھنے میں بسر ہوتا، تراویح کے بعد مسجد میں بالکل سناٹا ہوجاتا۔ ہلکی سردی تھی، مسقّف حصہ اکہرا تھا، دروں پر کپڑے کے پردے پڑے ہوئے تھے، مسجد کا کشادہ سا صحن تھا، میں بے خوف اور مطمئن ہوکر رہتا، رات کو عموماً ڈیڑھ دو بجے اٹھ جاتا، مسجد کے شمال میں ٹونس ندی بہتی ہوئی ہے، جنوب میں میرے رشتہ کے ایک ماموں کا مکان تھا، جو بریلوی تھے، اس لئے ان سے مناسبت نہ تھی، پچھّم طرف کچھ غیر آباد زمینیں تھیں، پورب جانب ایک تالاب تھا، جسے ہمارے عرف میں ''گڑھی'' کہا جاتا ہے، یہ مسجد آبادی کی چہل پہل سے الگ تھلگ تھی، میں رات کو اٹھتا، تو ایک ڈراؤنا سناٹا محسوس ہوتا، مگر مجھ پر کسی اور ہی حال کا غلبہ تھا، اٹھتا، مسجد کے باہر ضروریات سے فارغ ہوتا اور وضو کر کے تہجد کی نماز میں محو تلاوت ہوجاتا، ایک اللہ ہوتا، ایک اس کا غلام ہوتا، باقی سب کچھ معدوم وفنا ہوتا!

ایک روز رات کے ڈیڑھ بجے آنکھ کھلی، تو باہر صحن میں تلاوت کی آواز محسوس ہوئی، میں بستر پر بیٹھا سنتا رہا، کوئی شخص نہایت خوش الحانی سے، ہلکی آواز میں تلاوت کر رہا تھا، آواز کی نغمگی محسوس ہوئی، مگر حروف وکلمات کا ادراک نہ ہوتا تھا، مجھے خیال ہوا کہ ندی کے کنارے سے آواز آرہی ہے، میں باہر نکلا کہ آواز کچھ صاف معلوم ہو، مگر جونہی باہر نکلا آواز بند ہوگئی، پھر میں اندر آگیا، پھر آواز آنے لگی، میں پندرہ بیس منٹ تک آواز کے حسن ترنم سے محظوظ ہوتا رہا، لیکن مجھے خود بھی پڑھنا تھا، اس لئے باہر نکلا اور آواز بند ہوگئی، پھر میں وضو کر کے نماز میں مشغول ہوگیا، اور خیال نہ رہا کہ آواز آرہی ہے یا نہیں؟

☆☆☆☆☆

۱۹۷۱ء کا سیلابِ عظیم

اگست ۱۹۷۱ء کے اواخر میں ہمارے علاقے میں ایک عظیم اور ہیبت ناک سیلاب آیا، ہمارا گاؤں دو طرف سے ٹونس ندی کی آغوش میں ہے، یہ ندی ہمارے گاؤں میں شمال مغرب سے آئی ہے، گاؤں کا پورا مغربی علاقہ اس کے دائرے میں ہے، وہ مغربی حصہ میں شمال سے چل کر جنوب میں چلی گئی ہے، پھر وہاں سے پورب کی جانب مڑ گئی ہے، اس طرح جنوبی حصہ بھی اس کی زد میں ہے، پھر وہ آگے بڑھتی ہوئی محمد آباد، پورہ معروف ہوتی ہوئی مئو چلی گئی ہے، جب سیلاب آتا ہے، تو وہ گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے، اور گاؤں جزیرہ بن جاتا ہے، میرے بہت بچپن میں جبکہ میری عمر ۴؍سال کی تھی ۱۹۵۵ء میں ایک بڑا سیلاب آیا تھا، مجھے وہ سیلاب ذرا ذرا یاد ہے، گاؤں کے بڑے بوڑھے لوگ اس کا تذکرہ بکثرت کرتے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں جو سیلاب آیا وہ کم وکیف کے اعتبار سے اس کے برابر یا اس سے کچھ بڑھ کر تھا، گاؤں کی حفاظت کے لئے ہر طرف باندھ باندھے گئے تھے، یہ سیلاب کم وبیش ڈیڑھ ماہ یکساں برقرار رہا، سارا گاؤں اس سے بچاؤ کے انتظام میں مشغول رہا، رات دن باندھ کی حفاظت کے لئے پہرہ دیا جاتا تھا کہ مبادا کوئی چوپایا کوئی دشمن باندھ کاٹ دے گا، تو دم کے دم میں پورا گاؤں غرقاب ہوجائے گا، اس پہرہ اور اس کے انتظام میں گاؤں کے نوجوانوں کے دوش بدوش بلکہ کچھ آگے بڑھ کر میں بھی حصہ لیتا تھا، میں نوجوانوں میں دوڑتا پھرتا تھا، ان کی حوصلہ افزائی کرتا، اللہ رسول کی باتیں انھیں سناتا، ان کی تکان کو دور کرتے ہوئے ٹوٹتی ہوئی ہمت کو از سر نو بلند کرنے کی جدوجہد کرتا، اس وقت نوجوانوں میں میری مقبولیت ومحبوبیت بہت ہو چلی تھی، جس طرف نکل جاتا نوجوانوں میں ایک تازہ جوش وحوصلہ پیدا ہوجاتا۔ یہ سیلاب ڈیڑھ ماہ تک جما رہ گیا، ہر طرف پانی ہی پانی تھا، گاؤں کے کنارے سے کشتی چلتی اور محمد آباد یا خیرآباد کی آبادی میں جا کر رکتی، یہ تین

کیلومیٹر کا فاصلہ ہوتا، ضروریاتِ زندگی کی فراہمی اور اس کا انتظام ایک مشکل امر ہو گیا تھا، گاؤں کی جامع مسجد سیلاب کے حصار میں آ گئی تھی، پنج وقتہ نمازوں کے لئے محلّہ کے لوگ مشکل سے پہونچ پاتے تھے، جمعہ کا دن آیا، تو اس تک پہونچنے کا مرحلہ سنگین ہو گیا، راستہ گھٹنوں تک غرقاب تھا۔ لوگوں پر خوف وہراس کا تسلط تھا، ہر شخص دوسرے سے پوچھتا تھا کہ مسجد کیونکر پہونچا جائے، یہ آخری ہفتہ بہت سخت گزر رہا تھا، لوگوں کے قلوب ابل رہے تھے، میں نے اپنے استاذ امام جامع مسجد حضرت مولانا عبدالستار صاحب کے ایماء پر بعد نماز جمعہ دعاء خوانی کا اعلان کیا، مسلمان خواہ اسباب کے لحاظ سے کتنا ہی ٹوٹا ہوا ہو، تاہم دعا پر یقین رکھتا ہے، اس اعلان سے قلوب میں تازگی آئی، لوگ جمعہ پڑھنے تو جاتے ہی، لیکن اس علان کے بعد بڑے ذوق وشوق اور یقین وعزم سے مسجد کی جانب چلے، سب طرف سے لوگ پانی میں ہل ہل کر آئے، قلب مضطر اور چشم گریاں کے ساتھ آئے، جمعہ کی نماز کے بعد میں نے ایک تقریر کی، طبیعت بھری ہوئی تھی، دل شکستہ تھا، لرزتی زبان اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے الفاظ وکلمات کیا نکل رہے تھے تاثیر وتاثر کے شرارے برس رہے تھے، بولنے والا بھی کانپ رہا تھا، سننے والے بھی زیروزبر ہو رہے تھے، تھوڑی دیر تقریر کے بعد جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھے تو مسجد میں گریہ وزاری کا کہرام مچ گیا، کوئی آنکھ نہ تھی جو کھل کر نہ روئی ہو، قلوب پھٹ رہے تھے، آوازیں کانپ رہی تھیں، آدھ پون گھنٹہ وہ سماں رہا، کہ رحمت الٰہی اترتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ دعا کے بعد ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ رحمت کی چادر پوری فضا پر تانی جا چکی ہے، اب سیلاب کو اذن رخصت مل چکا ہے، چنانچہ عصر کی نماز کے وقت پانی اچھا خاصا اتر چکا تھا، اور دوسرے دن صبح کو آنکھ کھلی تو جامع مسجد کا راستہ خالی ہو گیا تھا، سیلاب باندھ کو چھوڑ کر کھسک رہا تھا، اور دیکھتے ہی دیکھتے سیلاب اتر گیا۔ فالحمد للہ والمنۃ للہ

سیلاب کے دوران میرے ساتھ ایک عجیب قصہ پیش آیا، جس کو ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں، پانی تمام میدانوں اور کھیتوں پر چھا چکا تھا، میدان کے جانور اکثر تو ہلاک ہو گئے

تھے، جن کو موقع ملا وہ آبادیوں میں گھس آئے، سانپوں کو دیکھا گیا کہ وہ درختوں پر چڑھ گئے، کشتیوں کے ملاح اہتمام کرتے تھے کہ کشتی کسی درخت کے پاس سے نہ گزرے، ورنہ درخت پر چڑھے ہوئے سانپ چھلانگ لگا کر کشتی پر آجاتے اور سواریوں میں افراتفری مچ جاتی، اور کشتی کو سنبھالنا مشکل ہوجاتا، بعض اوقات خبر آتی کہ فلاں جگہ کشتی ڈوب گئی کیونکہ سانپ کود گیا، اور افراتفری میں کشتی سنبھل نہ سکی اور کروٹ لے کر غرقاب ہوگئی۔

میں معمول کے مطابق غیر رہائشی مکان میں رات گزارتا تھا، ایک لمبا کمرہ تھا، جس میں مغربی سمت دیوار سے لگا کر جلاون کی لکڑیوں کا ڈھیر تھا، مشرقی سمت میں مَیں ٹاٹ کا حجرہ بنا کر رہتا تھا، درمیان میں دو دروازے قریب قریب بنے ہوئے تھے، اور دونوں دروازوں کے درمیانی حصے میں دو تین ہاتھ کی دیوار فاصلہ بنا رہی تھی، گرمی سخت تھی، میں ایک رات مکان کے آنگن میں سویا تھا، ڈیڑھ دو بجے آنکھ کھلی، وضو کر کے مغربی دروازے کے پاس چٹائی بچھا کر نماز کے لئے کھڑا ہوگیا، دروازے کی چوکھٹ کے پاس جلتی ہوئی لالٹین رکھ دی، اس وقت گاؤں میں بجلی نہیں آئی تھی، ہلکی ہلکی روشنی آگے لکڑیوں تک جا رہی تھی، میں قدرے آواز سے محوِ تلاوت تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک سانپ دروازے کی طرف سے لکڑیوں کی جانب بڑھ رہا ہے، سانپ خاصا بڑا محسوس ہوا، میں پڑھتا رہا کہ وہ لکڑیوں کی طرف جا رہا ہے، لیکن میری نگاہ اس پر جمی ہوئی تھی، پھر دیکھتا ہوں کہ وہ پلٹ کر چٹائی کی طرف آرہا ہے، اب مجھے تابِ ضبط نہ رہی، نماز توڑ کر میں دروازے سے باہر آگیا اور کوئی ڈنڈا تلاش کرنے لگا، کہ اسے ٹھکانے لگاؤں، ڈنڈا لے کر اندر گیا تو وہ غائب ہوچکا تھا، میں نے باقی رات آنگن میں گزاری، فجر کی نماز کے بعد میں نے گھر والوں کو اور اہل تعلق کو اس کی اطلاع کی، لکڑیاں ہٹا کر سانپ کو تلاش کیا گیا، مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ مچھلی مارنے کی بنسی میں کٹیا کے اندر کبوتر کا ایک انڈا لگا کر رکھ دیا گیا، دن بھر وہ انڈا پڑا رہا، مغرب کی نماز پڑھ کر آئے تو سانپ انڈے کو نگل چکا تھا اور دھاگا اس کے آدھے طول تک اندر گھس گیا تھا، اور وہ پھن

نکال کر پیچھے کی دیوار کا سہارا لے کر لہرا رہا تھا۔ ہمارے محلّہ کے ایک بزرگ حاجی محمد وزیر صاحب سانپ مارنے کے بہت ماہر تھے، ان کے پاس اس کے لئے متعدد ہتھیار تھے، وہ ایک ہتھیار لے کر آئے، اور اس کے ٹھیک بیچ میں اسے پیوست کر دیا، وہ ہتھیار اس کا سینہ چیرتا ہوا دیوار میں گھس گیا، تھوڑی دیر وہ تڑپتا تلملاتا رہا، پھر جھول گیا، ہمارے چچازاد بھائی محمد افضل مرحوم چاقو لائے اور اس کا جسم چیر کر چربی نکالنے لگے کہ سانپ کا تیل بناؤں گا۔

یہ زہریلا ناگ تھا، جو اپنے قد وقامت کے لحاظ سے مکمل ہو چکا تھا، لوگ کہتے تھے کہ اس کا جوڑا ابھی کہیں ہوگا، وہ بھی کبھی ظاہر ہوگا، میں نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ **سَلَامٌ عَلٰی نُوحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ** سات مرتبہ پڑھ کر ہاتھ سے دستک دی جائے تو سانپ رخصت ہو جاتے ہیں، یہی عمل میں دن میں متعدد بار کرتا رہا، پھر کوئی سانپ ظاہر نہیں ہوا۔

رمضان کا ماہ مبارک آیا، میرے ماموں زاد بھائی حافظ عزیز الرحمٰن صاحب کو تراویح پڑھانی تھی، اور مجھے ان کے پیچھے قرآن سننا تھا، گاؤں کے دکھن جانب مسلمان کوئری برادری کا ایک محلّہ ہے، کوئری ہندو بھی ہوتے ہیں، مگر میرے گاؤں کے کوئری تمام تر مسلمان ہیں، یہ سبزی ترکاری کی کاشت کرتے ہیں، ان میں پڑھے لکھے کم تھے، مسلک کے لحاظ سے بجز ایک گھر کے سب بریلوی تھے، بریلویوں میں کوئی حافظ نہ تھا، یہ لوگ ہمارے نانا کے گھرانے سے پرانا تعلق رکھتے تھے۔ ہمارے استاذ حافظ احمد کریم صاحب علیہ الرحمہ نے حافظ عزیز الرحمٰن کو متعین کیا کہ وہاں تراویح پڑھائیں، وہ لوگ بھی تیار ہو گئے، یہ محلّہ ہم لوگوں سے خاصے فاصلہ پر ہے، درمیان میں ہریجنوں کی ایک بستی ملتی تھی، مغرب کی نماز کے بعد چار آدمیوں کا قافلہ لالٹین اور لاٹھی لے کر روانہ ہوتا تھا، میرے بڑے ماموں عبدالحلیم مرحوم، منجھلے ماموں حاجی عبدالمنان مرحوم، ان کے فرزند حافظ عزیز الرحمٰن صاحب اور یہ خاکسار! ایک روز تراویح سے فارغ ہو کر ہم لوگ آ رہے تھے، گاؤں کے قریب آ کر غیر مسلموں کی ایک گلی میں داخل ہونا چاہ ہی رہے تھے کہ بڑا سا سانپ دکھائی دیا، داہنی طرف

پختہ مکان تھا، بائیں طرف کچی دیوار کا احاطہ تھا، بڑے ماموں کے ہاتھ میں لالٹین تھی، منجھلے ماموں کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، میں نے انھیں اشارہ کیا، وہ لپکے، سانپ تیزی سے کچی دیوار کے ایک سوراخ میں گھس گیا، میں ڈرا کہ وہ اندر چلا جائے گا تو شکار ہاتھ سے نکل جائے گا، میں نے تیزی سے بڑھ کر اس کی دم پر پاؤں رکھ دیا، وہ پیچ وتاب کھانے لگا، ماموں نے اس پر لاٹھی برسانی شروع کی، بڑے ماموں مجھے دانٹتے رہے کہ چھوڑو، مگر میں نے اسے دبائے رکھا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دیوار پر پاؤں جما کر اسے کھینچا، تب وہ اچانک جھٹکے سے نکلا اور تیورا کر پھن نکال کر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا، ماموں نے ایک زوردار لاٹھی اس پر جمائی اور وہ ڈھیر ہوگیا۔

اس دن سے سانپ کا خوف دل سے نکل گیا، اس کے بعد متعدد مرتبہ زندگی میں سانپ سے واسطہ پڑا، مگر دل پر کبھی خوف نہیں مسلط ہوا۔

☆☆☆☆☆

تصوف وسلوک کی طرف رجحان

مجھے بخوبی یاد نہیں کہ تصوف وسلوک کی طرف میرا رجحان کب سے ہے؟ میرا خیال ہے جب سے شعور ہوا ہے، اپنے دل میں تصوف واحسان کا ذوق پاتا ہوں، میرا دل اہل اللہ اور بزرگانِ دین کی محبت سے کبھی خالی نہیں رہا، مجھ کو جہاں تک یاد ہے، میرے دل کو روحانی دنیا میں سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی محبت ملی، بچپن کا ایک خواب میں کہیں لکھ چکا ہوں، میں لکھ چکا ہوں کہ حروف شناسی کی سعادت حاصل ہوئی تو سیرت کی ہر چھوٹی بڑی کتاب جو مجھے ملتی، اسے ضرور پڑھتا تھا، میں نے بہت بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا، جہاں تک خیال کام کرتا ہے اس وقت مکتب کے درجہ تین یا چار میں پڑھتا تھا، اور میری عمر ۹/ یا ۱۰/ سال کی رہی ہوگی۔ وہ خواب مجھے آج بھی ہو بہو یاد ہے، جیسے آج ہی کی بات ہو، میں اسے اسی باب میں ''محبت نبوی'' کے عنوان تحت لکھ چکا ہوں۔ رسول کی محبت سے میں اللہ کی محبت تک

پہونچا، میرے بچپن میں مئو کے ایک بزرگ صوفی عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ تشریف لایا کرتے تھے، میرے دادا اور میرے بڑے والدان کے ارادت مند تھے، یہ تینوں حضرات کوہنڈہ ضلع اعظم گڑھ کے ایک نقشبندی بزرگ حضرت حافظ حامد حسن صاحب علیہ الرحمہ کے مرید تھے، حافظ صاحب کے انتقال کے بعد حضرت صوفی صاحب سے ہمارے دادا وغیرہ کا رابطہ رہا میرے بچپن میں ان کا بھی انتقال ہوگیا، ان کی طرف سے جہانا گنج کے ایک بزرگ میانجی عبداللہ صاحب علیہ الرحمہ کو اجازت تھی، میں جب مبارک پور میں پڑھتا تا تو حضرت میانجی صاحب کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا، میرا ارادہ تھا کہ فراغت کے بعد ان سے بیعت ہوں گا مگر وہ بھی بارگاہ رحمت میں بلالئے گئے، اس کے بعد ذہن سے بات نکل گئی دیوبند جب پہونچا، تو سہارن پور گیا اور حضرت شیخ الحدیث صاحب سہارنپوری کے یہاں بیعت عام کی ایک مجلس میں بیٹھا مگر بیعت نہ ہوا، پھر دیوبند کا حادثہ پیش آ گیا، اس سانحے میں حضرت شیخ الحدیث صاحب گناہگار طلبہ پر شدید ناراض ہوئے، اور اس شدت کی ناراضگی ظاہر فرمائی کہ ان کی طرف رجوع کی ہمت باقی نہ رہی۔ دورۂ حدیث میں ہم لوگ تھے، حضرت مولانا افضال الحق صاحب مدظلہ سے اس موضوع پر ایک ایک مرتبہ گفتگو ہو رہی تھی، انھوں نے بھوپال کے بزرگ حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب علیہ الرحمہ کا نام لیا، ان کے ملفوظات کا مجموعہ حضرت مولانا علی میاں نے مرتب فرمایا ہے، اسے میں پڑھ چکا تھا، دل میں ایک ہلکا سا خیال پیدا ہوا مگر چند ماہ کے بعد ان کے انتقال کی خبر سنی۔

فراغت کے بعد تبلیغی جماعت کے دورہ سے جب واپسی ہوئی اور مطالعہ کا ذوق حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے مکاتیب، امام غزالی کی کیمیائے سعادت، اور سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کی کتاب فتوح الغیب اور اس کی شرح کے دروازے تک لے گیا، تو طبیعت میں ایک نئی بے چینی کا احساس شروع ہوا، اسی دور میں ڈاکٹر میر ولی الدین حیدرآبادی کی کتاب ''مدارج سلوک'' ہاتھ آئی، اسے پڑھ کر دل میں آگ لگی کہ کسی بزرگ، کسی اللہ

والے کے قدموں کے نیچے پامال ہونا چاہئے، فطرۃً سب سے پہلے مشائخ دیوبند کی طرف نگاہ گئی، مگر دیوبند کے حادثہ نے رسوا سر بازار، اس طرح کر رکھا تھا کہ کسی کے پاس حاضری دینے سے طبیعت لرزتی تھی۔

انھیں دنوں میرے قریبی گاؤں خیرآباد میں ایک روز کا تبلیغی اجتماع تھا، میں چونکہ ابھی تازہ تازہ چلہ سے واپس آیا تھا، اس میں شرکت کے لئے گیا، تبلیغی اکابر نے ہاتھوں ہاتھ لیا، کافی عزت افزائی کی، میں خوش ہوا کہ شاید پچھلا دھبہ اب مٹ جائے، مشورہ میں کسی نماز کے بعد میرا بیان طے ہوا۔ نماز کے بعد میں ارادہ کر رہا تھا کہ اٹھ کر بیان شروع کروں، تب تک دیکھا کہ ایک ذرا پرانے تبلیغی مولوی تیزی سے اٹھے اور میرے کھڑے ہونے سے پہلے وہ بیان کی جگہ پہونچ کر تقریر وافادہ میں مشغول ہو گئے، مجھے دھکا لگا، اپنی گنہگاری اور ناکارگی کا احساس جاگا، پچھلا نامۂ اعمال نگاہوں کے سامنے پھر گیا، میں بوجھل قدموں سے اٹھا، اور مسجد کے جنوبی برآمدے کی طرف آ گیا، وہاں دیکھا کہ میرے بزرگ حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے خلیفہ، انجان شہید کے رہنے والے حضرت مولانا عبدالحی صاحب تشریف فرما ہیں، انھیں دیکھ کر مجھے قدرے سکون ہوا، میں ان کی خدمت میں جا کر بیٹھ گیا، انھوں نے بڑے التفات اور بڑی محبت سے پرسش احوال کی، میں ان سے گفتگو کرنے لگا، گفتگو کا سلسلہ درد دل اور اضطراب و بے چینی تک پہونچا، ان کے سوال پر میں نے تبلیغ میں ایک چلہ لگانے کا ذکر کیا، انھوں نے مزید دلچسپی لی اور پوچھا کہ جماعت میں دل کو سکون ہوا، میں نے جو بات تھی عرض کر دی، کہ مجھے اطمینان نہیں ہوا، بلکہ بے چینی میں کچھ اضافہ ہی ہوا۔

ابھی میں نے اتنا کہا تھا کہ ایک تندمزاج نوجوان نے جنھیں میں پہلے سے جانتا تھا، اور انھیں جماعت سے بحد غلو شغف تھا، کڑک کر کہا کہ مولوی صاحب آپ کو کبھی اطمینان نصیب نہ ہوگا، آپ ہی وہ ہیں جنھوں نے ایسا ایسا کام کیا ہے، اور حوالہ دیوبند کے حادثے کا

دیا، میں خاموش ہوگیا، گنہگار تھا، گناہ کا اقرار تھا، بجز سکوت کے اور کیا کرسکتا تھا، لیکن مولانا عبدالحی صاحب نے اس نوجوان کو ڈانٹا اور سرزنش کی، اور فرمایا کہ یہاں ہر طرح کا مجمع ہوجائے گا، چلو تنہائی میں چلیں، مغرب بعد کا وقت تھا، مجھے لے کر مولانا مدرسہ منبع العلوم کی چھت پر چلے گئے، مدرسہ منبع العلوم پہلے جامع مسجد ہی کے حلقے میں تھا، بعد میں بازار کے اندر اس کی مستقل عمارت بنی، پھر عشاء کی اذان تک گفتگو فرماتے رہے، میں نے اپنے اضطراب کا ذکر کیا، انھوں نے تسلی دی، انھوں نے اس روز محبت الٰہی پر ایک مبسوط تقریر کی، جس کا اثر میرے قلب پر یہ ہوا کہ اللہ کی محبت محسوس ہونے لگی، مولانا کے ساتھ یہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی صحبت بہت مفید اور موثر ہوئی۔

مگر مجھے ہمت نہ ہوئی کہ ان سے بیعت کی درخواست کرتا، میری گنہگاری نے مجھے میرے نزدیک اتنا ذلیل کردیا تھا کہ میں کسی آستانے کے لائق نہ تھا، پھر میں نے استخارہ شروع کیا، استخارے کے دوران اپنے گردوپیش میں دیکھا تو مئو میں ایک بزرگ حضرت مولانا منیرالدین صاحب نوراللہ مرقدہٗ امام جامع مسجد مئو پر نظر پڑی، ان سے ہمارے گاؤں کے کئی لوگ وابستہ تھے اور سب نیک لوگ تھے، میں بھی ان کی خدمت میں اپنے گاؤں کے بعض بزرگوں کے ساتھ گیا، انھوں نے بہت شفقت فرمائی، میں نے ان کے سامنے اپنی گناہگاری کا سارا قصہ دہرایا، انھوں نے سننے کے بعد بھی اپنی شفقت ومحبت کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں فرمائی، بلکہ اب کچھ اور ہی شفقت بڑھادی، بار بار آنے جانے کے بعد میں نے ان سے بیعت کی درخواست کی انھوں نے قبول فرمائی اور بیعت کرلیا۔

ان سے بیعت کے بعد میری یکسوئی اور خلوت گزینی میں کچھ اور اضافہ ہوگیا، نماز وتلاوت میں خاصی حلاوت بڑھ گئی اس کے ساتھ ایک کام کا اور غلبہ ہوا، وہ یہ کہ میں نے روزوں کا سلسلہ شروع کردیا، کبھی مسلسل کبھی ایک روز ناغہ کرکے روزہ رکھنے لگا، حضرت کے بتائے ہوئے وظائف پڑھتا رہا، حضرت مولانا کے فیض صحبت کا یہ اثر ہوا کہ دل کو جو ایک

پریشانی رہا کرتی تھی، اور میں اضطرابی کیفیت میں الٹتا پلٹتا رہتا تھا، اس سے مجھے نجات مل گئی خدا کی محبت دل میں تو تھی ہی اب محبت کے ساتھ اعتماد و توکل کا عنصر بھی گھل مل گیا، اب دنیا اور اسباب دنیا کی فکر سے بالکلیہ آزادی نصیب ہوگئی، میں اپنے گرد و پیش دیکھتا کہ لوگ معاش کے مسئلے میں پریشان حواس باختہ ہیں، اور میں اپنے دل کو دیکھتا تو اسے بالکل مطمئن اور بے فکر پاتا، الحمدللہ جو کیفیت اس وقت پیدا ہوئی وہ ہمیشہ برقرار رہی۔

تدریسی ملازمت کی ایک کوشش اور ناکامی

رمضان کا مہینہ جس کے عشرہ اخیرہ میں مَیں نے اعتکاف کیا تھا، گزرا تو خیال ہوا کہ حفظ کی تکمیل ہوچکی ہے، کہیں تدریس کے لئے سلسلہ جنبانی کرنی چاہئے، فارغ ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اب شاید کوئی مدرسہ قبول کرلے۔ میرے استاذ حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ نے مدرسہ دینیہ غازی پور کے مہتمم جناب عزیز الحسن صاحب صدیقی سے میرے متعلق بات کی، دونوں میں تعلق بہت تھا، مولانا پر صدیقی صاحب کو کافی اعتماد تھا، انھوں نے قبول کرلیا، مولانا نے مجھے ایک خط لکھ کر دیا کہ سامان لے کر غازی پور چلے جاؤ، بات مکمل ہوچکی ہے۔ میں نے اپنے اساتذہ سے دعائیں لی، سب نے خوشی کا اظہار کیا، میں ساز و سامان لے کر غازی پور کے لئے روانہ ہوا، شام کو پہونچا، عزیز الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی، میں مطمئن تھا کہ یہاں سب بات طے ہوچکی ہے، میں پہونچوں گا اور وہاں کا ایک فرد بن جاؤں گا۔ عزیز صاحب نے اولاً خوشی کا اظہار کیا، مولانا سے گفتگو کا ذکر کیا، پھر افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ان سے گفتگو کافی پہلے ہوئی تھی، آپ کا انتظار تھا، آپ کے آنے میں تاخیر ہوئی تو کوپا گنج کے ایک صاحب سے بات کرلی گئی، وہ کل آجائیں گے، یہ سن کر صدمہ ہوا، مگر کیا کرسکتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ آج میں ساز و سامان لے کر گاؤں سے خوش خوش مطمئن نکلا ہوں، کل بوریہ بستر لپیٹے گاؤں میں داخل ہوں گا تو میرا کیا حشر ہوگا؟ لوگوں کی نگاہِ طعن اور زیرلب زہرخند کا مقابلہ کیونکر کروں گا، مگر مجبوری تھی، مجھے واپس ہونا ہی تھا۔

دوسرے روز صبح کو پھر اسی ساز وسامان کے ساتھ میں مدرسہ سے نکلا، گاؤں سے نکلا تھا، تو مسرت اور خوشی کی چہرے پر دمک تھی، اور اب مدرسہ سے نکل رہا ہوں تو رنج وحسرت کی کلونس چڑھی ہوئی تھی، بوجھل قدموں سے گاؤں میں داخل ہوا، اور نگاہ جھکائے ہوئے سیدھا اپنے گھر چلا گیا، ایسا صدمہ اللہ کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے، اس وقت میرے دل کا جو حال تھا بیان کے قابل نہیں ہے۔

میری بہن کا انتقال

غازی پور سے ناکام واپسی کے بعد پھر میں نے کہیں جانے کا ارادہ نہیں کیا، اسی دوران میری ایک بہن جو مجھ سے بڑی تھی اور بڑی بہن سے چھوٹی تھی، اس کا نکاح خیرآباد ہوا تھا، اس کے شوہر بہت اچھے شریف محبت کرنے والے تھے، بچے کی ولادت کے مرحلے میں اس کی طبیعت خراب ہوئی اس کے شوہر نے اپنے امکان بھر علاج کیا مگر اس کا وقت پورا ہو چکا تھا، وہ جوار رحمت میں چلی گئی، اناللّٰہ وانا الیہ راجعون، اللھم اغفرلھا وارحمھا

اس کی تجہیز وتکفین اور نماز جنازہ وتدفین سے فارغ ہو کر آیا تو اطلاع ملی کی بڑی بہن جو میرے لئے بمنزلہ ماں کے تھی، میری والدہ کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب میری عمر دو ڈھائی سال کی تھی، پرورش کی تمام تر ذمہ داری میری بہن اور پھوپھی پر تھی، معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت بہت خراب ہے اس کا نکاح سریاں مبارک پور میں ہوا تھا، میں دوسرے دن گیا اور بہنوئی سے اجازت لے کر اسے گھر لے آیا، تین ماہ تک دوا کی دوادوش رہی، ڈاکٹر کے یہاں جانا ضرورت پر ڈاکٹر کو بلا کر لانا، دوائیں لانا، دواؤں کا استعمال کرانا، یہ سب خدمت میں نے انجام دی، اخیر میں میری اہلیہ بھی اس خدمت میں شریک ہوگئی تھی مگر اس کا وقت بھی پورا ہو چکا تھا، تین ماہ میرے گھر رہ کر وہ بھی راہی ملک عدم ہوئی، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون اس کی وفات کا صدمہ مجھے بہت محسوس ہوا۔

پھر امروہہ میں

بہن کی وفات کے بعد دل میں ایسا خلا پیدا ہوگیا کہ مجھے وحشت سی ہونے لگی ، گھر میں جاتا تو بہن کا چہرہ نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتا، باہر کی دنیا میں کچھ زیادہ انس نہ تھا طبیعت کی بے کیفی بڑھی تو میں سوچنے لگا کہ کچھ دنوں کے لئے گھر سے باہر چلا جاؤں، لیکن کہاں جاؤں؟ اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا صرف جانا ہی نہ تھا اپنے گھر والوں اور دوسرے اہل تعلق کو مطمئن بھی کرنا تھا، میری قسمت تھی کہ انھیں دنوں جمعیۃ علمائے ہند نے ایک سالانہ اجلاس دہلی میں طے کیا، اس کے اشتہارات ہمارے یہاں بھی آئے، میں نے فرار کا دروازہ پالیا، والد صاحب سے اپنی وحشت کا تذکرہ کیا اور دہلی اجلاس میں جانے کی اجازت چاہی کہ وہاں میرے کئی اساتذہ اور اکابر ملیں گے، ممکن ہے کوئی راہ عمل کھلے، والد صاحب نے اجازت دیدی، جن حفاظ کرام کو میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھاتا تھا ان سے اس کا تذکرہ کیا، تو وہ بے چین ہوئے، مگر میری طبیعت کا اضطراب دیکھ کر کچھ نہ بولے۔

پھر ایک دن، رات میں میرے انھیں احباب نے محمد آباد اسٹیشن پر مجھے ایک ٹرین میں سوار کرادیا، میں اس وقت کس اضطرابی حالت میں تھا، اسے آج شاید بیان کرنا میرے لئے مشکل ہو، بظاہر کوئی مستقبل نہ تھا ایسے ہی بغیر کسی منزل کے میں گھر سے نکل پڑا تھا، اصل میں میرے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی پڑھنے لکھنے میں جو کچھ محنت کی تھی ، طالب علمی میں ذہانت وذکاوت اور درس وتدریس کی وجہ سے جو کچھ عزت حاصل ہوئی تھی مستقبل میں میرے بزرگوں نے اور خود میں نے جو توقعات وابستہ کی تھیں اسے ہنگامہ کی ایک آگ نے جلاکر خاکستر کردیا تھا، اب کوئی شخص سیدھے منھ بات کرنا تو درکنار نام سننا بھی پسند نہ کرتا تھا، عزت کے بعد بے عزتی ، نیک نامی کے بعد بدنامی ، کارآمد ہونے کے احساس کے بعد ناکارگی کا خیال اس درجہ تکلیف دہ تھا کہ جینے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر مرکر ہی کیا مل جاتا، اس وقت میں سوچا کرتا تھا کہ کہیں جاکر گم ہوجاؤں، ایسی جگہ جہاں کوئی مجھے پہچانتا نہ ہو اور میں

اپنے کو چھپالوں، کسی پر ظاہر نہ ہونے دوں کہ میں پڑھا لکھا ہوں، ایک عام آدمی کی سی زندگی بسر کرلے جاؤں، لیکن کیا ایسا ممکن تھا؟ میں نے کچھ دنوں کے لئے اپنا نام بدلنے کی کوشش کی ’’نعیم اختر‘‘ نام رکھا اور اس نام سے بعض مضامین اور رسالے بھی شائع ہوئے، مگر یہ کارروائی کیا نفع دیتی، جو دھبہ لگ چکا تھا وہ اتنا بڑا تھا کہ یہ سب کم ظرفیاں اسے ہرگز دھو نہ سکتی تھیں۔

کہیں ان دیکھی منزل کی طرف ٹرین کی رفتار مجھے بھگائے لئے چلی جارہی تھی ایک وقفہ دکھائی دے رہا تھا کہ میں دہلی جارہا ہوں، خیر میں نے اپنے آپ کو ڈال دیا تھا، گاڑی نے دہلی پہونچادیا، میں اسٹیشن سے اتر کر سیدھا عیدگاہ پہونچا جہاں جمعیۃ علماء کا اجلاس شروع ہو چکا تھا، یہ مئی ۱۹۷۲ء کی کوئی تاریخ تھی، اجلاس میں حضرت مولانا افضال الحق صاحب سے ملاقات ہوئی، پوچھتے رہے کہ کیا کرتے ہو، میں نے حفظ قرآن کی بات عرض کی تو بہت خوش ہوئے، وہ اجلاس کے انتظامات میں منہمک تھے کچھ زیادہ بات نہ ہوسکی۔

اجلاس میں امروہہ کے ایک اور استاذ حضرت مولانا سید عبدالحی صاحب علیہ الرحمہ سے ملاقات ہوئی ان سے ذرا تفصیل سے بات ہوئی، مولانا نے فرمایا کہ اگر تیار ہو تو میسور چلے جاؤ، میسور کے کچھ لوگ آئے ہیں وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد پچھلے سال ڈالی گئی ہے، وہاں علم کا کوئی ماحول نہیں ہے وہاں ضرورت ہے کہ مدرسہ کیلئے ماحول تیار کیا جائے میں نے کہا کہ میں کہیں بھی جانے کیلئے تیار ہوں، حضرت مولانا رمضان شریف میں میسور جایا کرتے تھے، وہاں ان کے تعلقات بہت تھے، تعلقات کے وہی لوگ مولانا سے ایک عالم مانگ رہے تھے، میں نے آمادگی ظاہر کی مجھے یاد آیا کہ میرے مرحوم استاد حضرت مولانا محمد یحیٰ صاحب نوراللہ مرقدہ کبھی کبھی فرماتے تھے، کہ میسور ضرور جانا وہاں کی آب وہوا بہت اچھی ہے، مجھے خوشی محسوس ہورہی تھی کہ شاید استاذ مرحوم کے ارشاد کی تکمیل ہوجائے گی۔

مولانا نے ان حضرات سے بات کرلی، میسور کے لوگوں نے کہا کہ واپسی کے بعد ہم لوگ باضابطہ دعوت نامہ اور کرایہ بھیجیں گے، تب بھیجئے گا، مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ تھوڑا سا

وقفہ ہوگا، چاہیں تو آپ گھر ہولیں میں نے گھر جانے کی نفی کردی فرمایا کہ امروہہ چلے چلئے وہ آپ کی مانوس جگہ ہے چندروز کے بعد آپ میسور چلے جایئے گا، میں نے حضرت مولانا افضال الحق صاحب سے تذکرہ کیا مولانا خوش ہوئے۔

اجلاس ختم ہونے کے بعد میں امروہہ چلا آیا، یہاں محلّہ بڈوال کے ایک حاجی صاحب بہت نیک بزرگ تھے، مجھ سے انھوں نے فرمائش کی کہ ان کا ایک پوتا جاوید نامی ہے وہ انگریزی اسکول میں پڑھتا ہے، آج کل چھٹیاں ہیں، اسے عربی پڑھا دیجئے میں نے حامی بھرلی، لیکن شرط رکھی کہ میں گھر جا کر نہیں پڑھاؤں گا، مدرسہ میں ہی آکر پڑھ لیا کرے، حاجی صاحب نے منظور کرلیا، وہ بچہ آنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ دونوں وقت کھانا بھی لاتا۔

تدریس

حضرت مولانا نے فرمایا کہ جب تک میسور جانے کا انتظار ہے، یہاں ایک استاذ مولانا عبدالمنان صاحب مظفر پوری گھر گئے ہوئے ہیں اور چھٹی ان کی قدرے لمبی ہے، ان کی کتابیں پڑھاؤ، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ بے کاری میں کام مل گیا، چنانچہ ان کی کتابیں مجھے پڑھانے کیلئے مل گئیں وہ کتابیں یہ تھیں۔

مختصر المعانی، مقامات حریری، مرقات، هداية النحو، یہ چار تو یاد ہیں، ایک دو اور تھیں، اب وہ یاد نہیں۔ ان جماعتوں میں بعض طلبہ بڑی عمر کے تھے، دو طالب علم تو بہت معمر تھے، ایک ترپین سال کے اور ایک ان سے کچھ کم، میں نے یہ کتابیں بے تکلف پڑھانی شروع کردیں، طلبہ بہت مطمئن ہوئے، مدرسہ پر میرے رہنے کا کوئی بار بھی نہ تھا کوئی معاوضہ مجھے لینا نہیں تھا، کھانا بھی بڈوال والے حاجی صاحب کے یہاں سے آتا تھا، میں بھول گیا کہ مجھے میسور جانا ہے، انتظار کچھ تھا مگر مضمحل سا، اس طرح دو ماہ گزر گئے۔

وہاں ایک چھوٹا سا طالب علم بنگال کا رہنے والا انجم الحق نام کا تھا، بہت ذہین اور بہت صالح، پڑھنے کا اسے خاص شوق تھا اس کے شوق کو دیکھ کر ہدایۃ النحو میں نے اسے جماعت

سے الگ پڑھائی، وہ بہت جلد ہدایۃ النحو پر حاوی ہوگیا، مجھے امید ہوئی کہ یہ طالب علم آگے چل کر کام کا نکلے گا۔

مولانا نجم الحق سلّمہٗ

بہت عرصے کے بعد تقریباً تیس بتیس سال کے بعد میں کلکتہ میں جامع مسجد نارکل ڈانگہ کے امام وخطیب مولانا شرافت ابرار صاحب سلّمہٗ کے کمرے میں مقیم تھا، کسی ضرورت سے باہر گیا واپس آیا تو ایک صاحب پستہ قد، تنومند، بھاری بدن کے، داڑھی میں قدرے سفیدی آچلی تھی، پان کھائے ہوئے اسی کمرے میں بیٹھے تھے، میں گیا تو اٹھ کر انھوں نے بہت ادب اور تعظیم سے مصافحہ کیا، میں نے تعارف چاہا تو کہنے لگے میں نجم الحق ہوں، میں حیرت میں پڑ گیا، میں نے کہا کہ وہ بچہ سا نجم الحق جو امروہہ میں مجھ سے هداية النحو پڑھتا تھا، بولے ہاں میں وہی ہوں، اور آپ نے جو ہدایۃ النحو پڑھائی تھی، میری کائنات علم نحو میں وہی ہے، اس کے بعد جتنی کتابیں علم نحو کی پڑھی ہیں سب اسی ہدایۃ النحو کی روشنی میں پڑھیں، جو آپ نے پڑھائی تھی، میں تو اپنے طلبہ سے کہا کرتا ہوں کہ علم نحو پڑھنا ہو تو مولانا اعجاز احمد صاحب سے پڑھنا چاہئے۔

معلوم ہوا کہ یہ مولانا نجم الحق سلّمہٗ مدرسہ شاہی مرادآباد سے فارغ ہوئے، اور حضرت مولانا عبد الجبار صاحب شیخ الحدیث سے بیعت ہوئے، اور انھیں سے اجازت بیعت پائی، اب گجرات کے کسی بڑے مدرسے میں شیخ الحدیث ہیں۔

☆☆☆☆☆

بارھواں باب

میسور میں

امروہہ کا یہ قیام ایک عبوری دور کا قیام تھا، ہر روز انتظار تھا کہ میسور سے بلاوا آجائے، تو رخت سفر باندھا جائے، امروز وفردا کرتے کرتے دو ماہ کی مدت گزر گئی۔ جولائی ۱۹۷۲ء کا دوسرا عشرہ تھا کہ مولانا سیّد عبدالحی صاحب نوراللہ مرقدہ کے نام میسور سے پیغام آیا کہ آپ اپنے شاگرد کو بھیج دیجئے، کرایہ کی رقم بھی ساتھ ساتھ آئی۔ میں نے دلی میں مولانا عبدالوحید حیدرآبادی کو لکھا کہ جی۔ ٹی اکسپریس سے مدراس کا ٹکٹ ریزرو کرادیں، مولانا موصوف دیوبند میں میرے بزرگ کرم فرما تھے، اس وقت وہ جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور مسجد عبدالنبی دفتر جمعیۃ علماء میں امامت کرتے تھے، انھوں نے مجھے ٹرین پر سوار کرادیا۔ اب میں اپنے وطن سے دور بہت دور جنوبی ہند کی ریاست میسور حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی سرزمین کی طرف بڑھتا جا رہا تھا، مدراس اتر کر چھوٹی لائن کی ٹرین پر میسور کیلئے بیٹھا۔ ایک سرسبز وشاداب علاقے میں، لطیف وخنک ہواؤں میں ٹرین دوڑ رہی تھی، طبیعت مچل رہی تھی، ایک وجد کی سی کیفیت چھائی جا رہی تھی، جی میں آ رہا تھا کہ کسی سنسان وادی میں اتر جاؤں اور کسی پہاڑی ندی یا چشمے کے کنارے ڈیرا ڈال دوں، پھر میں ہوں اور کائنات کی وسعت میں میرے پروردگار کی یاد ہو۔ اس وقت علامہ اقبال کی نظم مجھے یاد آ رہی تھی، میں بے چین تھا کہ کاش مجھے خلوت کی یہ یکسوئی حاصل ہوتی، اور مجھ میں اور میرے پروردگار کی یاد میں

ایک خوشگوار سناٹے کے علاوہ اور کوئی چیز حائل نہ ہوتی۔ اقبالؔ مرحوم کی نظم یہ ہے۔ ؎

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامُشی پر، یہ آروز ہے میری
دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں، عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو، چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ مزا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے بھرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمین کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھادے
جب آسماں پہ ہرسو بادل گھرا ہوا ہو
پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن
میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر وحرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑے کا مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا میرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
اس خامشی میں جائیں ، اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہردردمند دل کو رونا میرا رلادے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگادے

(کلیات اقبال ص۴۶/۴۷ بعنوان ”ایک آرزو“)

اس وقت غالب کے یہ اشعار بھی یاد آئے

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے درودیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مرجایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ٹرین سترہ گھنٹے چلتی رہی، علی الصباح وہ میسور کے اسٹیشن پر رکی، تو ایک شاداب اور پُر بہار شہر کی فضا نے مجھ پر گویا سحر کر دیا، اتنی لطیف اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی کہ دل کی کلی کھلی جا رہی تھی، ایک آٹو رکشہ پر بیٹھا، اسے بتایا کہ چوک پر لے چلو، اسٹیشن سے چوک تک خاصا فاصلہ تھا۔ آٹو رکشہ پُرسکون سڑک پر دوڑ رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ کچھ مرد اور کچھ عورتیں اپنے سروں پر پھولوں سے بھرے ہوئے ٹوکرے لادے ہوئے سڑک کے کنارے خراماں خراماں چل رہے ہیں، پھولوں کا حسن نگاہوں کو اور ان کی خوشبو فضاؤں کو نظارۂ جنت بنا رہی ہے، موسم اتنا سہانا کہ ہمارے یہاں کا موسم بہار بھی اس سے مات کھائے، طبیعت جو ایک عرصہ سے اداسی، مایوسی اور حسرت وحرماں کی خوگر بنی ہوئی تھی، یکا یک انگڑائیاں لینی لگی، میں سوچ رہا تھا کہ اگر میری طبیعت موزوں ہوتی اور شعر گوئی کا ذوق ہوتا تو اس وقت ایک مرصع بہاریہ نظم تیار ہو جاتی، دل وجگر میں ایک اہتزازی کیفیت کی مستی تھی، حسن وخوشبو سے لبریز یہ شہر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

آٹو رکشہ رکا، میں اترا، سامنے ایک جوان، باریش مرد دیندار پر نظر پڑی، میں آگے بڑھا، وہ بھی میری طرف لپکے، میں نے سلام کیا، مصافحہ کیا، میں نے عرض کیا کہ میں یہاں اجنبی ہوں، آپ مجھے بتائیں کہ ”خاکی شاہ پہلوان“ کی مسجد کہاں ہے؟ انھوں نے کہا

آپ یوپی سے آرہے ہیں، میں نے ہاں کہی، وہ خوش ہوکر کہنے لگے کہ آپ کا انتظار ہے، چلئے، انھوں نے میرا بیگ لے لیا اور ایک طرف چلنے لگے، تھوڑی دور چل کر ایک پختہ قبر کے سامنے پہونچے اور بتایا کہ یہ خاکی شاہ کا مزار ہے، اور یہ ان کی مسجد ہے۔ ایک اوسط درجہ کی مسجد! پورب اور شمال میں خاصا بڑا میدان نما صحن، مشرق وجنوب کے گوشہ میں خاکی شاہ کی پختہ قبر، جس کے اوپر ایک کھلی ہوئی مسقّف عمارت! شمال میں استنجا خانے وغیرہ، مسجد سے متصل جنوب میں امام کے لئے ایک بڑا سا حجرہ! رہبر نے اسی حجرے میں میرا سامان رکھا، اور کہا کہ چلئے آپ بھوکے ہوں گے، میں آپ کو ناشتہ کراؤں، اور میں واقعی بھوکا تھا، کیونکہ سفر میں کھانے پینے کی بالکل عادت نہ تھی، وہ ایک ہوٹل میں لے گئے، انھوں نے اپنا نام عبد الرحیم بتایا، انھوں نے ہوٹل میں بیٹھایا، میں ہوٹل سے شمال میں بھی مانوس نہ تھا، جنوب میں کیا مانوس ہوتا؟ انھوں نے میز پر کچھ منگایا، میں اسے دیکھ کر حیران تھا کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ اٹلی ہے، چاول کے آٹے سے بنتی ہے، اسے انھوں نے توڑا، اور ایک خاص قسم کی ترکاری کے سالن میں ملایا۔ مجھے اچھی تو نہ لگی، مگر بھوک نے ایک خاصی حد تک اسے خوشگوار بنائے رکھا، چائے سے فارغ ہونے کے بعد میں پھر اسی حجرے میں آگیا۔ وہ مسجد کے ارباب انتظام کو میری آمد کی اطلاع دینے چلے گئے اور میں بستر پر دراز ہوگیا، اور تھوڑی دیر میں نیند کی آغوش میں بے خبر ہوگیا۔

وہ جمعہ کا دن تھا، گیارہ بجے آنکھ کھلی تو مسجد کے سکریٹری کے۔ نذیر احمد صاحب اور بعض دوسرے اراکین موجود تھے، سب سے ملاقات ہوئی، انھوں نے بتایا کہ ابھی فی الحال آپ کو اس مسجد میں امامت کرنی ہے، جمعہ کا خطبہ دینا ہے، اور اس کے ساتھ ایک مدرسہ کے لئے فضا ہموار کرنی ہے۔ دو سال پہلے یہاں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے دست مبارک سے مدرسہ صدیقیہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے، شہر کا ماحول مدرسہ کے حق میں زیادہ سازگار نہ تھا، اتنا بڑا شہر کسی عالم دین سے بالکل خالی تھا، مساجد کے

ائمہ عموماً عالم تو کیا ہوتے، حافظ قرآن بھی نہ تھے، بدعات ورسومات کا دور دورہ۔ تبلیغی جماعت کا کام کسی قدر شروع ہو چکا تھا، خاکی شاہ کی مسجد کی منتظمہ کمیٹی، تبلیغی جماعت کے ساتھ مربوط تھی، لیکن بریلویت کا غلبہ تھا، جمعہ کے خطبہ کا مطلب یہ تھا کہ پہلا خطبہ اردو میں تقریر کی شکل میں ہوتا تھا، مجھے یہ بات عجیب سی لگی، ہمارے یہاں دونوں خطبے عربی میں ہوتے ہیں، یہاں اصرار تھا کہ پہلا خطبہ اردو میں ہو، میری طبیعت رکی، مگر اندازہ ہوا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو فتنہ ہوسکتا ہے، میں نے سوچا کہ عربی میں خطبہ سنت تو ضرور ہے، لیکن فرض نہیں ہے، اور خطبہ جتنا فرض ہے وہ تقریر کے پہلے خطبہ پڑھنے سے ادا ہوجائے گا، اس لئے مسلمانوں میں انتشار سے بچنے کے لئے اگر اردو میں تقریر کردی جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ مجھے لوگوں نے بتایا کہ اس سے پہلے یہاں میسور میں ایک فاضل دیوبند اور اعلیٰ درجے کے خطیب مولانا عبدالرحیم صاحب بستوی (حال استاد دارالعلوم دیوبند) اسی طرح خطبہ دیا کرتے تھے۔ میں نے مصلحتاً اور کرہاً حامی بھرلی، یہاں خطبہ کے لئے ہاتھ میں عصا لینے کی بھی شرط تھی، اور اسی غرض سے ایک خاص قسم کا عصا ہر مسجد جامع میں رکھا رہتا تھا، خطیب اسے بوقت خطبہ ہاتھ میں رکھتا تھا۔ نماز کے لئے عمامہ کی بھی شرط تھی، امام کے لئے صافہ باندھنا ضروری تھا، خواہ رومال ہی کو بطرز عمامہ لپیٹ لے۔

مجھے ان بے جا شرطوں سے وحشت ہوئی، مگر مجھے کام کرنا تھا، میں نے ان غیرضروری رسوم کو قبول کرلیا کہ جب کام شروع ہوگا تو آہستہ آہستہ ان کا التزام ساقط ہوجائے گا۔

لوگوں نے ایک اور عجیب بات سنائی، جو میں کسی طرح قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا، مگر لوگوں کے جبر واصرار اور مصلحت اندیشی کے باعث قبول کرنی پڑی، وہ یہ کہ ہر نماز کے بعد سنتوں سے فارغ ہوکر تمام مقتدی بیٹھے رہتے ہیں، امام اس وقت بلند آواز سے **الفاتحة** پکارتا ہے، پھر سب لوگ سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں، اس کے بعد امام کچھ اور دعائیں

باآواز بلند کرتا ہے، پھر لوگ اٹھتے ہیں، یاد آتا ہے کہ لوگ اس کے بعد مصافحہ بھی کرتے ہیں۔

یہ سب باتیں مجھ ناواقف کو پہلی ہی ملاقات میں منتظمین نے بتادیں، اور یہ بھی سنادیا کہ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ کے رہنے اور کام کرنے کی گنجائش نہ ہوگی۔

چنانچہ یہ ساری پابندیاں مجھے پہلے ہی روز جمعہ کی نماز پڑھانے میں برتنی پڑیں۔ تقریر کرنے کا ملکہ تو تھا ہی، پہلا خطبہ ہاتھ میں عصا لے کر کسی خاص موضوع پر دیا، دوسرا خطبہ عربی میں ہوا۔ نماز کے بعد دعا بالجہر کی، سنتوں سے فراغت کے بعد دعائے الفاتحہ ہوئی، اس کے بعد مصافحہ شروع ہوا، ہر مصلّی نے فرداً فرداً مصافحہ کیا، اور اس طرح سے کیا کہ ہر شخص اپنے انگوٹھے سے میرے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو زور سے دباتا، آخر آخر میں اس میں شدید درد ہوگیا۔ میں نے عبدالرحیم سے پوچھا کہ یہ کیا حرکت تھی، لوگوں نے میرے انگوٹھے کو تقریباً توڑ ہی دیا، کہنے لگے آپ کو معلوم نہیں، یہاں یہ بات معروف ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کے انگوٹھے میں ہڈی نہیں ہے، یہ دبا دبا کر دیکھتے ہیں کہ یہ صاحب خضر علیہ السلام تو نہیں؟ میں اس جاہلانہ عقیدے اور حرکت پر متعجب ہوا۔

بہر حال پہلی تقریر اور پہلی نماز ان کے معیار پر کامیاب اتری، وہیں سے نیک نامی اور شہرت کا آغاز ہوا۔ لوگوں کو یہ اندازہ ہوا کہ میں تقریر اچھی کر لیتا ہوں، اس وقت میسور شہر میں جہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہے اکیلا مولوی میں ہی تھا۔ بڑی عزت اور آؤ بھگت ہوئی، لوگوں نے خطبۂ جمعہ کے علاوہ میری تقریروں کے پروگرام رکھنے شروع کئے، شہر کے مختلف حلقوں میں کچھ اکھاڑے تھے، جہاں کشتی ہوتی، فنونِ سپہ گری، بنوٹ وغیرہ کی مشق ہوتی، ان جگہوں کو وہاں کے عرفِ عام میں ''تعلیم'' کہا جاتا۔ انھیں ''تعلیموں'' میں پروگرام ہوتے، میں جاتا اور جتنی اللہ توفیق دیتا وعظ کہہ کر چلا آتا، یہ پروگرام روزانہ ہوتے، بلکہ بعض دنوں میں کئی کئی جگہ ہوتے۔ اس وقت طبیعت کی کمان چڑھی ہوئی تھی، تبلیغ دین کا جوش بہت تھا، لوگ پروگرام بناتے، آ کر لے جاتے، میں نہ سستی کرتا اور نہ معذرت کرتا اور نہ

پروگراموں پر کسی طرح کا ہدیہ قبول کرتا، نہ کھانا کھاتا، صرف چائے کی گنجائش رکھی تھی، میرا یہ طرز عمل محض اس لئے تھا کہ تبلیغ دین پر کوئی معاوضہ نہ ہو، میں محض اللہ کے لئے یہ کام کرنا چاہتا تھا، ملازمت کی تنخواہ کا بھی میں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔

حضرت مولانا سیّد عبدالحی صاحب علیہ الرحمہ نے امامت وخطابت کا معاملہ طے کرتے وقت ماہانہ تنخواہ ڈھائی سو روپے مقرر کی تھی، جس کو اہل میسور نے قبول کیا تھا، اس کے علاوہ کسی اور طرح کا ہدیہ ونذرانہ مجھے منظور نہ تھا۔ میرے اس طرز عمل کا اثر اہل میسور پر بہت خوشگوار پڑا، لوگوں کا اعتماد مجھے حاصل ہوا، لوگ بڑی محبت سے پیش آتے، مسائل پوچھتے، جو کچھ کہتا اسے وقعت دیتے، اس طریقۂ کار سے تقریر وخطابت کا وزن خاصا بڑھ گیا، مجھے اصل میں مدرسہ صدیقیہ کے لئے محنت کرنی تھی، میں اس سلسلے میں مسلسل کدوکاوش کرتا رہا۔

تنخواہ میں ترمیم:

میسور کے ابتدائی ایام میرے لئے مالی لحاظ سے بہت سخت تھے، گھر سے جو کچھ رقم قدرے قلیل لے کر آیا تھا، وہ امروہہ میں ہی ختم ہوگئی تھی، میسور کے لئے راستے کا کرایہ اور خرچ جو کچھ ملا تھا وہ میسور پہونچتے پہونچتے ختم ہوگیا۔ تنخواہ ایک ماہ کے بعد ملنے والی تھی، درمیان میں کسی نے پوچھا نہیں، میری غیرت نے سوال کرنے کی بات تو الگ، تذکرہ کرنے کی اجازت نہ دی، اب نہ کپڑا دھونے کے لئے صابن، نہ گھر یا امروہہ خط لکھنے کے لئے پیسہ! مگر میں پیشانی پر شکن لائے بغیر مہینہ ختم ہونے کی مدت بخوشی گزار لے گیا، مہینہ ختم ہونے پر جب تنخواہ ملنے کا وقت آیا تو مسجد کے سکریٹری کے۔ نذیر احمد صاحب اور دو ممبران ابوبکر سیٹھ اور اقبال سیٹھ صاحبان تشریف لائے، ان حضرات سے اتنی مدت میں ذرا بے تکلفی ہوگئی تھی، ابوبکر سیٹھ نے معذرت کے لہجے میں کہنا شروع کیا کہ مولانا عبدالحی صاحب سے آپ کی تنخواہ کے متعلق جو گفتگو ہوئی تھی، اس میں طے یہ ہوا تھا کہ آپ کی تنخواہ ڈھائی سو ماہانہ ہوگی، مگر ہم لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کو ہم نباہ نہ پائیں گے، اس لئے طے ہوا ہے کہ آپ کی

تنخواہ دوسو روپئے ہو۔

میں نے عرض کیا کہ تنخواہ کی بات چونکہ مجھ سے نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس معذرت کا محل میں نہیں ہوں، مولانا ہیں، آپ ان سے بات کرلیں، رہا میرا معاملہ تو وہ یہ ہے کہ نہ مجھے تنخواہ کی کسی مقدار کا مطالبہ ہے اور نہ خود تنخواہ کا مطالبہ ہے، مجھے آپ حضرات نے کام کرنے کا موقع دیا ہے، اس کے لئے میں شکرگزار ہوں، مجھے کام کرنے دیجئے، اس کے بعد آپ کی طرف سے جو کچھ مل جائے گا میں اسے عطیۂ الٰہی سمجھ کر قبول کرلوں گا، مجھے اس کا بھی انتظار نہ رہے گا کہ آپ نے مولانا سے بات کی یا نہیں؟ اسے سن کر وہ لوگ بہت خوش ہوئے، اور فوراً دوسو روپئے مجھے دئے، میں یہ سمجھ کر کہ یہ دوسو روپئے بھی میری حیثیت سے بڑھ کر ہیں، میں نے بخوشی قبول کرلئے، اس طرح پندرہ بیس دن کی میری غربت ٹوٹی، ڈاک خانہ سے کارڈ اور لفافے لایا، امروہہ اور گھر خطوط لکھے۔

میسور یونیورسٹی میں:

شہر میں رفتہ رفتہ میری تقریروں کا آوازہ گونجتا گیا، ایک روز ایک نوجوان جو حلئے اور چہرے بشرے سے دیندار معلوم ہورہا تھا، میرے پاس آیا، اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنا نام عبدالرشید بتایا، وہ میسور یونیورسٹی کا طالب علم تھا، اس نے بتایا کہ یونیورسٹی کے حلقے میں طلبہ کے لئے جو دارالاقامے ہیں، ان میں ایک بڑا دارالاقامہ مسلمانوں کے لئے مختص ہے، اتوار کے دن جبکہ چھٹی ہوتی ہے، ہم لوگ مختلف طرح کے پروگرام کرتے ہیں، آپ کی شہرت عام ہوئی ہے، اور بہت سے طلبہ نے آپ کی تقریریں سنی ہیں، ان کا ارادہ ہے کہ اب کی اتوار کو آپ کا بیان ہو، اگر آپ حامی بھردیں تو میں طلبہ کو مطلع کردوں، میں نے اس کو بخوشی قبول کرلیا۔ دوسرے دن اتوار تھا۔

عبدالرشید علی الصباح میرے پاس آیا، اس کے ساتھ میں ایک بس پر سوار ہوا۔ بس بل کھاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑی سڑکوں پر چل رہی تھی، فضا بہت خوشگوار تھی، ہرطرف

شادابی اور ہریالی کا سماں تھا، نیچی نیچی پہاڑیاں سبز پودوں اور سرخ پھولوں کا لبادہ پہنے ہوئے کف گل فروش اور جمال جہاں آراء بنی ہوئی تھیں، مگر مجھے اس وقت بس کا سفر راس نہ آتا تھا، فضا کا حسن و جمال طالب چشم نظارہ تھا مگر میں دورانِ سر اور متلی میں مبتلا تھا، کسی طرح اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا یونیورسٹی کے حلقے میں داخل ہوا، ایک وسیع وعریض عمارت کے سامنے بس رکی، عبدالرشید کے ساتھ میں اترا، یہ مسلم ہاسٹل تھا، طلبہ نے بڑھ کر استقبال کیا، ہلکا پھلکا ناشتہ ہوا، پھر دیکھا تو ایک ہال میں سب سراپا شوق بنے منتظر ہیں۔ میں نے اللہ کی وحدانیت، رسالت کی ضرورت پر ایک بسیط تقریر کی، اندازہ ہوا کہ طلبہ اس سے متاثر ہوئے، تقریر کے بعد وہ ملاقات اور بات چیت کے لئے ٹوٹے پڑ رہے تھے، میں نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے یونیورسٹی کے کتب خانہ میں لے چلو، طلبہ نے معذرت کی کہ آج اتوار ہے، کل تشریف لایئے، ظہر کی نماز تک میں وہاں رہا، ظہر کے لئے اپنی مسجد میں آ گیا۔

دو روز کے بعد کتب خانہ میں گیا، مگر اس میں عربی فارسی اور اردو کی کتابیں بہت کم تھیں، تاہم کئی گھنٹے میں اس میں رہا۔ پھر ہر ہفتہ اتوار کو یہ معمول بن گیا، کہ میں مسلم دارالاقامے میں جاتا اور کسی ایک دینی موضوع پر تقریر کرتا، اس طرح ان انگریزی خواں طلبہ سے خاصا ربط ہو گیا، اور انھوں نے بھی بہت محبت کی، ان تقریروں اور تعلقات کی وجہ سے ان طلبہ کی زندگی اور ماحول میں خاصا بدلاؤ آیا، مگر میرا قیام دو تین ماہ ہی رہا، پھر وطن واپسی کے بعد میں نہ جا سکا۔

پروفیسر غوث محمد مولوی:

برادر عزیز عبدالرشید برابر میرے پاس آتے جاتے رہے، ایک روز دیکھا کہ اپنے ساتھ وہ ایک معمر بزرگ کو لا رہے ہیں۔ کہنے لگے یہ میرے استاذ ہیں، یونیورسٹی میں عربی زبان کے پروفیسر ہیں، آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے ان کا خیر مقدم کیا، وہ باتیں کرتے رہے، میں نے نام دریافت کیا، تو بولے ''غوث محمد مولوی'' میں نے از راہ بے تکلفی کہا کہ

آپ نے خود اپنی زبان سے اپنے آپ کو مولوی کہا، ایسا کیوں؟ کہنے لگے یہ کوئی تعظیمی لقب نہیں ہے، مجھے ''مولوی'' کی سند حاصل ہے، اس لئے میں نے مولوی کہا، جیسے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی سند ہوتی ہے، تعظیمی لقب کا استعمال نام کے پہلے ہوتا ہے، اور سند کا استعمال نام کے بعد ہوتا ہے، میں خود کو مولوی غوث محمد نہیں کہتا، غوث محمد (مولوی) کہتا ہوں۔

انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں عربی پڑھاتا ضرور ہوں، لیکن کسی عربی دینی مدرسہ کا پڑھا ہوا نہیں، اس لئے مجھے دقت بہت ہوتی ہے، اگر ایک کتاب مجھے آپ پڑھا دیا کریں تو احسان ہوگا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تدریس کا موقع ملا، لیکن طبیعت ہچکچائی کہ یہ پچاس پچپن سال کے بزرگ اور میں بیس بائیس سال کا نوجوان! مجھے بڑی شرم آئی، لیکن اس وقت شرم پر حصول سعادت کا جذبہ غالب آیا۔ آٹھ بجے صبح کا وقت مقرر ہوگیا، وہ آٹھ بجے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی مرتب کردہ عربی ادب کی کتاب ''نخبة الادب'' لے کر آئے، یہ کتاب میں نے نہ پڑھی تھی نہ دیکھی تھی، لیکن مبارک پور اور دیوبند میں عربی ادب میں جو محنت میں نے کرلی تھی وہ یہاں کارآمد ہوتی نظر آئی۔ میسور میں میرے پاس لغت کی کوئی کتاب نہ تھی، غوث محمد صاحب کے پاس بھی لغت کی کوئی کتاب نہ تھی، اور یہ کتاب خاصی معیاری تھی، حصہ نثر میں تو مجھے کوئی دقت نہ تھی، البتہ عربی نظم اور اشعار سے مجھے مناسبت کم تھی، اس لئے اس میں دقت کا اندیشہ ہوا، مگر میں نے اللہ کا نام لے کر شروع کرادیا، روزانہ وہ مجھ سے پڑھتے اور پھر جاکر اپنے طلبہ کو پڑھاتے، دو ماہ تک یہ سلسلہ چلا، پھر میری واپسی ہوگئی، انھوں نے بہت اصرار کیا کہ آپ عید کے بعد فوراً آجائیے گا، اس کے لئے انھوں نے کرایہ رقم بھی پیش کی، میں نے معذرت کی، مگر وہ نہ مانے، لیکن پھر واپس آنا مقدر نہ تھا، تفصیل آگے آرہی ہے۔

غوث محمد صاحب نے بہت محبت کا تعلق رکھا، ایک شاگرد کی طرح وہ مجھ سے معاملہ کرتے رہے، اپنے طلبہ کو بھی انھوں نے بتایا کہ اب میں ایک عالم سے کتاب پڑھ کر آتا ہوں تب پڑھاتا ہوں، ان کے تلامذہ بھی بڑی عزت کرتے تھے۔

بریلوی فتنہ:

میں غالباً ربیع الآخر ۱۳۹۲ھ کی کسی تاریخ میں میسور پہونچا تھا میری تقریریں مسلسل ہو رہی تھیں، میسور شہر میں مَیں اکیلا مولوی تھا، شہرت پھیلتی جارہی تھی، تبلیغی جماعت کو بھی میری وجہ سے تقویت حاصل تھی، یعنی کام کی فضا ہموار ہو رہی تھی، کہ ایک فتنہ نے سر ابھارا۔ میسور میں بریلویت کا زیادہ اثر تو نہ تھا، لیکن بدعات کا زور تھا، اور بدعت کو بریلویت سے بڑی مناسبت ہے، اور بریلویت بھی بدعت کو تلاش کر کر کے اسے مستحکم کرتی ہے، بریلویت کا مزاج جارحانہ ہے، اس میں اعتدال و توازن کا فقدان ہے، جس نے اس سے اختلاف کیا، وہ سرے سے کافر ہے، اور جو اس کے موافق ہے وہ ہر فسق و فجور کے بعد عشق مصطفیٰ میں ڈوب کر مومن کامل ہے۔

اللہ جانے کیا ہوا کہ کچھ لوگ بمبئی سے مشہور جنگجو اور انتہا پسند بریلوی عالم مولوی حشمت علی کے بھتیجے مولوی منصور علی کو جو کہ مولوی محبوب علی کے بیٹے ہیں، بلالائے، یا یہ کہ وہ خود سے آ گئے، اس کی مجھے تحقیق نہیں ہے، ان کے جلسے شہر میں جا بجا ہونے لگے، انھوں نے علماء دیوبند کے خلاف وہ آگ اگلنی شروع کی کہ **الامان والحفیظ** ۔ بدزبانی، گالی گلوج، بہتان طرازی اور اشتعال انگیزی کی کوئی حد نہ تھی جس کو وہ پھلانگ نہ گئے ہوں، ایسی بدزبانی اور اشتعال انگیزی کا مجھے تجربہ نہ تھا، حد یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ہر تقریر میں یہ کہنا شروع کیا کہ دیوبندیوں کی مسجد، مسجد نہیں ہے، اس میں پاخانہ کرو، پیشاب کرو، دیوبندیوں کے کنویں میں کتا مار کر، بلی مار کر ڈال دو تو ثواب کے مستحق ہوگے۔

ایک ہفتہ تک ان کی شعلہ بار تقریریں ہوتی رہیں، پورا شہر آگ کی بھٹی بن گیا، مسلمانوں کا ماحول و معاشرہ آگ کی لپیٹ میں آ گیا، تبلیغی جماعت والوں کو لوگوں نے مسجدوں سے نکالنے بھگانے کی مہم چلائی، فتنے اور سر پھٹول کی گرم بازاری ہوگئی، سنجیدہ حضرات پریشان ہوگئے، مجھ سے آ آ کر کہنے لگے کہ اس شخص سے مناظرہ کرنا چاہئے، میرا ذوق

مناظرہ سے اباء کرتا تھا، دیوبند کے حادثے کے بعد میں نے ایک خاموش عہد کیا تھا کہ اللہ نے توفیق دی، تو مسلمانوں کے درمیان ہونے والے کسی بھی فتنہ ونزاع سے دامن کشاں گزر جاؤں گا۔ میں جانتا تھا کہ دیوبندی بریلوی مناظروں نے ملت کو فائدہ تو ضرور پہونچایا ہے، لیکن اس کا ضرر بھی کچھ کم نہیں ہے۔ انتشار، لڑائی، جھگڑے، کشمکش اور سر پھٹول کی فضا بنی ہے، حالانکہ اس وقت میری نوجوانی تھی، جوش بھی تھا، بریلویت کے سلسلے میں معلومات بھی تھیں، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ کے معرکہ آرا مناظروں کی روداد پڑھ چکا تھا، مبارک پور میں طالب علمی کے زمانے میں مناظرہ کر بھی چکا تھا، بجز اس کے کہ میں بریلوی مولویوں کی طرح بدزبانی، بہتان طرازی اور گالی گلوج نہیں کرسکتا تھا، مگر دیوبند کے حادثے نے مجھے ہر قسم کی کشمکش اور نزاع سے یکسو کر دیا تھا، اس وقت میدان مناظرہ میں مولانا نور محمد صاحب ٹانڈوی اور مولانا ارشاد احمد صاحب مبلغ دار العلوم دیوبند جیسے سورما مقابلے کے لئے موجود تھے، اور میرے احباب نے اصرار بھی کیا کہ ان حضرات کو دعوت دی جائے، مگر میں نے سمجھایا اور صبر واستقامت کی تلقین کی، نیز یہ کہ یہ صاحب تو چند روز کے بعد چلے جائیں گے، پھر میرے لئے میدان کھلا ہوا ہے، میں اپنی تقریروں میں مثبت انداز میں ان تمام الزام تراشیوں اور بہتان طرازیوں کا ازالہ کرتا رہوں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جمادی الاخریٰ کا آخری ہفتہ اس ہنگامہ خیزی سے معمور رہا، آخری تاریخوں میں وہ مولوی صاحب ہدیہ نذرانہ وصول کر کے میسور سے چلے گئے، میری تقریروں کا سلسلہ چل ہی رہا تھا، رجب کا مہینہ شروع ہوا تو میں نے اپنی تقریروں کا موضوع معراج النبی ﷺ کو بنایا، اور اس موضوع پر روزانہ تقریریں کرتا رہا، مسلمانوں کو حضرت رسالت مآب ﷺ کی ذات اقدس سے جو شیفتگی اور وارفتگی ہے، وہ محتاج بیان نہیں، بریلوی مولوی عوام کو یہی باور کرا کے مشتعل کرتے ہیں کہ علماء دیوبند رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں، گو یہ روئے زمین پر بولے جانے والے جھوٹوں میں ایک بڑا جھوٹ ہے، مگر اس طبقہ نے اتنا غل مچایا ہے اور

اسے اس طرح دہرایا ہے کہ عوام کا ایک بڑا طبقہ اس سے متاثر اور مشتعل ہے۔

میں ہر تقریر کے آغاز میں **سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ الخ** کی تلاوت کرتا اور اسی کے دائرے میں سیرت پاک کے مختلف جلوے اجاگر کرتا، مجھے یاد ہے کہ پہلی تقریر جمعہ کے دن ایک بڑے مجمع کے سامنے جب ہوئی، تو پورا مجمع وجد میں جھوم رہا تھا، پھر مسجد کا معمر اور تجربہ کار موذن جس کا جھکاؤ زیادہ تر بریلویت کی طرف تھا، میرے پاس آکر بے ساختہ بآواز بلند بولا، آج تو ایسی تقریر ہوئی ہے، کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے طاقت دیتے تو میں اپنے کندھے پر بیٹھا کر آپ کو پورے شہر میں لے جاتا، اور اعلان کرتا کہ عاشق رسول یہ ہیں، ان سے ملو۔

اس تقریر کے بعد ۲۶/رجب تک مسلسل ہر روز، بلکہ بعض اوقات ایک ایک دن میں کئی کئی وعظ اس آیت کریمہ پر ہوتے۔ اپنی ان تقریروں میں مَیں بغیر نام لئے ہوئے بریلویوں کی ہرزہ سرائیوں کا جواب دیتا، چند تقریروں کے بعد عناد و بغض کی جو گرد اڑائی گئی تھی، بیٹھ گئی۔ تبلیغی جماعت والوں کو کوئی مسجدوں سے باہر کر دیا گیا تھا، پھر وہ اپنی جگہ لوٹ گئے۔

بریلوی مولوی نے سارا زور اس پر لگایا تھا کہ علماء دیوبند کافر اور گستاخ رسول ہیں، پس جو ان لوگوں کو بزرگ عالم بلکہ مسلمان بھی مانتا ہے وہ کافر ہے، اس لئے تمام دیوبندی کافر ہیں، میں اپنی تقریروں میں علماء دیوبند کا نام نہ لیتا تھا، بغیر نام لئے ان کے علوم و معارف بیان کرتا، ان کے ایمان کی قوت اور اسلام کی خدمت کی روداد سناتا، ان کے واقعات دہراتا، غالباً دو ہفتہ کی تقریروں کے بعد حالات معمول پر آگئے، تب میں نے علماء دیوبند کا نام لینا شروع کیا، جمعہ کے خطبہ میں مَیں نے ایک عام فہم بات عوام کے سامنے رکھی، وہ یہ کہ کفر و ایمان کے جو معیار علمی و نظری ہیں، انھیں چھوڑیئے، ایک موٹی بات جس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، بغور سنئے!

> ’’مسلمانوں کا اصل سرمایہ اور اصل طرّۂ امتیاز کلام الٰہی یعنی قرآن شریف

ہے، قرآن دین اسلام اور رسول اکرم ﷺ کا لازوال معجزہ ہے، اس کے معجزہ ہونے کے متعدد پہلو ہیں، اس کی فصاحت و بلاغت، اس کی بیان کردہ غیب کی خبریں، اس میں کہیں اختلاف و تناقض کا نہ ہونا، ان سب کے ساتھ معجزہ ہونے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کے حفظ کی دولت صرف مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے، کافروں کا یہ نصیب نہیں ہے کہ وہ حافظ قرآن ہوسکیں، خود مسلمان کہلانے والے بعض فرقے جن کا قرآن کریم پر ایمان درست نہیں ہے، انھیں قرآن حفظ کرنے کی قدرت نہیں ہوتی، اسی لئے آج تک کوئی شیعہ حافظ قرآن نہیں ہوسکا ہے، بعض لوگوں نے قرآن کریم حفظ کیا لیکن بعد میں شیعہ ہوگئے، تو ساتھ ہی ساتھ حفظ کی دولت سے محروم ہوگئے، یہ ایسی مسلّم بات ہے کہ اس میں کسی کو مجال اختلاف نہیں ہے، شیعوں کی تاریخ حفاظ کے نام سے خالی ہے۔

اس بات کو ذہن نشین کرلینے کے بعد علماء دیوبند کے حالات پڑھئے، جاننے والوں سے پوچھئے کہ ان میں کتنے حافظ قرآن تھے، اور ان لوگوں کے حفظ قرآن کی کیا کیفیت تھی؟ اور کتنی مدت میں ان لوگوں کو یہ دولت عظمیٰ حاصل ہوئی ہے؟

پھر میں نے کہا کہ:

علماء دیوبند کے سرخیل مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ہیں، اور انھیں کے کفر پر مولانا محمد اسمٰعیل شہید کے بعد سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے، لیکن یہ سننا چاہئے کہ یہ تینوں حافظ قرآن تھے، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب تو سات سال کی عمر میں حافظ قرآن ہوگئے تھے، اور شہادت کے وقت تک قرآن کریم تراویح میں سناتے رہے، اور اللہ نے ان کی تلاوت میں وہ برکت دی تھی جسے کرامت ہی کہا جاسکتا ہے، مولانا شہید عصر سے مغرب تک میں پورا قرآن کریم عمدہ تلاوت کے ساتھ پڑھ لیا کرتے تھے، ان کے معاصرین میں بکثرت لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے سفر حج میں پانی کے جہاز پر ایک ماہ کی مدت میں حفظ کی تکمیل کی اور تراویح پڑھائی، حضرت گنگوہیؒ نے طالب علمی سے

> فراغت کے بعد چھ ماہ کی مدت میں حفظ کی تکمیل کی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری نے بھی عالم ہونے کے بعد قلیل مدت میں حفظ مکمل کرلیا۔
>
> یہ خاص ان اکابر کا حال ہے، جن کا کفران کے نزدیک ایسا ہے کہ جوانھیں کافر نہ کہے وہ خود بھی کافر ہوجاتا ہے، سب حافظ قرآن ہیں اور سب کی تلاوت معروف ہے، حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نہایت جید حافظ تھے، ہر روز تمام مشاغل علمی وتصنیفی اور دن بھر لوگوں کی ملاقات اور ان کی اصلاح وتربیت کے ساتھ روزانہ ایک منزل قرآن کی تلاوت زبانی کیا کرتے تھے، اور سات دن میں ختم کرتے تھے، ان کے خلیفہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ بڑھاپے تک روزانہ ایک ختم قرآن زبانی کرلیا کرتے تھے، علماء دیوبند میں حفاظ قرآن کی تعداد اتنی ہے کہ ان کی گنتی نہ ہوسکے، اور پھر دیوبندی کہلانے والے عوام میں حفاظ قرآن کا وہ انبوہ گراں ہے کہ مسلمانوں کے کسی طبقے میں بھی اس کی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی، بریلویوں میں تو حفاظ کی تعداد کم، بہت کم ہے، فرقہ غیر مقلدین، جماعت اسلامی میں بھی قرآن کے حافظ اقل قلیل ہیں۔
>
> علماء دیوبند اور دیوبندی عوام کے ایمان واسلام کے لئے اس سے بڑی شہادت کیا چاہئے، کہ ان میں حفاظ قرآن کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انھیں شمار نہیں کیا جاسکتا، کیا اپنی عظیم کتاب کی حفاظت کے لئے اس کے حفظ کے لئے اللہ نے کافروں کو چن لیا ہے؟ یہ بات کسی طرح باور کرنے کے لائق نہیں ہے، اس لئے میسور والے خوب سمجھ لیں کہ ہفتہ بھر جن لوگوں کو انھوں نے ’’کافر کافر‘‘ سنا ہے، وہ خالص اہل ایمان ہیں، اللہ کے مقبول ومنصور بندے ہیں، دین اسلام کے خدام ہیں، نبی ﷺ کی محبت ان کی رگوں میں سمائی ہوئی ہے، اگر وہ مسلمان نہیں تو دنیا میں کہیں مسلمانوں کا وجود نہیں ہے۔

یہ تقریر کچھ اس انداز سے ہوئی کہ عوام کے ذہن نشین ہوگئی، اور آناً فاناً پورے شہر میسور میں اس کی گونج پھیل گئی، اور ہفتوں اس تقریر کا چرچا رہا۔

پھر آخری جلسہ ۲۶؍ رجب کا دن گزار کر رات میں ہوا، مجھے وہ جگہ اب یاد نہیں

ہے جہاں جلسہ ہوا تھا، مگر یہ یاد ہے کہ اس جلسے کے انعقاد میں شہر میسور کے تمام مسلمان شریک تھے، بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا، لوگوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ جب جلسہ کا اشتہار چھاپنا ہوا تو میرے نام کے ساتھ وہ القاب وآداب لکھے گئے، جن کا اس وقت تو کیا میں آج بھی جبکہ چالیس سال کا عرصہ گزرنے کو ہے تصور نہیں کرسکتا، اشتہار چھپنے کے بعد مجھے دکھایا گیا، میں نے سخت نکیر کی، لیکن عقیدت ومحبت کا جذبہ شاید اس طرح کی نکیروں سے مزید شدت اختیار کرتا ہے، اس لئے میں نے اس سے صرف نظر کرلیا۔

یہ آخری جلسہ تھا، جس میں مَیں نے بیان کیا، یہ بیان رسول اکرم ﷺ کے سفر معراج پر ہوا، اور اس کے ضمن میں عظمت رسول کا ایسا بیان ہوا کہ بریلوی بھی برملا یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ رسول اللہ ﷺ کی عظمت ورفعت شان پر ایسا بیان کبھی نہیں سنا گیا۔

اس کے بعد میں میسور کے مسلمانوں کا مرکز نگاہ بن گیا، شعبان کا مہینہ آیا، تو اس کی فضیلت، شب برأت کی عظمت پر بیانات شروع ہوئے، ساتھ ہی اس ماہ مبارک کے ساتھ جو بدعات وخرافات، جہالت نے جوڑ رکھی ہے، اس کا خوبصورتی سے ردوانکار بھی کرتا رہا۔

میسور پہونچ کر اور ایک اجنبی جگہ دین کی خدمت کا وجود دیکھ کر پچھلی وحشتیں مٹنے لگیں، زندگی میں اطمینان کی لہر دوڑنے لگی، یہ امید ہو چلی کہ اللہ ورسول کی خدمت کی توفیق مجھے عطا ہوسکتی ہے، مایوسی کے جو بادل میرے وجود پر چھائے ہوئے تھے محسوس ہوا کہ وہ چھٹ رہے ہیں، رمضان کا ماہ مبارک لحظہ بہ لحظہ قریب آرہا تھا اور مجھے وطن اور گھر کی یاد ستانے لگی۔

وطن کی واپسی:

میں نے مسجد کی انتظامیہ سے ذکر کیا کہ رمضان کے پہلے میں گھر جانا چاہتا ہوں، انھیں حیرت ہوئی کہ کام کا میدان تو بن گیا ہے اور رمضان المبارک کی ساعتوں میں جبکہ طبیعتیں فطرۃً دین کی طرف ہوتی ہیں، کام کا اچھا موقع ہوگا، مگر میں نے کہا اس وقت مجھے

جانے دیجئے، کچھ مصلحت ہے، میں نے اپنے دل میں یہ مصلحت سوچی تھی کہ میں اپنے گھر والوں کو اور ماحول و معاشرہ کو مطمئن کردوں کہ اب میری زندگی سفر کے ایک معقول راستے پر آگئی ہے، ان لوگوں نے سوال کیا کہ آپ کا نکاح ہو چکا ہے، میں نے اثبات میں جواب دیا، تو سب نے اصرار کیا کہ آپ اہلیہ کو ساتھ لیتے آئیں، کہ دور کی مسافت ہے، بار بار جانا نہ پڑے، مسجد کی انتظامیہ نے میری رہائش کے لئے ایک آرام دہ گھر بھی کرایہ پر متعین کر کے اس کی چابی لے لی اور وعدہ لیا کہ عید کے بعد فوراً آجایئے گا۔

میسور والوں نے بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ مجھے رخصت کیا، واپسی کے لئے کرایہ اور مصارف سفر کی رقم بھی ساتھ کردی، اہل میسور پر میری واپسی کا بہت اثر تھا، خاص طور سے پروفیسر غوث محمد زیادہ متاثر تھے، میسور کے احباب کے۔ نذیر احمد، عبدالعزیز چاند، اقبال احمد سیٹھ، عبدالرحیم، عبدالرشید صاحبان اور ان کے علاوہ ایک جم غفیر اسٹیشن تک مشایعت کے لئے آیا، بہت سے وعدوں اور معاہدوں کے درمیان ٹرین میسور کے پلیٹ فارم سے آگے بڑھی، دل میں عزم مصمم تھا کہ عید کے بعد مع اہلیہ فوراً واپس آؤں گا، اس وقت تک کوئی اولاد نہ تھی۔

رمضان ۱۳۹۲ھ سے دو تین روز قبل میں گھر پہونچ گیا، گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، میرے وہ رفقاء جنھوں نے چند ماہ پہلے مجھے محمد آباد اسٹیشن پر بادل ناخواستہ ٹرین پر سوار کرایا تھا اور جو مجھ سے ترجمہ قرآن پڑھا کرتے تھے، بہت خوش ہوئے، سب کو اطمینان ہو گیا کہ اب میری زندگی لائن پر آچکی ہے۔

رمضان المبارک کا مہینہ عبادتوں میں، مسرتوں میں، وعظ و بیان میں بہت تیزی سے گزر گیا، عید آگئی، اب مجھے میسور جانے کی فکر ہوئی۔ بنارس جا کر ٹکٹ بنوانا ہوگا، اس وقت کمپیوٹر کا وجود نہ تھا، میں ۵/ یا ۶/ شوال کو بنارس گیا، بنارس میرے لئے اجنبی نہ تھا، کیونکہ میں طالب علمی کے زمانہ میں جامعہ اسلامیہ بنارس کی ماتحتی میں سرکاری امتحان ''مولوی'' میں

نمایاں کامیابی کے ساتھ دیا تھا، جامعہ اسلامیہ بنارس اس سلسلہ میں دوتین مرتبہ جانا ہوا تھا، وہاں کے ناظم حافظ عبدالکبیر صاحب سے جو بنارس کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتے تھے، تعارف تھا، خیال تھا کہ انھیں کے پاس جاؤں اور ان سے درخواست کروں کہ میرے لئے میسور کا ٹکٹ بنوادیں۔

چنانچہ وہاں پہونچ کر میں نے ان سے گزارش کی، وہ مل کر بہت خوش ہوئے، بہت اعزاز واکرام کیا، مدرسہ کے صاحب دفتر منشی وحیداللہ صاحب کو بلایا کہ میسور کے دو ٹکٹ بنوا کر لائیے، اس وقت مدراس کے راستے میں کہیں ہندو مسلم فساد ہوا تھا، ان کی رائے ہوئی کہ سفر براہ بمبئی کیا جائے، بمبئی پہونچ کر پونہ اور پھر پونہ سے میسور، مجھے سفر کا تجربہ زیادہ نہ تھا، لیکن اور کوئی صورت نہ تھی، میں نے حامی بھرلی، منشی وحیداللہ صاحب اسٹیشن گئے اور بمبئی کا ٹکٹ ایک ہفتہ بعد کا بنوالائے، دو بجے مجھے ٹکٹ ملے، میں نے حافظ عبدالکبیر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور رخصت چاہی، انھوں نے کہا آج رک جائیے، کل چلے جائیے گا، میں اس کے لئے تیار نہ تھا، مگر انھوں نے اصرار کیا، اور میں احسان میں ڈوبا ہوا تھا ہی، رک گیا۔

تدبیر پر تقدیر کا غلبہ:

شام کو عصر کے بعد حافظ صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا، دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب جو قدرے معمر تھے، بزرگ صورت تشریف لائے، میں نے ان سے سلام ومصافحہ کیا، حافظ صاحب نے تعارف کرایا کہ ہمارے مدرسہ جامعہ اسلامیہ کے صدر حاجی عبدالقیوم صاحب ہیں، اب صدر اور ناظم نے مجھ سے کہنا شروع کیا کہ اب تک جامعہ اسلامیہ کی ایک ہی عمارت تھی، مدن پورہ میں، اسی میں پرائمری کی بھی تعلیم ہوتی تھی اور عربی کی بھی، لیکن اب عربی شعبہ الگ کردیا گیا ہے، اس کے لئے ریوڑی تالاب میں عمارت تیار ہے، اس سال عربی شعبہ وہاں جائے گا، اب تعلیم کو ترقی بھی دینی ہے، اس لئے آپ میسور کے بجائے یہیں کی مدرسی قبول کرلیجئے۔

میں یہ سن کر ہکا بکا ہوگیا، جس چیز کو کبھی سوچا بھی نہ تھا، وہ بات سامنے آرہی ہے، میرے سامنے اہل میسور کے وعدے، معاہدے اور محبتیں تھیں، میں نے معذرت کی، اور صورت حال انھیں بتائی، مگر یہ دونوں حضرات مصر رہے، خاص طور پر حاجی عبدالقیوم صاحب زیادہ زور دے رہے تھے، اتنے میں مغرب کا وقت ہوگیا، ہم لوگ نماز کے لئے اٹھ گئے، نماز کے بعد حاجی صاحب مجھے الگ لے گئے اور بڑی محبت اور اصرار سے گفتگو کرتے رہے، میں حیران تھا کہ الٰہی اب کیا کروں؟ میں نے ان سے پوچھ لیا کہ آخر آپ حضرات مجھ پر اتنا زور کیوں ڈال رہیں، میں تو ایسا کوئی متعارف نہیں ہوں۔

انھوں نے بتایا کہ ہم کو جب مدرسہ ریوڑی تالاب پر لے جانا ہوا، تو ہمارے صدر مدرس مولانا محمد ادریس صاحب اور عربی کے ایک پرانے استاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جگدیش پوری (حال استاذ دارالعلوم دیوبند) مستعفی ہوکر چلے گئے، ہمیں استاذ کی تلاش ہوئی، تو ہم نے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے ناظم مولانا عبدالباری صاحب سے درخواست کی کہ وہ کسی استاذ کی نشاندہی کردیں، انھوں نے آپ کا نام لیا اور یہ بھی بتادیا کہ دیوبند میں ایک حادثے کا اس پر داغ ہے، لیکن اگر وہ آپ کو مل جائے تو بے تکلف رکھ لیجئے، آپ کے مدرسہ کی رونق بڑھ جائے گی، اس کی ذہانت وذکاوت اس وقت بھی معروف تھی جب پڑھتا تھا، اس لئے ہم آپ کے اوپر اصرار کررہے ہیں۔

میں شش وپنج میں تھا، ان بزرگوں کا اصرار اور اس پر میرا انکار! کچھ اچھا نہیں معلوم ہورہا تھا، وہ رات اضطراب میں گزری، بالآخر صبح کو میں نے بادل ناخواستہ حامی بھردی، حافظ عبدالکبیر صاحب نے ٹکٹ واپس کرنے کیلئے لے لئے، اور اس کی رقم مجھے واپس کردی، میں بوجھل قدموں کے ساتھ گھر واپس آگیا، گھر والے خوش ہوئے کہ قریب ہی رہنا ٹھیک ہے، دوتین روز کے بعد میں تیاری کرکے جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس حاضر ہوگیا۔

☆☆☆☆☆

میسور کی بعض یادیں

ایک نصیحت خیز مشاہدہ:

میسور کی آب وہوا بہت عمدہ ہے، صبح کا موسم تو اتنا سہانا ہوتا ہے کہ دل کی کلی کھل جاتی ہے، مجھے صبح کو چہل قدمی سے کوئی خاص مناسبت نہیں ہے، لیکن میسور کا سہانا موسم مجھے اکثر باہر کھینچ لے جاتا۔ صبح کی اس تفریح میں روزانہ ایک عجیب منظر دیکھتا، جس کا دل پر بہت اثر ہوتا اور میں دیر تک سوچتا رہتا۔

میں دیکھتا کہ ایک آدمی اپنے گھر سے کپڑے کی ایک جھولی کندھے سے لٹکائے نکلتا، اس کی تھیلی میں ''بوندیا'' ایک خاص قسم کی مٹھائی ہوتی، اسے دیکھتے ہی ہر طرف سے کووں کی یلغار ہوجاتی، یہ کوے اڑتے ہوئے اس کے کندھے پر، سر پر بیٹھ جاتے، کتنے کوے اس کے دامن اور آستین پکڑ کر لٹک جاتے اور زیادہ تر اڑتے ہوئے اس کے سر پر چھتری بنائے رہتے، وہ تھیلی میں ہاتھ ڈالتا اور ایک مٹھی بوندی نکالتا اور سڑک پر پھینک دیتا، تمام کوے سڑک پر آجاتے، ایک ایک دانہ اٹھاتے اور پھر اس کے بدن پر بیٹھ جاتے اور سر کے اوپر اڑنے لگ جاتے، وہ مسلسل چلتا رہتا، اور ہر تھوڑی دور پر بوندیاں پھینکتا رہتا، تقریباً ایک کیلومیٹر چلتا پھر واپس آتا، کوے اس کے ساتھ ساتھ ہوتے، جب وہ اپنے گھر میں قدم رکھتا، تو کوے اپنی اپنی راہ لیتے۔ میں یہ حیرتناک منظر روزانہ دیکھتا اور سوچتا کہ محبت اور احسان میں کتنی طاقت ہے کہ ایک وحشی تر پرندہ جو ایک انسان کی آہٹ سے بھاگتا ہے، کس طرح گرویدہ ہوکر بدن پر ٹوٹا پڑتا ہے، کوا بھی احسان کو پہچانتا ہے۔ انسان جو حق تعالیٰ کے احسان میں سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا ہے، اور اس میں گرویدگی اور محبت کی استعداد بھی ہر

مخلوق سے زیادہ ہے، مگر خارجی موثرات میں مبتلا ہوکر احسان مندی کے تقاضوں سے کتنا دور ہوجاتا ہے۔

مجھے جب یہ منظر یاد آتا ہے، دل کی عجیب کیفیت ہونے لگتی ہے۔

شب برأت:

میسور میں علم دین کی کمی کی وجہ سے عجیب عجیب رسمیں رائج تھیں، شب برأت کا موقع آیا تو مجھ سے لوگوں نے بکثرت سوالات کئے، لوگوں نے اس رات میں طرح طرح کی نمازیں گڑھ رکھی ہیں، جن کا مجھے علم نہیں تھا اور اس وقت بھی کچھ یاد نہیں آرہا ہے، میں نے اپنی تقریروں میں شب برأت کی جو اصل حقیقت وحیثیت ہے اسے بیان کیا، جب یہ رات آئی، تو لوگوں کا جم غفیر مسجد میں اکٹھا ہوا، میں نے عشاء کے بعد ایک مبسوط وعظ کہا، وعظ کے بعد لوگ عبادات میں مشغول ہوگئے، میں اپنے کمرے میں تھا کہ ایک نوجوان آیا اور کہنے لگا ماچس کی ڈبیہ آدھی ہوچکی ہے، میں تھک گیا ہوں، اب ذرا تفریح کرنا چاہتا ہوں، میں نے پوچھا کیا مطلب؟ بولا آپ جانتے نہیں، آج سو رکعت نماز پڑھنی ہے، ماچس کی ایک ڈبیہ لوگ لاتے ہیں، ہر دو رکعت پر ماچس کی ایک تیلی نکال دیتے ہیں، ایک ڈبیہ میں بچاس تیلیاں ہوتی ہیں، جب ڈبیہ خالی ہوجاتی ہے تو گویا سو رکعتیں مکمل ہوگئیں۔ میں رکعت شماری کی اس تدبیر پر متحیر ہوگیا، لیکن اس سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب اس نے تفریح کی شرح کی، میں نے پوچھا تفریح کے لئے کہاں جاؤ گے؟ اس نے کہا جارہا ہوں پکچر دیکھنے! میں نے حیرت زدہ ہوکر ڈانٹا کہ یہ کیا واہیات ہے، تو اس نے بڑی معصومیت سے کہا کہ اس سے دل بہل جائے گا، مجھے بہت صدمہ ہوا کہ جہالت نے مسلمان نوجوانوں کو کہاں تک پہونچا رکھا ہے۔

☆☆☆☆☆

تدریسی زندگی

پڑھنے کے ساتھ پڑھانے کا ذوق، درس کے ساتھ تدریس کا شوق مجھے شروع ہی سے تھا، مکتب میں جب پڑھتا تھا تو خودرَو پودوں پر مشق تدریس کیا کرتا تھا، عربی مدرسہ میں داخل ہوا تو جلد ہی اپنے سے چھوٹے طلبہ کو پڑھانا شروع کر دیا تھا، یہ سلسلہ طالب علمی کے آخر تک چلتا رہا، فراغت کے بعد گاؤں میں حفاظ قرآن کو ترجمۂ قرآن پاک پڑھانے کی طرح ڈالی، چھٹی کے دنوں میں عربی کے طلبہ کو پڑھاتا رہا، پھر میسور جانے سے پہلے امروہہ میں دو ماہ تک عربی کی کتابیں زیر درس رہیں، میسور میں عربی کے ایک پروفیسر صاحب کو پڑھانے کا مشغلہ رہا، مگر تدریس کی مشغولیت اصطلاح کے مطابق باقاعدگی کے ساتھ نہ تھی، جیسا موقع ہوا پڑھانے کا کام ہوتا رہا۔

میسور میں چند ماہ قیام کے بعد گھر واپس آیا، اور دوبارہ رخت سفر باندھنے والا تھا کہ تقدیر الٰہی بنارس میں نمودار ہوئی اور میسور کا ٹکٹ بن جانے کے بعد حافظ عبدالکبیر صاحب اور حاجی عبدالقیوم صاحب علیہما الرحمہ ناظم وصدر جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس کا اصرار وحکم میسور جانے سے مانع بن گیا، یہ شوال ۱۳۹۲ھ کی بات ہے، عیسوی سن ۱۹۷۲ء غالباً رہا ہوگا۔

یہاں سے باضابطہ مدرسہ میں بطور ملازمت کار تدریس کا آغاز ہوا۔ زمانہ کی ٹھوکروں اور مزاج وطبیعت کی افتاد نے نئی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے بہت کچھ غور وفکر کی دعوت دی۔ میں سوچتا رہا کہ اب تک کی زندگی میں مَیں نے جو کچھ پایا ہے، وہ مدرسوں میں رہ کر پایا ہے اور جو کچھ کھویا ہے وہ بھی مدرسوں میں ہی رہ کر کھویا ہے، کیونکہ شعور کی زندگی کا آغاز مدرسہ میں ہی ہوا، اور ایک مرحلہ میں آ کر مدرسہ سے باہر کر دیا گیا تھا، مگر پھر وہی مدرسہ

پناہ گاہ بنا، مگر وہ طالب علمی کا دور تھا۔ اب میں مدرس ہوں گا، طلبہ مجھے استاذ سمجھیں گے، مدرسہ کے اہل انتظام مجھے تنخواہ دیں گے، اس لئے میں ملازم اور ماتحت ہوں گا، کچھ تقاضے استاذی اور مدرسی کے ہوں گے، اور کچھ تقاضے ملازمت اور ماتحتی کے ہوں گے، ان دونوں کو جمع کرنا ہے، میں غور کرتا رہا کہ میں ان دونوں تقاضوں کو کیونکر بہم کروں گا۔

تعلیم وتعلم کا تجربہ تو عرصہ سے ہو رہا تھا، آغاز تعلیم ہی سے اساتذہ سے سابقہ تھا، اس تجربہ نے نظری طور پر بہت کچھ سکھا اور سمجھا دیا تھا، کہ استاذ کو کیسا ہونا چاہئے؟ طالب علموں کے ساتھ اس کا ربط کیونکر ہونا چاہئے؟ اس تعلق میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟ اور کن کن خرابیوں سے بچنا چاہئے؟ میں طالب علم رہ چکا تھا، اساتذہ کے کیا معاملات پسندیدہ تھے؟ اور کیا چیزیں گرانی خاطر کا سبب بنتی تھیں؟ اور ان میں کیا باتیں شریعت اور عقل کی میزان پر پوری اترتی تھیں؟ اور کن چیزوں پر عقل وشرع کو اعتراض ہوتا تھا؟ ان باتوں کا تجربہ اور شعور زمانۂ طالب علمی میں ایک حد تک ہو چکا تھا، لیکن ملازمت کا کوئی خاص تجربہ نہیں ہوا تھا، جن اساتذہ سے میں نے تعلیم حاصل کی تھی ان میں سے بیشتر مدرسہ کے ملازم تھے، مگر میں نے انھیں کبھی ملازم اور ماتحت ہونے کی حیثیت سے دیکھا ہی نہیں، وہ استاذ ہیں، بڑے ہیں بہت بڑے ہیں، اس حیثیت سے انھیں دیکھتا رہا، اس بڑی حیثیت کے منافی کوئی چیز ان سے ظاہر ہوتی تو الجھن ضرور ہوتی، مگر ان کی عظمت کے بارمیں وہ الجھن دفن ہوکر رہ جاتی، اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ ملازمت میرے لئے بالکل نیا تجربہ تھا، میرے لئے یہ سوچنا مشکل تھا کہ جن کی ماتحتی میں ملازمت کروں گا، انھیں راضی کرنے اور خوش رکھنے کے کیا ڈھب ہوں گے؟ وہ مجھ سے کن باتوں کی توقع رکھیں گے؟ سن وسال اور علم وفضل کے فرق مراتب کے علاوہ مجھے اور کن کن نزاکتوں کی رعایت کرنی پڑے گی؟ مجھے کن کن بڑائیوں کے سامنے خود کو چھوٹا محسوس کرنا پڑے گا؟ یہ باتیں اس وقت میرے ذہن میں نہیں آسکی تھیں، کہیں کہیں اس کی وجہ سے ناگواریوں کا سامنا کرنا پڑا، اسے ناظرین کہیں کہیں محسوس کریں گے۔

میسور میں ملازمت کے وقت میں نے اپنے دل میں یہ بات طے کی تھی، کہ دینی خدمت جو بھی میسر آئے گی اسے بطور خدمت اور عبادت کے پورا کروں گا، اسے میں ذریعۂ معاش نہ سمجھوں گا۔ طالب علمی کے زمانے سے یہ بات دل میں راسخ تھی کہ روزی حق تعالیٰ دیں گے، میرے ذمہ دین کی خدمت ہے، روزی کا وعدہ رازق مطلق نے کر رکھا ہے، مجھے یاد ہے کہ جب میں عربی سوم کا طالب علم تھا، تو مبارکپور کی مضافاتی آبادی اُملو میں اپنے والد کے ایک دوست مولانا محمد ادریس آزادؔ رحمانی علیہ الرحمہ کی زیارت وملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا۔ مولانا اہل حدیث عالم تھے، شاعری کا ذوق رکھتے تھے، اسی مناسبت سے والد صاحب سے دوستی تھی۔ ہمارے گاؤں کی جامع مسجد کی تعمیر نو کے لئے عمومی چندہ ہو رہا تھا، یہ چندہ بذریعہ نغمہ ہوتا تھا، خوش گلو افراد کی دو پارٹیاں بن گئی تھیں، ہر پارٹی کو چند شعراء کی سرپرستی حاصل تھی، یہ حضرات چندہ کے موضوع پر روزانہ تازہ تازہ نظمیں لکھ کر اپنی پارٹی کو دیتے، وہ لوگ انھیں اجتماعی طور اصحابِ خیر کے دروازوں پر جا کر پڑھتے، سننے والوں کا ہجوم ہوتا، ہر روز دو چار گھر منتخب ہوتے، عشاء کی نماز سے بارہ بجے شب تک یہ سلسلہ چلتا، چندہ دینے والے پہلے سے تیاری رکھتے، لوگ اپنے حوصلے سے بڑھ کر چندہ دیتے۔

گانے والی ایک پارٹی کو اس وقت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اور مولانا محمد عثمان صاحب ساحرؔ مبارکپوری علیہما الرحمہ کی سرپرستی حاصل تھی، یہ دونوں حضرات اسے نظمیں لکھ کر دیتے۔ دوسری پارٹی نے مولانا ادریس آزاد رحمانی اور میرے والد صاحب محمد شعیب کوثرؔ اعظمی علیہما الرحمہ کے ساتھ وابستگی اختیار کی تھی۔ اسی مناسبت سے والد صاحب مولانا آزاد رحمانی کا بکثرت تذکرہ کرتے تھے، اس وقت مولانا موصوف دربھنگہ کے جامعہ احمدیہ سلفیہ میں استاذ تھے، اور وہاں کسی ‘‘الہدیٰ’’ نامی پرچہ کے مدیر تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ مولانا اپنے وطن املو تشریف لائے ہیں تو ان سے ملاقات کا شوق ہوا، میں حاضر ہوا، تو بہت اخلاق سے ملے، بڑی شفقت فرمائی، تعلیم کے متعلق پوچھتے رہے، مشورہ دیتے رہے، آخر میں ایک بات یہ پوچھ لی کہ پڑھنے کے بعد کیا کروگے؟ میں نے عرض کیا، دین کی خدمت کروں گا، فرمایا

ہاں، یہ جذبہ تو اچھا ہے مگر معاش کے لئے میں پوچھ رہا ہوں۔ میں نے عرض کیا، معاش کا وعدہ حق تعالیٰ نے کیا ہے، اس پر ذرا پھیکے ہوکر وہ بولے، اس وقت یہ کہہ رہے ہو مگر بعد میں اسی بات پر کیا تم قائم رہ سکو گے؟ میں خاموش رہ گیا، مگر میرے دل میں وہی بات جمی رہی جو میں نے عرض کی تھی۔

پھر فارغ ہونے کے بعد جن دنوں میں گھر پر مقیم تھا، کبھی کبھی والد صاحب سے گفتگو ہوتی، تو اس میں معاش اور ذریعۂ معاش کا بھی تذکرہ آتا، میں کہتا کہ روزی رساں اللہ تعالیٰ ہیں، اس کے لئے محنت کرنی کیا ضرور ہے؟ تو والد صاحب فرماتے کہ یہ تو صحیح ہے، مگر ذریعۂ معاش تو آدمی کو تلاش کرنا ہی پڑتا ہے، میں عرض کرتا کہ جو خدا معاش دے گا، کیا وہ ذریعۂ معاش نہ دے گا، اور یہ واقعہ ہے کہ میرے دل کو معاش اور ذریعۂ معاش کی فکر نے کبھی نہیں دبایا۔ انھیں دنوں میں ایک بار اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا منیر الدین صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر تھا، ان کے یہاں بھی کسی تقریب سے ذریعۂ معاش کا ذکر آیا، میں نے سر جھکا کر عرض کیا کہ اس سلسلے میں مَیں وعدۂ الٰہی پر مطمئن ہوں، یہ سنتے ہی حضرت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور بہت تحسین کی اور بہت دعائیں دیں۔

یہ تفصیل میں نے اس لئے لکھی کہ ملازمت کے سلسلے میں میری سوچ اور میرے فیصلے کا پس منظر سامنے آجائے۔ جامعہ اسلامیہ کی مدرسی طے ہورہی تھی، تو صدر و ناظم حضرات نے تنخواہ کی بابت کچھ دریافت کیا تھا، میں نے میسور کی تنخواہ انھیں نہیں بتائی، صرف اتنا عرض کیا کہ تنخواہ کی مقدار سے میرا کوئی تعلق نہیں، آپ حضرات جو چاہیں مقرر فرمائیں، میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے، ان حضرات نے بتایا کہ ہمارا مدرسہ گورنمنٹ بورڈ سے ملحق ہے، جزوی طور پر بورڈ کچھ رقم دیتا ہے، باقی ہم پورا کریں گے، بورڈ کی منظوری میں ابھی کچھ وقت لگے گا ہماری طرف سے ماہانہ ۱۳۵/روپئے آپ کو ملا کریں گے، میں نے یہ نہیں پوچھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے کتنا ملے گا، کیونکہ یہ سوال میرے موضوع سے خارج تھا۔

☆☆☆☆☆

جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس

شوال ۱۳۹۲ھ تا شعبان ۱۳۹۳ھ

جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس میں جب میں باقاعدہ وباضابطہ حاضر ہوا، تو معلوم ہوا کہ میرے رفیق درس، استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب علیہ الرحمہ کے برادر خورد مولانا محمد رضوان صاحب اور ان کے بھتیجے مولانا عبیداللہ مرحوم نیز انھیں کے ہم وطن مولانا عبدالحی صاحب کا بھی بصیغۂ تدریس تقرر ہوا ہے۔

یہ مدرسہ اس سے پہلے مدن پورہ میں تھا، عربی شعبہ کو وہاں سے ہٹا کر ریوڑی تالاب میں اسی سال منتقل کیا جانا طے ہوا تھا۔ اس وقت مدرسہ کے عملہ میں بڑے پیمانے پر تبدیلی لائی گئی تھی۔ مدرسہ کے صدر مدرس مولانا محمد ادریس صاحب علیہ الرحمہ اعظم گڈھ کے رہنے والے ایک بزرگ تھے، مدرس دوم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جگدیش پوری (حال استاذ دارالعلوم دیوبند) تھے، مگر معلوم ہوا کہ اس انقلاب میں یہ دونوں حضرات مدرسہ سے مستعفی ہوگئے ہیں، اب صدر مدرسی کے لئے مدن پورہ بنارس ہی کے ایک نوجوان عالم مولانا حسین احمد صاحب کا تقرر ہوا ہے، اور مدرس دوم مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب ہیں، اساتذہ بجز ایک کے سب نئے ہیں۔

مدرسہ میں تعلیم، فارسی سے لے کر جلالین شریف تک تھی، مجھے درج ذیل کتابیں پڑھانے کے لئے دی گئی تھیں:

۱۔ قدوری ۲۔ شرح تہذیب ۳۔ قطبی ۴۔ نورالانوار ان کے علاوہ ابتدائی درجے کی کوئی ایک کتاب تھی جو اس وقت یاد نہیں ہے، اس کے ساتھ دارالاقامہ کی نگرانی بھی

اہل انتظام نے میرے ذمہ لگائی تھی۔

میرے لئے باضابطہ تدریس کا یہ پہلا تجربہ تھا، طالب علمی کے زمانے میں کتابیں میں نے سمجھ کر پڑھی تھیں، اور ہر کتاب کا ایک مدرس کی طرح تکرار بھی کرایا تھا، اس لئے تدریس میں اور اس کے لئے مطالعہ میں مجھے بہت زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ زیر درس ہر ایک کتاب کا سرسری مطالعہ کافی ہوتا۔ تفہیم مطالب کے لئے آسان سے آسان طرز اختیار کرتا، طلبہ بآسانی سمجھ لیتے، اس طرح پڑھاتا کہ انھیں تحصیل کا شوق پیدا ہوجاتا، گھنٹے میں جو وقت درس وتفہیم کے بعد بچ جاتا اس میں پچھلے علماء وبزرگوں کا تذکرہ کرتا، ان کی محنتوں کی داستانیں سناتا، ترغیب وتشویق کے مضامین بیان کرتا، اس سے طلبہ کو بہت دلچسپی ہوتی، تذکروں اور سوانح کا مطالعہ چونکہ وسیع تھا، بالخصوص علماء دیوبند کے حالات وواقعات سے بکثرت واقفیت تھی، ان کے تذکرے زیادہ تر ہوتے، بنارس میں ایک سال رہنا ہوا، وہاں کی یادیں متفرق طور پر لکھتا ہوں۔

(۱)

بنارس کے رفقائے تدریس میں جن لوگوں سے ابتداءً تعلق ہوا، ان میں سب سے اہم اور سب سے مفید ربط وتعلق مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی سے ہوا، مفتی صاحب مجھ سے تین چار سال پہلے فارغ ہوئے تھے، فراغت کے بعد انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے افتاء کی تعلیم حاصل کی، اور غالباً دوسال سے جامعہ اسلامیہ میں مدرس تھے، ان سے ملاقات ہوئی تو ایسا محسوس ہوا کہ ہم میں کبھی اجنبیت نہ تھی، بہت بے تکلفی، بڑا خلوص، بے ساختہ محبت، جیسے بہت پرانا تعلق ہو، مفتی صاحب ایک نمونہ کے انسان ہیں، میں ان سے بہت چھوٹا ہوں، علم میں بھی! عقل میں بھی! ذہانت وذکاوت میں بھی! مگر ایسا برتاؤ کیا کہ یہ فرق مٹ کر رہا۔ مفتی صاحب مالتی باغ مدن پورہ کی مسجد میں امامت فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ نے حسن سیرت وصورت کے ساتھ حسن صوت سے بھی نوازا ہے، ان کی وجہ سے مسجد میں بڑی رونق آگئی، جمعہ کی نماز سے پہلے تقریباً آدھ گھنٹہ ان کا وعظ ہوتا تھا۔ یہ وعظ قرآن وحدیث

کے عام فہم ترجمہ اور عمدہ دلنشیں تشریح پر مشتمل ہوتا، دلوں میں اتر جانے والا موثر اور مفید!

مفتی صاحب سے دوستی اور محبت کی بنیاد پڑی تو ان کے گھر بکثرت آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا، پھر ان کے حلقۂ احباب سے تعلق ہوا، ان کے بھائیوں سے محبت ہوئی، یہ چار بھائی ہیں، بھائی کے بھائی ہیں اور دوست کے دوست! بڑے بھائی ابوالہاشم صاحب، ان سے چھوٹے مفتی ابوالقاسم صاحب، ان کے بعد خواجہ ابوطالب صاحب، ان کے بعد حافظ ابوالکلام صاحب! میں کسی حیثیت میں نہ تھا، مگر ان چاروں بھائیوں نے میرے ساتھ ایسا معاملہ رکھا جیسے میں پانچواں بھائی ہوں، بھائیوں جیسی بے تکلفی، بھائیوں والی محبت! بڑا پاکیزہ اور دلآویز ماحول تھا۔

جمعہ کی نماز میں مفتی صاحب کے پیچھے ادا کرتا تھا، مفتی صاحب کو بھنک مل گئی تھی کہ میں بھی وعظ وتقریر کر لیتا ہوں، ان کی کوشش ہوتی کہ جمعہ کا بیان میں کروں، میں ان کا وعظ سننا چاہتا، کبھی وہ جیتتے، کبھی میری معذرت کامیاب ہوتی، حقیقت یہی ہے کہ مفتی صاحب کی شفقتوں نے مجھے واعظ وخطیب بنایا۔

مفتی صاحب کا ایک منتخب حلقۂ احباب تھا، جس میں نیک، شریف اور سنجیدہ نوجوان شامل تھے، مفتی صاحب نے اپنی مہربانی سے مجھے اس کا رکن بنایا، عام دنوں میں یہ حلقہ ایک دوسرے کے قریب رہتا، ہر ایک دوسرے کے حال میں شریک ہوتا، مگر اس کے ساتھ ہفتہ میں ایک وقت حلقے کا ہر رکن کھانے میں شریک ہوتا۔ اتوار کا دن گزار کر شب میں یہ پروگرام ہوتا، جس میں تمام رفقاء اپنے اپنے گھر سے اپنا کھانا ٹفن میں لے کر کسی ایک جگہ جمع ہوتے اور سب مل کر بے تکلفی کی محفل میں کھانا کھاتے، دینی وتربیتی باتیں ہوتیں، مسائل کا مذاکرہ ہوتا، ایک دوسرے کے مسائل سنے جاتے، ان کے حل کئے جانے کی تدبیریں سوچی جاتیں، بڑا خوشگوار ماحول ہوتا، مفتی صاحب میر مجلس ہوتے، سنجیدگی اور سبک روحی کی ایک لطیف فضا ہوتی۔

میں بھی مدرسہ سے اپنا کھانا ٹفن میں لے کر حاضر ہوتا، ایسے موقع پر مفتی صاحب کی

طبعی خوبیاں نمایاں ہوتیں، مفتی صاحب بایں جلالت شان ہر خدمت میں سب سے بڑھ کر حصہ لینے کی کوشش کرتے، اور اس لطیف طریقے سے کہ دوسرے منہ دیکھتے رہ جاتے، اور وہ خدمت انجام دے کر اس طرح آسودہ اور مطمئن ہوتے، جیسے انھوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہو۔

مجھے یاد ہے کہ ایک روز میں مدرسہ سے ٹفن میں اپنا کھانا لے کر چلا، مفتی صاحب کے گھر پر اجتماعِ احباب تھا، مالتی باغ کی مسجد کے قریب سے مدن پورہ کی راہ گیروں سے بھری ہوئی گلیوں سے گزر رہا تھا کہ اچانک مفتی صاحب مل گئے، انھوں نے بے تکلف میرے ہاتھ سے ٹفن لے لیا، میں روکتا ہی رہ گیا، مگر انھوں نے یہ کہہ کر کہ اس وقت مجھے ہی لے کر چلنا چاہئے، بات ختم کر دی، میں پریشان اور پشیمان ان کے ساتھ خالی ہاتھ چلتا رہا، لیکن ان کا انداز عمل یہ تھا کہ انھوں نے میرے ساتھ کوئی خاص حسن سلوک یا خدمت کا کام نہیں کیا ہے بلکہ یہی ان کا فریضہ تھا، جو وہ بجا لائے۔ اور یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں، آج بھی مفتی صاحب کا مزاج اور ان کی طبیعت یہی ہے، مجھے ان کے ساتھ بارہا رہنے، کھانے، سفر کرنے کا موقع ملا ہے، میں ہمیشہ اپنی ناکارگی اور کاہلی پر پشیمان رہا، اور وہ خدمت کر کے آسودہ اور مطمئن رہے۔

(۲)

مدن پورہ بنارس میں مفتی صاحب کی سرپرستی میں دینداروں کی ایک تنظیم، مسلمانوں میں دینی بیداری کے لئے، اصلاح عقائد واعمال کے لئے ''انجمن اصلاح المسلمین'' کے نام سے سرگرم عمل تھی، اس کے تمام اراکین کا دیندار اور نمازی ہونا ضروری تھا، مفتی صاحب کی سرپرستی اور نگرانی میں دینداروں کا ایک عمدہ حلقہ ان کے ساتھ وابستہ تھا، اس انجمن کے ماتحت ہر پندرہ دن پر مدن پورہ کی کسی کوٹھی میں ایک صاف ستھرا دینی جلسہ منعقد ہوتا، مدن پورہ ماشاء اللہ خوش حال اہل ثروت کا محلّہ ہے، وہاں عموماً رہائش پہلی منزل پر ہے، زمین والا حصہ خالی ہوتا ہے یا اس میں کپڑا بننے کے کارخانے ہوتے ہیں، انجمن کے اراکین کسی ایک کوٹھی کو صاحب مکان کی فرمائش پر یا ان سے فرمائش کر کے طے کر لیتے اور اعلان ہو جاتا کہ

بعد نماز عشاء وعظ کا پروگرام ہوگا، عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر سامعین اکٹھا ہوجاتے، بغیر کسی تکلف کے پروگرام شروع ہوجاتا، مفتی صاحب کا سادہ اور موثر وعظ ہوتا، اس انجمن میں مفتی صاحب نے مجھے بھی شامل کیا، تو ایک مقرر کا اضافہ ہوا، کچھ دیر میں بیان کرتا، پھر مفتی صاحب کا بیان ہوتا۔ انجمن کے یہ جلسے بہت مفید ہوتے، ان جلسوں کی برکت سے اصلاح معاشرہ کی ایک لہر چل پڑی، عقائد کی بھی تصحیح ہوتی، اعمال کا شوق پیدا ہوتا، اخلاق عالیہ کی راہ ہموار ہوتی، لوگوں کو ہر پندرہ روز کا انتظار رہتا، مفتی صاحب کی برکت سے ایک ناکارہ اور کاہل سست رو بھی کام پر لگ گیا۔

میری پہلی تصنیف:

شوال اور ذوقعدہ کے چند پروگراموں کے بعد بقرعید کا موقع قریب آیا، تو مفتی صاحب نے مجھے حکم دیا کہ قربانی کے موضوع پر ایک رسالہ تیار کیجئے، اسے بقرعید سے پہلے چھپوا کر تقسیم کرنا ہے، اس کے لئے انھوں نے مجھے تین چار روز کی مہلت دی، میں سوچتا رہا کہ کس انداز پر لکھوں، متفرق مضامین طالب علمی کے زمانے میں کبھی کبھی لکھتا رہا، مگر کچھ چھپنے اور اشاعت کے لئے نہیں لکھا تھا۔ ایک روز عشاء کی نماز کے بعد قلم اٹھایا، مکالمے کا انداز آسان معلوم ہوا، میں نے لکھنا شروع کیا اور صبح تک لکھتا رہا۔ اس رات بالکل نہیں سویا، اس وقت جاگنا میرے لئے اتنا ہی آسان تھا جتنا آج کل سونا آسان ہے۔ صبح مفتی صاحب مدرسہ تشریف لائے تو میں نے اپنی تحریر ان کے حوالے کی، انھیں تعجب ہوا کہ اتنی جلدی رسالہ تیار ہوگیا، انھوں نے ساتھ ہی کاتب کے حوالے کیا، چند روز میں یہ رسالہ ”قربانی کیجئے، قربانی دیجئے“ کے نام سے چھپ کر مدن پورہ کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں پہونچ گیا، اور بہت رغبت اور شوق سے پڑھا گیا۔

انھیں دنوں انجمن کا پندرہ روزہ جلسہ ہوا، مضامین سب تازہ اور مستحضر تھے، میں نے ایک پُر جوش اور رقت انگیز تقریر کی، جلسوں اور تقریروں کا یہ سلسلہ پورے سال پابندی سے چلتا رہا۔

(۳)

مجھے تقریر وتحریر سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی، یہ تو مفتی صاحب کی شخصیت کا اثر اور ان کی محبت تھی کہ میں اپنے ذوق ومزاج کے خلاف لیکن ذوق وشوق سے ان پروگراموں میں شریک ہوتا تھا، واقعہ یہ ہے کہ محبت میں بڑی طاقت ہے، اس طاقت کے زیر اثر آدمی اپنی طبیعت کے خلاف کتنے کام انجام دے لیتا ہے، مجھے اصل ذوق پڑھنے اور پڑھانے کا تھا۔ پڑھنے کے لئے مفتی صاحب کا کتب خانہ تھا اور پڑھانے کے لئے مدرسہ کے طلبہ تھے۔ عربی چہارم کی جماعت میں دو یا تین طلبہ تھے اور وہ صاحب استعداد نہ تھے، ان سے مجھے زیادہ دلچسپی نہ ہوئی، عربی سوم کی جماعت بڑی تھی اور اس میں طلبہ بھی خاصے ذی استعداد اور حوصلہ مند تھے، اس جماعت کے دو سبق میرے پاس تھے۔ ایک قدوری اور دوسرے شرح تہذیب! میں نے اس جماعت پر بہت محنت کی اور ماشاء اللہ محنت کے ثمرات اچھے ظاہر ہوئے، اس جماعت میں دو مقامی طالب علم تھے وسیم احمد اور عبداللہ ناصر، عبداللہ ناصر بہت سنجیدہ اور متین تھا، ساتھ ہی بہت خاموش! وسیم احمد میں محنت کرنے، سمجھنے اور آگے بڑھنے کا جذبۂ بیتاب تھا، اس نے بہت محنت کی، کتابیں سمجھنے کی کوشش کی، جو بات سمجھ میں نہ آئی، اسے مکرر پوچھا، اس طرح **لسان سئول اور قلب عقول** کی بدولت استعداد نکھرتی چلی گئی، میں ایک سال کے بعد بنارس سے چلا گیا، لیکن وسیم نے ربط باقی رکھا، ملاقات اور مراسلت کا سلسلہ قائم رہا، وسیم کے نام میرے بہت سے خطوط ہیں، جن کی اس نے بڑی حفاظت کی، عزیزم مولانا ضیاء الحق سلّمہٗ نے جب میرے خطوط جمع کرنے کا آغاز کیا تو وسیم کے یہاں سے ایک ایک پُرزہ ملا۔ یہ تمام خطوط ''حدیث دوستاں'' میں شائع ہو چکے ہیں۔

وسیم نے جامعہ اسلامیہ سے دار العلوم دیوبند تک پڑھنے میں کافی جدوجہد کی اور اس پورے عرصے میں خط وکتابت کے واسطے سے مجھ سے ربط قائم رکھا، حق تعالیٰ نے فضل فرمایا، فراغت کے بعد جامعہ اسلامیہ میں تدریس کے شعبہ میں خدمت کا موقع مل گیا، حضرت مولانا مفتی ابو القاسم صاحب نعمانی کی نگرانی میں کامیابی کی منزلیں طے ہوتی رہیں،

اوراب ماشاءاللہ منصب صدارت پر فائز ہیں، **بارک اللہ فی علمہ وعملہ وعمرہ**

مولانا عبداللہ ناصر بھی جامعہ اسلامیہ میں استاذ حدیث ہیں، اور ماشاءاللہ خوش بیان خطیب وواعظ ہیں۔

ایک مسکین طالب علم:

قدوری کے اسباق شروع ہو چکے تھے، چند ہی روز کے بعد ایک غریب ومسکین طالب علم نے بلند آواز سے بہت صاف اور صحیح عبارت پڑھنی شروع کی، اس کے لہجے اور اندازِ خواندگی پر میں چونکا، دیکھا تو ایک کم عمر طالب علم جو شکل وہیئت کے لحاظ سے بہت کمزور اور مسکین معلوم ہورہا تھا، عبارت پڑھ رہا ہے، بدن کی ہیئت اور عبارت کی بلند آہنگی میں بظاہر کوئی مناسبت نہ تھی، عبارت بہت اچھی پڑھی، میری طبیعت متاثر ہوئی۔ سبق کے بعد میں نے اس سے پُرسشِ حالات کی، معلوم ہوا کہ وہ ضلع مدھوبنی کے شہر بھوارہ کا رہنے والا ہے، یتیم ہے، تین بھائیوں میں بڑا ہے، والدہ موجود ہیں، کفالت اس کے خالو کرتے ہیں، اس پر میری توجہ مبذول ہوچکی تھی، اس کی عبارت خوانی، اس کی محنت، اس کی سعادت مندی، اس کی سنجیدگی اور اس کی مسکنت، سب وجہ کشش تھی، وہ مجھ سے قریب ہوتا چلا گیا، میں نے اسے اپنی کفالت میں لے لیا۔ اب اس کے پڑھنے اور محنت کی رفتار بڑھ گئی، امتحان ششماہی کی تعطیل ہوئی، تو اسے میں اپنے ساتھ گھر لے آیا، دس دن وہ میرے گھر کا ایک فرد بن کر رہا، اسے میں نے اس وقفہ میں شرح تہذیب از سرنو پڑھائی، وہ خاموش ضرور تھا مگر استعداد بہت اچھی تھی، پھر میرے ساتھ ہی وہ مدرسہ میں آیا۔ اس کے بعد سالانہ امتحان تک میرے پاس میری نگرانی میں رہا، اس دوران اس کی استعداد بہت ترقی کرگئی، نام اس کا حبیب اللہ ہے، اس کا تذکرہ بار بار آئے گا۔

تین خصوصی طلبہ:

قدوری کی جماعت میں تین طالب علم ہم عمر اور ہم وطن ایسے تھے کہ ان پر میری نگاہ ابتداءً بار بار پڑتی رہی، یہ تینوں عام طلبہ کے لحاظ سے قدرے معمر تھے، مجھے اندازہ

ہو رہا تھا کہ یہ تینوں میرے ہم عمر ہوں گے، بہت خاموش، بہت سنجیدہ، باتیں بہت غور سے سننے والے، طالب علمانہ شوخی اور شرارت سے بہت دور! میں نے تعارف چاہا تو ایک نے اپنا نام رفیع الدین بتایا، دوسرے نے منیر الدین اور تیسرے نے ولی محمد! یہ تینوں ضلع سنتھال پرگنہ (دُمکا) کے رہنے والے تھے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتایا، اس وقت میرے اوپر دینی جوش بہت تھا، تربیت کا ذوق مجھے بے چین رکھتا تھا، اس موضوع پر مسلسل گفتگو کرتا رہتا تھا، اور محسوس کرتا تھا کہ یہ تینوں طلبہ دوسرے طالب علموں کے مقابلے میں زیادہ متاثر ہوتے ہیں، سننے کے انداز سے، چہرے بشرے کے اتار چڑھاؤ سے تاثر کی شدت کا اندازہ ہوتا۔

ایک روز تینوں میرے پاس سبق کے علاوہ وقت میں آئے، میں نے مزید توجہ کی، حالات پوچھے، رفیع الدین نے بتایا کہ ہم لوگ ایسی جگہ سے پڑھنے آئے ہیں جہاں مسلمانوں کی تعداد تو خاصی ہے، لیکن اسلام کا نام ونشان نہ تھا، بالکل جاہلی ماحول، مسجد تو ایک ضرور ہے، مگر نمازیوں سے خالی! کفر وشرک کی گرم بازاری ہے، بدعات کا زور ہے، پڑھا لکھا کوئی نہیں ہے، اب سے چند سال پہلے ایک مولوی صاحب کمال الدین نامی وہاں تشریف لائے، انھوں نے بہت محنت کی، دن رات کوشش کر کے ماحول کو تبدیل کرنا چاہا، لوگوں کے نام ہندوانہ تھے، انھوں نے بدلے، کفر وشرک کی کئی رسمیں تھیں، بہت مشکلات میں پڑ کر انھوں نے ان رسموں کو توڑا۔ تعزیہ پرستی زوروں پر تھی اسے انھوں نے بند کرایا، لیکن انھوں نے عمر کم پائی، چار سال کام کر کے دنیا سے رخصت ہوئے، ہم تینوں کو انھیں نے جان پر کھیل کر گھر والوں کی مخالفت مول لے کر تعلیم کے لئے نکالا، ہم لوگ پہلے دُمکا شہر کے ایک مدرسہ میں رہے، پھر شیر گھاٹی ضلع گیا کے مدرسے میں پڑھتے رہے، اب یہاں آ گئے ہیں، مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، اب ان کی جگہ خالی ہے، مجھے دلچسپی ہوئی، میں نے ان کے مزید حالات پوچھے تو معلوم ہوا کہ اس جگہ ہندوانہ تہذیب پورے طور سے مسلط تھی، نام تک مسلمانوں جیسے نہ تھے، خود ان تینوں کے نام بھی اسلامی ناموں سے کوئی مناسبت نہ رکھتے تھے، مولوی صاحب نے ان کے موجودہ نام رکھے تھے، اس علاقہ میں کام کرنے کے لئے

مولوی صاحب کو جہاد کرنا پڑا، پھر بالآخر انھوں نے میدان جہاد میں ہی جان دے دی۔ ان پر میں نے بہت پہلے ایک مضمون لکھا تھا، جو سہ ماہی المآثر مئو میں چھپا، پھر ضیاء الاسلام شیخوپور میں شائع ہوا، اور اب میری کتاب ''کھوئے ہوؤں کی جستجو.....'' میں شامل ہے، وہ اس لائق ہے کہ اسے اس آپ بیتی کا بھی جز بنایا جائے، ضمیمے میں ملاحظہ ہو۔

ان تینوں نے باتوں باتوں میں درخواست کرڈالی کہ اب پھر جہالت کا غلبہ ہورہا ہے، بدعتی مولوی دھاوا مارتے رہتے ہیں، اپنے علماء میں سے بعض حضرات پہونچتے ہیں، مگر صرف دھان کی فصل کے سیزن میں چندے کے لئے۔ اگر آپ زحمت کریں اور رمضان کی تعطیل میں وہاں چلیں تو آپ سے امید ہے کہ دین کا کام ہوگا، میری طبیعت بے چین ہوئی، لیکن میرے دل میں میسور کی یاد سمائی ہوئی تھی، وہاں سے میں کرائے کی رقمیں لے کر آیا تھا، میں نے طے کر رکھا تھا کہ رمضان کی تعطیل ہوتے ہی میسور جاؤں گا تاکہ کرائے کی رقمیں واپس کروں، اس کے متعلق میں متعدد خطوط میسور کے اہل تعلق کو لکھ چکا تھا، وہ لوگ شدت سے منتظر تھے، اور پُر امید تھے کہ مجھے میسور ہی کو مستقر بنانا ہے، وہاں سے ایک وفد بنارس آنے کی تیاری کررہا تھا، میں نے اصرار کرکے باز رکھا، اور پختہ وعدہ کیا کہ میں شعبان میں ان شاء اللہ ضرور آؤں گا۔

میں نے معذرت کی کہ تم لوگوں کے یہاں جانے کا اس وقت موقع نہیں ہے اور بعد میں معلوم نہیں موقع ملے کہ نہ ملے، اس لئے وعدہ نہیں کرسکتا، مگر یہ تینوں طلبہ میرے دل میں اتر گئے، میں نے ان کی تربیت اس انداز سے شروع کردی کہ اپنے یہاں جاکر یہ دین کے مضبوط سپاہی اور داعی بن سکیں۔ آپ بیتی میں ان تینوں کا تذکرہ بھی بکثرت آئے گا۔

ایک اور مسکین طالب علم:

تعلیم کے ابتدائی ایام میں جب کہ مدرسہ میں داخلہ مکمل ہوچکا تھا اور تعلیم باقاعدگی کے ساتھ شروع ہوچکی تھی، میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا، غالباً جمعہ کا دن تھا، ایک مسکین لڑکا ننگے سر، لنگی باندھے، پھٹی پرانی قمیص پہنے، ننگے پاؤں، سلام کرکے کمرے میں داخل

ہوا۔ میں نے آنے کی غرض پوچھی، بولا کہ طالب علم ہوں، داخلے کے لئے آیا ہوں، میرا مکان دربھنگہ ہے، وہ اپنی ہیئت سے طالب علم نہیں معلوم ہورہا تھا، میں نے پوچھا کہ تم گھر سے بھاگ کر آئے ہو، اس نے اقرار کیا اور بتایا کہ میرے گھر کے لوگ بہت غریب ہیں، مجھے کام پر لگانا چاہتے ہیں اور مجھے پڑھنے کا شوق ہے، اس لئے بھاگ کر آیا ہوں، میں نے کہا تم نے بہت دیر کردی، اب داخلہ بند ہو چکا ہے، کہنے لگا کہ میں عید کے بعد فوراً گھر سے نکلا تھا، پیسے جتنے تھے بس کے کرائے میں خرچ ہو گئے، ٹرین میں بغیر ٹکٹ کے بیٹھ گیا، پکڑا گیا، اسی میں دیر ہو گئی۔ مغل سرائے اسٹیشن سے پیدل آرہا ہوں، میں نے کہا بھوکے بھی ہو گے، کہا ہاں، کئی وقت سے کھانا نہیں کھایا۔ میں نے ایک طالب علم کو بلایا اور اس کے حوالے کیا کہ اسے کھانا کھلاؤ، اس نے اپنا نام محمد زبیر بتایا، میں نے مدرسہ کے ناظم سے اس کے متعلق بات کی، انھوں نے داخلہ بند ہو جانے کا عذر کیا، میں نے کہا اگر یہ طالب علم سال اخیر میں آتا تب بھی اس کا داخلہ کرنا ضروری تھا، یہاں تو ابھی تعلیم شروع ہوئی ہے، ناظم صاحب نے منظور کرلیا، اور اس کا داخلہ ہو گیا۔

کئی سال کے بعد جب میں مدرسہ دینیہ غازی پور میں مدرس تھا، رمضان کا مہینہ تھا، میں ایک چھوٹے سے حجرے میں بیٹھا تلاوت کر رہا تھا کہ کسی نے آہستگی سے دروازہ کھٹکھٹایا، کھولا تو ایک مولوی صاحب شیروانی پہنے سلام ومصافحہ کرنے لگے، میں نے تعارف چاہا تو بولے میں محمد زبیر ہوں، میں پوچھا کون زبیر؟ کہا جامعہ اسلامیہ میں آپ نے میرا داخلہ کرایا تھا، میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا، پاؤں پر نگاہ پڑی تو یاد آیا کہ یہ وہی زبیر ہے جو میرے پاس ننگے پیر آیا تھا، اور ایک قدم تھوڑا سا مڑا ہوا ٹیڑھا تھا، میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے، میں ایک ہی سال جامعہ اسلامیہ میں رہا تھا، اس کے بعد اس طالب علم سے کوئی ربط نہ تھا، میں بھول بھی گیا، آج جب اس نفیس حالت میں دیکھ رہا ہوں تو علم کی عظمت کا نور دل پر پھیل رہا تھا۔

اس نے بتایا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں آج کل حضرت اقدس ماسٹر محمد قاسم

مدظلہ کے مدرسہ پوہدی بیلا در بھنگہ میں پڑھا رہوں، اپنے گاؤں میں بھی ایک مکتب شروع کیا ہے، اب گاؤں گھر کی دینی حالت بہتر ہے۔

مدرسہ کا ماحول خیر وخوبی سے چلتا رہا، میں طلبہ کی تربیت میں کوشش کرتا رہا، پڑھنے پڑھانے کی اچھی فضا بن رہی تھی، مگر ایک مدرس جو پرانے تھے، انھیں شاید دکھ تھا کہ مدرسہ میں اتنا پُرسکون ماحول کیوں ہے؟ وہ جس کے پاس بیٹھتے دوسروں کی شکایت کرتے، پھر کسی استاذ کے منہ سے بے خیالی میں یا ان کی رواداری میں کوئی شکایتی بات کسی استاذ یا انتظامیہ کے کسی فرد کے بارے میں نکل جاتی تو وہ نمک مرچ لگا کر اس بات کو پہونچا دیتے، اس طرح ماحول میں کبھی کبھی کشیدگی کی لہر بھی آجاتی، سال کے آخر میں بعض ایسی نامناسب باتیں سامنے آئیں کہ میرا دل ٹوٹنے لگا، میری متعدد شکایتیں انھوں نے انتظامیہ کے کانوں میں پہونچائیں، مجلس شوریٰ کی میٹنگ ہوئی، مجھے اس میں طلب کیا گیا، مجھ سے جو باتیں پوچھی گئیں میں نے ان کا جواب تو دیا، لیکن اپنی صفائی نہیں پیش کی، میں بعض حالات کی وجہ سے دلگیر تھا، اسی مجلس میں میں استعفیٰ پیش کر دیا اور میسور جانے کی تیاری کرنے لگا۔

میسور کا سفر:

طلبہ کو مجھ سے انس ہو گیا تھا، جب میں نے استعفیٰ دیا تو سالانہ امتحان ختم کے قریب تھا، طلبہ نے سنا تو بے چین ہو گئے، میں نے انھیں تعلیم کا تسلسل جاری رکھنے کی تلقین کی اور بتایا کہ مجھے میسور جانا تھا، وہیں جا رہا تھا کہ روکا گیا، میسور والے پورے سال تقاضا کرتے رہے، میں وہیں جا رہا ہوں، البتہ تم لوگ خط وکتابت کے ذریعہ ربط رکھنا، میں ان شاء اللہ بہی خواہ رہوں گا۔

سب سے زیادہ رنج مفتی ابوالقاسم صاحب اور بنارس کے احباب کو تھا، مگر ان کا انتظام سے کوئی تعلق نہ تھا، جو صاحب صدر مدرس تھے وہ نہ مجھے پسند کرتے تھے اور نہ مفتی صاحب کو!

مدرسہ کی تعطیل کے بعد میں گھر چلا گیا، مفتی صاحب نے ۲۰؍شعبان ۱۳۹۳ھ کے

بعد کسی تاریخ کا کاشی ایکسپریس سے اٹارسی تک کا ٹکٹ بنوا دیا، جس دن مجھے بنارس کے لئے آنا تھا، اس سے دو روز پہلے موسلا دھار بارش شروع ہوئی، یہ بارش متواتر چھتیس گھنٹے ہوئی تھی، درمیان میں ذرا بھی وقفہ نہیں ہوا، چھتیس گھنٹے میں ۱۹۷۱ء جیسا سیلاب آ گیا، میں گھبرایا کہ اب میسور کیونکر جاؤں گا، وہاں میں نے خط لکھ کر اطلاع کر دی تھی، ۳۶؍ گھنٹے کے بعد بارش رکی، تو گاؤں کے کنارے سے میں کشتی پر بیٹھا اور محمد آباد بازار کے پاس تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اترا، مئو گیا، مئو سے بنارس گیا اور ۲۶؍ شعبان کو مفتی صاحب نے مجھے کاشی ایکسپریس پر سوار کر دیا۔

دوسرے دن شام کو اٹارسی اترا، چھ گھنٹے کے بعد دہلی سے مدراس جانے والی ٹرین ملی، اس سے مدراس پہونچا، مدراس بنگلور، پھر بنگلور سے چھوٹی لائن کی ٹرین سے میسور پہونچا، یہ سفر ۲۷؍ گھنٹے کا ہوا تھا۔ اہل میسور بہت خوش ہوئے، خاکی شاہ کی مسجد میں ایک دوسرے امام متعین ہو چکے تھے، تراویح کے لئے ایک حافظ قرآن بھی آ چکے تھے، میرے لئے یہ پروگرام بنا کہ ہر روز بعد نماز ظہر میری تقریر ہوا کرے اور جمعہ کا خطبہ میں دوں۔

رمضان شریف شروع ہوا، تو میں نے ظہر کی نماز کے بعد ریاض الصالحین سامنے رکھ کر حدیث کے درس کا آغاز کیا، یہ درس بہت مقبول ہوا، بڑی تعداد میں اس میں مسلمانوں کی حاضری ہونے لگی، میں پچھلے سال کرایہ کی جو رقم لے کر گیا تھا، اسے واپس کیا، وہ لوگ بہت متاثر ہوئے۔

پروفیسر غوث محمد مولوی بہت خوش تھے، اب کی بار سب لوگ مصر تھے کہ میسور میں رہنے کا فیصلہ کر لیجئے، میں نے قبول کر لیا، پھر میرے لئے مکان طے کیا گیا، اب میں صاحب اولاد ہو چکا تھا، میری بڑی بیٹی عائشہ گود میں تھی، طے ہوا کہ میں اپنے چھوٹے سے گھرانے کو لے کر عید بعد آ جاؤں، پھر لوگوں نے میری آمد کا مفصل انتظام کیا۔

تحصیل مال میں طبائع کی پستی:

اس سفر میں دو باتیں ایسی پیش آئیں جن کا میرے دل پر بہت اثر ہوا، انھیں لکھتا

ہوں، اور ان دونوں کا تعلق انسانی طبیعت کی پستی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو چار چیزیں بخشی ہیں، یہ چاروں بنیادی نعمتیں ہیں جن پر انسانی زندگی کا مدار ہے، اور ان میں اعلیٰ وادنیٰ ہونے کے اعتبار سے ترتیب ہے۔ سب سے اعلیٰ نعمت ایمان ہے، اس کے بعد آبرو ہے، اس کے بعد جان ہے، اور ان میں کمتر نعمت مال ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر جان پر کوئی آفت آئے تو مال دے کر اسے بچالینا چاہئے، اور اگر عزت وآبرو پر حرف آئے تو مال اور جان دونوں کو قربان کر کے آبرو بچالینی چاہئے، اور اگر خدانخواستہ ایمان پر کوئی ابتلاء آئے تو آبرو اور جان ومال تینوں کا نذرانہ پیش کر کے ایمان کی حفاظت کرنی چاہئے، لیکن انسانوں ستم ظریفی اور حوصلہ کی پستی یہ ہے کہ جو سب سے کمتر ہے اسی کو اکثر پہلا درجہ دیدیا جاتا ہے، اور اس کے کمتر ہونے ہی کا کرشمہ ہے کہ انسانیت کا سب سے اول اور سب سے بڑا بگاڑ مال ہی کی وجہ سے آتا ہے، مال کی زیادتی ہو، تب بھی انسان میں سرکشی اور طغیانی آجاتی ہے، اور اگر اس کا فقدان ہو تب بھی کفر کا اندیشہ ہوتا ہے، **کاد الفقر أن یکون کفراً**، اندیشہ ہے کہ تنگدستی کفر کی دہلیز پر پہونچادے۔ انسانی سوسائٹی میں مال کا طغیان بکثرت دکھائی دیتا ہے۔

میں میسور میں تھا تو وہاں علم دین کی کمی پائی، مگر مال کی فراوانی اپنے علاقے سے زیادہ دیکھی، میں دیکھتا تھا کہ ہمارے یہاں کے جو لوگ دین کی نسبت سے اس علاقے میں جاتے تھے، وہ مختلف حیلوں سے مال بٹورنے کی دوڑ میں لگ جاتے تھے، کوئی امامت کی نسبت سے گیا، کوئی تراویح پڑھانے کی غرض سے صرف رمضان میں پہونچا، کوئی مسجد کا موذن بنا، کسی نے مکتب میں تعلیم دینے کا قصد کیا، عموماً یہ حضرات سرمایہ داروں کے پیچھے لگ جاتے تھے اور مال حاصل کرنے کی تدبیریں کرتے تھے، اس طرح کے قصے میں نے میسور میں بہت سنے، بعض مرتبہ مجھے خود سابقہ پڑا، میری طبیعت میں غیرت کا مادہ بہت ہے، اور اس کے ساتھ حق تعالیٰ کی اخص الخاص رحمت یہ تھی کہ مجھے اللہ کی رزاقیت پر اطمینان ابتداء عمر سے حاصل تھا، گزشتہ اوراق میں کہیں کہیں یہ بات گزر چکی ہے، اس کا اثر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اصحاب ثروت کے دروازوں پر جانے اور ان کی خوشامد کرنے سے محفوظ رکھا، حق

تعالیٰ کا شکر گزار ہوں اور جانتا ہوں کہ نفس کی شرارت سے محفوظ نہیں ہوں۔ **وما أبری نفسی إن النفس لأمارة بالسوء إلا مارحم ربی۔**

میں عموماً اصحاب ثروت سے دور دور رہنے کی کوشش کرتا، غرباء ومساکین سے میرا زیادہ ربط رہتا تھا، کوئی مالدار آدمی مجھے دعوت دیتا تو میں لطیف حیلوں سے ٹال دیتا تھا، وہاں جن لوگوں سے میری بے تکلفی تھی، ان میں سے صاحب اقبال سیٹھ تھے، یہ کوئی بڑے صاحب ثروت نہ تھے، ایک متوسط طبقے کے فرد تھے اور دیندار تھے، مسجد کے ذمہ داروں میں سے تھے، یہ صاحب بے تکلفی میں گفتگو کی حدوں کو کبھی کبھی پھاند جاتے تھے، لیکن مخلص تھے، سچے تھے، اس لئے ناگواری نہ ہوتی تھی، ایک روز مجھ سے بے تکلفی کی حد کو پھلانگتے ہوئے کہنے لگے، مولوی صاحب آپ بہت بیوقوف ہیں؟ میں یہ سن کر سناٹے میں آگیا، لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ ان کا ارادہ کسی گستاخی کا نہیں ہے، اس لئے مجھے نہ تکدر ہوا، نہ اشتعال ہوا، میں نے کہا مجھے اپنے بیوقوف ہونے میں شبہ نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ میں بیوقوف ہوں، لیکن آپ کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے، میں نے آپ کے ساتھ کون سی بیوقوفی کی ہے، کہنے لگے کہ میسور میں دینی علم نہیں ہے، یہاں شمال سے جو عالم اور حافظ وقاری آئے ہیں وہ مختلف تدبیروں سے یہاں کے مالداروں کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں، اور ان کے پیچھے لگے رہتے ہیں، اس طرح وہ تھوڑے دنوں میں مالدار ہوجاتے ہیں، اور آپ نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں تو ہمیشہ غریب ہی رہیں گے۔

میں نے کہا غریب رہنا منظور ہے، مگر دین اور علم دین کو بیچنا مجھے منظور نہیں ہے، میرے حصے کی روزی اللہ تعالیٰ مجھے دیں گے، مجھے جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اسی رمضان میں دو واقعے ایسے پیش آئے جن کے مشاہدے نے مجھے مزید متنبہ کر دیا کہ جن لوگوں پر علم دین کا نام لگا ہے انھیں بہت باخبر رہنا چاہئے۔

ایک واقعہ یہ ہوا کہ میرے ایک بے تکلف اہل تعلق نے افطار اور کھانے کی دعوت کی، اس روز صبح سے میں دیکھ رہا تھا کہ ایک صاحب بزرگ صورت، سفید ریش، بہت وجیہ

وشکیل، دراز قد، چوڑے بدن کے، ہری لنگی اور ہرا صافہ باندھے ہوئے مسجد میں تشریف فرما ہیں، ظہر بعد درس حدیث میں بھی نظر آئے، میں نے سمجھا کسی مدرسے کے سفیر ہوں گے، ملاقات کرنے کی ضرورت نہ انھوں نے محسوس کی اور نہ میں نے!

عصر کی نماز کے بعد صاحب دعوت گاڑی لے کر آئے کہ چلئے، میں گاڑی میں بیٹھنے لگا تو وہ بزرگ صورت بھی بے تکلفی سے بیٹھ گئے، میں نے سمجھا کہ ان کی بھی دعوت ہوگی، افطار ساتھ میں ہوا، اس وقت تک یہ صاحب خاموش رہے، مغرب کی نماز کے بعد کھانے پر بیٹھے، کھا کر فارغ ہوئے تو یہ صاحب کھڑے ہوگئے اور خطبۂ مسنونہ کے چند کلمات پڑھے، میرے کان کھڑے ہوئے کہ یہ صاحب تقریر کریں گے، خیر انھوں نے خطبہ ناتمام پڑھنے کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں کہتا ہے: **ولمن خاف ربی جنتی**، میں چونکا، مگر انھوں نے اس کے بعد اس سے زیادہ چونکا دینے والا ترجمہ کیا، ترجمہ یہ تھا کہ ”جس نے کھانا کھلایا اس کے لئے جنت ہے“ میں نے سر پیٹ لیا، خیریت یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنی تقریر اتنے پر روک دی، میں نے صاحب دعوت سے پوچھا کہ آپ ان کو دعوت دے کر لائے ہیں، انھوں نے کہا نہیں، میں تو انھیں جانتا بھی نہیں، میں سمجھا کہ آپ کے تعلق والے ہیں، جو اتنی بے تکلفی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

میں سوچنے لگا کہ اسی طرح کی الٹی پلٹی باتیں کر کے یہ صاحب اور اس طرح کے لوگ شکار پھنساتے ہوں گے، اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہوں گے۔

مال کی طغیانی:

بزرگوں کا مقولہ ہے کہ: **نعم الامیر علیٰ باب الفقیر**، فقیر کے دروازے پر اگر امیر جائے تو وہ بہتر امیر ہے، کیونکہ یہ اس کے تواضع اور انکسار نفس کی دلیل ہے۔ اور: **بئس الفقیر علیٰ باب الامیر**، اور اگر امیر کے دروازے پر فقیر جائے تو وہ برا فقیر ہے، کیونکہ اس کا امیر کے دروازے پر جانا حریص ہونے یا کسی غرض دنیوی حاصل کرنے اور

تملق وخوشامد کی دلیل ہے، جوطبیعت کا سخت رذیلہ ہے۔ ہاں جب امیر فقیر کے دروازے پر آ گیا تو اس کے ساتھ تواضع اور اکرام کے ساتھ معاملہ کرنا ضروری ہے، کیونکہ اخلاق عالیہ اسلام میں بے حد ضروری ہے۔

میسور میں یہ مقولہ میرے پیش نظر رہا کرتا تھا، کئی اصحاب ثروت ایسے تھے جو دینی مسائل ومعلومات کے لئے بے تکلف حاضر ہوا کرتے تھے، ان سے محبت ہوگئی تھی، وہ اگر کبھی دعوت دیتے تو مجھے جانے میں تکلف نہ ہوتا، لیکن بعض صاحبان ثروت گھر بیٹھے دعوت بھیجتے تو میں ہرگز قبول نہ کرتا۔

رمضان شریف میں ایک پرانے عالم وخطیب جو بہت عرصہ تک میسور کی ایک مسجد میں امام وخطیب رہ چکے تھے، اور اب دوسرے شہر میں فیض پہونچا رہے تھے، تشریف لے آئے، میسور کے ایک مالدارترین آدمی نے ان کی افطار اور کھانے کی دعوت کی، انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی اور مجھے بھی اس دعوت میں شامل کرلیا، اور مجھے اس وقت بتایا جب وہ جانے کے لئے تیار ہورہے تھے، میں نے معذرت کی مگر انھوں نے ایک نہ سنی، زبردستی مجھے گاڑی پر بیٹھالیا، وہ مجھ سے عمر اور مرتبہ میں بہت بڑے تھے، اس لئے میں قوت سے انکار نہ کرسکا، گاڑی ہم لوگوں کو میسور شہر کے کسی ایک کنارے سرسبز وشاداب علاقے میں لے گئی، ایک باغ نما احاطہ میں ایک بڑی کوٹھی میں گاڑی داخل ہوئی، ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا، ایک شخص کو دیکھا کہ کرسی پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا ہے، ان عالم وخطیب صاحب نے بڑھ کر مصافحہ کیا، میں ٹھٹک گیا، مولانا نے فرمایا کہ یہی داعی ہیں، میں سخت مکدر ہوا، میں نے نہ سلام کیا نہ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا، میں نے کرھاً مصافحہ کرلیا، میں نے مولانا سے کہا کہ آپ کہاں لے آئے؟ وہ خوشامدانہ لہجے میں اس شخص کی مالداری کے گن گاتے رہے، میں خون کے گھونٹ پیتا رہا، افطاری کا سامان دیکھا تو کہہ سکتا ہوں کہ اتنا پُرتکلف انتظام افطاری کا میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا، انواع واقسام کے کھانے کی چیزیں تھیں، دوتین آدمیوں کے لئے اتنا سامان تھا جو پچیس تیس آدمیوں کے لئے

کافی ہوتا، میں نے تکدر کے ساتھ چند لقمے فرو کیے، اور ہاتھ کھینچ لیا، مولانا لطف لے لے کر کھاتے رہے اور منہ بھر بھر تعریفیں کرتے رہے، وہیں مغرب کی نماز پڑھی، نماز میں بھی وہ شخص شامل نہ ہوا، اس کا ایک لڑکا شامل ہوا، اس نے روزہ بھی رکھا تھا، نماز کے بعد لوگ کھانے پر بیٹھے، میں بھوک کے باوجود نہ کھا سکا، میں اصرار کر رہا تھا کہ جلدی چلیں، مگر مولانا اس اطمینان سے تھے جیسے یہیں مقیم ہوں، وہاں سے کسی طرح رخصت ہوئے، تو ہم لوگ ایک دوسری عمارت میں جو شہر کے اندر تھی لے جائے گئے، مولانا بتاتے رہے کہ یہ ان کا اپنا مکان ہے، اس کو انھوں نے ہوٹل میں تبدیل کر دیا ہے، اور جہاں ہم لوگوں نے افطار کیا ہے وہ کرائے کا مکان ہے، اس مکان کا کرایہ ڈھائی ہزار ماہانہ ہے، خیال رہے کہ یہ بات ۱۹۷۳ء کی ہے، ہوٹل کی سیر تفصیل کے ساتھ مولانا نے کی اور مجھے بھی کرائی۔ ہوٹل میں بہت سے رہائشی کمرے تھے، ہر کمرے کی آرائش الگ تھی، رنگ الگ تھا، کمرے کی دیواروں میں جو رنگ استعمال کیا گیا تھا، کمرے کی ہر چیز اسی رنگ کی تھی، چادر، تکیہ، ٹونٹیاں، صابن، صابن دانی، دروازے، ان کی سٹکنیاں، غسل خانے کی بالٹیاں، غرض سب ایک رنگ کے، مولانا نے بتایا کہ کمرے کا کرایہ ایک شب کا اسّی روپئے ہے، ہوٹل میں چائے پانچ روپئے کی ہے، میں اکتا گیا، آخر بیزار ہوکر باواز بلند مولانا سے کہا: **وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهِ اَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ** (طٰہ: ۱۳۱) ہم نے ان کو جو مختلف انواع واقسام کی دنیاوی خوشنمائیاں دے رکھی ہیں، جن میں ان کی آزمائش ہے، ان کی طرف نگاہ بھی نہ اٹھاؤ۔ مولانا نے جب میری بیزاری عروج پر دیکھی تب فرمانے لگے کہ جلدی چلنا چاہئے، ہم لوگ گاڑی پر بیٹھے اور جب مسجد میں پہونچے تو آٹھ رکعتیں تراویح کی ہو چکی تھیں، مجھے بڑا صدمہ ہوا، یہ وہ وقت تھا جب حضر میں میری تکبیر اولیٰ فوت نہ ہوتی تھی، بالخصوص رمضان میں اس کا بہت اہتمام تھا، اس نامسعود دعوت کی وجہ سے فرض کی جماعت فوت ہوئی، آٹھ رکعت تراویح گئی۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا، اور طے کر لیا کہ اب ان مولانا کے ساتھ مجھے تعلق رکھنا ہی نہیں ہے، میں نے ان سے بعد میں صفائی سے کہہ دیا کہ

آپ یہاں کے پرانے ہیں، آپ کی دعوتیں ہوتی رہیں گی، مجھے دعوتوں میں لے جانے سے معاف ہی رکھئے، پھر میں ان حضرت سے دور ہی دور رہا۔

میں ۲۷ر رمضان کو اہل میسور سے رخصت ہوکر ٹرین پر سوار ہوا، اٹارسی میں کلکتہ بمبئ میل ملا، اس سے مغل سرائے بارہ بجے رات کے بعد اترا، معلوم ہوا کہ عید کا چاند ہوگیا ہے، میں نے سوچا کہ گھر پہونچنے میں نماز چھوٹ جائے گی، کیوں نہ بنارس میں ہی عید کی نماز پڑھ لوں، یہ سوچ کر میں مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی کے گھر آ گیا، مفتی صاحب اور ان کے بھائیوں نے بنارس میں مجھے پا کر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ نہا دھو کر مفتی صاحب کے پیچھے عید کی نماز ادا کی، نماز کے بعد خوب خوب ضیافتیں ہوئیں۔

میں مفتی صاحب کے گھر پر بیٹھا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، انھوں نے ریسیور اٹھایا اور کسی سے گفتگو کرنے لگے، گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ لیجئے، وہ یہیں بیٹھے ہوئے ہیں، یہ کہتے ہوئے انھوں نے فون میرے ہاتھ میں دیدیا۔ دوسری طرف مدرسی دینیہ کے مہتمم جناب عزیز الحسن صاحب صدیقی بول رہے تھے، وہ مجھی کو مفتی صاحب سے پوچھ رہے تھے، فرمایا کہ آپ مدرسہ دینیہ میں آ جایئے، آپ کی ضرورت ہے، کوپا گنج کے مولوی صاحب مستعفی ہوگئے ہیں، میں نے عرض کیا کہ میں میسور جا رہا ہوں، وہ مصر ہوئے کہ آپ غازی پور آ جایئے، یہاں بے حد ضرورت ہے، میں نے مکرر معذرت کی، مگر وہ اپنے اصرار پر قائم رہے۔

میں بنارس سے رخصت ہوکر عصر کی نماز کے بعد اپنے گاؤں بھیرہ اس حال میں پہونچا کہ میں پان کھائے ہوئے تھا اور پورا گاؤں روزہ دار تھا، جو ملتا صورتِ سوال بن جاتا، میں نے بتایا کہ میں عید کی نماز پڑھ کر آ رہا ہوں، یہاں چاند نہیں ہوا تھا، دوسرے دن یہاں عید ہوئی، میں نے مسلمانوں کی موافقت میں دوبارہ عید کی نماز ادا کی۔

گیارہ بجے کے قریب غازی پور سے ایک صاحب عزیز الحسن صاحب کا خط لے کر آئے، یہ میرے بزرگ حضرت مولانا محمد اسلم صاحب علیہ الرحمہ کے فرزند فضل اللہ صاحب

تھے، مولانا محمد اسلم صاحب فاروقی ہمارے گاؤں بھیرہ کے رہنے والے تھے، پھر نقل مکانی کر کے گھوسی کے قریب اِملا بازار میں آباد ہو گئے تھے، ایک عرصہ تک مدرسہ دینیہ غازی پور میں فیض پہونچاتے رہے، پھر عرصہ سے غازی پور ضلع کے علاقہ کمسار وبار کے مرکزی مقام دلدارنگر میں جامعہ عربیہ مخزن العلوم کے صدر مدرس اور سرپرست تھے، ان کے صاحبزادے فضل اللہ صاحب کو عزیز صاحب نے ایک خط دے کر بھیجا تھا، عزیز صاحب کا یہ خط زور بیان اور انشا پردازی کا شاہکار تھا، انھوں نے نہایت شد ومد سے میری ضرورت غازی پور میں ظاہر کی تھی، لیکن میں میسور سے جو وعدہ کر کے آیا تھا اس کے بوجھ سے دبا ہوا تھا، اس لئے میں عزیز صاحب کی فصاحت وبلاغت اور زور بیان سے متاثر نہیں ہوا، میں نے جواب لکھ کر فضل اللہ کو واپس کر دیا۔

دوسرے دن دیکھتا ہوں کہ ظہر کی نماز میں عزیز صاحب بہ نفس نفیس موجود ہیں، نماز کے بعد ملاقات ہوئی، انھوں نے مجھ سے، میرے والد صاحب سے اور دوسرے اہل تعلق سے گفتگو کی، اس وقت یہ یاد نہیں آرہا ہے کہ گفتگو کے کس مرحلے میں مَیں نرم پڑا، اور غازی پور جانے پر آمادگی ظاہر کی، لیکن یہ یاد ہے کہ انھوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اثبات میں جواب لئے بغیر ٹلیں گے نہیں۔

چند روز کے بعد میں بنارس جارہا تھا کہ مفتی ابوالقاسم صاحب سے مشورہ کروں، کیونکہ مجھے اس وقت سب سے زیادہ اعتماد اور تعلق مفتی صاحب ہی سے تھا، میں نے اپنے جی میں طے کیا تھا کہ مفتی صاحب جو مشورہ دیں گے اس کی تعمیل کروں گا، اس وقت بنارس جانے کے لئے دو ہی راستے تھے، ایک یہ کہ محمد آباد سے اعظم گڈھ جا کر بس پر سوار ہو کر بنارس جایا جائے، دوسرے یہ کہ مئو پہونچ کر ٹرین پکڑی جائے۔ مجھے بس کے سفر میں بہت دقت تھی، میں نے مئو سے چھوٹی لائن کی ٹرین پکڑی، ٹرین اوڑیہار پہونچی تو مولانا ابوبکر غازی پوری نظر آئے، وہ ان دنوں ڈابھیل میں پڑھاتے تھے، مدرسہ دینیہ پہلی مرتبہ گیا تھا تو اس وقت وہ مدرسہ دینیہ میں مدرس تھے، اسی وقت ان سے شناسائی ہوئی تھی، وہ مل کر بہت خوش

ہوئے، وہ بھی بنارس جارہے تھے، وہاں سے غالباً ڈابھیل جانے کا پروگرام تھا، انھوں نے بتایا کہ اسی ٹرین میں ڈابھیل کے شیخ الحدیث مئو کے مشہور عالم حضرت مولانا محمد ایوب صاحب بھی موجود ہیں، چلو ان سے ملاقات کراؤں، ہم لوگ ان کی خدمت میں جا کر بیٹھے، مولانا میرے متعلق پوچھنے لگے، میں نے ساری بات بتائی، مولانا نے بہت تیقن کے لہجے میں فرمایا کہ تم میسور جاؤ، وہاں کام کے مواقع ہیں، غازی پور قطعاً نہ جانا، وہاں کچھ نہ ہوگا۔ اس بات کو وہ مکرر نہایت یقین اور اعتماد کے لہجے میں فرماتے رہے، مولانا ابوبکر صاحب بھی تائید کرتے رہے، مولانا کی اس گفتگو اور مولانا ابوبکر صاحب کی اس تائید نے مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔

میں بنارس مفتی صاحب کے پاس حاضر ہوا، تو شام تک عزیز صاحب بھی آ گئے، اس وقت عزیز صاحب سراپا سفر تھے، حرکت مسلسل تھے، مجھے معلوم نہیں کہ وہ اتفاقی طور پر بنارس آ گئے تھے یا مفتی صاحب سے گفتگو کر کے انھوں نے بنارس میں میرا ہونا معلوم کر لیا تھا، آتے ہی انھوں نے پھر پچھلی باتیں دہرانی شروع کیں، مفتی ابوالقاسم صاحب نے غازی پور رہ جانے کو ترجیح دی، ان کے مشورے کے بعد میں یکسو ہو گیا، اہل میسور کے سامنے ایک بار پھر مجھے شرمندہ ہونا پڑا، دوسرے دن گھر لوٹا اور والد صاحب کو صورت حال بتائی، تو انھوں نے بھی غازی پور کی ترجیح کی تائید کی۔

☆☆☆☆☆

مدرسہ دینیہ غازی پور میں

شوال ۱۳۹۳ھ تا شعبان ۱۳۹۴ھ

میں ۱۰؍شوال کو غازی پور پہونچ گیا، عزیز صاحب نے نقد تنخواہ ۱۷۵؍ روپئے مقرر کی، اور دونوں وقت کے کھانے کو تنخواہ کا جز قرار دیا، گویا پونے دوسو نقد اور دو وقت کھانا تنخواہ ہوگی، میں چونکہ اول روز طے کر چکا تھا کہ تنخواہ کے بکھیڑے سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا، اس لئے اس میں کسی قیل وقال کی گنجائش نہ تھی۔

مدرسہ دینیہ میں اس وقت عربی تعلیم تھی، مگر برائے نام! طلبہ نہ ہونے کے درجے میں، اساتذہ بھی نہ تھے، مولانا مشتاق احمد صاحب علیہ الرحمہ صدر مدرس تھے، وہ دفتری امور میں اس درجہ مشغول تھے کہ انھیں پڑھانے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ عربی کے ایک مدرس مولوی جلال الدین صاحب تھے، جن کی عربی کی استعداد بس واجبی تھی، بلکہ واجبی سے بھی کم، حفظ میں ایک مدرس حافظ محمد الیاس صاحب تھے، پرائمری میں چند اساتذہ تھے۔

عربی درجات کا حال یہ تھا کہ عربی چہارم میں دو طالب علم تھے، عربی سوم میں ایک طالب علم، عربی دوم میں کوئی نہ تھا، عربی اول میں دو تین تھے، فارسی میں یاد نہیں کوئی تھا یا نہیں؟ چند طلبہ حفظ میں تھے، دارالاقامہ میں زیادہ سے زیادہ دس پندرہ طلبہ تھے، عربی چہارم اور سوم کی سب کتابیں میں نے اپنے پاس رکھیں، عربی اول کی کتابیں مولانا مشتاق احمد صاحب اور مولوی جلال الدین کے درمیان تقسیم ہوئیں، ہاں غالباً ترجمہ کلام پاک دونوں جماعتوں کے ان حضرات کے پاس تھے۔

تعلیم شروع ہوئی تو میری طبیعت بہت گھبرائی، بنارس میں طلبہ کی تعداد بھی اچھی

تھی اور مفتی صاحب اور دوسرے احباب کی وجہ سے ماحول بھی پُرکشش تھا، یہاں بالکل سناٹا تھا۔ مولانا مشتاق احمد صاحب بزرگ تھے اور اپنی دفتری دنیا میں مست تھے، مولوی جلال الدین سے مناسبت نہ تھی، اور وہ ملنے ملانے کے آدمی نہ تھے، ایک عزیز صاحب سے مناسبت ہوئی، لیکن وہ اس وقت سراپا سفر تھے، ملاقات ہوتی تو بہت باتیں کرتے، اور ان کی باتیں زیادہ تر سیاسیات کے محور پر دائر ہوتیں یا جمعیۃ علماء ہند کے کاموں سے متعلق ہوتیں، میں ان کی وجہ سے دلچسپی لیتا مگر یہ دونوں چیزیں میرے موضوع سے خارج تھیں، جو طلبہ تھے، ان کا مزاج علم وتعلیم سے بہت کم مناسبت رکھتا تھا، وہ زیادہ تر مدرسہ کی ضروریات کی خدمت میں لگے رہتے تھے، میری دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا، کتب خانہ بھی بہت چھوٹا تھا، میں گھبراتا تو جمعرات کو بنارس چلا جاتا، مجھے بس کے سفر میں بہت پریشانی ہوتی تھی۔

غازی پور سے بنارس فقط ۷۷ رکلومیٹر ہے، اور بسیں دونوں کے درمیان بہت سی چلتی تھیں، بسیں تین طرح کی تھیں، بعض پونے دو گھنٹے میں بنارس پہونچاتی تھیں، انھیں ''طوفان میل'' کہا جاتا تھا، بعض دو سوا دو گھنٹے میں، یہ میل بسیں تھیں، بعض پونے تین گھنٹے میں، یہ پسنجر بسیں تھیں، ہر پانچ منٹ میں ایک بس بنارس روانہ ہوتی تھی، میرے لئے بس کا سفر بڑا صبر آزما تھا، بس پر بیٹھتے ہی دوران سر اور متلی کا اثر ہوجاتا، بس چلنے لگتی تو الٹی بھی ہوتی، اس لئے بس کا سفر مجبوراً ہی کرتا تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ہر روز شام کو بنارس چلا جاتا اور صبح کو واپس آجاتا، مگر ایسا کرنا ممکن نہ تھا، تاہم جمعرات کو عموماً جانے کی کوشش کرتا، مہینوں طبیعت کا یہی حال رہا، لیکن کب تک، طلبہ سے بھی انس پیدا ہوا، جگہ بھی مانوس ہوئی، امتحان سہ ماہی تک کچھ اضطراب کم ہوا، امتحان سہ ماہی کے بعد عربی چہارم میں کچھ طلبہ مزید داخل ہوئے، بنارس سے میرے چلے آنے کے بعد اساتذہ میں کچھ اور ردوبدل کا عمل ہوا، کئی لوگ نکل گئے، کچھ نئے اصحاب آئے، اس سے مدرسے کا سکون درہم برہم ہوا، طلبہ بھی ادھر ادھر ہوگئے، عربی چہارم کے درجے میں مولوی حبیب اللہ، مولوی رفیع الدین، مولوی منیر الدین، مولوی ولی محمد اور ان کے ساتھ ایک نئے طالب علم مولوی عبدالحق بنارس چھوڑ کر میرے پاس آگئے،

ان طلبہ سے مجھے پہلے سے انس تھا، ان کے آجانے کی وجہ سے، میری طبیعت بندھ گئی، یہ طلبہ معمر بھی تھے، سنجیدہ اور فہیم بھی تھے، محنت سے پڑھنا بھی جانتے تھے، ان کے آجانے کے بعد میرے اندر تعلیم وتربیت کا نیا جوش وولولہ پیدا ہوا۔

مجھے محنت کا ایک میدان مل گیا، مغرب کی نماز کے بعد ہر روز میں ان طلبہ کو لے کر بیٹھ جاتا، آدھ گھنٹہ علم کی ترغیب وفضیلت، اس کے لئے کوشش ومحنت کی اہمیت، علماء کے واقعات، محنت کے نتائج بیان کرتا، پھر ان کے پڑھنے اور مذاکرہ ومطالعہ کی نگرانی بھی کرتا۔ اس سے آناً فاناً مدرسہ میں تعلیم کا ایک اچھا ماحول بن گیا، اس وقت میں بالکل یکسو تھا، اپنے مطالعہ، وظائف اور طلبہ کی تعلیم کے علاوہ کوئی مشغولیت نہ تھی، میں ہمہ تن اسی میں لگا رہتا، اب بنارس جانے کا خیال بھی مدھم پڑ گیا، گھر بھی کم جاتا۔

بارگاہِ مصلح الامت میں:

غازی پور میں جب یکسوئی نصیب ہوئی، تو طبیعت ان اعمال ووظائف کی طرف مائل ہوئی جن میں مَیں گھر پر رہ کر مشغول رہا کرتا تھا، یعنی تلاوت، طول طویل نوافل، اوراد و وظائف، اور ان سب کے ساتھ شوق مطالعہ، تہجد کی پابندی بحمد اللہ ہر جگہ رہی۔ میسور میں، بنارس میں، یہاں بھی وہ سلسلہ قائم رہا۔ یہاں اوراد ووظائف میں اضافہ بھی ہوا اور پابندی بھی بڑھی۔ ایک روز مدرسہ کے کتب خانہ میں مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی خانقاہ الہ آباد سے نکلنے والے رسالہ ’’معرفت حق‘‘ کے چند شمارے ہاتھ آئے، میں انھیں پڑھنے لگا، ان کے پڑھنے سے دل پر عجیب وغریب اثر ہوا، ایسا محسوس ہوا جیسے پیاسے کو آب زُلال مل گیا ہو، دلچسپی بڑھی اور اتنی بڑھی کہ میں ان مضامین ومواعظ میں جذب ہوکر رہ گیا، وہاں جتنے رسائل مل سکے، میں سب اٹھا لایا اور بار بار پڑھتا رہا، اور جتنا پڑھتا دلچسپی بڑھتی رہی، طبیعت دنیا سے پہلے ہی سرد ہوچکی تھی، دل نے ’’معرفت حق‘‘ کے مضامین سے محبت ومعرفت کی گرمی پائی، پھر آنکھوں نے آنسوؤں کی جھڑی لگادی۔ میں شاہ صاحب کے نام سے واقف تھا، ان کی تاثیر بھی قدرے جانتا تھا، مگر ان کے مواعظ

وملفوظات پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، اب جو پڑھنے کی توفیق ہوئی تو دل کی دنیا زیروزبر ہوکر رہ گئی، میں بار بار ان مضامین کو پڑھتا اور قلب کو گرماتا رہتا، لیکن یہ چند ہی پرچے تھے، وہ بھی متفرق!

عزیز الحسن صاحب صدیقی کے یہاں ہمدرد دواخانہ کی ایجنسی تھی، اس میں کوپاگنج کے ایک بزرگ عالم دین، صاحب تقویٰ بطور حکیم کے مریضوں کی خدمت کرتے تھے، یہ تھے مولانا حکیم بشیرالدین صاحب علیہ الرحمہ، معلوم ہوا کہ یہ بزرگ حضرت شاہ صاحب کے اخص الخواص لوگوں میں تھے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور معرفت حق کا تذکرہ کیا، تو انھوں نے بہت سے شمارے مجھے دئے، میں انھیں لاکر انھیں میں جذب ہوگیا، اسباق، اوراد و وظائف اور تلاوت کے علاوہ سارا وقت معرفت حق کے لئے وقف ہوگیا، رات کو بستر پر پہونچتا تو اس کے مطالعے میں نیند غائب ہوجاتی، حکیم صاحب کا عطا کیا ہوا سرمایہ چند دنوں میں پورا ہوگیا۔ میں نے حکیم صاحب سے مزید درخواست کی تو انھوں نے رہنمائی فرمائی کہ الہ آباد مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامؔی کو لکھئے، وہ بہت سے شمارے بھیج دیں گے، میں نے انھیں بصد شوق خط لکھا، ان کا جواب جلد ہی آگیا، اس میں بشارت تھی کہ معرفت حق کی کئی جلدیں جو دفتر میں موجود ہیں بھیجی جارہی ہیں، میں نہایت بے تابی سے ان کا انتظار کرنے لگا۔

ادھر حکیم صاحب کو حضرت شاہ صاحب کے علوم و معارف سے میری دلچسپی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے ملاقات کے مواقع بڑھادئے، وہ ہر ملاقات پر مجلس میں حضرت مصلح الامت کا ذکر کرتے، ان کے ملفوظات نقل کرتے، اپنے تجربات بیان کرتے، میں دیوانہ وار ان کے حالات سنتا، دل میں ان کی محبت وعقیدت کے ساتھ اللہ ورسول کی محبت وعقیدت اور دین کی عظمت کا چراغ روشن ہوتا چلا جاتا، ایک طرف حکیم صاحب کی باتیں دل میں آگ لگاتیں، دوسری طرف معرفت حق کا انتظار شدت اختیار کرتا چلا جاتا، ہر روز بعض طلبہ کو ڈاک خانہ بھیجتا کہ شاید آگیا ہو، گرمی شدید تھی، تکلیف کا لحاظ بھی ہوتا، مگر میری بے تابی چین

لینے نہ دیتی، وہاں کے پرانے طالب علموں میں دو طالب مولوی محمد عابد اور مولوی خورشید میری بڑی خدمت کرتے تھے، ان دونوں نے میری بے قراری دیکھی تو از خود ڈاک کا پتہ لگانا شروع کر دیا، ایک روز چلچلاتی دھوپ میں مولوی محمد عابد کتابوں کا بنڈل لئے ہوئے آئے، میں دیکھ کر بے خود ہوگیا، عابد نے بتایا کہ بڑے ڈاک خانے سے لے کر آیا ہوں، بڑا ڈاک خانہ مدرسہ دینیہ سے بہت دور دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، اس گرمی میں، دوپہر میں عزیز موصوف کا وہاں تک پیدل آنا جانا مجھے بھاری معلوم ہوا، مگر وہ خوش تھے کہ ایک خدمت تو مجھ سے بن پڑی! میں نے بڑی دعائیں دیں، پھر تو میں تھا اور معرفت حق کی یہ جلدیں تھیں۔

زندگی میں ایک خوشگوار اضافہ:

ہمارے ماحول ومعاشرے میں اور ہمارے علاقے میں عموماً یہ رواج ہے کہ نکاح کے بعد دلہنیں اپنے سسرال میں مشترک خاندان کا ایک حصہ بن کر رہتی ہیں، بیٹا اپنے والد کی کفالت میں ہوتا ہے، اس کی بیوی بھی اسی گھر کی کفالت میں ہوتی ہے، بیٹا اگر گھریلو ذریعۂ معاش میں ہے تو والدین سے علیٰحدہ رہنے کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا، اگر وہ گھر سے باہر کہیں دوسری جگہ کسی مشغلہ میں ہوتا ہے، تب بھی اس کی بیوی اپنی سسرال میں اپنے خسر اور ساس کے ساتھ رہتی ہے، یہ رسم اس قدر پختہ ہے کہ اس کے علاوہ سوچنے کی بھی گنجائش نہیں ہے، اگر کسی نے اس کے خلاف سوچا یا عمل کیا تو وہ پورے معاشرہ میں نکو اور گھر والوں کی نگاہ میں نالائق بن کر رہ جاتا ہے، حالانکہ معاشرے کی یہ رسم شرعاً اتنی قباحتیں رکھتی ہے کہ ان کی اصلاح مشکل ہے۔

میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا، میں بنارس پڑھاتا رہا اور میری اہلیہ میرے گھر والد صاحب کے ساتھ رہی، اس دوران بعض ناخوشگواریاں ہوئیں، میری بڑی بیٹی یہیں تولد ہوئی، میں غازی پور آیا تو میری اہلیہ زیادہ تر اپنے میکے میں رہی، کچھ وقت والد صاحب کے گھر رہی۔

غازی پور آنے کے بعد میں نے تدبیر کی کہ کسی طرح اہلیہ کو اپنے ساتھ غازی پور میں رکھوں، پہلے میں نے اپنی سسرال کے لوگوں سے اجازت طلب کی، انھوں نے بخوشی اجازت دے دی، پھر میں نے ڈرتے ڈرتے والد صاحب کے سامنے یہ معاملہ رکھا، مجھے اندیشہ تھا کہ وہ ناراض ہوں گے، مگر بحمد اللہ کچھ نہ ہوا، انھوں نے بھی اجازت دے دی، گو کہ بادل ناخواستہ دی، مگر میں نے اسے غنیمت سمجھا۔ غازی پور میں عزیز الحسن صاحب صدیقی نے مولانا مشتاق احمد صاحب علیہ الرحمہ کے مشورے سے ایک مکان کا انتظام کر دیا تھا۔

یہ مکان مدرسہ دینیہ سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر غازی پور شہر کے ایک کنارے ''میر محلّہ'' نامی علاقے میں تھا، اچھا خاصا بڑا مکان تھا، جو مولانا مشتاق احمد صاحب کی ایک عزیزہ کا تھا، وہ بیوہ تھیں، پرانی رئیس! بہت فہیم اور سلیقہ مند! تن تنہا اس طویل وعریض مکان میں رہتی تھیں، یہ مکان کچا اور کھپریل تھا، آنگن اس کا کافی بڑا تھا، جس میں کئی درخت تھے، انھوں نے ایک کمرہ اور اس کے سامنے کا آنگن اپنے تصرف میں رکھا اور باقی مکان ہمارے تصرف میں دے دیا۔ اس مکان میں ہر طرح آرام تھا، بہت کشادہ ہوادار، آرام دہ! ہاں محلّہ ذرا تکلیف دہ تھا، تھا تو مسلمانوں کا مگر کسی کو دینی ذوق نہ تھا، مکان کے قریب ایک مسجد تھی مگر ویران، نماز باجماعت کا انتظام نہ تھا، میری اکثر نمازیں مدرسہ میں ہوتیں، لیکن میں نے کوشش کی، محلّہ والوں سے ملاقاتیں کی، جماعت کا انتظام کیا، مگر میرا خود وہاں رہنا کم ہوتا، اور جس وقت رہ جانے کی کوشش کرتا تو بعض اوقات تنہا نماز پڑھنی پڑتی، اور مدرسہ کے نظام میں بھی خلل پڑتا۔ پریشان ہو کر پانچوں وقت کی نمازیں مدرسہ کی مسجد میں جا کر ادا کرتا، غازی پور شہر میں دینی اعتبار سے بڑی مردنی تھی، دینی احساس میں نے وہاں بہت کم پایا۔

میں اپنے معمول کے مطابق بہت سویرے اٹھتا، جب صبح صادق ہوتی تو میں مدرسہ کی راہ اختیار کرتا، ۱۵ر منٹ کا راستہ تھا، اس وقت شہر میں سناٹا ہوتا، میرا راستہ خصوصیت سے غیر آباد اور سنسان تھا، کتے کبھی کبھی پریشان کرتے مگر میں پابندی سے روزانہ مدرسہ آتا،

یہاں آتے ہی فجر کی اذان کہتا، پھر طلبہ کو جگاتا، فجر کی نماز کے بعد معمولات سے فارغ ہوتے ہی تعلیم کا وقت شروع ہوجاتا۔ ناشتہ کی کوئی پابندی نہ تھی، درس شروع ہوجاتا، عربی سوم اور چہارم کی سب کتابیں پڑھاتا، دوپہر کا وقفہ ہوتا تو گھر چلا جاتا، ظہر کی نماز کے لئے پھر آجاتا۔ ظہر کے بعد درس ہوتا، عصر کی نماز کے بعد عربی چہارم کے طلبہ کو تجوید پڑھاتا، مغرب کے بعد طلبہ کو سمجھاتا اور معمولات ووظائف میں مشغول ہوتا۔ فارغ ہوکر گھر چلا جاتا، کھانا کھا کر عشاء کی نماز کے لئے مدرسہ آجاتا، یہاں طلبہ بھی عشاء کے پہلے کھانے سے فارغ ہوجاتے، عشاء کے بعد ایک گھنٹہ مدرسہ میں رہتا، پھر گھر چلا جاتا۔

بچوں کو غازی پور لانے کے بعد یہی معمول مستقل رہا، بنارس کی آمدورفت اب کم ہوگئی، جمعرات کو غازی پور کے محلّہ ’’جوڑن شہید‘‘ مسجد میں تبلیغی اجتماع ہوتا، اس میں میرا جانا ہوتا، اور وہاں بیان ہوتا۔

میں لکھ چکا ہوں کہ مدرسہ دینیہ میں میری تنخواہ اس وقت ۱۷۵/روپئے تھی، اس کے ساتھ کھانا بھی تنخواہ میں شامل تھا، جب میں اپنے بچوں کو لے گیا تو مدرسہ کے مطبخ سے میرے کھانے کا انتظام موقوف ہوگیا، تو مہتمم صاحب نے یہ آسانی کردی کہ شروع ماہ میں ایک مہینہ کا غلہ، آٹا، چاول اور دال دیدیتے، اس کے ساتھ سبزی ترکاری اور جلاون کے پیسے بھی متعین کرنے چاہے، میں نے پیسوں کے لئے تو معذرت کی، البتہ میرے حصے کا غلہ مل جاتا۔ اس سے مجھے بہت سہولت ہوتی، وہ ہوتا تو صرف میرے حصہ کا مگر اللہ تعالیٰ اس میں برکت دیتے اور تقریباً ہم دونوں کے لئے پورے مہینے کفایت کرتا۔ گوشت، تیل، سبزی اور لکڑی خریدنی پڑتی، مگر آسانی سے کام چل جاتا، ہاں یہ ہے کہ کھانے اور کپڑے میں آخری حد تک سادگی رہتی، بسااوقات ایسا ہوتا کہ نہ تیل ہوتا نہ سبزی، صرف دال روٹی اور چاول ہوتا، اور ہم دونوں اللہ کا شکر ادا کرکے کھالیتے، اس صورت حال میں اس وقت ذرا دقت محسوس ہوتی جب کوئی مہمان آجاتا! اس وقت تک نہ میری کوئی شہرت تھی اور نہ کوئی خاص وقعت! اس لئے مہمانوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی، پس سکون کے ساتھ وقت گزرتا اور

زندگی بسر ہوتی رہتی۔

ایک خاص واقعہ:

اس پُرسکون زندگی میں ایک مرتبہ اضطراب کی ہلچل مچی۔ گھر میں مدرسہ کی طرف سے ملی ہوئی صرف دال روٹی پر اکتفا تھی، گوشت، ترکاری، تیل مصالحہ سے ہمارے برتن ناآشنا تھے، لیکن ہنسی خوشی اوقات بیت رہے تھے، غربت تھی، مگر اس کا احساس نہ تھا، نہ کوئی پریشانی اور دل تنگی تھی۔ اسی دوران مغرب کی نماز کے بعد عشا کے قریب مدرسہ میں میرے دو بہت عزیز دوست آئے، ایک میرے مخدوم زادے، میرے اخص الخاص محسن استاذ حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب مدظلہ...... جنھوں نے اس وقت میرے سر پر دست شفقت رکھا تھا جب ہر طرف سے میں طمانچوں کا مستحق تھا اور طمانچے لگ بھی رہے تھے، اس سنگین وقت میں انھوں نے اپنی آغوش میں پناہ بخشی تھی، اس لئے ان سے، ان کی اولاد سے، ان کے متعلقین سے مجھے اس وقت بھی ایسی محبت تھی اور اب بھی ہے کہ ان کی ہر خدمت میرے لئے باعث صد سعادت و ہزار مسرت ہے...... انھیں استاذ محترم کے فرزند گرامی تھے، اور ان کے ساتھ ان کے ایک دوست تھے۔ میں دال روٹی کھا کر گھر سے آگیا تھا، میں سہم گیا کہ ان عزیزوں کی خاطر داری کیونکر کروں، ایک لمحہ تشویش میں مبتلا ہوا، پھر اپنے ایک طالب علم کو بلایا اور دریافت کیا کہ تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں، اس نے کہا جی ہاں! میں نے کہا عشا کی نماز کے بعد بازار سے کھانا لے کر آؤ، مہمانوں کو کھلانا ہے، پھر میں مطمئن ہوگیا، عشا کی نماز کے بعد بازار سے جو عمدہ کھانا مل سکتا تھا وہ لایا، میں نے اپنے مہمانوں کی تواضع کی، یہ وقت تو خیریت سے گزر گیا، اب صبح ناشتے کی فکر سوار ہوئی، جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی، گھر میں کوئی سامان نہ تھا، میں رات کو گھر آیا، اہلیہ کو کچھ نہیں بتایا چپ چاپ بستر پر پڑ گیا، مگر فکر میں نیند کہاں آتی، رات کو بارہ بجنے کے بعد میں نے بستر چھوڑ دیا، وضو کرکے نماز اور مناجات میں مشغول ہوگیا، بڑے کرب اور درد میں یہ رات گزری، لیکن صبح ہوتے ہوتے دل میں ٹھنڈک پڑ چکی تھی، میں روزانہ کی عادت کے مطابق مدرسہ میں آیا، اذان دی، نماز پڑھی،

نماز کے بعد پھر دعا ومناجات میں مشغول ہونا چاہ رہا تھا، اور اسی نیت سے مسجد سے نکل کر اپنے چھوٹے سے حجرے میں بند ہونے جا رہا تھا کہ مدرسہ کے مہتمم صاحب بھی مسجد سے نکلتے ہوئے مل گئے اور انھوں نے کوئی گفتگو چھیڑ دی، ان کی گفتگو دراز ہوتی تھی، مگر اتنی دلچسپ ہوتی تھی کہ وقت کے گزرنے کا احساس نہ ہوتا تھا، مگر آج مجھے بے کلی تھی، میں اپنے پروردگار سے کچھ مانگنا چاہتا تھا، اس لئے آج میں اکتا رہا تھا، خیر وہ چند باتیں کرکے رخصت ہوئے اور میں کمرے میں جا کر اسے بند کرنے لگ گیا، ابھی ٹھیک سے بند نہ کرسکا تھا کہ مہتمم صاحب پلٹ کر آئے اور سلام کیا۔ مجھے خیال ہوا کہ پھر کوئی بات انھیں یاد آئی، انھوں نے کہا کہ آپ کی تنخواہ کے یہ ستّر روپئے باقی رہ گئے تھے، میں دو روز سے اسے جیب میں لئے ہوئے ہوں کہ آپ کو دیدوں، مگر یاد نہ رہا، اب بھی بھول کر جا رہا تھا، تھوڑی دور پہونچا تھا کہ یاد آگیا، پلٹ کر آیا کہ ابھی دیدوں، میں نے لے لیا، وہ چلے گئے، اور میں دروازہ بند کرکے حق تعالیٰ کے احسان اور مہربانی کے تصور سے بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، میں روئیں روئیں سے شکر الٰہی بجالا رہا تھا، جب اس حال سے افاقہ ہوا تو میں نے ناشتے کا سامان منگوایا، اس وقت کے لحاظ سے پُر تکلف ناشتہ بنا، مہمانوں کو ناشتہ کرایا، رخصت کے وقت دونوں کو دس دس روپئے ہدیہ دئے، اس رقم میں بہت برکت ہوئی۔

برکت کا قصہ:

ستر روپئے کی اوقات ہی کیا تھی، لیکن اس میں جو برکت ہوئی، میں آج بھی حیران ہوں اور حق تعالیٰ کی مہربانی وعنایت میں ڈوبا ہوا ہوں، کہ وہ رازق حقیقی چاہے تو قطرے کو دریا بنا دے۔ ہوا یہ کہ میں نے اپنے دوستوں کو پُر تکلف ناشتہ کرایا، انھیں ہدیہ دیا، پھر پہلے سے یہ اطلاع تھی کہ میرے مخلص اور محسن دوست حافظ قاری شبیر احمد صاحب جو اس وقت میرٹھ میں پڑھا رہے تھے، تشریف لا رہے ہیں، میں انھیں لینے کے لئے بنارس گیا، وہاں وہ ریل سے اترے، میں انھیں لے کر غازی پور آیا، وہ چند روز مہمان رہے، پھر انھیں لے کر شاہ گنج گیا، انھیں ٹرین پر میرٹھ کے لئے رخصت کرکے واپس آیا، اور یہ سب کام اسی ستر

روپئے میں ہوا۔

جن دنوں قاری صاحب غازی پور تشریف لائے تھے، سردی کا موسم تھا، اس وقت میں موسم کے تغیرات سے قدرے بے نیاز تھا، نہ گرمی کا زیادہ احساس تھا نہ سردی کا! سردی سے تو اس حد تک بے نیازی تھی کہ میرا جسم اس وقت ہر قسم کے گرم کپڑے سے ناآشنا تھا، نہ سوئٹر پہنتا تھا نہ گرم رومال رکھتا تھا، اور نہ کبھی موزے پہنے تھے، مجھے یاد ہے کہ مکتب کے درجات میں جب تھا تو والد صاحب ایک مرتبہ لکھنؤ گئے تھے، اس کا تذکرہ پہلے کہیں کر چکا ہوں، وہاں سے وہ ایک سوئٹر لائے تھے، جسے میں شوق اور محبت میں پہنتا تھا، اس کے پھٹ جانے کے بعد کبھی سوئٹر پہننے کی نوبت نہیں آئی، پوری طالب علمی گرم کپڑوں سے خالی رہی، دیوبند میں سردی شدید پڑتی ہے، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی علیہ الرحمہ نے مجھے صرف کرتے بنیائن میں شدید سردی میں دیکھا تو پوچھنے لگے کہ آپ اور آپ کے اطراف کے طلبہ بہت غریب ہوتے ہیں کیا؟ میں نے عرض کیا نہیں، خاصے خوشحال ہوتے ہیں، فرمایا میں دیکھتا ہوں کہ نہ سوئٹر پہنتے ہیں نہ جرسی، میں نے عرض کیا کرتے کے نیچے پہنتے ہیں، فرمایا اور آپ؟ میں نے عرض کیا مجھے ضرورت نہیں ہے۔

پھر فراغت کے بعد جب دلی میں دفتر جمعیۃ علماء میں مقیم تھا، تو ضرورت محسوس ہوئی کہ سوئٹر یا جرسی خریدی جائے، میرے محترم دوست مولانا عبدالوحید حیدرآبادی نے ایک پوری آستین کا سوئٹر خریدوادیا، جسے میں تبلیغی سفر میں پہنتا رہا، جب گھر واپس آیا تو مسجد میں ایک غریب آدمی کو دیکھا کہ سردی سے کانپ رہا ہے، تو میں نے وہ سوئٹر اسے دیدیا، پھر میں آزاد تھا، البتہ ایک سوتی رومال رکھنے کا عادی تھا، جو ہر موسم میں میرے کندھے پر رہا کرتا تھا، جاڑوں میں اسے کانوں پر لپیٹ لیتا تھا، سردیوں میں کرتے بنیائن پر ایک ہلکی سی سوتی چادر ہوا کرتی تھی، بس تمام جاڑا اسی میں بسر ہوتا تھا، اس وقت تک میں نے موزہ کبھی نہیں پہنا تھا، قاری صاحب تشریف لائے اور مجھے اس حال میں دیکھا تو انھوں نے گرم کپڑوں کی تاکید بلیغ کی، مگر مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور اس وقت میری مالی حیثیت بھی ایسی نہ تھی

کہ گرم کپڑوں کا انتظام کرتا، غریبانہ زندگی بسر ہوتی رہی، وہ سال بخیریت گزر گیا۔

ضلع دُمکا (سنتھال پرگنہ میں)

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ ضلع دُمکا (سنتھال پرگنہ) بہار کے تین سنجیدہ اور معمر طلبہ بنارس میں میرے لئے وجہ کشش بنے تھے، انھوں نے اصرار کیا تھا کہ میں رمضان میں ان کے دیار میں چلوں، اس وقت میسور کا سفر مانع بنا تھا، اور میں نہ جا سکا تھا اور نہ وعدہ کر سکا تھا۔ اب جب میں مدرسہ دینیہ میں یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ آ گیا، اور میسور کا تعلق ختم ہو گیا، تو یہ طلبہ بھی ششماہی امتحان کے بعد بنارس سے رخصت ہو کر میرے پاس مدرسہ دینیہ غازی پور میں آ گئے۔ ان کے ساتھ مدھوبنی کے مولوی حبیب اللہ بھی آ گئے، اب میں پوری دلجمعی اور تندہی کے ساتھ ان طلبہ پر محنت کرنے لگ گیا، اور ان کا تعلق مجھ سے بڑھتا چلا گیا۔ جب شعبان قریب آیا اور چھٹی کا وقت آنے لگا تو ان طلبہ نے مجھ سے پچھلے سال کی بات کا اعادہ کیا، وہ بار بار اس کا تذکرہ چھیڑتے رہے کہ اگر آپ چلتے تو ہمارے یہاں کام ہوتا۔ ہمارے یہاں کے گھریلو ماحول کے اعتبار سے رمضان شریف میں گھر سے باہر رہنا ایک مشکل کام تھا اور معیوب بھی! مگر میں دارالعلوم دیوبند کی تیاری کے بہانے ایک سال گھر رہنے کا ناغہ کر چکا تھا، اور دوسرے سال اسٹرائیک کے ہنگامے کے بعد رمضان شریف دیوبند میں گزار چکا تھا، اس لئے میرے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوا۔ میں نے وعدہ کرنے سے پہلے چاہا کہ والد صاحب سے اجازت لے لوں، چنانچہ گھر جا کر میں والد صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں یہ بات رکھی، پہلے انھیں تامل ہوا، مگر میں ان سے بچپن سے بے تکلف تھا، دینی وایمانی ضرورت پر ایک پُرجوش تقریر کر ڈالی، وہ راضی ہو گئے، میں نے طلبہ کو خوشخبری سنائی کہ ان شاء اللہ حاضری دوں گا۔

۱۱؍شعبان ۱۳۹۳ھ کو مدرسہ میں تعطیل ہوئی۔ طلبہ گھروں کو رخصت ہوئے، میں نے اپنے گھر والوں کو وطن پہونچایا، شب برأت کو گھر رہا، ۱۵؍شعبان کو بنارس کے لئے نکلا،

پنجاب میل سے ’’جسی ڈیہہ‘‘ کا ٹکٹ لیا، جسی ڈیہہ کلکتہ کی مین لائن پر ایک ریلوے اسٹیشن ہے، یہاں سے ہندوؤں کے مقدس استھان بیدناتھ دھام دیوگھر ۸؍کلومیٹر ہے، دیوگھر میں ہندو زائرین کا ساون کے مہنے میں ہجوم ہوتا ہے، ایک مخصوص قسم کا لباس پہن کر ہندو ’’بولو بم‘‘ کہتے ہوئے وہاں پوجا کے لئے اکٹھا ہوتے ہیں، وہ ساون ہی کا مہینہ تھا، جب میں وہاں کے لئے نکلا تھا۔ پنجاب میل ڈھائی بجے رات میں جسی ڈیہہ پہونچا، طلبہ وہاں میرے منتظر تھے، انھوں نے اسٹیشن پر میرا استقبال کیا، اب وہاں سے دیوگھر جانا تھا، دیوگھر کے لئے ایک لوکل ٹرین ۴؍ بجے ملنے والی تھی، اس وقفے میں ہم لوگ پلیٹ فارم پر انتظار میں بیٹھ گئے، میں نے وضو کیا اور نماز پڑھنے لگا، نماز سے فارغ ہوا تو ایک صاحب کو جن کی داڑھی قدرے سفید تھی دیکھا کہ نماز پڑھ رہے ہیں، میں اپنے طلبہ سے باتیں کرنے لگا، وہ صاحب نماز سے فارغ ہوکر آئے اور سلام ومصافحہ کیا، طلبہ نے میرا تعارف ان سے کرایا، اور بتایا کہ یہ محمد عثمان صاحب ہیں، ہمارے قریب ایک گاؤں ہے ’’مورنے‘‘ وہاں کے رہنے والے ہیں، اچھے دیندار ہیں۔

فجر کے پہلے ہم لوگ دیوگھر پہونچ گئے، وہاں جامع مسجد میں فجر کی نماز ادا کی، معلوم ہوا کہ ۸؍ بجے بس ملے گی، جامع مسجد کے قریب ہی روڈویز ہے، وہاں پہونچے تو ہندو زائرین کا ہجوم دیکھا، پیلا پیلا لباس پہنے وہ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ میں جہاں بس کے انتظار میں کھڑا ہوا، وہاں ایک غیر مسلم کو دیکھا کہ کھڑا ہے، پاؤں پھولا ہوا ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کے پاؤں میں اتنی سوجن کیوں ہے؟ کہنے لگا کہ میں نے منت مانی ہے کہ بھارت کی تمام تیرتھ گاہوں پر پیدل جاؤں گا، اور اس وقت تک نہ بیٹھوں گا جب تک آخری تیرتھ گاہ تک پہونچ جاؤں، تو چھ ماہ سے بیٹھا نہیں ہوں، اس لئے پاؤں سوج گئے ہیں، اب یہ آخری جگہ ہے، یہاں کی پوجا جب پوری ہوجائے گی تب بیٹھوں گا۔ میں اس کے اس مجاہدے پر حیرت زدہ ہوگیا، میں نے سوچا یہ شخص اتنی محنت کررہا ہے مگر غلط راہ پر کررہا ہے، اس لئے سب ضائع ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وُجُوْہٌ یَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ○ عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ

○ تَـصْلَى نَارًا حَامِيَةً ○ (الغاشية:۲/۳/۴) قیامت کے دن کتنے لوگ ہوں گے جن کے چہرے لٹکے ہوں گے، محنت بہت کی ہوگی، تھکے ماندے ہوں گے مگر دہکتی ہوئی آگ میں گریں گے۔ یہاں مَیں وہی محنت اور تھکن دیکھ رہا تھا، لیکن شرک کی راہ پر یہ محنت تھی، اس لئے اس کا انجام دہکتی آگ ہی ہوگی۔

۸/ بجے کے قریب بس ملی، وہاں سے تقریباً پچیس تیس کلومیٹر مشرق میں چل کر ایک بازار میں ہم لوگ اترے، اس بازار کا نام ''گھوڑ مارا'' ہے، اس جگہ ایک خاص طرح کے پیڑے بہت بنتے ہیں جنھیں ہندو زائرین لزوماً خریدتے ہیں اور اپنے گھروں کو لے جاتے ہیں، ہندو زائرین بید ناتھ دھام سے ایک اور مقام ''باسکی ناتھ'' جاتے ہیں اور درمیان میں یہ جگہ پڑتی ہے۔

گھوڑ مارا سے تقریباً ۱۵/ کلومیٹر اور آگے جانا تھا، وہاں کے لئے اس وقت بسیں اور سواریاں نہیں چلتی تھیں، میرے طلبہ نے ایک سائیکل کا انتظام کر رکھا تھا، جسے ایک قوی اور توانا نوجوان غیاث الدین نامی چلانے والا تھا، اس نے سائیکل کے کیریر پر گدی کی طرح کپڑا باندھ دیا اور مجھے آرام سے بیٹھالیا، پھر نہایت مہارت اور سہولت سے کھینچتا ہوا پیچ در پیچ پہاڑی راستوں میں گزرتا ہوا سائیکل چلاتا رہا، درمیان میں چھوٹے چھوٹے گاؤں پڑتے رہے، ایک اچھا خاصا بازار بھی عبور کیا، اوبڑ کھابڑ راستوں میں سائیکل ہچکولے بھی کھاتی رہی مگر چلانے والا ہوشیار تھا، اس نے حتی الامکان احتیاط سے سائیکل چلائی اور ۱۵/ کلومیٹر کی مسافت اس پیچ در پیچ اور نشیب وفراز سے معمور راستے پر چل کر اس نے پوری کی، وہ ایک ایسے چھوٹے سے گاؤں میں لایا جس کی آبادی پندرہ بیس مکانوں پر مشتمل تھی، اس میں ایک اچھی اور پختہ مسجد بنی ہوئی تھی، اس کے پورب اور جنوب میں چھوٹے چھوٹے متعدد گاؤں تھے، شمال میں بہت دور تک غیر آباد زمین تھی، پھر اس کے بعد ایک گاؤں تھا۔ مغرب کی سمت بھی قدرے فاصلے پر ایک بڑا گاؤں تھا، اس گاؤں کا نام جہاں اس نے مجھے اتارا ''مرکٹہ'' بتایا۔ جنوب میں نا ہی ڈیہہ اور منجھلا ٹولا دو گاؤں تھے۔ مشرق میں اوپر نوا ڈیہہ اور ہیٹ نوا

ڈیہہ دو گاؤں تھے، ان دونوں سے قدرے فاصلہ پر جڑوا ڈیہہ ایک گاؤں تھا، شمال میں دو گاؤں تین گھرا اور بسمتہ تھے، اس طرح یہ علاقہ چھوٹے چھوٹے آٹھ گاؤں پر مشتمل تھا۔ اس مجموعۂ آبادی کا دنیوی اعتبار سے مرکز نا ہی ڈیہہ تھا، اور دینی اعتبار سے مرکٹہ! کیونکہ مسجد اور عیدگاہ صرف مرکٹہ میں تھی، آٹھوں گاؤں کے لوگ پنجوقتہ نماز، تراویح اور جمعہ اسی مرکٹہ کی مسجد میں ادا کرتے تھے، اب سے کچھ دنوں پہلے مکتب یہیں تھا، دین کی تعلیم کی بنیاد یہیں سے پڑی تھی۔ دنیوی اعتبار سے مکھیا، ڈاکٹر اور مالدار افراد نا ہی ڈیہہ میں تھے، ڈاکخانہ بھی وہیں تھا۔

برسات کا زمانہ تھا، موسم خوشگوار تھا، شعبان کی ۱۶/تاریخ تھی، شام تک میں وہیں رہا، تینوں طلبہ پہونچے، انھوں نے باہم مشورہ کرکے میرے رہنے کا ابتدائی انتظام مولانا رفیع الدین صاحب کے گھر ہیٹ نوا ڈیہہ میں کیا، ان کے رہائشی مکان سے الگ ایک بیٹھک تھی، اس میں قیام طے ہوا۔ چونکہ ابھی رمضان آنے میں وقت تھا، اس لئے کھانے کے لئے کبھی مولانا منیر الدین کے گھر بسمتہ جانا ہوتا، نماز پانچوں وقت کی مرکٹہ میں ہوتی، اس طرح تینوں طلبہ کے یہاں آمدورفت ہوتی۔ آبادیوں کا یہ مجموعہ پہاڑیوں کے درمیان تھا، یہ پورا علاقہ دینی لحاظ سے بھی اور دنیوی اعتبار سے بھی آخری درجہ میں پسماندہ تھا، دنیوی اعتبار سے تو یہ حال تھا کہ سارے علاقے چند ایک پختہ مکان تھے، کوئی شخص اور کوئی گھر مالدار دکھائی نہیں دیتا تھا، تمام مکانات کچی دیواروں کے بنے ہوئے بہت معمولی کھپریل تھے، زندگی کی آسائش کا کوئی خاص سامان نہ تھا، گھروں میں چراغ کے نام پر معمولی ڈھبریاں جلتی تھیں، لالٹین کہیں کہیں نظر آتی تھی، سڑک نام کی کوئی چیز نہ تھی، سواری بڑی سے بڑی صرف سائیکل تھی، عام طور سے لوگ دھوتی باندھتے، لکڑی کی کھڑاؤں پہنتے، دھان کی کھیتی تھی، مگر پانی صرف بارش کا مل سکتا تھا۔ نہ کوئی ہینڈ پائپ، نہ ٹیوب ویل، بس صرف چند کنویں تھے، کسی کسی گاؤں میں مختصر سے تالاب تھے، مرکٹہ میں ذرا بڑا تالاب تھا جس سے کبھی ضرورت پر آب پاشی بھی کی جاتی تھی، عورتیں باہر مسجد کے کنویں سے پینے اور پکانے کے لئے پانی

بھرتیں اور کپڑا دھونا، برتن دھونا، نہانا، یہ سب کام تالاب پر ہوتا، گھروں میں بیت الخلاء واستنجا خانے کا نام ونشان نہ تھا، لوگ تالاب کے کنارے اور کھیتوں میں ضروریات سے فارغ ہوتے، یہاں تک کہ قضائے حاجت کیلئے کنایہ، تالاب جانے سے ہوگیا تھا۔ ایک صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تالاب کے راستے سے خون جارہاہے، میں نہیں سمجھا، کافی دیر پوچھنے پاچھنے پر معلوم ہوا کہ بواسیر خونی کا عارضہ ہے، اس کی تعبیر اس طرح کررہے تھے۔

گھروں میں اوڑھنے بچھانے کے سامان بقدر ضرورت سے بھی کم تھے، جاڑوں میں رضائی کا فقدان تھا، دھان کی پیال کا استعمال زیادہ تھا، اسی کا بچھونا، اسی کا اوڑھنا اور اس کے طریقے بھی عجیب وغریب، ضرورت ایجاد کی ماں ہے، مالی کمزوری نے ضرورت کی چیزوں کی عجیب عجیب شکلیں بنارکھی تھیں، میں وہاں گیا تھا، تو اپنے ساتھ روزمرہ ضرورت کی کئی کئی چیزیں لیتا گیا، اور بعض چیزیں تجربہ کے بعد اس کے بعد کے اسفار میں لے جاتا رہا، مثلاً لالٹین، پیڑھا، مچھردانی، لوٹا وغیرہ۔

اس مجموعہ آبادی کے قریب پاس میں کوئی بڑا بازار نہ تھا، دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر دودن ہاٹ لگتی تھی، جس میں روزمرہ کی ضروریات قدرے مہیا ہوتی تھیں، بڑا بازار کم از کم ۱۵ر کلومیٹر کے فاصلے پر دو تھے، ایک پالوجوری اور دوسرے جرمنڈی، ان بازاروں میں جانے کے لئے کوئی سواری کا راستہ نہ تھا، زیادہ تر لوگ پیدل جاتے تھے، یا اگر کسی کو میسر ہوئی تو سائیکل سے جاتا تھا، ڈاکٹر وہیں ملتے، ضروریات کے اہم سامان وہیں ملتے، وہاں کے لوگوں کا روزمرہ کا معمول تھا کہ کھڑاؤں پہنے پہاڑی راستوں کو عبور کرتے ہوئے صبح کو بازار جاتے اور دوپہر یا شام کو لوٹ آتے۔

عام لوگوں کا ذریعہ معاش کاشتکاری کے علاوہ کچھ نہ تھا، اور اس کا بھی انحصار محض بارش پر! ہلکی پھلکی بیماریوں کے لئے کچھ دیہاتی ڈاکٹر جو چند دواؤں کے نام اور ان کا استعمال جانتے تھے وہاں دستیاب تھے، لیکن اگر کسی اہم اور بڑی بیماری یا ضرورت میں ابتلا ہوتا تو وہی ۱۵ر کلومیٹر دور پالوجوری یا جرمنڈی جانا پڑتا، یا کچھ دور دیوگھر کا رخ کرنا پڑتا۔

سواری کے نام پر زیادہ سے زیادہ جو چیز حاصل تھی وہ سائیکل یا قدیم دور کی بیل گاڑی کام میں لائی جاتی، موٹر سائیکل یا موٹر کار وغیرہ کا کہیں نام نہ تھا۔

کھیتی کے علاوہ بعض لوگ بنگال وغیرہ میں کوئلے کی کان پر ملازمت کرتے تھے، بعض لوگ کوئلے کے ٹرک چلاتے تھے، اس قسم کے افراد نسبتاً خوش حال سمجھے جاتے تھے، مگر ان کی خوشحالی ہمارے علاقے کے متوسط درجے کے خوش حال کے قدرے قریب تھی۔

یہ دنیوی پسماندگی کا حال تھا۔ دینی پسماندگی جسے موضوع بنا کر میری حاضری ہوئی تھی، اس کا حال ناگفتہ بہ تھا۔ میں اس وقت وہاں پہونچا تھا جب ایک دینی اصلاح کی ایک کوشش ہوچکی تھی، وہ کوشش تین چار سال قبل ہوئی تھی، ورنہ اس سے پہلے کا جو حال وہاں کے لوگوں سے معلوم ہوا وہ کسی طرح دینی واسلامی نہ تھا۔ جہالت تھی، کفر وشرک کی گرم بازاری تھی، توہمات کا دور دورہ تھا، مسجد ضرور تھی مگر اس لئے نہیں کہ اس میں نماز پڑھی جائے بلکہ اس لئے کہ اگر بارش نہ ہو، سوکھا پڑ رہا ہو تو سارے علاقے سے چندہ کرکے ایک بکری محرابِ امام میں ذبح کی جائے اور اس کا خون پکے فرش پر صحن تک بہایا جائے، پھر اس کی بوٹی بوٹی کرکے گاؤں کے ہر ہر فرد کو تقسیم کی جائے۔ یہ ان دیہاتیوں کے وہم کی کرشمہ سازی تھی کہ اس طرح بارش ہوگی، قحط کی وبا دور ہوگی، نماز کا ذکر تو نہ تھا، البتہ تعزیہ کی پرستش اہتمام سے تھی، مسجد کے سامنے چوک بنا ہوا تھا، گاؤں کے باہر پتھر کی ایک چٹان زمین پر جمائی ہوئی تھی، کاشتکار جب کھیتی کے عمل کا آغاز کرتا تو اس پر دودھ کا چڑھاوا بطور نذر کے پیش کرتا، کہ اس سے فصل اچھی ہوگی اور نقصان سے محفوظ رہے گی، شادی بیاہ کی تاریخیں ہندو پنڈتوں سے رکھوائی جاتیں، دلہنوں کو گھر میں لانے کے وقت کی تعیین ان سے کرائی جاتی، غرض زندگی کے ہر عمل پر شرک وکفر اور ہندوانہ تہذیب کی چھاپ تھی، اور یہ چھاپ اتنی عام تھی کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے نام تک ہندوانہ تھے، ان میں لفظ میاں لگا کر انھیں مسلمان بنالیا جاتا تھا، مثلاً جگدیش میاں، ڈوما میاں، لیدھو میاں، چھاتو میاں وغیرہ۔

میرے وہاں پہونچنے سے چند سال پہلے دارالعلوم دیوبند کے ایک ناتمام تعلیم یافتہ

مولوی جو اپنے حالات اور صحت کی مجبوری کے باعث تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے تھے، بھاگلپور کی طرف کہیں کے رہنے والے تھے، نام ان کا مولوی کمال الدین تھا، مشیت الٰہی نے انھیں اس علاقے میں پہونچا دیا، تعلیم تو ان کی ناتمام تھی مگر ایمانی واصلاحی جوش کامل تھا۔ انھوں نے چار سال وہاں رہ کر ہر طرح کی قربانی دے کر، ہر طرح کے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کر کے شرک وبدعت کی رسموں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، وہ تنہا کفر و جہالت کی اندھیریوں سے لڑتے رہے، مگر چار ہی سال میں دین کا یہ سپاہی عین میدان جنگ میں لڑتا ہوا اپنے پروردگار کے حضور حاضری کے لئے چلا گیا، لیکن اتنے دنوں میں نقشہ اچھا خاصا بدل چکا تھا، اور سب سے اہم کام انھوں نے یہ کیا تھا کہ تین صاحب استعداد نوجوانوں کو ان کے گھروں سے نکال کر ان کے دلوں میں علم دین کا شوق بھر کر باہر بھیج دیا۔ یہ تینوں طلبہ پھرتے پھراتے وہاں پہونچ گئے جہاں میرے منصوبے کو توڑ کر تقدیر نے ہر تدبیر کے خلاف لا کر بیٹھا دیا تھا۔ بنارس میں ان طلبہ سے ملاقات ہوئی، اور ایک سال کے بعد یہ مجھے اپنے علاقے میں لے جانے پر کامیاب ہوئے۔ مولوی کمال الدین مرحوم کے حالات ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' میں پڑھئے۔

یہاں میں وہ مضمون درج کرتا ہوں، جسے میں نے ۲۰۰۴ء میں مرض کی حالت میں املا کرایا تھا، اور بعد میں رسالہ ضیاء الاسلام (فروری اور مارچ ۲۰۱۰ء) میں ''پہاڑیوں کے دیس میں'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆

''میں ۱۷ رشعبان کو وہاں پہونچ گیا تھا اور ۱۰ رشوال تک یعنی تقریباً پونے دو ماہ وہاں رہنے کا پروگرام تھا، یہ بات اس علاقے کے لئے بالکل نئی تھی کہ کوئی نوجوان عالمِ دین وہاں اتنے دنوں تک قیام کرے، بعض بعض میلاد خواں مولوی کبھی کبھی بلائے جاتے تھے اور وہ میلاد کی ہلکی پھلکی مجلس جما کر اپنا نذرانہ وصول کر کے رخصت ہو جاتے تھے، میں جب پہونچا تو لوگ بکثرت تماشہ دیکھنے آئے کہ اس غریب اور پسماندہ علاقے میں کیسا مولوی آ کر بس گیا ہے، مجھے وہاں رہ کر یہ احساس ہوا کہ یہ پلکے پھلکے کاشتکار لوگ ہیں جہاں صرف دھان کی

کھیتی ہوتی ہے، کچھ ترکاریاں بولیتے ہیں، کچھ مرغیاں پال لیتے ہیں، یہ نہایت غریب لوگ ہیں، ان کی معیشت اور معاشرت بدحالی کے آخری سرے پر ہے۔ زندگی کے سامانِ آسائش تو کجا، ضروریات کا بھی یہاں گزر کم تھا، بجلی کو کون پوچھے؟ لالٹینیں بھی کم دکھائی دیتی تھیں، مجھے وہاں اس طرح وقت بسر کرنا تھا کہ ان ناخواندہ لوگوں کے کانوں میں اور دلوں میں زیادہ سے زیادہ دین کی بات اتار سکوں، مگر مشکل یہ تھی کہ میں جس زبان کے بولنے اور لکھنے کا عادی تھا اس زبان سے یہ لوگ پوری مانوس نہ تھے، اور جو زبان یہاں بولی جاتی تھی اس سے مجھے کوئی مناسبت نہ تھی، لیکن بہرحال مجھے یہاں رہنا تھا، میرے دوستوں نے بہت سمجھداری اور عقلمندی سے میری رہائش کا ایسا انتظام کیا کہ اس میں تنوع رہے، تاکہ میری طبیعت اکتا نہ جائے، اور زیادہ سے زیادہ لوگ دینی فائدہ بھی حاصل کرسکیں، چنانچہ رمضان سے پہلے قیام مختلف گاؤں میں ہوتا رہا اور نمازیں پانچوں وقت کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا ہوتی رہیں۔ عشاء کی نماز میں سارا علاقہ مسجد میں اکٹھا ہوتا اور آدھ گھنٹہ ہر روز پابندی سے وعظ ہوتا، رمضان کا چاند دیکھنے کے بعد پہلے عشرے میں قیام مولانا رفیع الدین صاحب کے گھر ہوا، نمازوں کے معمولات وہی رہے جو پہلے سے چل رہے تھے، تراویح کی نماز ایک جم غفیر کے ساتھ ادا کی جاتی، اس میں آٹھوں گاؤں کا ہر بالغ فرد حاضر ہوتا اور تراویح کے بعد آدھ گھنٹہ وعظ ہوتا۔ دوسرا عشرہ مولانا منیر الدین صاحب کے گھر بسمتہ گاؤں میں بسر ہوا، یہ گاؤں مسجد سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، لیکن میں پابندی کے ساتھ پانچوں نمازوں میں حاضر ہوتا تھا، اس کا خوشگوار اثر یہ پڑا کہ ہر گاؤں کے لوگ بالالتزام مسجد میں حاضر ہوتے رہے، بغیر کسی شدید مجبوری کے لوگ غیر حاضری نہ کرتے، اس طرح علاوہ مجالسِ وعظ کے انفرادی طور پر بھی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ جہالت کی تاریکیاں اس پورے علاقے کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھیں، لوگ تہذیب وتمدن سے کوسوں دور تھے، ملنے جلنے کا انداز بھی میرے لئے نامانوس تھا، مگر دلوں میں آہستہ آہستہ محبت اور عقیدت کی جڑیں گہری ہوتی جارہی تھیں

اوراس کا اظہار اطاعت اور دینداری کی صورت میں ہورہا تھا، نمازیوں کی تعداد بڑھتی رہی، روزہ رکھنے کا شوق اور تراویح کا اہتمام نمایاں طور پر محسوس ہورہا تھا، وہاں روزے کے سلسلے میں عام دستور پہلے سے یہ تھا کہ رات میں جب جس کی آنکھ کھلتی سحری کھالیتا، یہاں تک کہ اگر کسی کی آنکھ صبح صادق کا اجالا پھیلنے کے بعد کھلتی تو وہ بھی کمرے کا دروازہ بند کر کے اندھیرا کر کے سحری کھالیتا، میں نے اپنے دوستوں کی مدد سے ہر گاؤں میں اس کا انتظام کیا کہ صبح صادق ہونے کی اطلاع ہر گھر میں پہونچ جائے، اور کسی کا روزہ خراب نہ ہو، لوگوں نے بہت ذوق وشوق کے ساتھ اس انتظام کو قبول کیا، تراویح کے بعد مواعظ کا سلسلہ جاری تھا، ان مواعظ میں جہاں ترغیب ترہیب کی باتیں ہوتیں، وہیں روزمرہ کے ضروری اور اہم مسائل بھی بیان کئے جاتے، اس طرح لوگوں کو مسائل بھی معلوم ہوتے اور دلوں میں اللہ ورسول کی محبت وعظمت اور خوف وخشیت کی بھی پرورش ہوتی، اور بچوں کی تعلیم کا بھی جذبہ بیدار ہوتا۔

ایک قابل ذکر بات چند دنوں کے بعد یہ سامنے آئی کہ یہ سارا علاقہ پنجوقتہ نماز کی جماعت اور جمعہ کی جماعت میں تو متحد ہے، ایک امام کے پیچھے، ایک مسجد میں ساری نمازیں ادا کی جاتیں، مگر عیدین کی نماز ایک کے بجائے دوجگہ پڑھتے، اور معلوم ہوا کہ اس کا سلسلہ ایک عجیب وغریب جھگڑے سے شروع ہوا۔ ایسا جھگڑا جس کی نظیر اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی، وہ یہ کہ آج سے کم ازکم سو ڈیڑھ سو سال پہلے علاقے کے لوگ عیدین کے لئے اکٹھا ہوئے تو کچھ لوگ جو پنجگانہ نمازوں کے پابند تھے وہ خود اگلی صف میں کھڑے ہوئے اور بے نمازیوں کو اپنے ساتھ صف میں کھڑے ہونے اجازت نہ دی، اس کی وجہ سے نمازیوں اور بے نمازیوں میں سخت افتراق پیدا ہوگیا، اور بے نمازیوں نے اپنی عیدگاہ الگ کرلی اور اس طرح کچھ عرصے تک سال بھر کے نمازی الگ عید کی نماز پڑھتے اور دوسرے لوگ الگ، کچھ مدت گذرنے کے بعد الگ الگ آبادیوں کی عیدگاہیں ہوگئیں، اور اس بنیاد پر ایک بدمزگی کی کیفیت مستقل رہنے لگی، بعد میں مختلف لوگوں نے عید کی نماز کو متحد کرنا چاہا مگر اختلاف کی جڑیں اتنی مضبوط تھیں کہ کوشش بسیار کے بعد بھی اتحاد پیدا نہ ہوسکا۔ ۱۵؍رمضان المبارک

کے بعد میرے سامنے بھی یہ مسئلہ شدت سے ابھرنے لگا، کئی حضرات نے مجھ سے نہایت دردمندی کے ساتھ اس مسئلے کو ذکر کیا کہ سال میں یہ دو خوشی کے مواقع ایسے آتے ہیں جن میں دلوں کا سکون درہم برہم ہوجاتا ہے، آپ کو یہ سارا علاقہ ماننے لگا ہے اگر آپ کی فہمائش سے یہ اختلاف دور ہوجائے تو بہت مبارک ہوگا، میں نے اس سلسلے میں محنت شروع کردی، لیکن اندازہ ہوا کہ جھگڑے کا یہ جن آسانی سے لوگوں کے سروں سے اترنے والا نہیں ہے۔

یہ زمانہ برسات کا تھا، مگر بارش نہیں ہورہی تھی، کھیتیاں سوکھی جارہی تھیں، اس علاقے میں بارش کے علاوہ آب پاشی کا اور کوئی ذریعہ نہیں، پہاڑی زمین ہونے کی وجہ سے ہینڈ پائپ اور ٹیوب ویل کا کوئی نظم نہ تھا، چند ایک کنویں تھے جن سے لوگ پانی پینے کا انتظام کرتے تھے، اور دو ایک تالاب تھے جن میں لوگ نہاتے اور کپڑے دھوتے، سینچائی کے لئے صرف بارش کا سہارا ہوتا، مگر بارش مطلق نہیں ہورہی تھی، اس لئے خلقت پریشان تھی، میں نے نمازِ استسقاء اور دعاء واستغفار کے لئے کئی مرتبہ لوگوں کو اکٹھا کیا، مگر بظاہر ہر اجتماع ناکام رہا اور دعا نامراد رہی۔ بارش نہ ہونی تھی اور نہ ہوئی، جن لوگوں کے دلوں میں بدگمانی کی خلش تھی انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ فلاں مولوی کی نحوست سے بارش بند ہے، اس افواہ سے مجھے قلبی صدمہ ہوا، مگر قرآن کریم کی ان آیات سے تسکین ہوتی جن میں انبیاء کی قوموں نے انبیاء کو ملزم گردانا تھا اور اللہ نے ان کی تردید فرمائی ہے۔ عشرۂ اخیرہ میں اس خاکسار کا قیام مرکٹّا میں ہوا، بلکہ مسجد میں اعتکاف کیا اور وعظ ونصیحت میں مزید سرگرمی پیدا ہوئی، رمضان کا آخری دن آتے آتے اللہ کا خاص فضل یہ ہوا کہ پورے علاقے میں اتحاد کی صورت پیدا ہوگئی، صرف ایک گھرانہ بلکہ اس گھرانے کا ایک فرد جو خاصا بااثر تھا وحدتِ کلمہ کی اس صورت سے بدکتا رہا، میں نے عید کے دن فجر کی نماز کے فوراً بعد اس کے گھر جاکر اس موضوع پر گفتگو کی، وہ شخص تھوڑی دیر میں موم ہوگیا، اور عید کی نماز آٹھوں گاؤں نے ایک جگہ جمع ہوکر ادا کی، اس یکجائی کا منظر بھی قابل دید تھا، سب کے چہروں پر خوشی کی لہر تھی، پرانی رنجشیں یکلخت کافور ہوگئیں، کسی کو کسی سے گلہ نہ رہا، جب تمام لوگ خوشی خوشی ایک جگہ اکٹھا

ہوگئے اور صفیں درست ہونے لگیں تو اچانک بادِ رحمت چلنے لگی، پانی لئے ہوئے گھنگھور گھٹائیں آسمان پر امنڈنے لگیں، تمام لوگوں کی آنکھیں بارانِ رحمت کے آثار دیکھ کر خوشی سے چمکنے لگیں۔ میں نے اعلان کیا کہ اللہ کی رحمت برسنا ہی چاہتی ہے، مگر کوئی فرد یہاں سے ہرگز نہ ہٹے، اس اعلان کے بعد نماز شروع ہوئی، ایک رکعت کے بعد موسلا دھار بارش شروع ہوگئی، اتنا پانی برسا کہ دوسری رکعت کا سجدہ لوگوں نے پانی میں کیا، بارش ہو رہی تھی اور امام نے عید کا خطبہ پڑھا، ہر فرد شرابور ہوکر گھر لوٹا، دن بھر بارش ہوتی رہی اور گرمی کی شدت یکا یک کافور ہوگئی، اور قحط سالی کا منظر شادابی اور خوشحالی سے بدل گیا، کسان نہال ہوگئے اور سب نے محسوس کیا کہ یہ قلبی اتحاد کی برکت ہے، عید اچھی گزر گئی، دینداری کا رنگ جمنے لگا، تعلیم کا شوق بھی بڑھا۔

ایک عجیب واقعہ:

عید کے دن شام کے وقت یہ بات زیر بحث آئی کہ دس دن مزید قیام کرنا ہے، یہ وقت کہاں گزارا جائے؟ مرکٹا گاؤں میں مولوی ولی محمد کے گھر والوں نے ایک لمبا سا کھپریل کا کمرہ گاؤں کے مکتب کے لئے متعین کر رکھا تھا۔ مولوی کمال الدین مرحوم اسی میں پڑھاتے تھے اور اسی میں رہتے بھی تھے، اور اسی کمرے میں ان کا انتقال بھی ہوا تھا، ان کے انتقال کے بعد سے وہ کمرہ بند تھا، میرے دوستوں نے اب اس کو کھول کر اس کی صفائی، ستھرائی کر دی تھی، سب کی تجویز یہ ہوئی کہ باقی دس دن میں اسی کمرے میں رہوں، چنانچہ میری رہائش کا اس میں انتظام کر دیا گیا، یہ کمرہ شمال وجنوب میں لمبا تھا اور مشرق میں اس کا دروازہ کھلتا تھا، مغربی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی، اس کے بعد تھوڑی سی زمین غیر آباد تھی، اس سے متصل مولوی ولی محمد کا رہائشی مکان تھا، مولوی ولی محمد اپنے گھر سے نکل کر اسی کھڑکی سے کبھی کبھی کمرے میں آتے تھے، عشاء کی نماز کے بعد میرے طلبہ کچھ دیر میرے ساتھ رہے، پھر میں نے انھیں رخصت کر دیا اور باہر کا دروازہ اندر سے بند کر دیا، کھڑکی کا دروازہ بھیڑ دیا، بارش کی وجہ سے ہلکی سردی ہوگئی تھی، وہاں مچھروں کی بہتات تھی اس لئے

چار پائی پر مچھر دانی لگا دی گئی تھی، بستر پر بیٹھ کر کچھ دیر میں وظائف پڑھتا رہا، پھر لالٹین گل کر کے جیسے ہی تکیے پر سر رکھا ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص تکئے کے نیچے سے مچھر دانی کھینچ رہا ہے، مجھے خیال ہوا کہ شاید کھڑکی کے راستے سے مولوی ولی محمد آ گئے ہیں، اور غالباً سر پر تیل رکھنا چاہتے ہیں، میں نے منع کیا کہ جاؤ سو جاؤ، دیر ہو گئی ہے، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی عورت کا ہاتھ میرے سر پر آ گیا ہو، یہ ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور ٹھنڈک کی لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی، بے ساختہ میرے منھ سے نکلا کون ہو؟ اس کے جواب میں بجائے کسی آواز کے وہی ہاتھ میرے منھ پر آ گیا، مجھے سخت وحشت ہوئی، اب نہ کچھ بولنے کی تاب ہے، نہ کچھ پڑھنے کا یارا ہے، میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یا اللہ! میں اجنبی جگہ پر ہوں، یہ کون سی فاحشہ عورت میرے پاس گھس آئی ہے، پتہ نہیں اس کا کیا ارادہ ہے؟ صبح کے وقت میری کیا گت بنے گی؟ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ عورت پورے جسم کے ساتھ بستر پر آ کر لیٹ گئی، میں نے ہاتھ سے زوردار جھٹکا دیا تو اٹھ کر میرے پاؤں پر آ گئی، میں نے بدحواسی میں پاؤں کو جھٹکا دیا تو وہ چار پائی سے نیچے زمین پر دھم سے گر گئی، مچھر دانی تتر بتر ہو گئی، میں نے اٹھ کر لالٹین جلائی تو کچھ نہ تھا، نہ مرد نہ عورت، میں کچھ دیر بیٹھا، کچھ سوچتا رہا، کچھ پڑھتا رہا، پھر لالٹین مدھم کر کے سونے کی کوشش کی، دس منٹ بعد پیروں کی کھسکھساہٹ کی آواز آئی جیسے میرے سرہانے کوئی چل رہا ہو، کچھ دیر تک یہ آواز آتی رہی، پھر میں نے لالٹین کی روشنی بڑھائی تو کچھ نہ تھا، تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ آواز آتی رہی اور میں کچھ سوتا، کچھ جاگتا رہا، اسی کشمکش میں ایک بج گیا، میں اس صورتحال سے تنگ آ گیا تھا، پانی لے کر باہر نکلا کہ استنجاء سے فارغ ہو کر وضو کر لوں، کمرے سے تھوڑے فاصلے پر استنجاء کے لئے بیٹھا تو میرے دائیں بائیں درختوں سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی لکڑی توڑ رہا ہو، استنجاء سے فارغ ہو کر اٹھا تو لالٹین کی روشنی میں دروازے پر ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا، قریب پہونچا تو غائب ہو گیا، میں نے وضو کیا اور دو رکعت نماز میں پوری سورۂ بقرہ کی تلاوت کی، مجھ کو گمان ہو چلا تھا کہ یہ کوئی جن ہے جو روپ بدل بدل کر مجھے وحشت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، اور اس

علاقے میں بکثرت تجربہ ہوا کہ جناتوں کی بہتات ہے، نماز سے فارغ ہوکر میں بیٹھا کچھ پڑھتا رہا، ابھی صبح صادق کی کرن نہیں پھوٹی تھی، مجھے قضائے حاجت کا تقاضا ہوا، اس دیہات میں بیت الخلاء کہاں میسر! میں نے پانی لیا اور میدان کی طرف نکل پڑا، موقع کی دعائیں پڑھ کر ایک مناسب جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا، بیٹھنا تھا کہ ایک ہنگامہ شروع ہوگیا، دائیں بائیں، آگے پیچھے سے مٹی کے بڑے بڑے ڈلوں کی بارش شروع ہوگئی، لیکن کوئی ڈلا نہ بدن پر آتا نہ بدن کے قریب گرتا، دو دو چار گز کے فاصلے پر وہ ڈلے گرتے رہے، میں فارغ ہوکر اٹھا تو ڈلوں کے حملے بند ہوگئے، اطمینان سے کمرے پر واپس آگیا، مجموعی طور سے اس واقعے سے دل میں وحشت کی سی کیفیت پیدا ہوئی، مگر بحمد اللہ خوف طاری نہیں ہوا، میں دوپہر تک سوچتا رہا کہ یہ سرگزشت کسی سے ذکر کروں یا نہ کروں؟ اللہ جانے ان لوگوں پر کیا اثر پڑے؟ مگر اس قسم کی باتیں ہضم کرنا خاصا مشکل کام ہے، اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ سے یہ مشکل کام نہ ہوسکا، ظہر کی نماز کے بعد کچھ لوگوں سے میں نے اس کا تذکرہ کیا، تو ایک صاحب کہنے لگے کہ جی! اس کمرے میں ایک جنّیہ رہتی ہے، مولوی کمال الدین مرحوم سے اس کی اکثر لڑائی ہوتی تھی، میں نے کہا جب یہ بات آپ کو معلوم تھی تو مجھے پہلے ہی بتادینا چاہئے تھا تاکہ میں اس کی کوئی تدبیر کر رکھتا، خیر یہ بات رفت وگزشت ہوگئی اور اس جنّیہ نے اس کمرے کو چھوڑ دیا، بلکہ اس گاؤں کو چھوڑ دیا، اس سے پہلے اس کمرے میں کوئی رات میں رہنے کی ہمت نہیں کرتا تھا، اس قصے کے بعد وہ آباد ہوگیا۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ اس علاقے میں جہالت کا ڈیرا تھا، مولوی کمال الدین مرحوم نے بہت کچھ محنت کر کے لوگوں کو علم کی طرف متوجہ کیا تھا، لیکن ان کی جہالت کا حال اب بھی یہ تھا کہ بہت سے لوگوں کے نام ہندوؤں جیسے تھے، اکثر ناموں کو مولوی صاحب مرحوم نے بدل دیا تھا، بطور مثال کے چند ناموں کا ذکر کرتا ہوں جس سے جہالت کا قدرے اندازہ ہوگا، مسجد کے بانی اور پہلے امام جو میرے پہونچنے سے بہت پہلے وفات پاچکے تھے، ان کا نام ’’کودی میاں‘‘ تھا، ان کے بیٹے کا نام ’’لیدھومیاں‘‘ تھا، دوسرے بیٹے کا نام ’’پھولو

میاں'' تھا، مولوی صاحب مرحوم نے ''لیدھومیاں'' کا نام محمد قاسم رکھا تھا، پھولومیاں کا نام یاد نہیں رہا کہ کیا رکھا تھا۔ لیدھومیاں کے کئی بیٹے تھے، ان میں سے ایک بیٹے کا نام ''ڈِھبرا میاں'' تھا، اس کو انھوں نے بدل کر ولی محمد رکھا، اور یہ ان تین طالب علموں میں سے ایک تھے جو مجھے یہاں لائے تھے، اس طرح کے نام وہاں بکثرت تھے جن کو انھوں نے تبدیل کیا، ان ناموں کے باقیات سیئات میرے پہونچنے تک موجود تھے مثلاً چھاتومیاں، لاڑومیاں، جگدیش میاں، ڈوما میاں، چوڑی میاں، نفرومیاں وغیرہ۔ ہمارے مولانا رفیع الدین صاحب کا نام بھی پہلے کچھ اور تھا، اس کو مولوی صاحب مرحوم نے رفیع الدین کیا۔ مولانا منیر الدین صاحب کا بھی دوسرا نام تھا، اس کو انھوں نے بدل کر منیرالدین کیا، مولوی منیرالدین کے ایک چچا کا نام بَنکا میاں (بندوق) تھا، میرے پہونچنے کے بعد جو بچے پیدا ہوئے ان کے نام یا تو میں نے رکھے یا میرے طالب علموں نے، پھر اچھے ناموں کا ایک سلسلہ چل پڑا، عورتوں کے نام اور بھی مضحکہ خیز تھے وہ بھی زیادہ تر تبدیل کئے گئے۔

اس علاقے کا جائے وقوع ایسا تھا کہ پندرہ کلومیٹر تک کسی طرف کوئی قصبہ اور بازار نہ تھا، بازار جانا ہو یا بیمار کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہو تو کم ازکم پندرہ کلومیٹر پیدل یا سائیکل سے راستہ طے کرنا پڑتا، اور وہ بھی بعض اطراف میں پہاڑی علاقہ! پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر گھوڑمارا تھا، اور اسی قدر فاصلے پر ایک بازار پالوجوری اور دوسرا جَرمُنڈی تھا، جہاں لوگ اپنی ضروریات کے لئے جایا کرتے تھے، اس باب میں یہ لوگ اتنے جفاکش تھے کہ صبح کو پیدل جاتے اور بعض تو لکڑی کا کھڑاؤں پہن کر جاتے اور دو تین بجے تک لوٹ آتے، مریضوں کا معاملہ سب سے زیادہ مشکل تھا، ہلکی پھلکی دوائیں رکھنے والے دو تین نیم حکیم تو موجود تھے، مگر کسی بھی اہم بیماری کے لئے ان دونوں بازاروں میں یا دیوگھر اور دُمکا شہر میں جانا پڑتا۔

تعویذات کا آغاز:

اس مجبوری کی وجہ سے اس جگہ مجھے وہ کام شروع کرنا پڑا جس کا نہ کبھی مجھے تصور تھا

نہ اس سے کبھی مناسبت ہوئی اور نہ اب ہے، لیکن اس میں خاصا بدنام ہوگیا ہوں، اور وہ ہے تعویذات اور جھاڑ پھونک کا کام، اس پورے علاقے میں کسی کو کوئی بیماری ہوتی تو سیدھا میرے پاس آتا، مجھے اس فن سے کوئی واقفیت نہ تھی مگر حالات کی مجبوری کی وجہ سے کبھی پانی پر دم کرتا، کبھی کچھ لکھ کر تعویذ کے نام پر دیدیتا، کبھی تیل پر دم کرتا اور اللہ سے دعائیں کرتا کہ مجبوروں پر رحم کرنا آپ کا خاص کرم ہے، ان حاجتمندوں کی حاجات پوری فرمادیجئے ۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی سوانح ‘‘تذکرۃ الرشید’’ میں ایک واقعہ لکھا ہوا ہمیشہ ذہن میں رہا، وہ یہ کہ ایک نوجوان اپنی کسی ضرورت میں مضطر اور بے تاب ہوکر حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں پہونچا اور اسبابِ ظاہری کے اعتبار سے اس ضرورت کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا، اور اس کو حضرت کے سامنے رکھنے کی ہمت بھی نہیں تھی مگر انتہائی مجبوری سے بے تاب ہوکر اس نے حضرت کے سامنے زبان کھول ہی دی، حضرت نے ایک تعویذ لکھ کر اسے دیدیا کہ بازو میں باندھ لو، یکا یک حالات پلٹے اور مقصد حاصل ہوگیا، اس کے ساتھیوں اور ہمجولیوں کو حد درجہ تعجب ہوا کہ اتنے الٹے حالات یکا یک کیسے سیدھے ہوگئے، کسی نے کہا کہ یہ گنگوہ گیا تھا وہاں سے کوئی تعویذ لایا ہوگا، یہ نوجوان چھپانے کی کوشش کرتا رہا مگر ساتھیوں نے اس کی تلاشی لے ڈالی، اور بازو سے تعویذ کھول لیا، اب اشتیاق ہوا کہ دیکھنا چاہئے کہ اس میں کیا لکھا ہے؟ کھول کر دیکھا تو اس میں لکھا ہوا تھا ‘‘الٰہی ! میں جانتا نہیں، یہ مانتا نہیں، یہ تیرا بندہ اور تیرا غلام، تو جانے اور تیرا کام’’۔ تعویذ کے اس مضمون نے میرے دل پر یہ اثر ڈالا کہ الفاظ وعبارت کچھ نہیں، مشیّت الٰہی کام کرتی ہے، اس لئے جس کو جو ضرورت ہو اسے خدا کے حوالے کردینا چاہئے، ممکن ہے اسی راستے سے کچھ لوگ پریشانی سے بچ جائیں، چنانچہ اس کے تجربات ہونے لگے۔ اس سلسلے میں ایک بالکل ابتدا کا واقعہ یادگار ہے جو ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتا اور جس کی وجہ سے اس سلسلے کو نشو ونما ملی۔ یہ واقعہ پہونچنے کے دوتین کے بعد ہی پیش آیا، وہ یہ کہ ایک نوجوان نے مجھ سے کہا کہ اس کے یہاں دوتین ولادتیں ہوئیں مگر ہر ایک میں بہت دشواری اور زیر باری کا سامنا ہوا، اہلیہ کو ۱۰/۱۱/

میل دور ڈاکٹر کے یہاں لے جانا پڑا، پیسے بھی خرچ ہوئے، تکلیف بھی ہوئی اور بچے بھی زندہ سلامت نہ رہے، پھر پیدائش ہونے والی ہے، پھر وہی خوف لاحق ہے کہ عورت کو دوردراز کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑے گا، اور اللہ ہی جانے کتنی زحمت ہوگی، کتنے پیسے خرچ ہوں گے، میں غریب آدمی ہوں، اس نے مجھ سے تعویذ مانگا، میں گھبرا گیا، میں نے اب تک کوئی تعویذ نہیں لکھا تھا، مگر اچانک مجھے حضرت گنگوہیؒ کا مذکورہ بالا تعویذ یاد آیا تو میں نے تسہیل ولادت اور زندہ رہنے کی دعا لکھ کر تعویذ بنا کر دیدیا، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ نہایت سہولت سے ولادت بھی ہوگئی اور بچہ بھی تندرست اور زندہ رہا۔ پھر یہ سلسلہ بڑھتا ہی رہا، وہاں پر ایک دستور سا بن گیا تھا کہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد کچھ آیات پڑھ کر پانی پر دم کردیا کرتا تھا اور وہ پانی لوگ اپنی اپنی ضروریات کیلئے لے جاتے تھے، اللہ کی مشیّت سے ان کی حاجت براری ہوجاتی تھی۔ میں شوال میں لوٹ کر مدرسہ دینیہ آگیا، وہاں حضرت مولانا عبد الحمید صاحب اعظمی نظام آبادیؒ تشریف لائے ہوئے تھے، انھوں نے حالات پوچھے، میں نے اجمالاً وہاں کے حالات بیان کئے اور ساتھ ہی تعویذات کی ضرورت کا ذکر کیا، مولانا نے مجھے ایک کاپی دی اور فرمایا کہ اس میں سے اپنی ضرورت کے تعویذات نوٹ کرلو، اس پر انھوں نے ’’فیوضِ مدنی‘‘ کا عنوان لکھ رکھا تھا، مجھے چونکہ تعویذات کا ذوق نہیں ہے لیکن ضرورت اور مجبوری تھی اس لئے صرف خاص خاص تعویذات نقل کرلئے، جب یہ تعویذات نقل کرکے کاپی میں نے انھیں واپس کی تو بڑے اہتمام کے ساتھ انھوں نے ان تعویذات کی مجھے اجازت دی، میں ان سے کہتا رہا کہ اجازت کی ضرورت نہیں ہے اور نہ مجھے یہ کام کرنا ہے، اور نہ مجھے اس سے کوئی مناسبت ہے، مگر ازراہِ شفقت انھوں نے مجھے ڈانٹا اور زبردستی اجازت تھوپ دی، مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کی یہ اجازت رنگ لائے گی اور جس چیز سے مجھے قطعاً مناسبت نہیں ہے اسی کے ساتھ میری بدنامی ہوگی۔

☆☆☆☆☆

اسی سفر میں نانی ڈیہہ کے علاوہ ایک اور گاؤں میں جانا ہوا، اس کا نام ’’مورنے‘‘

ہے، یہ گاؤں گھوڑ مارا سے ۳/۴ رکلومیٹر شمال میں ہے، میں جب شعبان میں جسی ڈیہہ میں اترا تھا تو اپنے طلبہ کے ساتھ ایک معمر اور دیندار شخص کو بھی پایا تھا، جسی ڈیہہ میں دیوگھر کی گاڑی کے انتظار میں ڈیڑھ، دو گھنٹے رکنا تھا، میں نے دیکھا کہ وہ صاحب وضو کر کے تہجد پڑھنے میں مشغول ہوگئے، مجھے ان کی نیکی اور دینداری بہت بھلی معلوم ہوئی، چہرے پر عبادت کا نور جگمگا رہا تھا، تہجد سے فراغت کے بعد وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئے، میرے بارے میں طلبہ انھیں پہلے سے بتا چکے تھے، میں نے ان کا تعارف چاہا تو معلوم ہوا کہ ان کا نام محمد عثمان ہے، مورنے کے رہنے والے ہیں، کوئلے کی کان میں ملازمت کرتے ہیں، یہ بھی اپنے گھر واپس جا رہے ہیں، پھر گھوڑ مارا تک ساتھ رہے، انھوں نے بڑے اصرار کے ساتھ مورنے آنے کی دعوت دی، عید کے بعد جب مدرسے کی واپسی ہوئی تو دو روز کے لئے مورنے بھی جانا ہوا، قیام انھیں محمد عثمان صاحب کے گھر پر ہوا۔ یہ گاؤں پہاڑیوں کے بیچ میں ہے، چاروں طرف پہاڑیاں ہیں، درمیان میں مسلمانوں کا یہ گاؤں ہے، میں نے یہاں کے مسلمانوں کو دینداری کے آثار میں کچھ زیادہ پایا، بہت سے لوگ ذاکر وشاغل محسوس ہوئے، معلوم ہوا کہ چندسال پہلے حضرت مولانا سیّد اسعد صاحب مدنی علیہ الرحمہ ادھر تشریف لائے تھے اور بہت سے لوگ ان سے بیعت ہوئے تھے، یہ گاؤں سڑک سے قریب ہے، وہاں جانا آسان بھی ہے، لیکن معلوم ہوا کہ مولانا موصوف یہاں کے بعد نانی ڈیہہ بھی تشریف لے گئے تھے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کس مشقت سے وہاں پہونچے ہوں گے، وہاں بھی کچھ لوگ بیعت ہوئے تھے، اور ان کے ہاتھ میں بھی تسبیح نظر آتی تھی، اس کوردہ علاقے میں مولانا کا تشریف لے جانا محلِ حیرت تھا، مگر وہ جس قدر مجاہدے کے انسان تھے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی حیرت کی بات نہیں۔ مورنے میں ان کے اثرات میں نے واضح طور پر پائے، دو دن میرا قیام وہاں رہا۔

پونے دو ماہ کے اس قیام اور قدرے جدوجہد کے بعد حق تعالیٰ کی توفیق سے اس علاقہ میں دین کا رجحان پیدا ہوا، چنانچہ ۱۰ رشوال کو جب میں وہاں سے واپس ہوا، تو بچوں کی

ایک معتد بہ تعداد میرے ساتھ مدرسہ دینیہ غازی پور آئی، یہ بچے نوشت وخواند سے بالکل نابلد تھے، قاعدہ بغدادی پڑھنا بھی ان کے لئے مشکل امر تھا، لیکن ان کے گھر والوں نے بہت شوق سے انھیں میرے حوالے کیا۔ اللہ کے فضل نے کرم کیا، اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ بچے چل نکلے، مجھے ان بچوں کی بڑی قدر تھی، ان پر میں بہت محنت کرتا تھا، جو طلبہ مجھے وہاں لے گئے تھے، وہ اب بفضلہٖ تعالیٰ جلالین شریف اور ہدایہ اولین کی جماعت میں پہونچ گئے تھے، میرے ان کے یہاں جانے اور کام کا رنگ دیکھنے کے بعد ان کے حوصلے بہت بلند ہوئے، انھیں پڑھنے کا مزید شوق ہوا۔ دل وجان سے محنت میں لگ گئے، اس سال یہاں تعلیم کی تکمیل کرکے انھیں دیوبند جانا تھا، میں انھیں اس کے لئے تیار کررہا تھا، یہ تعلیم میں بھی محنت کرتے تھے اور خدمت بھی بہت شوق سے کرتے تھے، مجھے ان سے اتنی مناسبت اور محبت ہوئی، جیسے درس وتدریس کا کام میں نے انھیں طلبہ کے لئے شروع کیا ہو۔

واپسی کے بعد ابتداء ہی سے پروگرام بنتا رہا کہ بقرعید میں پھر چلنا ہے، مدرسہ میں دس دن تعطیل ہوتی ہے، میں نے ان طلبہ کو ساتھ لیا اور بقرعید سے تین چار روز پہلے پہونچ گیا، مجھے دیکھ کر لوگوں میں دین کا جوش خروش پیدا ہوا۔ سب لوگ مسجد میں جمع ہونے لگے، میری تقریروں اور مجلسوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، بوڑھے بھی، جوان بھی، نوجوان بھی، بچے بھی، سب ذوق وشوق سے شریک ہوتے، باتیں سنتے، اپنی سیدھی سادی زبان میں باتیں بھی کرتے۔ ان مجلسوں سے لوگوں میں دینداری بیدار ہوتی، اطراف کے دور ونزدیک کے مسلمان بھی کبھی کبھی آتے، خود میرے اوپر ان دنوں یکسوئی کا غلبہ تھا، یہاں وہاں آنے جانے کی ہمت نہ ہوتی، لوگوں کی بہت خواہش ہوتی کہ کھانے کی دعوت کریں، مجھے دعوتوں میں جانے سے مناسبت کیا معنی، سخت وحشت تھی، لیکن لوگ محبت سے بلاتے، میں شرط لگاتا کہ نماز کی پابندی کرو، تو قبول ہے، اس طریقۂ عمل سے بہت سے وہ لوگ جو نماز اور مسجد کی طرف رخ نہیں کرتے تھے، نمازی ہوگئے۔

میرے ساتھ ان تینوں عزیزوں کا تعاون مسلسل رہا، یہ اپنے گھر رہ کر بھی اپنے گھر

نہ رہتے، دن رات میرے ساتھ رہتے، طالب علمانہ شوخیوں اور لاپروائیوں سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ علاقے کے لوگ بھی ان کی دینداری سے بہت متاثر ہوتے، اور ان کی قدر کرتے۔

بقرعید میں قربانیاں بہت اہتمام سے ہوئیں، میرے وہاں ہونے کی وجہ سے پورا علاقہ دینی اعمال واشغال سے معمور رہا، اب میرا بھی حوصلہ بڑھا، میں بچوں کو تعلیم کے لئے تیار کرتا رہا۔ اکثر کو تعلیم دینے کے لئے اور بعض کو مدرسہ کی خدمت کے لئے ساتھ لے گیا۔”

☆☆☆☆☆

مدرسہ دینیہ میں دوسرا سال

شوال ۱۳۹۴ھ تا شعبان ۱۳۹۵ھ

میں پچھلے سال جب مدرسہ دینیہ میں آیا تھا، تو یہاں تعلیم کہنے تو عربی چہارم تک تھی، مگر طلبہ بہت کم تھے، عربی چہارم میں صرف دو طالب علم تھے، مولوی خورشید عالم اور مولوی عابد علی۔ یہ دونوں بچے بہت سعادت منداور نیک ودیندار تھے، ذہنی وعلمی استعداد متوسط تھی، عربی سوم میں بھی دو ہی طالب علم تھے جن کی استعداد بہت کمزور تھی، عربی دوم میں کوئی طالب علم نہ تھا۔ عربی اول میں اور فارسی میں مجموعی اعتبار سے پانچ سات طلبہ رہے ہوں گے، درجۂ حفظ میں دس پندرہ تھے، یہ کل کائنات تھی۔ اساتذہ میں عربی وفارسی میں میرے علاوہ حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب علیہ الرحمہ صدر المدرسین تھے، اور مولوی جلال الدین صاحب علیہ الرحمہ تھے، درجہ حفظ میں حافظ محمد الیاس صاحب تھے، عمارت بھی بہت مختصر تھی، مکتب کے درجات میں بھی طلبہ زیادہ نہ تھے، البتہ مہتمم جناب عزیز الحسن صاحب صدیقی کا حوصلہ بلند تھا، وہ موقع کے لحاظ سے تو چھوٹا مدرسہ تھا، مگر کاغذی تحریروں اور منصوبوں کے اعتبار سے خاصا بڑا تھا۔

کھلی ہوا کا مدرسہ:

میرے آنے سے پہلے عزیز الحسن صاحب نے مدرسہ کی افادیت کو عام کرنے کے لئے ایک بڑا منصوبہ بنایا تھا اور اس پر عمل درآمد بھی ہوا تھا، جس سے مدرسہ کی خاصی شہرت ہوگئی تھی۔ اس منصوبہ کا نام انھوں نے ’’کھلی ہوا کا مدرسہ‘‘ رکھا تھا، انھوں نے شہر کے تنگ ماحول سے مدرسہ کو، مدرسہ کے اساتذہ کو، مدرسہ کے طلبہ کو، مدرسہ کے انتظام کو، مدرسہ کے دفتر اور مطبخ کو اٹھایا، اور اس سارے تام جھام کو لے ایک گاؤں دیہات میں ڈیرا جما دیا۔ وہاں اسباق ہو رہے ہیں، اساتذہ ہیں، طلبہ ہیں، باورچی ہے، دفتر ہے، گھنٹہ بج رہا ہے، طلبہ کتابیں لے کر بیٹھے، اساتذہ درس دے رہے، گاؤں کا ماحول بالکل مدرسہ کے ماحول میں بدل گیا ہے، یہ ایک نئی چیز تھی، ایک ہفتہ تک اس گاؤں میں خوب چہل پہل رہی، لوگ آتے اور مدرسہ کی رونق دیکھتے، متاثر ہوتے، ایک ہفتہ مدرسہ چلتا رہا، پھر انھوں نے ایک جلسہ کیا، جس میں اس وقت کے بڑے عالم وخطیب حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب جلال پوری علیہ الرحمہ تشریف لائے، انھوں نے تقریر فرمائی، اور فرمایا کہ ہم لوگ کہتے ہیں کہ لوگو! آؤ اور مدرسہ دیکھو، عزیز صاحب نے خطاب وانداز بدل دیا، یہ کہتے ہیں لیجئے اور مدرسہ دیکھئے! یہ ان کا اجتہاد ہے، لیکن غازی پور کا ضلع دینی تعلیمی اعتبار سے ایک پژمردہ ضلع ہے، میں جب مدرسہ دینیہ میں آیا تو اس ’’کھلی ہوا کے مدرسہ‘‘ کا بجز کاغذی تحریر کے اور کوئی خاص اثر نہیں دیکھا، ہاں تھوڑی سی شہرت بڑھی تھی مگر ضلع غازی پور میں نہ کوئی تعلیمی یا دینی جذبہ بیدار ہوتا ہوا محسوس ہوا نہ مدرسہ میں طلبہ کا کوئی اضافہ ہوا، بس ایک مردنی سی مردنی تھی اور افسردگی سی افسردگی!

اس کی وجہ جو بھی رہی ہو، مگر میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ باہر کی شہرت اور کاغذی تحریریں مدرسہ کی افادیت کے لئے زیادہ کارآمد نہیں ہوتیں، مدرسہ کا داخلی نظام جب تک ٹھوس اور پختہ نہ ہو مدرسہ ترقی نہیں کرتا، اساتذہ اچھے ہوں، تعلیم کا نظام عمدہ ہو، طلبہ کو تعلیمی مشاغل کے لئے فارغ رکھا جائے، ان سے تعلیم کی محنت لی جائے، تب مدرسہ پھلتا

پھولتا ہے، اور اگر طلبہ واساتذہ کو تعلیم سے الگ تحریک اور خدمت کے دوسرے کاموں میں الجھا دیا جائے تو مدرسہ بانجھ ہو کر رہ جاتا ہے، خدمت خلق اچھی چیز ہے، عبادت ہے، مگر وہ اپنے وقت پر ٹھیک ہوتی ہے، تحصیل علم کے زمانے میں علم کے لئے یکسوئی ہونی چاہئے، اس وقت کسی بھی خدمت میں لگانا تعلیم کے لئے مضر ہوتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے تو تحصیل علم کے زمانے میں طلبہ کو بیعت کرنے اور تصوف وسلوک کے مشاغل میں لگانے کو بھی پسند نہیں کیا، حالانکہ وہ دینی زندگی کی سب سے اہم ضرورت ہے، کیونکہ اس میں لگ کر حصول علم کی راہ کھوٹی ہوتی ہے، پھر سوچا جا سکتا ہے کہ طلبہ کو خدمت خلق کے دوسرے شعبوں میں لگانا جس کا براہ راست علم اور دین سے تعلق نہیں، کتنا مضر ثابت ہوگا، مجھے محسوس ہوا کہ مدرسہ اس لئے پیچھے جا رہا ہے کہ تعلیم پر زور نہیں ہے، البتہ دوسری خدمتوں کے لئے طلبہ گویا مفت کے کارکن مل گئے ہیں، ان کو جہاں جھونک دیا جائے ہفتوں کا کام دنوں میں اور دنوں کا کام گھنٹوں میں انجام پا جاتا ہے، مگر وہ جس کام کے لئے مدرسہ میں داخل ہوئے ہیں اس سے کورے رہ جاتے ہیں، پس بددل ہوتے ہیں اور کوئی دوسری راہ اختیار کر لیتے ہیں، میں نے دیکھا کہ جو تھوڑے سے طلبہ ہیں وہ خدمتوں کے تو بہت مشاق ہیں، مگر تعلیم اور مطالعہ و مذاکرہ میں حد درجہ مژمردہ ہیں، میں نے اس صورت حال کو محسوس کیا تو عزم کیا کہ پژمردگی اور مردنی کے اس ماحول کو بدلنا ہے، اس سلسلے میں مجھے بہت محنت کرنی پڑی، تعلیمی نظم وضبط کو استوار کیا، مغرب کی نماز کے بعد روزانہ ان چند طلبہ کو لے کر بیٹھتا، انھیں سمجھاتا، علم کی اور تعلیم کی اہمیت بتاتا، مطالعہ و مذاکرہ کی ترغیب دیتا، حصول علم کے لئے محنت ومجاہدہ پر آمادہ کرتا، پھر باقاعدہ نگرانی کرنا، اس طرح سال بھر میں ماحول یکسر بدل گیا، طلبہ میں پڑھنے کا ذوق وشوق نمایاں ہوا، اسباق کی پابندی ہونے لگی، مطالعہ و مذاکرہ کی فضا بنی، اس کا خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ اس سال طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا، جماعتوں کا تسلسل بھی قائم ہوا۔

میں رمضان کے بعد جب دُمکا سے واپس آیا تو میرے ساتھ ابتدائی طالب علموں کا ایک قافلہ آیا، یہ قافلہ ایک نئے جوش کے ساتھ آیا تھا، جو جہل وضلالت کے ماحول سے

نکل کرآ رہا تھا، اس کے علاوہ آس پاس کے طلبہ بھی معقول تعداد میں داخل ہوئے، اب میری طبیعت نے مشغولیت کا وافر سامان پایا، یکسوئی بڑھی، پچھلے سال کا اضطراب ختم ہوا، طبیعت مدرسہ میں جمی، فارسی کے لے کر عربی پنجم تک کے طلبہ کی جماعتیں مسلسل قائم ہوئیں، مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ میرے پاس بارہ چودہ کتابیں زیر درس تھیں، عربی پنجم سے عربی دوم تک ہر جماعت کی زیادہ تر کتابیں میں ہی پڑھاتا تھا، فجر کے بعد سے درس شروع ہوتا، تو مغرب کے پہلے تک سلسلہ چلتا رہتا، پڑھانے کا وہ جوش تھا کہ تکان کا نام ونشان نہ تھا، عربی پنجم کے طلبہ سے خاص طور سے دلبستگی تھی، اس جماعت میں بڑے بڑے طلبہ تھے، اور بہت فہیم اور فرمانبردار تھے، خاص طور سے

۱۔ عزیزم مولوی رفیع الدین سلّمہٗ
۲۔ عزیزم مولوی منیر الدین سلّمہٗ
۳۔ عزیزم مولوی ولی محمد سلّمہٗ
۴۔ عزیزم مولوی حبیب اللہ سلّمہٗ
۵۔ عزیزم مولوی خورشید عالم سلّمہٗ
۶۔ عزیزم مولوی عابد علی سلّمہٗ
۷۔ عزیزم مولوی عبدالحق سلّمہٗ

ان طلبہ پر محنت کر کے طبیعت خوش ہوتی تھی، یہ بھی بہت سعادت مندی کے ساتھ تعلیمی یکسوئی میں لگے رہتے تھے، مدرسہ میں تجوید کی تعلیم کا نظم نہ تھا، میرے پاس ان طلبہ کا آخری سال تھا، میں عصر کے بعد انھیں تجوید پڑھاتا تھا۔ غرض صبح سے شام تک مسلسل مشغولیت رہتی، ان دنوں عبادات کا ذوق بھی عروج پر تھا، صوم داؤدی کا پابند تھا، رات کو عشا کے بعد جلد سو جاتا، صبح صادق سے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے بیدار ہوتا، نماز وتلاوت اور ذکر وشغل کی مشغولیت رہتی، پھر فجر کے بعد اشراق تک وظائف، پھر مسلسل درس! یہ چوبیس گھنٹہ کا عمل ہوتا، کہیں آنا جانا بند! تعلقات مختصر سے مختصر! میں ہوتا، طلبہ ہوتے، کتابیں ہوتیں، گھرانا بھی چھوٹا تھا، ایک بیوی، گود میں ایک بچی! نہ بیوی کا کوئی مطالبہ اور دباؤ، اور نہ بچی کا کوئی مسئلہ!

میرا زیادہ وقت مدرسہ میں گزرتا، تعارف نہ تھا، اس لئے ملاقاتوں کی کوئی زحمت نہ تھی، فجر کی نماز سے قبل مدرسہ میں آجاتا، اذان کہتا، طلبہ کو جگاتا، دوپہر کے وقفہ میں گھر جاتا جو مدرسہ سے تقریباً ایک کلومیٹر دور تھا، ظہر میں واپس آتا، پھر عشا کے بعد جاتا۔ یہ ایسا دور تھا کہ کسی معمول میں تخلف کم ہوتا، مدرسہ میں سارا وقت یا تو درس وتدریس اور طلبہ کے لئے ہوتا یا عبادت کے لئے!

مجھے یاد ہے کہ ان دنوں ایک وقت مشہور عالم وخطیب حضرت مولانا ضمیر احمد صاحب جلال پوری علیہ الرحمہ ایک ہفتہ تک مدرسہ دینیہ میں تشریف فرما رہے، غازی پور کے مختلف حلقوں اور گاؤں میں ان کے پروگرام چل رہے تھے، وہ رات میں یا صبح کو مدرسہ میں تشریف لاتے اور شام تک قیام فرماتے، پھر پروگرام میں جاتے، میں اس وقت ان سے قریب ہوا، انھوں نے بھی محبت کا برتاؤ کیا، بہت دنوں کے بعد ان کے مدرسہ کے ایک مدرس مولانا محمد صاحب، جن کا نام پیر محمد تھا، مگر ہم لوگ صرف محمد کہتے تھے، دیوبند میں بندہ ان کے قریب تھا، یہ فارغ ہوکر حضرت مولانا وحید الزماں صاحب علیہ الرحمہ کے قائم کردہ درجہ صف نہائی میں زیر تعلیم تھے اور میں صف ثانوی میں تھا اور جلالین شریف پڑھ رہا تھا۔ انھوں نے سنایا کہ مولانا جب غازی پور سے لوٹے تو فرما رہے تھے میں مدرسہ دینیہ میں ایک جن سے مل کر آرہا ہوں، وہ ابتداء سے عربی پنجم تک کی بارہ چودہ کتابیں پڑھاتا ہے، رات میں زیادہ تر عبادت کرتا ہے، دن بھر پڑھاتا ہے، اللہ جانے کب مطالعہ کرتا ہے، اور طلبہ نہ صرف اس سے مطمئن ہیں بلکہ اس پر فدا ہیں، اس کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔

مولانا محمد صاحب کہہ رہے تھے مولانا کے اس ارشاد سے مجھے خوشی ہوئی، میں تو آپ کو جانتا ہوں، ساتھ ہی رشک بھی آیا۔

مدرسوں میں طلبہ کے بگاڑ کے اسباب: (۱)

عربی پنجم کے طلبہ کو اگلے سال چونکہ دیوبند جانا تھا، اس لئے میں ان کے ساتھ

---

(۱) یہ عنوان حضرت مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی بالکل آخری تحریر ہے، انتقال کے دن صبح میں نے اس کو تصحیح کیلئے دیا اور کہا کہ یہاں عنوان کی علامت بنی ہوئی ہے اور عنوان ہے نہیں، تو یہ لکھ کر دیا۔ (ضیاء الحق)

خاص محنت کرتا تھا، علمی وکتابی صلاحیت واستعداد کے ابھارنے اور بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ ان کی دینی واخلاقی تربیت کا بھی خاص اہتمام کرتا تھا، میں چونکہ دیوبند میں خود ایک بڑے حادثے کی چوٹ کھائے ہوئے تھا، اس لئے چاہتا تھا کہ میرے طلبہ اس کی طرح کی چوٹ سے محفوظ رہیں، لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ کم ازکم دارالعلوم دیوبند کا ماحول ایسا ہے کہ اگر کوئی کچھ بننا چاہے تو اسے بھی سازگار ماحول مل جاتا ہے، لیکن بگڑنے اور بگڑتے چلے جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ جس حادثہ سے میں دوچار ہوا تھا یہ بھی اس کے شکار ہو جائیں، میں اکثر غور کیا کرتا تھا کہ وہ کیا اسباب ہیں جن میں مبتلا ہو کر طلبہ نفس وشیطان کے دام میں پھنستے ہیں، مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے دو خاص اسباب ہیں، طلبہ نادانی میں اور نوجوانی کے جوش میں اس کے قریب جاتے ہیں اور حرماں نصیبی کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

(۱) ان میں پہلی چیز انجمن سازی ہے، انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں طلبہ کی یونین ہوتی ہے، یہ یونین انتظامیہ کے لئے بڑا دردسر بنتی ہے، مگر کالجوں کے سامنے نصب العین چونکہ صرف دنیا اور مفاد دنیا ہے، اس لئے انجمن اور یونین ان کے مقاصد کے لئے قدرے معین ثابت ہوتی ہے، اس کی وجہ سے انتظامیہ کے سامنے جو مسائل آتے ہیں، انھیں وہ دنیاوی طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ مسائل حل ہوں یا نہ ہوں، ان کے سامنے آخرت کی جواب دہی کا احساس چونکہ نہیں ہوتا، نہ شرعی مسائل کا پاس ولحاظ کوئی رکاوٹ بنتا، اس لئے وہ بجائے الجھن بننے اور باعث خرابی ہونے کے سیاسی شعور حاصل ہونے کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں، ہر کالج اور یونیورسٹی میں یونین کا موضوع دردسر بنتا ہے، نہ جانے کتنے جھگڑے، کتنے فساد اس سے ابھرتے ہیں اور نہ جانے کتنی ذہانتیں اور کتنی صلاحیتیں اس سیلاب بلا میں ڈوب جاتی ہیں، مگر دنیادارانہ نظام تعلیم خوش ہوتا ہے کہ اس نے اتنے لیڈر، اتنے قائد پیدا کئے، حقیقت میں یہ سوچ ذوق کا فساد ہے۔

میں نے دیکھا کہ بلاؤں کا یہ سیلاب انگریزی درس گاہوں سے چل کر اسلامی

درس گاہوں میں بھی گھس آیا ہے، یہاں بھی انجمن بنتی ہے، جمعیۃ سجتی ہے، انتخابات کے نام پر الیکشن ہوتے ہیں، پارٹیاں سجائی جاتی ہیں، امیدواروں کی حمایت ومخالفت کی سرگرانیاں تعلیم کے نظام کوتہ وبالا کرتی ہیں، پورے سال اس پارٹی بندی کا اثر باقی رہتا ہے، تعلیم کی چولیں ہل جاتی ہیں، طبیعتوں کا رخ بدل جاتا ہے، میں نے متعدد طلبہ کو دیکھا کہ وہ تعلیم میں ذہین تھے، محنت میں طاق تھے، ان سے دین اور علم کے موضوع پر بڑی امیدیں وابستہ تھیں، مگر انجمن کے انتخاب اور اس کے عہدوں کی کشمکش نے انھیں کسی اور راہ پر ڈال دیا، ان کی صلاحیتیں نہ صرف بجھ کر رہ گئیں، بلکہ انھوں نے تعمیر کے بجائے تخریب کی راہ اختیار کی، اور خود اپنے لئے، اپنے معاشرہ کے لئے بلکہ بعض اوقات دین وملت کے لئے بڑا مسئلہ بن گئے۔

مدارس کا موضوع چونکہ دین کا علم وعمل ہے، آخرت کا افکر واعتقاد ہے، اللہ کی رضا وخوشنودی ہے، انجمن اور اس کے تقاضے اس موضوع سے خاصے منحرف ہیں، اس لئے ان میں پڑ کر طالب علم کی طبیعت عجب انتشار کی شکار ہوتی ہے، نہ وہ دین کے لئے یکسو ہو پاتا اور نہ دنیا کے لئے! پھر جس مقصد کے لئے اس نے مدرسہ میں قدم رکھا تھا اس سے بہت دور جا پڑتا ہے، تب نہ وہ اپنے موضوع کا ہوتا ہے نہ دنیا کے موضوع کا، یہ اس کی بہت بڑی ناکامی ہوتی ہے۔

میں نے اپنے طلبہ کو انجمن سازی سے یکسو کرنے کا اہتمام کیا، میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک تھوڑی سی دنیاوی چمک دمک اور عارضی عزت وجاہ کے لئے وہ اپنی پوری دینی زندگی کو داؤ پر لگا دیں، میں خود اس کا شکار ہو چکا تھا، اس لئے اس فساد کی رگ رگ سے واقف ہو گیا تھا، میں بہت تفصیل سے اس سلسلے میں اپنے طلبہ کو سمجھاتا تھا، مجھے طلبہ سے چونکہ محبت بہت ہے، اس لئے وہ میری بات سمع قبول بلکہ حسن قبول سے سنتے ہیں، میں نے طلبہ کو متنبہ کیا کہ جب تم دار العلوم جاؤ گے تو وہاں تمہیں بھی انجمن سازی کی دعوت دی جائے گی، عہدے پیش کئے جائیں گے، مگر تم قریب نہ جانا، صراحۃً مخالفت بھی نہ کرنا ورنہ خوامخواہ کی

دشمنی پیدا ہوگی، اور عاقبت برباد ہوگی، بس خود کو ایسا بنالو کہ تمہیں لوگ بے کار اور نکما سمجھ کر چھوڑ دیں، اس میں تمہاری تھوڑی سی سبکی محسوس ہوگی مگر اس کا تحمل کرلو، آئندہ تمہارے حق میں بہتری ہوگی۔

اس سلسلے میں مَیں نے طلبہ کو مثنوی مولانا روم کی یہ حکایت اکثر سنائی کہ ایک شخص تجارت کے لئے اپنے گھر سے نکلا، اسے ہندوستان آنا تھا، نکلتے وقت اس نے اپنے گھر والوں سے، عزیزوں سے فرمائش کی کہ اگر کسی کو ہندوستان کا کوئی تحفہ درکار ہو، کوئی چیز پسند ہوتو فرمائش کرے، میں لاؤں گا، سب نے اپنی اپنی پسند کی فرمائش کی، گھر میں ایک طوطا پلا ہوا تھا، اس نے ازراہ تلطف اس سے بھی دریافت کیا میاں مٹھو! تم بھی کچھ کہو اس نے کہا کہ ہندوستان میں امرودوں کے باغ پر اگر گزرہو تو میری برادری اور کنبے کے افراد بکثرت ملیں گے، ان سے میرا سلام کہئے گا، اور انھیں اطلاع کردیجئے گا کہ تمہاری برادری کا ایک فرد میرے یہاں پنجرے میں پرورش پارہا ہے، پھر جو پیغام ادھر سے ملے، میرا تحفہ وہی ہوگا۔ اس نے کہا بہت خوب! وہ سفر پر نکلا، ہندوستان میں شہر در شہر گھومتا رہا، ایک روز امرودوں کے ایک باغ میں وہ ٹھہرا ہوا تھا، اچانک طوطوں کی ٹائیں ٹائیں سنائی دی، اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو پرندوں کا ایک جم غفیر تھا، اس نے باواز بلند پکار کر اپنے گھر کے طوطے کا سلام و پیام کہا، یہ سننا تھا کہ ایک خوبصورت طوطا جھرجھرایا، کانپا، ٹائیں ٹائیں چیخا، اور گر کر مرگیا، اس کو بیحد افسوس ہوا کہ ناحق یہ طوطا مرگیا، ایسا لگتا ہے کہ یہ میرے طوطے کا کوئی محبت کرنے والا تھا، شاید صدمہ کی وجہ سے مرگیا، دل میں طے کیا کہ میں اپنے طوطے سے اس واقعہ کو ظاہر نہ کروں گا، وہ جب لوٹ کر گھر آیا اور خوشی خوشی سب کی فرمائشوں کی تکمیل اور ان کے تحفے پیش کئے، آخر میں طوطے نے کہا حضور! میرے پیغام کا کیا ہوا؟ تاجر نے آہ سرد بھری اور کچھ معذرت کے کلمات کہے، طوطے نے اصرار کیا، اس نے کہا کہنے کی بات نہیں، کہنے لگا نہیں ضرور بتایئے! آخر میرا کیا قصور ہے؟ سب کے تحفے آپ لائے اور میں ہی محروم رہوں، اس نے کہا سنو! میں نے تمہارا سلام تمہاری قوم کے افراد سے کہا، تمہارا پیغام پہونچایا، پیغام کا

سننا تھا کہ سلام کا جواب تو درکنار! ایک طوطا کانپا اور تھرتھرایا اور بے تحاشا گرا اور مر گیا، اتنا سننا تھا کہ قفس میں یہ طوطا بھی کانپا، چیخا اور تڑپ کر مر گیا، تاجر پریشان ہو گیا، یہ طوطا اس کے گھر کی زینت تھا، اسے ایک سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا، اس نے افسوس کرتے ہوئے طوطے کو ہلایا ڈلایا، خوب دیکھا، اسے یقین ہو گیا کہ یہ بھی دم توڑ چکا ہے، بہزار افسوس اس نے اسے پنجرے سے نکالا اور ایک گھورے پر لے جا کر پھینک دیا، پھینک کر ابھی دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے پھرجھرجھری لی اور ایک زقند بھر کر ایک درخت کی اونچی شاخ پر جا بیٹھا، اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، وہ شاخ پر بیٹھا اپنی مخصوص بولی بولنے لگا، تاجر نے چلا کر کہا او دغاباز! یہ کیا تیری حرکت ہے، میں نے تیری کتنی خدمت کی، کھلایا پلایا، تربیت دی، لیکن واقعی طوطا چشمی اسے کہتے ہیں، سب احسان فراموش کر کے تو دغا دے گیا، تو نے دھوکہ دیا، طوطے نے جواب دیا کہ میں آزاد ہو کر فضاؤں میں اڑنے والا پرندہ آپ کی قید میں گرفتار تھا، ایک چھوٹے سے پنجرے میں میری زندگی تنگ تھی، میں نے اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ رہائی کی تدبیر بتاؤ، میں گرفتار ہوں، میرے دوست نے اشارے کی زبان میں مجھے بتایا کہ تم اپنی آواز اور حسن نغمہ کی وجہ سے گرفتار ہو، جب تک تمہارا یہ ہنر باقی ہے، رہائی نصیب نہ ہوگی، میری طرح مردہ ہو جاؤ، ہنر ختم اور قید بھی ختم! چنانچہ میں نے اس پیغام کو سمجھا اور مردہ ہو گیا، اب آپ کے لئے بے کار تھا، آپ نے مجھے پنجرے سے نکال کر باہر پھینک دیا، کیونکہ میں آپ کے کام کا نہ رہا، اب آزاد ہوں، اب تنگنائے قفس سے باہر ہوں، لیجئے میرا آخری سلام لیجئے۔ یہ کہہ کر وہ فضا کی وسعتوں میں گم ہو گیا، تاجر ہاتھ مل کر رہ گیا۔

میں نے کہا، تم لوگ حصول علم کی راہ میں ہر کام سے نکمے ور نا کارہ بن کر رہو تا کہ کوئی انجمن تمہیں نہ پوچھے، نہ تم صدر بننے کی لیاقت رکھو نہ سکریٹری بننے کی، نہ انجمن کے کسی کام کی! طلبہ تمہیں بیوقوف کہیں، صوفی کہیں، بے کار کہیں، سنو اور خوش رہو، تمہیں کوئی نہ چھیڑے گا، تم علم کیلئے فارغ رہو، اور بس ایک ہی کام کرو، دوسرے کسی کام سے مطلب نہیں!

☆☆☆☆☆

تصانیف حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ

(۱) **تسہیل الجلالین** ”شرح اردو جلالین شریف“ (جلد اول)

(سورہ بقرہ تا سورہ نساء، سوا پانچ پارے)، صفحات: 648 قیمت: 400

(۲) **حدیث دوستاں**

دینی واصلاحی اور علمی وادبی مکاتیب کا مجموعہ، صفحات: 730 قیمت: 350

(۳) **حدیث دردِ دل**

مجلّہ المآثر، الاسلام، اور ضیاء الاسلام کے اداریئے صفحات: 592 قیمت: 300

(۴) **کھوئے ہوؤں کی جستجو**

مختلف شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ، صفحات: 616 قیمت: 200

(۵) **حیاتِ مصلح الامت**

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمی کی مفصل سوانح، صفحات: 528 قیمت: 150

(۶) **مدارسِ اسلامیہ، مشورے اور گزارشیں** (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)

مدارس سے متعلق مضامین کا مجموعہ، صفحات: 312 قیمت: 150

(۷) **بطوافِ کعبہ رفتم** ---(سفرنامۂ حج) (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)

حرمین شریفین (مکہ مکرمہ ومدینہ منورہ) کے سفر کی روداد، صفحات: 464 قیمت: 300

(۸) **تہجد گزار بندے** (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)

تہجد کی اہمیت وفضیلت اور تہجد گزار بندوں کا تفصیلی تذکرہ، صفحات: 472 قیمت 300

(۹) **ذکرِ جامی**

ترجمان مصلح الامتؒ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے حالاتِ زندگی، صفحات: 216 قیمت: 90

(۱۰) **حضرت چاند شاہ صاحب اور ان کا خانوادۂ تصوف**

حضرت چاند شاہ صاحب ٹانڈوی اور ان کے خلفاء کے حالات، صفحات: 180 قیمت: 70

(۱۱) **تذکرہ شیخ ہالیجویؒ:** سندھ کے معروف شیخ طریقت و عالم اور مجاہد فی سبیل اللہ

حضرت مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کا مفصل تذکرہ۔ صفحات: 224، قیمت: 56

(۱۲) **مودودی صاحب اپنے افکار ونظریات کے آئینہ میں**

مولانا بنوریؒ کی عربی کتاب الاستاذ المودودی کا ترجمہ۔ صفحات: 184، قیمت: 95

(۱۳) **حکایتِ ہستی** (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)

خودنوشت سوانح، ابتداءِ حیات سے اختتام طالب علمی تک۔ صفحات: 400، قیمت: 250

(۱۴) **کثرتِ عبادت** عزیمت یا بدعت؟ قیمت ۲۸/روپے

(۱۵) **قتل ناحق** قرآن وحدیث کی روشنی میں قیمت ۱۶/روپے

(۱۶) تعویذات وعملیات کی حقیقت وشرعی حیثیت قیمت ۲۰/روپے

(۱۷) شب برأت کی شرعی حیثیت قیمت ۴۰/روپے

(۱۸) اخلاق العلماء علماء کیلئے خاص چیز قیمت ۲۰/روپے

(۱۹) دینداری کے دو دشمن حرصِ مال وحب جاہ قیمت ۴۰/روپے

(۲۰) فتنوں کی طغیانی ٹی۔وی پر ایک فکر انگیز تحریر! قیمت ۱۵/روپے

(۲۱) اہل حق اور اہل باطل کی شناخت قیمت ۶۰/روپے

(۲۲) مالی معاملات کی کمزوریاں اور انکی اصلاح قیمت ۴۰/روپے

(۲۳) منصب تدریس اور حضرات مدرسین	قیمت ۴۵/روپئے
(۲۴) حج وعمرہ کے بعض مسائل میں غلو اور اس کی اصلاح	قیمت ۳۵/روپئے
(۲۵) برکات زمزم ماءزمزم کی فضیلت واہمیت کا بیان	قیمت ۲۵/روپئے
(۲۶) تصوف ایک تعارف!	قیمت ۸۰/روپئے
(۲۷) خواب کی شرعی حیثیت	قیمت ۴۰/روپئے
(۲۸) تکبر اور اس کا انجام	قیمت ۳۰/روپئے
(۲۹) مسئلۂ ایصالِ ثواب	قیمت ۶۰/روپئے
(۳۰) مروجہ جلسے بے اعتدالیاں اور ان کی اصلاح	قیمت ۳۰/روپئے
(۳۱) رمضان المبارک: نیکیوں کا موسم بہار	قیمت ۴۰/روپئے
(۳۲) علوم ونکات: (مجموعۂ مضامین) جلد اوّل، دوم	قیمت ۱۰۰۰/روپئے
(۳۳) نمونے کے انسان	قیمت ۲۵۰/روپئے

اسٹاکسٹ

مکتبہ ضیاء الکتب اترارى، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
PIN:276403 MOB:9235327576

دیوبند میں ہماری کتابیں ملنے کا پتہ
کتب خانہ نعیمیہ، جامع مسجد دیوبند (01336223294)

دہلی میں ہماری کتابیں ملنے کا پتہ
فرید بک ڈپو، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ (01123289786)

خوشخبری

حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے متعلقین کے لئے یہ خبر مسرت کا باعث ہوگی کہ ان کے علمی وفقہی مضامین کا مجموعہ انشاء اللہ عنقریب (اندازاً ایک دو ماہ میں) طبع ہوکر منظر عام پر آرہا ہے۔ جو حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے صاحبزادے مولانا محمد عرفات سلّمہٗ کی کوشش وکاوش کا مرہون منت ہے، جس پر وہ تمام متعلقین کی جانب سے شکریئے کے مستحق ہیں۔

اس کتاب کے مندرجات سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

فقہی مضامین

۱۔ مسئلہ عنین
۲۔ المد التعظیمی لفظ اللہ میں مد کی تحقیق
۳۔ نوٹوں کی شرعی حیثیت
۴۔ دارالحرب میں ربوا کی شرعی حیثیت
۵۔ گاؤں میں جمعہ
۶۔ شرعی پنچایت یا قاضی
۷۔ زکوٰۃ
۸۔ فی سبیل اللہ
۹۔ مصارف زکوٰۃ، ایک اہم استفتا کا جواب
۱۰۔ مسئلہ رفع یدین

تعارف کتب حدیث

۱۱۔ مسند حمیدی
۱۲۔ کتاب الزہد والرقائق
۱۳۔ المطالب العالیہ
۱۴۔ کشف الاستار
۱۵۔ مؤطا امام محمد، تعارف واہمیت

متعلقات حدیث

۱۶۔ استدراکات علمیہ
۱۷۔ ضعیف اور موضوع احادیث
۱۸۔ کتابت حدیث کے اصول وقواعد
۱۹۔ محدث کبیر کی اسناد حدیث

متفرقات

۲۰۔ نقد بر حقیقت رجم
۲۱۔ امام محمد اور اہل الرائے ہونے کی حقیقت
۲۲۔ البانی شذوذہ واخطاءہ
۲۳۔ سنت مؤکدہ